یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اردو مثلاً مرزا غالب، خواجہ حالی، علامہ شبلی، مولانا آزاد،
مولانا ظفر علی، علامہ اقبال، منشی پریم چند وغیرہ کے علاوہ تمام مصنفین کی تصانیف [illegible]
لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، حیدرآباد، اکبرآباد، اعظم گڑھ وغیرہ مقامات کی چھپی ہوئی ہر قسم کی کتابیں
ہمارے یہاں موجود ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرما کر اپنی پسند کی کتابیں منتخب فرمائیں

رعایت: مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف ہو سکتا ہے بشرطیکہ

(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔
(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر ان شرطوں کے ساتھ کہ فرمائش
مبلغ پانچ روپے سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی بھیج دی جائے۔ محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔
البتہ ان کتابوں پر جن میں پہلے ہی کسی قسم کی رعایت دی گئی ہو یہ ممکن نہ ہوگا۔

مکتبہ جامعہ کے مندرجہ ذیل رسائل کے نمونے مفت طلب کیجیے

رسالہ جامعہ ماہوار ۔۔۔ پیام تعلیم ماہوار ۔۔۔ کتاب ماہوار
سالانہ چندہ [illegible] ۔۔۔ سالانہ چندہ [illegible] ۔۔۔ سالانہ چندہ [illegible]

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

حصہ پڑھ چکا ہو۔ لمحات شام میں پستالوزی نے جماعت کا ایک نصب العین پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان
اپنی فطرت اعلیٰ کی تکمیل سے کیا ہو سکتا ہے۔ لین ہارڈ اور گرٹروڈ میں جماعتی زندگی کی اصلی تصویر پیش
کی گئی ہے یعنی اس میں انسان کی صرف فطرت اعلیٰ ہی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ اس کی فطرت ادنیٰ بھی
انسان کی اعلیٰ اور ادنیٰ فطرت کا کوئی ہم آہنگ نظام موجود نہیں ہے۔ پستالوزی تقریباً پندرہ برس
کوشش کرتا رہا کہ وہ کسی طرح جماعتی زندگی میں ایک توازن پیدا کر دے۔ پہلے اس نے حکومت اور
قانون کے ذریعے اس کی کوشش کی جب اسے اس میں ناکامیابی ہوئی تو وہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔
پستالوزی تمام عمر اس کی تحقیق کرتا رہا کہ انسان کی فطرت خیر پر مبنی ہے یا شر پر؟ اس کتاب میں بھی
پستالوزی کے پیش نظر یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ پستالوزی کی سب سے اعلیٰ فلسفیانہ تصنیف "تحقیقات
فطرت انسانی" میں بھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک
پستالوزی کے پیش نظر حقیقت انسان ہی کا مسئلہ رہا۔

مسئلہ فطرتِ انسانی

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی شخص فطرت انسانی کی حقیقت کو نہ سمجھتا ہو، اس کے قوانین سے
واقف نہ ہو، وہ کس طرح جماعتی زندگی میں حصہ لے سکتا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کر سکتا ہے؟ یا وہ کس
طرح انسان کی تعلیم و تربیت کر سکتا ہے۔ "لمحات شام" میں پستالوزی لکھتا ہے کہ "انسان کیا ہے، اس
کو کس چیز کی ضرورت ہے، کونسی چیز اس کو اعلیٰ کرتی ہے اور کونسی ادنیٰ۔ کونسی اس کو قوی کرتی ہے
اور کونسی ضعیف۔ قوموں کی رہنمائی کرنے والوں کو بھی اس کے جاننے کی ضرورت ہے اور ادنیٰ
جھونپڑوں میں رہنے والے بھی اس علم کے محتاج ہیں۔

اس کتاب کی تمام عبارت ایک الہامی انداز میں لکھی گئی ہے۔ صداقت اور جوش ہر جگہ
ٹپکا پڑتا ہے۔ خاص اور اہم خیالات نہایت مختصر مگر موثر جملوں میں ادا کئے گئے ہیں، اس کتاب
کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پستالوزی کے خیالات کی داخلی بنیادوں سے واقف ہو۔
فطرت کا تصور جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اس کتاب میں پیش پیش ہے۔ اکثر پستالوزی

رت سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے گویا وہ ایک مجسم انسان ہے۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ
طرت سے مفہوم انسان کا شخصی ارادہ ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ "اے عظیم الشان فطرت تیری تربیت
ں میری خوشیاں اور میرے فرائض مضمر ہیں" بعض اوقات وہ خدا اور فطرت کے تصور کو ایک
دوسرے سے ملا دیتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ انسان کی جھونپڑی میں رحمت الٰہی باپ کی طرح موجود ہے۔
خدا میری ہستی کے انتہائی عمق میں پنہاں ہے . . . اور یہی فطرت کی اصل قوت ہے" نہ صرف
پستالوزی کے لئے بلکہ اس عہد کی تمام ذہنی زندگی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اصطلاح فطرت کو
واضح طور پر اپنے پیش نظر رکھیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مذہب کا اثر کم ہو رہا تھا اور خدا کا تصور
متزلزل لیکن مذہبی جذبہ چونکہ انسانی فطرت میں داخل ہے اس لئے اس کا اظہار دوسرے ذریعے
سے ہوا۔ انسان ایک مافوق الطبیعی ہستی کا عقیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اپنے ایام مصیبت میں اس سے
امداد کا طالب ہونا چاہتا ہے اور ایام خوشی میں اس کا ممنون اور متشکر۔ مغرب کے عہد جدید میں ذہن
انسانی عام طور پر کلیسا سے بغاوت کر چکا تھا۔ اور کسی قسم کی قیود کا پابند نہیں رہنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ مذہبی
جذبے سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا اس زمانہ کے انسان نے اپنے اس مذہبی
جذبے کو فطرت قرار دیا۔ اور اسی فطرت کو خدا کہہ کر پکارا۔ "فطرت" کا جو مفہوم پستالوزی کے
یہاں ہے وہی کانٹ کے یہاں "عقل" کا، فشٹے کے یہاں "نفس مطلق" کا، ہیگل کے یہاں "ذہن
مطلق" کا ہے۔ مذہبی جذبہ لاشعوری طور پر ان تمام فلسفیوں کی زندگیوں میں کام کر رہا تھا۔ مگر بظاہر
اس نے ایک غیر مذہبی شکل اختیار کر لی تھی۔

دقت یہ ہے کہ "فطرت"، "نفس مطلق"، "ذہن مطلق"، "عقل" وغیرہ مابعد الطبیعاتی اصطلاحات
بھی ہیں اور نفسیاتی بھی۔ وہ انسان سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور خدا سے بھی۔ اصطلاح فطرت کی اس دوئی
کی وجہ سے پستالوزی کے خیالات کو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ فطرت کے دو پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور ایک خارجی۔
فطرت داخلی وہ ہے جو تمام صوفیہ کی توجہ کا موضوع رہی ہے یعنی انفرادی نفس جس کے ذریعے
حقیقت کا بلاواسطہ ادراک کیا جا سکے۔ پستالوزی کہتا ہے کہ حقیقت کا ادراک میری داخلی فطرت کر سکتی

ہے۔"

فطرت خارجی وہ ہے جس کا اظہار تمام نوع انسان کی زندگی میں ہوتا ہے۔ اپنے نفس کے ادراک
کے لئے تمام انسانی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ پستالوزی کہتا ہے کہ انسان خود کو جب پہچان سکتا
ہے جب وہ تمام زندگی کو بحیثیت کلی اپنے پیش نظر رکھے۔ اسی بنا پر پستالوزی نے اپنے اصول
تعلیم یہ مقرر کیا تھا کہ "زندگی کو انسان کا معلم ہونا چاہئے۔"

صوفی کی نظر فطرتِ داخلی پر اور عملی آدمی کی نظر فطرت خارجی پر رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ
نفس انسان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ فطرت کے دونوں پہلو ایک دوسرے کی مدد کریں۔
انسان اسی وقت کامل ہو سکتا ہے جب وہ اپنی داخلی زندگی کی تربیت کرے۔ لیکن اس طرح کہ
خارجی دنیا سے اس کا تعلق برقرار رہے۔ خارجی دنیا کی کثرت کو اپنے نفس کی وحدت کی آنکھ سے
دیکھنا سیکھے۔ خدا سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہوئے اس دنیا کے کاموں میں پورا پورا حصہ لے۔

۲۔ مسئلہ "نامی تعلیم"

پستالوزی نے دوسرا اہم تصور "لمحات شام" میں نامی تعلیم کا پیش کیا ہے۔ انسان چونکہ زندہ اور
نامی ہے اس لئے اس کی تعلیم بھی نامی ہونی چاہئے فطرت ایک زندہ چیز ہے۔ اس کا اظہار ہر جگہ
ہوتا ہے۔ روسو اور پستالوزی کے قبل تعلیم کا یہ تصور تھا کہ ذہن انسان ایک صندوق کے مانند ہے
جس میں باہر سے اشیا داخل کی جا سکتی ہیں۔ یہ تصور مشہور انگریز فلسفی اور ماہر تعلیم لاک کا بھی تھا۔ بچہ
کے جذبات اور احساسات کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی اور نہ اس کا خیال تھا کہ اس
کی نشوونما اور تربیت کے کوئی علٰحدہ قوانین ہیں بچے کی زندگی کی مستقل حیثیت نہیں سمجھی جاتی تھی۔
جس کی بالذات کوئی اہمیت ہو اور جس کا ایک علٰحدہ مقصد ہو۔ بچہ ایک چھوٹا سا آدمی تصور کیا جاتا
تھا، اور اس کی تعلیم بالغوں کی طرح کی جاتی تھی۔ روسو اور پستالوزی نے اس خیال کی جس کو میکانیکی
کہا جا سکتا ہے سخت مخالفت کی، اور اس کے بجائے ایک نامی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کے نزدیک
بچے کی نشوونما ایک درخت کے مانند ہوتی ہے جو اپنی نشوونما کے مخصوص قوانین رکھتا ہے۔ انسان

کوان قوانین کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اُن کی پیروی کرنی چاہئے۔ اُسے بچوں کی تعلیم میں اس مقررہ راہ عمل سے علٰحدہ نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ ان کی تمام زندگی برباد کردے گا۔ اور ہر انسان کو خود بھی اپنی زندگی میں اس فطری اصول کی پیروی کرنی چاہئے۔ ورنہ اس زندگی کا تمام امن سکون برباد ہو جائے گا۔

انسان کی اصلی تعلیم اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب اُسے فطرت سے سابقہ پڑتا ہے۔ فطرت انسان کی تعلیم جسمانی حواس سے شروع کرتی ہے اور تدریجاً ذہنی اور روحانی تعلیم تک پہنچتی ہے۔ بچہ شروع ہی میں اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔ اس طرح اس کی ایک جسمانی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اور اُسے ماں کی محبت کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ پستالوزی کہتا ہے کہ اس جسمانی محبت کے حس کو ہمیں رفتہ رفتہ ترقی دینی چاہئے تاکہ بعد میں بچہ انسانیت اور خدا سے محبت کرے جس طرح ماں بچے کی چند ضروریات پوری کرتی ہے۔ اسی طرح خدا اس کی تمام جسمانی، ذہنی روحانی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس لئے بچے کے دل میں خدا کی محبت تدریجاً پیدا کرنی چاہئے۔ فطرت غیر شعوری طور پر انسان کی نصف تعلیم کرتی ہے، لیکن چونکہ اس کی نصف تعلیم باقی رہ جاتی ہے۔ اس لئے انسان کو شعوری طور پر اس فرض کو ادا کرنا چاہئے

پستالوزی تعلیم کی دو قسمیں کرتا ہے، ایک سطحی اور ایک عمیق۔ سطحی تعلیم وہ ہے جسے ہم ذہنی تعلیم کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے صرف اشیاء سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی ماہیت کا علم نہیں ہوتا، عمیق تعلیم وہ ہے جو اشیاء کی ماہیت بتاتی ہے اور اس کے ذریعے انسان حقیقت اعلیٰ سے یعنی، خدا سے تعلق پیدا کرتا ہے جو نفس انسانی اور کائنات کا مرکز و مقصد ہے۔ سطحی تعلیم صرف اشیاء کے سائے سے واقفیت پیدا کرتی ہے، اصلی اشیاء سے نہیں۔ سطحی تعلیم انسان کو مغرور، غیر مستقل مزاج اور غیر مطمئن بنا دیتی ہے۔ پستالوزی اپنے زمانے کی تعلیم کو سطحی کہتا ہے اور اس کے خیال میں وہ تمام متذکرہ بالا عیوب کا سرچشمہ ہے۔ بخلاف اس کے عمیق تعلیم اشیاء کی ماہیت سے واقف کرتی ہے۔ اس سے انسان کو اپنی صحیح قدر کا اندازہ ہوتا ہے، اور اس

میں غرور کی بجائے انکسار، متانت، محبت اور شفقت پیدا ہوجاتی ہے، عمیق تعلیم سے جہاں داخلی قوی کی نشوونما ہوتی ہے، اور وہ ایک رشتے میں مربوط ہوجاتے ہیں۔ وہاں خارجی دنیا کی اشیاء کو بھی ایک نظام کے تحت میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعلیم کی بدولت انسان اشیاء کو جدا جدا دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ان پر کسی ایک اعلیٰ مقصد کے تحت میں غور بھی کرتا ہے

پستالوزی کے نزدیک تعلیم کا سب سے بڑا مقصد داخلی سکون ہے، جو قویٰ داخلی کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی داخلی سکون تصوف و مذہب کی جان ہے۔ داخلی سکون کے لئے پستالوزی داخلی جذبے کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ اور اس لفظ کو اس نے "لمحاتِ شام" کے چند اوراق میں کوئی دس مرتبہ دہرایا ہے۔ اسی داخلی جذبے سے بعد میں پستالوزی کا تصور "ادراک" پیدا ہوا۔ "ادراک" داخلی جذبے ہی کا نام ہے، البتہ اس میں چند ذہنی اور عقلی عناصر بھی شامل ہوگئے ہیں۔ پستالوزی کے طریقۂ تعلیم کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ وہ اس "داخلی جذبے"، "داخلی کیف"، "داخلی سکون" یا "ادراک" کو مختلف مضامین کی تعلیم کے ذریعے حاصل کرے۔ انسان کی یہ فطری اور اصلی کیفیت ہے اس لئے لازماً وہ سادہ ہوگی اور اخلاقی اصطلاح میں اسی کو معصومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ پستالوزی کہتا ہے کہ فطرت ہی خدا ہے اور وہی نفسِ انسانی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کا انسان میں ظہور ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی کی قوتیں اصل میں خدائی قوتیں ہیں۔ انسان کو اپنے نفس کی قوتوں کی نشوونما کرنی چاہئے۔ اور جن قوانین کے مطابق نفسِ انسانی نشوونما پاتا ہے ان کی پابندی کرنا چاہئے۔ ان قوانین سے علیحدگی اختیار کرنا گویا خدا سے علیحدگی اختیار کرنا ہے۔

انسان نہ صرف مخصوص قوتوں کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے، بلکہ وہ ایک مخصوص ماحول میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس ماحول سے اس کو علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے ورنہ وہ پُرامن زندگی نہیں گذار سکتا اور نہ اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کرسکتا ہے۔ اسی بناء پر پستالوزی کہا کرتا تھا کہ غریبوں کو غربت ہی کی تعلیم دینی چاہئے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ غریبوں

اظہار کیا ہے۔ اور جماعت کے نفسی عوامل سے بحث کی ہے۔

لین ہارڈ اور گرٹروڈ کے سمجھنے کے لئے انسانیت کا تصور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پستالوزی کے عہد میں عام طور پر یہ فیشن تھا کہ انسانیت کے متعلق گفتگو کی جائے۔ مصنفین کے لئے یہ موضوع بہت اہم تھا۔ "لمحاتِ شام" میں پستالوزی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس عہد کی ذہنی میراث تھی، لیکن اس قصے میں پستالوزی نے اپنے زمانے کے خیالات سے آزاد ہوکر مسائل کے متعلق خود اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں۔

بھی یہ بعید از قیاس ہے کہ لوگوں نے کیلٹ قوم کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہو۔ شمال مغرب (کمبرلینڈ) اور جنوب مغرب (کارنوال) میں کچھ دن پہلے تک کیلٹی زبان بولی جاتی تھی۔ بہت سے شہروں (مثلاً زمین، بیتھ، کارلیل، لندن، ڈینار) اور دریاؤں (ایون، سیورن، ٹیمس، ٹرینٹ ڈی) کے نام یقیناً کیلٹی زبان کے الفاظ سے مشتق ہیں۔ موجودہ زمانے میں انگلستان میں کیلٹی شکل و شمائل کے لوگ اس کثرت سے نظر آتے ہیں، کہ یہ توجیہہ کہ وہ سب قریب کے ملکوں سے آگئے ہیں کام نہیں دیتی۔ پھر جو شخص تاریخ ادبیات کا مطالعہ کرتا ہے اسے انگریزی ادب میں تخیل کا قوی عنصر بھی جرمن انداز طبیعت کے خلاف نظر آتا ہے جس کی مثال میں شکسپیئر، اسپنسر شیلے اور کیٹس کا نام لینا کافی ہے اسی طرح انگلستان کے ادنیٰ طبقوں کی اشتعال پذیری سے بھی غیر جرمن عنصر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب تک یہ لوگ خوش حال ہوں ان میں کسی قسم کی حرکت پیدا کرنا مشکل ہے لیکن جہاں کسی خطرہ کا شور اٹھا (مثلاً سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں پوپ کا اندیشہ، انیسویں صدی میں فرانس کے اور بیسویں صدی میں جرمنی کے حملہ کا خوف) تو یہ خود بخود بھڑک اٹھتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کی غیر معین علامات کی بنا پر قوموں میں نسلی امتیاز کرنے میں غلطی کا احتمال ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انگریز قوم کی رگوں میں جرمن خون کے ساتھ کیلٹی خون بھی ملا ہوا ہے۔ کیلٹی زبان ویلس، اسکاٹستان اور آئرستان میں اب تک بولی جاتی ہے۔ ویلس میں تو یہ ایک ملکی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے ویلس اور اس سے ملی ہوئی انگلستان کی قسمت مان متھ میں ۴۰ فیصدی باشندے کیلٹی زبان بولتے ہیں اور دو قسمتوں میں تو نصف سے زیادہ لوگ سوائے اس کے کوئی زبان نہیں جانتے۔ اسکاٹستان کی شمالی قسمتوں (آرگائل، انورنیس، روس کرومارٹی اور سدرلینڈ) میں ۱۴ فیصدی باشندے محض گیلی زبان اور ۲۲ سے ۵۰ فیصدی تک گیلی اور انگریزی دونوں بولتے ہیں۔ آئرستان میں انگریزوں کے جبر و تشدد سے محض آئری زبان بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر ½ فیصدی رہ گئی ہے یعنی سوائے دو صوبوں ڈونیگل (۲.۸) اور گیلوے (۲.۴) کے اور

کہیں یہ لوگ کسی شمار ہی میں نہیں۔ البتہ پچھلے قرن کی زوردار قومی تحریک کے سلسلے میں سارے ملک میں آئرش زبان پھیلانے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ١٩٢٢ء میں (٩ر١٢) فیصدی باشندے انگریزی کے ساتھ آئرش زبان بھی بولتے تھے۔

انگلستان میں عیسوی مذہب بہت جلد پہنچ گیا۔ پہلی بار آئرستان کی راہ سے آیا جہاں اُسے مقدس پیٹرک کے عہد سے اب تک زوال نہ ہوا تھا۔ یہ مذہب کیلٹی اثرات قبول کرکے بہت کچھ بدل گیا تھا۔ قوم پرستی، پوپ کے اثر سے آزادی، رہبانیت، خانقاہ کی زندگی اس کی خصوصیات تھیں۔ اس کا مرکز جزائر ہیبرڈیز کا ایک دور دراز جزیرہ جونا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد (٥٩٥ء میں) روما کے مبلغ جنوبی برطانیہ میں پوپ کی عیسائیت لے کر پہنچے۔ شدید نزاعوں کے بعد ہی رومی عیسائیت غالب آئی یعنی عالمگیر کلیسا کی تحریک کو تنگ نظرانہ قوم پرستی پر (اگرچہ انگلستان کی عیسائیت میں ہمیشہ قومیت کا ایک قومی عنصر موجود رہا ہے) اور عملی اثبات زندگی کے تمدن کو خانقاہ کی باطنیت اور رہبانیت پر فتح حاصل ہوئی۔

نوجوان جرمن عیسائی تمدن کے لئے ناروے اور سویڈن کی ملحد قوموں (جنھیں انگلوسکسن لوگ ڈین کہتے تھے) کے حملے بہت خطرناک تھے۔ انھوں نے عرصے تک اسکاٹستان کے قریب کے جزائر پر اور جزیرہ مین پر حکومت کی اور آئرستان میں کئی سلطنتوں کی بنیاد ڈالی چنانچہ آئرستان کے مشہور شہر ڈبلن (٨٤٠ء) اور کارک (٨٦٠ء) عیسوی انھیں لوگوں کے بسائے ہوئے ہیں۔ انگلستان میں یہ لوگ سالہا سال قتل و غارت کرتے رہے شاہ الفریڈ (٨٧١ء تا ٩٠١ء) نے اپنے ملک کو اس شدید خطرے سے نجات دی۔ "ڈین" لوگوں نے مذہب عیسوی اور انگلوسکسن بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی لیکن الفریڈ کو ان کے لئے اپنے ملک کا پورا مشرقی حصہ خالی کرنا پڑا جس میں انھوں نے اپنی بستیاں بسائیں۔ بعض شہروں مثلاً ڈربی، وہٹبی وغیرہ کے ناموں میں ڈینی زبان کا لفظ "بی"، جو شہر کے معنی رکھتا ہے۔ اور یوں بھی انگریزی زبان کے موجودہ ذخیرۂ الفاظ کا ایک معقول حصہ اسکینڈی نیوین زبان سے ماخوذ ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کی گفتگو

ہیں بھی ان زبانوں کی ضمیریں THEY , THEIR وغیرہ داخل ہوگئی ہیں۔ الفریڈ کی موت کے بعد جنگ نئے سرے سے چھڑ گئی کینوٹ اعظم (سال وفات ۱۰۳۵ء) جو اسکینڈی نیویا کا بادشاہ تھا انگلستان پر بھی حکومت کرتا تھا۔ اُس کے بعد ایڈورڈ کنفیسر کے تخت نشین ہونے سے حکومت ایک ہم قوم خاندان میں واپس آگئی لیکن اسی زمانے سے زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ خود بادشاہ پر نارمن قوم کے خیالات کا بہت اثر تھا اور اُس کے ہم قوموں یعنی انگلوسیکس لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ اندیشہ تھا کہ اُس کی سلطنت دوبارہ ان حکومتوں میں بٹ جائے گی جنہیں ایگبرٹ اور الفریڈ اعظم نے متحد کیا تھا۔ ۱۰۶۶ء میں ہیرالڈ کے عہد حکومت میں ولیم فاتح نے انگلوسیکسن سلطنت کو مسخر کرلیا۔

(۲)

نئے خاندان شاہی کے ہاتھ میں زمام حکومت کا آنا تھا کہ فرانسیسی تمدن کی ایک زوردار لہر تمام ملک میں دوڑ گئی جس سے ابتدا میں یہ اندیشہ تھا کہ انگلوسیکس تہذیب بالکل فنا ہو جائے گی۔ یہ خطرہ اس سبب سے اور بڑھ گیا کہ قدیم الایام سے برطانیہ اور فرانس میں بہت گہرے تعلقات چلے آتے تھے (چنانچہ جولیس سیزر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے) اور انگلوسیکس عہد میں برابر فرانسیسی تمدنی عناصر انگلستان میں داخل ہوتے رہے تھے، فرانس ہی کے توسط سے انگلستان نے ہمیشہ برِاعظم کے تمدن سے تعلق قائم رکھا ہے۔ کینٹ کی ایک ملکہ نے جو فرانکی نسل سے تھی (۵۹۷ء) انگلوسیکس قوم میں عیسائی مذہب کی اشاعت میں بہت مدد دی تھی، شاہ ایگبرٹ جس نے انگلوسیکسن لوگوں کو متحد کیا عرصے تک فرانس میں رہا تھا، قدیم انگلستان کے سب سے اولوالعزم بادشاہ الفریڈ اعظم کی سوتیلی ماں فرانس کے بادشاہ شارل اصلع کی ماں تھی۔ فن تعمیر اور نقاشی میں انگلوسیکس تمدن پر فرانسیسی اثر اور ایک حد تک فرانسیسی تمدن پر انگلوسیکسن اثر صاف نظر آتا ہے خود انگلوسیکسن

عہد کے آخر میں منصبداری نظام اور فوج کی بہت سی اصطلاحات انگریزی میں داخل ہو چکی تھیں، ایڈورڈ کنفیسر نے جو اصل میں اینگلوسیکسن نسل کا آخری بادشاہ تھا، اپنا دربار بالکل نارمن طرز پر قائم کیا تھا۔ اب نئے فرانسیسی خاندان کی حکومت سے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ جرمن طرز معاشرت بالکل فنا ہو جائے گا۔

نئے خاندان نے جفاکش اینگلوسیکسن قوم کی مقاومت کو ایک سخت گیرانہ نظام منصبداری کے ذریعے سے جو ایک مرکزی قوت کے ماتحت تھا جس میں جرمن طرز کی خود مختار حکومتوں کی مطلق گنجائش نہ تھی اور نارمن امرا، نارمن اسقفوں اور فرانسیسی تہذیب کی مدد سے دبا لیا۔ رچارڈ شیر دل جو سب سے بڑا تو نہیں مگر سب سے مشہور بادشاہ تھا بالکل ایک رنگیلا فرانسیسی تھا، کہیں چودھویں صدی میں جاکر بادشاہ پر انگریزی رنگ چڑھا اور عدالتوں اور پارلیمنٹ میں انگریزی زبان جاری ہوئی۔ (مگر قدیم سرکاری فرانسیسی زبان کا اتنا اثر باقی رہا کہ بادشاہ نئے قوانین کو اس جملے سے منظور کرتا ہے (LEROILE VUELT) اور کسی جلیل القدر حاکم یا جج کی آمد کا اعلان (OYEZ) کے لفظ سے کیا جاتا ہے) فرانس میں نارمن راج کے مقبوضات پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے پلانٹیجنیٹ خاندان کے بادشاہ ایڈورڈ سوم (۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء) اور ہنری پنجم نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے بلکہ انھوں نے سارے فرانس کو فتح کرنے کی کوشش کی، مگر اُن کی ساری سعی لاحاصل ثابت ہوئی یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں انھیں کیلے سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ انگلستان کی سلطنت براعظم سے بالکل الگ ہوئی۔ ۱۶۵۸ء میں ڈنکرک انگریزوں کے قبضے میں آیا مگر چار ہی سال بعد پھر نکل گیا جس سے دوبارہ رشتۂ تعلق قائم ہونے کے امید بالکل جاتی رہی۔

انگلوسیکس لوگوں نے نہایت عزم و استقلال سے اپنے تمدن کو غیر ملکی عنصر کے غلبے سے بچایا یہاں تک کہ آخر خود فاتح قوم کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی زبان میں فرانسیسی الفاظ کی بھرمار ہوگئی مگر سب سے اہم چیز یعنی صرفی اور نحوی ترکیب خالص جرمن ہی رہی۔ طرز حکومت اور ملکی نظم و نسق پہلے بالکل نارمن طرز کا تھا لیکن آگے چل کر انگلوسیکسن عنصر غالب آگیا طرز

کا کلام، میں جرمنوں کی اجڈ طبیعت اور خشک باطنیت سے دست و گریبان نظر آتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ
کے آخر میں ان مختلف عناصر کے ملنے سے ایک ہم رنگ، مغرور، بدیسی تہذیب کو حقیر سمجھنے والی
قوم بن گئی تھی۔ اس زمانے میں جو غیر ملک کے لوگ انگلستان آئے تھے انھوں نے انگریزوں
کے غرور اور خود پسندی کا ذکر کیا ہے۔

نارمن سلطنت ابتدا میں خالص مستبدانہ اور منصبداری کے نظام پر مبنی تھی۔ وہ اتنی
قوی تھی کہ اُس نے چھوٹی حکومتوں کو ابھرنے نہ دیا ورنہ جرمنی کی طرح یہاں بھی بادشاہ شاہِ شطرنج
بن کر رہ جاتا۔ یہاں تمام ملک میں شاہی عدالتیں قائم تھیں اور بادشاہ کی طرف سے محصول وصول کیا
جاتا تھا۔ نظام منصبداری میں زمین کا اصلی مالک بادشاہ تھا کہ اُس کے ماتحت امرا اور کلیسا کے مقابلے
میں بھی بادشاہ ہی تمام سلطنت کی نمائندگی کرتا تھا۔ امرا کو آپس میں جنگ کرنے کا حق نہ تھا۔ صرف
سرحدی علاقوں میں یعنی ویلس اور اسکاٹستان کی سرحد پر بعض ارل اور کاؤنٹ (نارد مبرلینڈ
لنکاسٹر، چیسٹر، شروسبری، ہرفرڈ اور ڈرہم کا اسقف) کبھی کبھی بادشاہ کے مقابلے میں خود
مختاری کا دعویٰ کرتے تھے مگر وہ بھی اسے نباہ نہیں سکتے تھے۔ اُس زمانے کی اتنی یادگار اب تک
باقی ہے کہ صوبہ لنکاسٹر کے چانسلر کے نام سے ایک عہدے دار ہوتا ہے جو مجلس وزرا میں
شریک کیا جاتا ہے اگرچہ اُس کے ماتحت کوئی خاص صیغہ نہیں ہوتا۔ البتہ ویلس میں جسے ایڈورڈ
اول نے سنہ ۱۲۸۴ء میں فتح کیا تھا ہنری ہشتم کے زمانے تک واقعی خود مختاری حکومت تھی۔ اس
انتہائی مرکزیت کے نتائج ظاہر ہیں۔ اس کی بدولت انگلستان بیرونی ممالک کے مقابلے میں ہمیشہ
قوی اور مستعد پیکار رہا ہے اور خود اس کے اندر کبھی قبائلی امتیازات کا ایسا خیال پیدا نہیں ہونے
پایا جو قابلِ ذکر ہو۔ مگر دوسری طرف اس نظام نے ساری قوم میں ایسی یک رنگی پیدا کر دی جو جرمن
قبائل کی زندگی کی گوناگونی کے مقابلے میں ایک طرح کا نقص معلوم ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ انگریزوں کی
زبان میں روزمرے اور محاورے کا وہ لطف نہیں جو اسکاٹوں اور امریکیوں بلکہ اکثر تعلیم یافتہ
جرمنوں کی گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ قومی سیرت کی مقامی خصوصیات، مقامی رسم و رواج، اپنے

کہ وہ شاہ شطرنج بن کر رہ گیا۔

(۳)

تجدیدِ مذہب کی تحریک میں انگلستان نے بہت کافی عملی حصہ لیا۔ اس تجدید کا سیاسی پہلو یعنی منفرد اقوام کا پوپ کے سیاسی مطالبات کی مخالفت کرنا اور اس کا مذہبی پہلو یعنی استحالہ عشائے ربانی[1] کے مسئلے اور مذہبی پیشوائی اور کلیسائی اقتدار کے معاملے میں شبہات پیدا ہونا دونوں پہلے پہل انگلستان میں جان وکلف (سال وفات ۱۳۸۴ء) کی بدولت منظرِ عام پر آئے۔ لیکن نئی تحریک کے آغاز ہی میں ہمیں انگریزوں کی ذہنیت کا مخصوص رنگ صاف نظر آتا ہے، اُن کی ایک معقول اقلیت، یعنی پندرھویں صدی میں لولارڈ فرقے اور سولھویں اور سترھویں میں پیوریٹین فرقے کے لئے یہ مسائل روحانی اور باطنی اہمیت رکھتے تھے لیکن عام قوم کو محض ان کے ایک پہلو یعنی تحریک آزادی سے دلچسپی تھی بلکہ لولارڈ اور پیوریٹین فرقے بھی زیادہ زور اسی چیز پر دیتا تھا۔ وکلف کے زمانے میں انگلستان پر پوپ کا اثر بہت کم ہو گیا اور ہنری ہشتم کے زمانے میں تو روما سے رشتۂ تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ پروٹسٹنٹ مذہب کی انتہا پسند جماعتیں متعدد غیر مقلد فرقے (پریسبٹیرین، انڈیپنڈنٹ وغیرہ) قائم کر کے کلیسا کے اقتدار کو کمزور بلکہ معدوم کرنا چاہتی تھیں۔ جہاں تک فرد کو مذہبی تقلید سے آزاد کرنے کا سوال تھا یہ لوگ نہایت شدت، استقلال اور انتہائی ایثار کے ساتھ لڑتے تھے۔ مگر مذہب کے نظری مسائل اور عقائد کی بحث سے سوائے معدودے چند افراد کے کسی کو بحث نہ تھی۔ انگلستان کے سب سے بڑے مستبد بادشاہ ہنری ہشتم (۱۵۰۹ء تا ۱۵۴۷ء) نے نئی مذہبی تحریکوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی مطلق العنانی اور تعدد ازدواج کی خواہشات پر کلیسا کے دامن تقدس کا پردہ ڈالا۔ جب پوپ نے اسے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی اجازت نہیں دی تو اُس نے رومی کلیسا سے قطع تعلق کر لیا اور رعایا کو

---

(۱) یہ مسئلہ کہ عشائے ربانی میں روٹی اور شراب قلب ماہیت سے حضرت مسیح کا گوشت اور خون بن جاتی ہے۔

اور کرسچیانا روسیٹی میں تھی اُس دنیاداری اور بیجان رسوم کی پابندی تک جس کا نمائندہ اٹھارھویں صدی میں لارڈ بالنگ بروک تھا۔ چنانچہ انگلستان میں علمی اور ادبی ذوق کے حامل جن کے پیش نظر علاوہ مذہب کے دوسرے نصب العین بھی ہیں، صرف انگلیکن مذہب والوں میں پائے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے نان کنفرمسٹ لوگ مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں ان کی مذہبیت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ بعض اُس ظاہری شریعت پرستی کے پابند ہوتے ہیں جس کا توریت میں حکم ہے اور بعض میں مشاہدے اور وجدان کی لطیف ترین باطنیت پائی جاتی ہے مگر سب کی نظر سختی کے ساتھ مذہب تک محدود ہوتی ہے۔ سب دیانت دار، بیدار مغز، رنگینی اور تخیل سے خالی فنون لطیفہ کے دشمن، کم ظرف اور بدمذاق ہوتے ہیں۔ ۱۶۴۰ء میں پہلے پہل یہ تضاد پوری طرح ظاہر ہوا۔ اس عہد میں تمدن کے اصلی حامل (CAVALIERS) تھے۔ جو ظاہری اعتبار سے سرکاری کلیسا سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ فنون لطیفہ کے عاشق، خوش باش، لاابالی مزاج کے تھے اور انھیں یہ دعویٰ تھا کہ آبائی ریاست اور نشاۃ ثانیہ کی تہذیب کی بدولت ہم دوسرے انسانوں سے افضل ہیں۔ اس زعم میں اپنے مرتبے کو قائم رکھنے کے لئے یہ ہر طرح کے ظلم اور بددیانتی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کا مکمل نمونہ چارلس اول تھا۔ دوسری طرف پیورٹین لوگ تھے جو سب کے سب سوائے اپنے جلیل القدر شاعر ملٹن کے دیانت دار پرہیزگار فنون لطیفہ کے دشمن اور تنگ نظر تھے۔ ان کے مختصر عہد حکومت نے (۱۶۴۰ء یا ۱۶۴۹ء سے ۱۶۶۰ء تک) انگریزی تھیٹر اور انگریزی موسیقی کا خاتمہ کر دیا۔ بخلاف شاعری اور ناول نویسی کے جو بادشاہ وقت کی سرپرستی میں گوشۂ تنہائی میں بھی نشوونما پاسکتی ہیں، موسیقی اور تھیٹر دونوں قبول عام کے محتاج ہیں، اس لئے انھیں جو صدمہ پیورٹین حکومت کے زمانے میں پہنچا تھا اُس سے وہ آج تک نہیں سنبھلے ہیں۔ انگلیکن کلیسا کی فتح (۱۶۶۰ء) کے بعد ڈراما کی قدغن کا پہلا دور تو ختم ہو گیا لیکن دوسرا دور جو آج تک چلا جاتا ہے اس وقت شروع ہوا جب اٹھارھویں صدی میں انگلیکن لوگوں میں نیچے طبقوں کی روح سرایت کر گئی۔ یہ نیچے طبقے والے جب

اونچے طبقے میں شامل کر لئے گئے تو انھوں نے پیورٹین عقائد کی سختی اور کلیسا کی سیاسی مخالفت کو ترک کر دیا مگر تمدنی نصب العین کو مذہب کے تنگ دائرے میں محدود رکھنے پر ان میں سے بہت سے آج تک قائم ہیں۔

انگلستان کے بادشاہوں کی استبداد پسندی جس کے سبب سے وہ قرون وسطیٰ کے آغاز سے برابر انفرادی قوت اور انفرادی آزادی کو دبانے کی کوشش کرتے رہے آخری اسٹوارٹ بادشاہ جیمس دوم کی معزولی (۱۶۸۸ء) کے بعد ختم ہو گئی۔ اب بجائے استبدادیت کے امرا کی مدبری حکومت قائم ہو گئی۔ بادشاہ کی قوت کو لوگ روز بروز دباتے رہے خصوصاً ۱۷۱۴ء سے جب ہنوور کا خاندان باہر سے آ کر انگلستان کے تخت سلطنت پر حکومت کرنے لگا۔ جارج سوم (۱۷۶۰ء تا ۱۸۲۰ء) کی آخری کوشش کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو عددیت سے آزاد کرے، بالکل ناکام رہی۔ امرا کی دو پارٹیاں ٹوری اور وہگ ۱۸۳۲ء تک باری باری سے حکومت کرتی رہیں۔ یہ امرا اور شرفا کی حکومت عہد جدید میں انگلستان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے اور اس کا اثر صرف نظام سلطنت پر نہیں پڑا ہے بلکہ انگریزوں کی سیرت اور ان کی ذہنی زندگی پر آج تک یہ رنگ چھایا ہوا ہے۔

امرا سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں سپید و سیاہ کے مالک تھے۔ مسلسل قوانین کے ذریعے سے جو بظاہر بے ضرر نظر آتے تھے مگر اپنے اثرات کے لحاظ سے بہت دور رس تھے، عوام عملاً سیاسی قوت میں حصہ لینے سے بالکل محروم کر دئے گئے۔ ضلعوں کا مقامی انتظام مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں تھا جو سب کے سب بڑے زمینداروں کے خاندان سے ہوتے تھے۔ شہروں میں بھی وہ سخت قیود جو اسٹوارٹ بادشاہوں نے حق انتخاب پر عائد کی تھیں بدستور باقی رہنے دی گئیں۔

شہروں کی اقتصادی زندگی بھی اُس زمانے میں جب بڑے کارخانے نہیں قائم ہوئے تھے آس پاس کے بڑے زمیندار خاندانوں کی پابند تھی۔ خود پارلیمنٹ کے انتخابات پر یہ لوگ آسانی سے اثر ڈال سکتے تھے کیونکہ حلقہ ہائے انتخاب بہت محدود اور برائے دبتے

میں وہ محصول جو سرکاری کی طرف سے اُن پر عائد کیا جاتا تھا معاف کیا گیا۔ نکاح کی رسم ۱۸۳۶ء تک ، اور تدفین کی ۱۸۸۰ء تک سرکاری کلیسا کے مخصوص اختیارات میں شامل رہی۔ غرض انیسویں صدی کے وسط تک ڈسینٹر لوگوں کی، جن میں ملک کی نصف بلکہ نصف سے زیادہ آبادی شامل تھی، یہ حیثیت رہی کہ طوعاً و کرہاً اُن کا وجود برداشت کیا جاتا تھا۔ مگر انگلستان کی یہ ملک پر کتنی ہی بار کیوں نہ ہو اس کا ظاہری برتاؤ نرم ہے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنا قبضہ بلاشرکت غیرے قائم رکھنے کے لئے سخت سے سخت قوانین بناتی ہے ان کے عملدرآمد میں وہ بڑی حد تک انسانیت سے کام لیتی ہے، اُس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ از راہ دانشمندی نیچے طبقے کے چیدہ لوگوں کو اپنے طبقے میں شامل کرتی رہی ہے۔ یہ وسعت نظر ان لوگوں کا خاصہ ہے جو محض حکومت کے بھوکے نہیں بلکہ حکومت کے اہل ہیں اور جو اپنی قوت کے حدود کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ چیز انگریزوں کی سرشت میں معلوم ہوتی ہے۔ انگلستان کے چھوٹے امرا نے جنھیں (GENTRY) کہتے ہیں قرون وسطیٰ میں اس بات کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ خواہ مخواہ گھس پیٹھ کر کے بڑے امرا میں شامل ہوں اور جب دارالعوام اور دارالامرا الگ الگ ہو گئے تو یہ لوگ دارالعوام میں شہریوں کے ساتھ مل گئے۔ یہاں صدیوں تک شہر والوں کو غلبہ حاصل رہا لیکن آہستہ آہستہ امرا نے اس مجلس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ یہاں بخلاف برِاعظم کے یہ رسم ہے کہ ہر امیر کا خطاب اور جائداد کا قبضہ بلاشرکت غیرے اُس کے بڑے بیٹے کو ملتا ہے۔ اس کے سبب سے یہاں مفلس، بیجا غرور کرنے والے، بیکار امرا پیدا نہیں ہونے پائے اور امرا اور شہر کے شرفا آسانی سے مل جل گئے۔ امرا کے بعض خاندان مثلاً لاپول چودھویں صدی میں مرفہ الحال تاجر تھے مگر بڑھتے بڑھتے امرا میں شامل ہو گئے۔ مشہور شاعر چاسر جو اپنے نسب اور انداز طبیعت کے لحاظ سے متوسط طبقے کا تھا چودھویں صدی کے آخر میں، رفیق خاص، سفیر، ملک الشعرا کے عہدوں پر فائز تھا جو امرا کے لئے مخصوص تھے۔

اٹھارھویں صدی میں بھی نئے امرا نے جو برسرِ حکومت تھے دانشمندی اور سلیقے کے

ساتھ اپنے طبقے کو وسیع کیا جس کے سبب سے ایک صدی تک لوگوں کو عددیت کا وجود محسوس نہ ہوا۔
کاریگروں کے لڑکے جو صلاحیت رکھتے تھے ہائی اسکول کی تعلیم سے نہیں روکے جاتے تھے بلکہ اکثر
یونیورسٹی کی تعلیم پاکر ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ بس اتنی شرط تھی کہ وہ انگلیکن مذہب
قبول کرلیں۔ اور چونکہ اصولاً سوائے سرکاری کلیسا کے کسی اور مذہب کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا
تھا اس لئے اس تبدیل مذہب کے لئے نہ کسی خاص رسم کی ضرورت تھی اور نہ پرانے عقائد سے
باضابطہ توبہ کرنے کی۔ نوجوان طالب علم کو یونیورسٹی میں داخل ہوتے وقت بس اتنا کہنا پڑتا تھا کہ
وہ انگلستان کے کلیسا کے ٣٩ عقائد کو مانتا ہے۔ اس کے بعد حکومت کے انتہائی مراتب پر پہنچنے کے
لئے اُسے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی کسی قسم کے محتسبانہ سوالوں کا جواب نہیں دینا پڑتا تھا، کلیسا کی
ظاہری رسوم وعبادات کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اور جو دولتمند تاجر، یا صنعتی کارخانوں کا مالک حکمراں
طبقے کی نظروں میں عزت حاصل کرنا چاہتا اُسے بس سرکاری کلیسا کا رکن ہوجانا کافی تھا جس میں کسی
باضابطہ داخلے کی ضرورت نہ تھی اور جس کے اصول اپنی وسعت کی وجہ سے تمام فرقوں کے عقائد
کے لئے گنجائش رکھتے تھے۔ اگر وہ کافی دولتمند ہوتو اس کا بہت امکان تھا کہ اُس کی لڑکی کی شادی
کسی امیر سے ہوجائے یا وہ خود آخر عمر میں طبقہ امرا میں شامل کرلیا جائے اور اس طرح اُس کی ذات
اور اُس کی دولت حکمراں طبقے کے لئے مزید تقویت کا ذریعہ بن جائے۔ خصوصاً جو بے اندازہ
دولت اٹھارہویں صدی میں ہندوستان سے انگلستان پہنچی وہ سب کی سب زمیندار امرا نے اس
کے مالکوں کے یہاں شادی کرکے یا انھیں مرتبہ امارت عطا کرکے اپنے طبقے میں کھینچ لی۔ یہ جذب
کرنے کا عمل اب تک جاری ہے اور پچھلے قرنوں میں اس کی رفتار اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ قدیم امرا
کا وجود معرض خطر میں آگیا ہے۔ انگلستان میں جو شخص کسی اقتصادی کاروبار میں غیر معمولی کامیابی حاصل
کرے اُسے یہ توقع رہتی ہے کہ وہ اپنی کاروباری زندگی کو ختم کرنے کے بعد نائٹ یا بیرونٹ کا خطاب
پاکر "GANTRY" (امرا کے طبقہ ادنیٰ) میں شامل ہوجائے گا یا لارڈ کا خطاب پاکے ARISTOCRACY
(امرا کے طبقہ اعلیٰ) میں جگہ پائے گا اور دارالامرا کا رکن ہوجائے گا۔ (ترجمہ)

[illegible] (REVUE DES ETUDES ISLAMIQUES) [illegible]

[illegible] (1)

[illegible]

[illegible]

[illegible] (1)

لیکن مسلمانوں کی آزادی خاص طور پر ان کی معاشرت میں ظاہر ہوتی ہے وہ آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور ان کے یہاں مہر کا رواج ہے مسلمانوں اور عیسائیوں میں ازدواجی تعلقات قائم ہونے کی مثالیں بھی ملتی ہیں ایسی حالت میں عیسائی عام طور سے مسلمان ہوجاتے ہیں۔ اگر وہ نہیں ہوتے تو کچھ فساد پیدا ہوتا ہے، کیونکہ بچوں کا مذہب طے نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال پیدائش کے دن ان کے نام امام ہی کے رجسٹر میں درج ہوتے ہیں۔

فنستانی مسلمان اس کی خاص فکر رکھتے ہیں کہ ان کے بچوں کو دین اور قومیت کی تعلیم دی جائے۔ اس ارادے سے انھوں نے اپنے اسکول کھولے ہیں جہاں بچے ہفتے میں دو تین دفعہ جاتے ہیں انھیں دینیات، تاریخ اسلام اور ترکوں کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، قرآن شریف کی تلاوت کرنا سکھایا جاتا ہے اور چند سورتیں حفظ کرا دی جاتی ہیں کہ وہ نماز پڑھ سکیں۔ ذریعۂ تعلیم ترکی زبان ہے۔ حروف پہچاننے اور تجوید کے علاوہ عربی زبان اور زیادہ نہیں سکھائی جاتی ہمیں سمجھنا چاہئے کہ نئے ترکی لاطینی حروف ہی کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔

اسکولوں کی تعداد بہت نہیں ہے، دو، جن میں سے ایک ہانگ فورز اور ایک تمپیر میں ہے، سال میں نو مہینے کھلے رہتے ہیں۔ باقی ایسے مقامات پر ہیں جہاں مسلمان بس مٹھی بھر ہیں، وہ صرف سال میں تین مہینے کام کرتے ہیں اور ان کے معلم ایک سے دوسرے میں جاتے رہتے ہیں اسکولوں کے علاوہ کانفرنسیں بھی ہوا کرتی ہیں جن کا موضوع بحث بدلتا رہتا ہے، کبھی تو مذہب ہوتا ہے، کبھی قومیت (یعنی ترکی قوم) کا مسئلہ کبھی ترک مسلم تاریخ۔ کانفرنس کے کرانے والے یا تو اسکولوں کے معلم ہوتے ہیں یا آتے جاتے باہر کے مسلمان، خاص طور پر ترک۔ پچھلے سال ابراہیم عارف اللہ فنستانی مسلمانوں کے اتحاد کے ناظم نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا مقصد قومیت کی تبلیغ کرنا تھا۔

فنستانی مسلمانوں کا کسی خاص دینی مرکز سے تعلق نہیں۔ پہلے ان کا روس کی ریاست قازان سے کچھ واسطہ رہتا تھا، مگر انقلاب کے بعد وہ علیٰحدہ ہوگئے۔ قومی نقطۂ نظر سے اب انھوں نے جنوبی روس کو چھوڑ کر انگورا سے لگاؤ پیدا کیا ہے۔ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ انھوں نے ترک لاطینی

حروف اختیار کرلئے ہیں۔ اس سے اور آگے بڑھ کر کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ترکوں کی قومی تحریک سے واقف رہیں اور دار الحکومت انگورا کے جو رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں انھیں پڑھتے رہتے ہیں ہر سال وہ ترکی کی آزادی کی اہتمام سے برسی (۲۹ر اکتوبر) مناتے ہیں اور اسی طرح ترکوں کا قومی دن (۲۳ر اپریل) بھی ان کے لئے ایک تہوار ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں مصطفےٰ کمال کی تصویر ہوتی ہے

فنستان میں کوئی جامع مسجد نہیں، لیکن تین چھوٹی مسجدیں ہیں، ایک ہلسنگ فورز، ایک تمپیر اور ایک ٹرکو میں جہاں کوئی مسجد نہیں ہے وہاں مومن مرد اور عورتیں سب کسی کے مکان پر جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ سوائے عید قرباں اور رمضاں کے عورتیں مسجدوں میں نہیں جاتی ہیں۔ امام صرف ایک ہے جس کی ضروریات ملت پوری کرتی ہے۔ اس کا مکان ہلسنگ فورز میں ہے، مگر وہ دوسرے شہروں کا ایک خاص معمول کے مطابق چکر لگاتا رہتا ہے جب امام موجود نہیں ہوتا تو مسلمانوں کی جماعت میں سے کوئی مناسب شخص امامت کرتا ہے۔ بارہ وفات کے دن مومن سب جمع ہو کر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں، اور امام حسب موقع کسی موضوع پر تقریر کرتا ہے۔ دولت مند لوگ اس دن دعوتیں بھی کرتے ہیں۔

سخت سردی کے باوجود فنستانی مسلمان عام طور سے شراب نہیں پیتے، مذہبی تہواروں اور قومی تقریبوں کے سلسلے میں جو ضیافتیں ہوتی ہیں ان میں بھی کوئی نشہ کی چیز پیش نہیں کی جاتی کہا جاتا ہے کہ بیس برس کے عرصے میں کوئی مسلمان بدمستی کے الزام میں نہیں پکڑا گیا ہے۔ روزے کے معاملے میں فنستانی مسلمان زیادہ سخت نہیں ہیں۔ جون اور جولائی کے مہینوں میں جب دن بہت ہی زیادہ لمبا ہوتا ہے، روزہ رکھنا فرض نہیں سمجھا جاتا۔ جو چاہے وہ اس کے بدلے کسی دوسرے مہینے میں اپنا دینی قرض ادا کر سکتا ہے۔ حج کے لئے اب تک صرف ایک فنستانی مسلمان گیا ہے۔ وہاں لوگ کہتے ہیں کہ حج کے لئے زمانہ ٹھیک نہیں ہے، اور ترکستانی مسلمانوں کا قول ہے کہ جہاز پر حاجیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ گویا وہ جانوروں سے بہتر نہیں۔

۹۔ ہر انسان کا لحاظ کرنا اور کسی کو نقصان نہ پہنچانا۔

۱۰۔ دوسرے کے لئے وہی چاہنا جو انسان اپنے لئے چاہتا ہو، اور دوسرے کے لئے کوئی ایسی بات نہ چاہنا جو انسان اپنے لئے نہ چاہتا ہو۔

(ب) فنستان کے مسلمانوں کی جماعت کا دستور

۱۔ فنستان کے لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں اور ان تمام قواعد کی پیروی کرتے ہوں جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ایک جماعت سمجھے جائیں گے۔

۲۔ اس جماعت میں کارکن اراکین ہوں گے اور ایسے بھی جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں

۳۔ کارکن رکن ہونے کے لئے دین دار ہونا لازمی ہے۔ ہر رکن پر لازم ہے کہ جماعت کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے۔ اراکین کا انتخاب جماعت کی مجلس منتظمہ کی تجویز پر ہوگا

۴۔ نوجوان اٹھارہ برس کے سن کو پہنچنے پر بالغ سمجھے جائیں گے اور اسی کے بعد وہ کارکن اراکین بن سکتے ہیں۔ انتخاب سے پہلے امام دینیات میں ان کا امتحان لے گا۔

۵۔ صرف کارکن اراکین کو جماعت کے کاروبار میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔

۶۔ جماعت کو اس کا اختیار ہوگا کہ کسی رکن کو جس کا عمل قابل اعتراض ہو خارج کر دے۔ اس کارروائی کو انجام دینے کے لئے کارکن اراکین میں سے جتنے موجود ہوں ان کی دو تہائی کی اکثریت درکار ہوگی، اور اخراج کے فیصلے کی تحریری اطلاع اس شخص کو دی جائے گی جو رکن اس طرح سے خارج کیا گیا ہو وہ تحریری اطلاع ملنے کے تیس دن کے اندر مجلس منتظمہ کے سامنے اپیل کر سکتا ہے مجلس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا

۷۔ مجلس منتظمہ اور دوسری انتظامی مجلسوں میں صرف معتبر کارکن اراکین منتخب ہو سکتے ہیں واعظ اور معلم کے فرائض وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنھیں مجلس منتظمہ نامزد کرے۔

۸۔ جماعت جمعہ کی نماز ادا کرے گی۔ دینی اور قومی تقریبوں کے دن مجلس منتظمہ مقرر کرے گی۔

۹۔ عام کاروبار مجلس عامہ کی رائے کے مطابق انجام پائے گا۔ مجلس منتظمہ کے جلسے حسب

ضرورت یا پانچ اراکین کی درخواست پر منعقد ہوں گے۔

۱۰۔ مجلس عامہ کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ فروری کے مہینے میں ہوگا۔

۱۱۔ ہر رکن کو رائے دینے کا حق ہوگا اور فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا۔ اگر موافق اور مخالف تعداد میں برابر ہوں تو صدر کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ مذہبی معاملات میں فیصلہ دو تہائی کی کثرت رائے سے ہو سکے گا۔ اگر کسی مذہبی معاملے کو ایجنڈا میں شامل کرنا مقصود ہو تو مجلس عامہ کے اجلاس کی تاریخ سے ایک مہینہ پہلے تجویز مجلس منتظمہ میں پیش کر دینا چاہیے۔

۱۲۔ جماعت کو توڑنے کا فیصلہ ۲/۳ کی کثرت رائے سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر جماعت ٹوٹ جائے تو اس کا تمام روپیہ کار خیر میں صرف کر دیا جائے گا۔

۱۳۔ . . . . مجلس منتظمہ امام اور چار اراکین پر مشتمل ہوگی جن کا انتخاب مجلس عامہ کے دوران اجلاس میں ہوگا۔ ہر مجلس تین سال کام کرے گی اور اپنے اراکین میں سے ایک صدر اور ایک ناظم مال کے لئے منتخب کرے گی۔

۱۴۔ . . . . مجلس منتظمہ کے اختیار میں تمام اجتماعی معاملات ہوں گے اور وہ اپنے فرائض انجام دینے میں مفاد عامہ کا ہر طرح سے لحاظ رکھے گی۔ جماعت کا روپیہ بھی اسی کی تحویل میں رہے گا۔ مجلس عامہ جو فیصلے کرے ان کی تعمیل کرانا بھی اسی کے ذمہ ہوگا۔

۱۵۔ مجلس منتظمہ کا صدر، یا اس کی عدم موجودگی میں امام جماعت کا وکیل ہوگا۔ جماعت کی طرف سے کاغذات وغیرہ پر دستخط کرنے کا اختیار صرف مجلس منتظمہ کے صدر یا امام کو ہوگا۔

۱۶۔ اگر مجلس کے کسی رکن کے خلاف عدالت فوجداری کی طرف سے کوئی کارروائی کی جائے تو وہ فوراً مجلس کی تحریک پر رکنیت سے خارج کر دیا جائے گا۔ خارج شدہ رکن مجلس عامہ میں اپیل کر سکتا ہے جس کا اجلاس بغیر کسی بیجا توقف کے ہوگا۔ مجلس عامہ کثرت رائے سے مجلس منتظمہ کے فیصلے کو رد کر سکتی ہے۔

اگر مجلس منتظمہ کا کوئی رکن اپنے فرائض سے غافل ہو جائے یا اس کا چال چلن بگڑ جائے تو

مجلس تین چوتھائی کی کثرت رائے سے اس کو برطرف کر سکتی ہے ۔

۱۷۔ جماعت کے غیر معمولی اخراجات چندے کے ذریعے سے پورے کئے جائیں گے اگر ضرورت ہو تو ہر فرد کی حیثیت کے مطابق اس سے مزید چندہ لیا جا سکتا ہے ۔

۱۸۔ ہر پندرہ سال کے بعد ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی جو اس مدت کے تمام حسابات کو جانچے گی۔

۱۹۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام جماعت کے سپرد ہوگا اور والدین کے لئے لازمی ہوگا کہ جماعت کے تجویز کئے ہوئے قواعد کی پابندی کریں۔ تعلیم کے اخراجات انہیں حسب استعداد ادا کرنا چاہئیں۔

۲۰۔ جماعت کی سرکاری زبان قفتانی زبان ہوگی، لیکن جلسوں میں قومی زبان یعنی ترکی زبان بولی جائے گی

۲۱ ۔ اگر جماعت کے کسی دو اراکین میں قانونی نزاع ہو تو ہر فریق اپنا ایک وکیل مقرر کرے گا۔ یہ وکیل مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے پنچ بن جائیں گے اور ایک تیسرے آدمی کو سرپنچ منتخب کرینگے دونوں فریق کو چاہئے کہ پنچوں کا فیصلہ تسلیم کریں۔ اگر ایسے افراد جن کے درمیان نزاع ہو تیس دن کے اندر وکیل مقرر نہ کریں، یا یہ وکیل سرپنچ کے انتخاب پر متفق نہ ہو سکیں تو مجلس منتظمہ خود وکیل اور سرپنچ نامزد کر دے گی ۔

اُردو زبان کی تعلیم کے مقاصد

ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور کام شروع کرنے سے پہلے مقصد کی تعیین ضروری ہوتی ہے تاکہ تمام تر توجہ کو اُس کی تحصیل پر مرکوز کیا جا سکے۔ کام کرنے والے کے ذہن میں مقصد کا تصور جس قدر صاف اور غیر مبہم ہوتا ہے کامیابی اسی قدر زیادہ یقینی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم تعلیم اردو کے مقاصد پر ابتدا ہی میں غور کر لیں اور اپنے نصب العین کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ جو نتائج اور اثرات ہم اپنی کوششوں سے پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل سلجھے ہوئے انداز میں ہمارے پیش نظر ہونے چاہئیں۔

اردو کی تعلیم و تدریس کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنی مادری زبان سے محبت کرنے لگیں۔ اُن کے دلوں میں یہ احساس جاگزیں ہو جائے کہ اُردو زبان اُن کی اپنی چیز ہے۔ ان کے آبا و اجداد کی یادگار ہے، اُن کی قوم و ملک کے بہترین دماغوں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے ایک ملی و قومی سرمایہ ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ تعلیم و تدریس کے دوران میں اس قسم کے جذبات طلبہ کے قلوب میں پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور کبھی اس خدمت سے غافل نہ ہو۔ وہ اُن کو بتائے کہ اردو زبان کی تاریخ ابتدا سے لے کر موجودہ زمانے تک کتنی شاندار کتنی دلچسپ اور کتنی سبق آموز ہے۔ یہ زبان کیونکر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم سے وجود میں آئی کیونکر مختلف اقوام کے میل جول کا لازمی اور خوشگوار نتیجہ ہے؟ اور کس طرح وجود میں آنے کے بعد اس نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی ہے، یہاں تک کہ آج اُس کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ نقشۂ عالم کے دور دراز ملکوں میں اُس کے بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں اور کیوں نہ ہو یہ تو وہ زبان ہے جس میں ہندی کا لوچ، فارسی کی شیرینی اور عربی کی فصاحت سبھی کچھ آ کر جمع ہو گیا ہے۔ جس کی تعمیر میں دنیا کی بہت سی زبانوں نے حصہ لیا ہے۔ اور جس کے پرچار میں متعدد قوموں نے ایک دوسرے

کا ہاتھ بٹایا ہے۔ پھر بھی نہیں، اُردو زبان ایک عظیم القدر لٹریچر کی ایہ دار ہے اور وہ لٹریچر ایسا ہے کہ دنیا کے کسی قوم و ملک کے لٹریچر سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ادبیات کا یہ بے بہا خزانہ ہماری تہذیب، ہمارے تمدن، ہمارے ذہنی ارتقا اور ہماری قومی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ علم اور آرٹ کی یہ وسیع اور عالیشان عمارت اُن گرامی قدر شعرا اور مصنفین کے ہمت و استقلال کی جیتی جاگتی یادگار ہے جنھوں نے اُردو کی خاطر کسی ایثار اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، جنھوں نے شدید ترین مصائب کے باوجود اُردو کی سرپرستی سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

اس سلسلے میں سب سے آخری اور سب سے زیادہ ضروری بات طلبہ کے ذہن نشین کرنے کی یہ ہے کہ اُردو زبان کی ملکیت کا بار اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کے ساتھ بہت سی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اُردو کا مستقبل تمھارے ہاتھ میں ہے اور تم سے وابستہ ہے۔ تمھارا فرض ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو تاکہ جب وقت آئے تو یہ امانت تمھارے سپرد کر دی جائے۔ تم کو اس امانت کی حفاظت کرنی ہوگی۔ اور پھر اس کو آئندہ نسلوں کے سپرد کر دینا ہوگا۔ تم کو ہر لحظہ اس امر کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس کی پاکیزگی میں فرق نہ آنے پائے اور اس لئے ضروری ہے کہ تم ابھی سے اس پر اپنی بہترین توجہ صرف کرو۔

جب تک اس قسم کے جذبات اور اس نوع کی عصبیت ہم اپنے نونہالوں میں پیدا نہیں کریں گے ہماری تدریس کامیاب کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

اسکول کے مختلف طلبہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، کوئی غریب گھرانے سے آتا ہے کوئی امیر خاندان سے، کسی کے والدین تعلیم یافتہ ہوتے ہیں کسی کے جاہل، کسی کے ہاں تجارت ذریعۂ معاش ہوتی ہے اور کسی کے ہاں صنعت و حرفت۔ غرض یہ کہ ہر بچہ ایک مختلف اور جداگانہ ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ سب کی تربیت جداگانہ ہوتی ہے۔ اگر ایک بچے کے ماں باپ صاحب ثروت ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی ہیں تو یقیناً وہ اُس بچے سے زیادہ خوش قسمت ہے

نامانوس ترکیبیں عامیانہ زبان سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہیں۔ اور تقریر کا مقصد یہ ہو کہ تحریر کو شستہ اور شگفتہ بنائے نہ یہ کہ تحریر، تقریر کو بھدا اور کرخت کر دے۔

اپنی مادری زبان کو سلاست، روانی اور صفائی کے ساتھ بولنا اور لکھنا ایک ایسا ہنر ہے جس کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے بہت سی باتوں کی ضرورت ہے اور اُن میں سے ایک یہی ہے کہ انسان کو اپنی زبان پر پوری دسترس حاصل ہو۔ تحریر ہو یا تقریر وہ اپنے خیالات کو وضاحت اور برجستگی کے ساتھ موثر پیرائے میں ادا کر سکے۔ اکثر لوگ بات کرتے وقت مناسب اور صحیح الفاظ نہیں پاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ادھورے، نامکمل اور پھسپھسے فقرے بولتے ہیں۔ اُن کی گفتگو میں ڈھیلا ڈھالا پن پایا جاتا ہے جستی نہیں ہوتی۔ دماغ میں خیالات کی لرزش ہوتی ہے، ہونٹ کانپتے ہیں لیکن اُن کو ادا نہیں کر سکتے۔ الفاظ کی یہ کمی جذبات اور شخصیت کی سچی ترجمانی میں خلل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے سامعین کو متاثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اُن میں یہ لسانی ضعف نہ پایا جاتا تو منازلِ ترقی قطع کرنے میں اُن کو کتنی آسانی ہوئی ہوتی اور آج دنیا میں اُن کا کیا مرتبہ ہوتا۔ زبان کا جادو مشہور ہے اور کسے جرأت ہے جو اس سحرِ حلال سے انکار کرے۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ جادو بیانی اور جادو نگاری خداداد صلاحیتیں ہیں تو اس میں بھی کلام نہیں کہ ہر شخص، کم از کم جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے اپنی تحریر و تقریر میں صحت، برجستگی اور قوت پیدا کر سکتا ہے۔ اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں یہ مقصد ہر وقت پیشِ نظر رہنا چاہئے۔

علوم و فنون کے میدان میں ذہنِ انسانی نے جس قدر تگ و تاز کی ہے وہ سب کتابوں میں محفوظ ہے۔ اگر ہم اپنے آبا و اجداد کی علمی و فنی جد و جہد سے واقف، اور اُس جد و جہد کے نتائج سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ہم صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہلانا چاہتے ہیں ـــــ تو ان کتابوں کا تھوڑا بہت مطالعہ ہمارا فرض ہے پھر مطالعہ اس کو نہیں کہتے کہ کسی کتاب کو شروع سے آخر

تک ایک دفعہ پڑھ لیا جائے۔ بلکہ مطالعہ نام ہے کسی علمی تحریر کو اس طرح پڑھنے کا کہ اُس کی تمام معنویت
ہمارے ذخیرۂ ذہنی کا ایک مستقل جزو بن جائے۔ چنانچہ اگر ایک طرف اس کی ضرورت ہے کہ
طلبہ میں مطالعے کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے تو دوسری طرف یہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ اُن کو صحیح خطوط
پر مطالعہ کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ کامیاب مطالعہ کے اصولوں سے طلبہ کو آگاہ
کرنا صرف اُردو ہی کے معلم کا فرض نہیں بلکہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کو بھی اس طرف توجہ کرنا
لازمی ہے، لیکن زبان کی تدریس میں یہ کام جس قدر اہم ہے اُسی قدر اچھے نتائج کے ساتھ انجام
بھی دیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اُردو کی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی تدریس کے ذریعے طلبہ میں مطالعہ
کی عادت پیدا کریں تاکہ وہ جب تک اسکول میں ہیں اپنی درسی کتابوں کے علاوہ بھی کچھ کتابیں
پڑھیں اور جب اسکول سے باہر جائیں تو کتب بینی کو روزانہ مشاغل میں شامل کر کے اپنے علم اور تجربے
کو وسیع کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کو مطالعے کے صحیح طریقوں سے واقف کرنے کی
ہر ممکن کوشش عمل میں لائیں تاکہ اُن کا مطالعہ کامیاب ہو اور جو کچھ پڑھیں اُس سے صحیح معنوں میں
مستفید ہوں۔

ادب حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے اور مطالعۂ ادب کا مقصد یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے مختلف
اور متنوع مناظر کے ساتھ ایک قلبی اور روحانی تعلق قائم کیا جائے۔ مطالعۂ ادب کا اثر ہماری زندگی پر
نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ ہمارے خیالات میں بلندی اور پاکیزگی، جذبات میں متانت اور
استواری اور اخلاق میں تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم کسی بلند پایہ شاعر کا کلام پڑھتے ہیں تو
ہم کو ایک ذہنی مسرت اور ایک قلبی راحت حاصل ہوتی ہے۔ اور کم از کم تھوڑی دیر کے لئے ہم اس
مادی دنیا اور اس کے علائق سے آزاد ہو جاتے ہیں، ہم ایک روحانی شگفتگی محسوس کرتے ہیں۔
مجموعی حیثیت سے اس مطالعہ کا اثر ہماری روزانہ زندگی پر نہایت مفید ہوتا ہے اور یہ اثر ایسا

ہے کہ کسی اور ذریعے سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شخص مطالعۂ ادب سے محروم ہے وہ زندگی کی ایک پاکیزہ ترین مسرت سے ناآشنا ہے۔ اور صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ادبیات کے مطالعے سے دلچسپی رکھتے ہیں، جو اس مطالعے کو اپنی زندگی کا ایک محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ بہت کم بہت ہی کم ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص نے اسکول میں کم سے کم پانچ چھ برس اُردو زبان پڑھی ہے اور ہم اپنے اکثر بہترین شعرا اور اُدبا کے ناموں سے واقف ہیں۔ جستہ جستہ اُن کے کلام و تصانیف کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے جنہوں نے اسکول سے نکلنے کے بعد ان شعرا و اُدبا کا زیادہ وسیع مطالعہ کرنے اور ادبیات کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ادب کا مطالعہ تو درکنار، ادبی کتابوں کے وجود سے بھی بے خبر ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی کوئی ادبی کتاب نہیں خریدتے کبھی کوئی حقیر سے حقیر رقم ایک ادبی رسالے کی سرپرستی میں خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ اُردو زبان کا موجودہ دور اخبارات و رسائل کا دور ہے، صحافت کا دور ہے۔ اور یہ ادبی صحیفے زبان کی وسعت اور ترقی کے آئینہ دار ہیں، ان کا مطالعہ لازمی ہے۔ کتب فروش فریاد کرتے ہیں کہ کوئی اُن کی کتابیں نہیں خریدتا، رسالوں کے ایڈیٹر چیختے چیختے تنگ آ گئے، اُن کے گلے بیٹھ گئے، لیکن اس بھرے ہندوستان میں جہاں کروڑوں اُردو بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں کسی کا مقصد خدمت زبان کی بجائے روپیہ سمیٹنا ہوتا ہے لیکن کچھ رسالے ایسے ضرور ہیں جن کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ اور باذوق انسان کے لئے مفید اور دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ملک میں خوش ذوق لوگوں کا مکمل فقدان ہے۔

اُردو کے استاد کے لئے زریں موقعہ ہے کہ ملک کو بدمذاقی کی لعنت سے رہا کرے۔ اور دنیا کو اپنا ممنون کرم بنائے۔ انسانی ذہن میں "دلچسپیاں" پیدا کرنے کا بہترین وقت بچپن کا زمانہ ہوتا ہے۔ ادبی ذوق بھی اسی زمانے میں پیدا کیا جا سکتا ہے [اُردو کی تدریس اس انداز سے

ہونی چاہئے کہ طلبہ نظم و نثر کے بہترین کارناموں سے حظ اندوز ہونے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں
اُن کے مذاق کی تربیت ہو، اُن کا وجدان بیدار ہو اور وہ اپنی زبان سے محبت کرنے کے علاوہ
اُس کے لٹریچر میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں۔ اُن میں مطالعے کا شوق پیدا ہو اور پھر یہ مطالعہ اُن کی
زندگی کا ایک مستقل اور ایک نہایت محبوب شغل بن جائے ۔

گویا ہماری تدریس کا ایک نہایت اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو نظم و نثر کے مطالعے
سے لطف اٹھانے کی ایسی تعلیم دیں، زبان و ادب کا ایسا ذوق و شوق پیدا کریں کہ مطالعۂ ادب
اُن کی ا ت مصروفیات و مشاغل کا ایک اہم جزو بن جائے، کہ ملک سے بد مذاقی کو دور کرنے
اور ادبیات کو فروغ دینے کا یہی ایک ذریعہ ہے ۔

علم النفس کے نقطۂ نظر سے ہر بچہ اپنے اندر نہ صرف تحسین کا مادہ رکھتا ہے بلکہ تخلیقی قوت
کا بھی مایہ دار ہوتا ہے ۔ ایک حسین چیز جب ایک بچے کے سامنے لائی جاتی ہے تو وہ اُس کو دیکھ کر
خوشی محسوس کرتا ہے ۔ یہی احساس وہ بنیاد ہے جس پر موزوں تربیت کے ذریعے جمالیاتی
ذوق کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ ہر بچہ جذبات اور محسوسات کی دنیا میں
رہتا ہے ۔ وہ اس قدر سوچتا نہیں جس قدر کہ محسوس کرتا ہے ۔ اور پھر ان جذبات و محسوسات
کے اظہار کا بھی خواہاں ہوتا ہے ۔ یہی اُس کی تخلیقی قوت ہے ۔

اُردو کی تدریس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کی وجدانی قوتیں بیدار کر کے ان کو تخلیق
پر آمادہ کیا جائے ۔ مضمون نگاری، انشا پردازی، شعر گوئی اور دیگر اصناف ادب میں طلبہ کی
ہمت افزائی کرنی چاہئے ۔ بچوں میں نقل کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جو کچھ وہ سیکھتے ہیں اسی
فطری صلاحیت کے ذریعے سیکھتے ہیں ۔ چنانچہ اُن کو آرٹ اور لٹریچر کے بہترین تخلیقی کارناموں
کی نقل پر آمادہ کرنا چاہئے ۔ وہ اس کام کو بڑی مستعدی اور دلچسپی سے کریں گے اور اس میں
ایک حقیقی مسرت محسوس کریں گے ۔

۲ طلبہ کو تخلیق ادب پر آمادہ کرنے کا مقصد یہ نہیں ہو کر غیر فانی شعرا اور اُدبا پیدا کئے جائیں۔ اسکول اس خدمت کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا مدعا صرف اتنا ہے کہ جن طلبہ میں ادبی صلاحیتیں ہیں اور جن کے متعلق توقع کیجاتی ہے کہ قوم و ملک کے آئندہ ممتاز اہل قلم ہوں گے اُن کی ہمت افزائی ہو، اور تخلیقی قوتیں فنا نہ ہو جائیں۔

---

۳ اُردو کی تدریس کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ طلبہ اُن تمام مسائل میں جو اُردو زبان کی موجودہ اور گزشتہ حالت سے متعلق ہیں ایک گہری دلچسپی لینے لگیں۔ وہ ذوق و شوق کے ساتھ زبان کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ اور پھر زبان کی موجودہ شکل کے حسن و قبح پر غور کریں۔ اسکول چھوڑنے سے پہلے اُن میں کم از کم آزاد اور بے لاگ تنقید کا مادہ پیدا ہو جائے۔ وہ اس لائق ہو جائیں کہ مختلف ادبی مسائل پر اظہار خیال کر سکیں۔ اردو سے متعلق سیکڑوں مسائل ایسے ہیں جو متنازعہ فیہ ہیں جن کے متعلق بہت اختلاف رائے ہے۔ ہماری تدریس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ ان تمام مسائل اور اُن کی اہمیت سے آگاہ ہو جائیں۔ اور اُن کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکیں۔

---

۴ ہمارے مقاصد کی فہرست نامکمل رہے گی اگر ہم ایک مقصد کو نظر انداز کر دیں۔ اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے، لیکن بدقسمتی سے اکثر لوگ اسے ایسا نہیں سمجھتے۔ اسکولوں میں اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ یہ امر اپنے طلبہ کے ذہن نشین کرا دیں تاکہ مسلمان طلبہ یہ خیال کرنا چھوڑ دیں کہ اُردو زبان ہماری اور صرف ہماری ہے۔ اور ہندو طلبہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کو اُردو زبان سے کوئی واسطہ نہیں، وہ تو ایک اسلامی چیز ہے۔ اس کی بجائے ہر طالب علم خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا فرد ہو اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان سمجھے اور کم سے کم ادبیات کے دائرے میں تو مذہبی تعصب نہ رہے۔ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوؤں نے اس کی تعمیر میں بہت کافی حصہ لیا ہے۔ زبان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے جب

طلبہ کو تاریخی شواہد سے واقفیت ہو جائے گی تو ان کو اس حقیقت میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہوگی۔ اور ہماری تدریس کا ایک ایسا مقصد حاصل ہو جائے گا جس کا اثر اُردو زبان کی ترقی پر نہایت خوشگوار ہوگا۔

تو گویا اسکولوں میں زبان اُردو کی تعلیم کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

(۱) طلبہ کے قلوب میں اُردو زبان کی محبت پیدا کرنا۔

(۲) طلبہ کی تحریری اور تقریری زبان میں سلاست صحت اور صفائی پیدا کرنا۔

(۳) طلبہ میں مطالعے کی عادت ڈالنا اور اُن کو مطالعے کے طریقوں سے واقف کرنا۔

(۴) طلبہ میں ادبیات سے شغف پیدا کرنا۔

(۵) طلبہ کو تخلیق ادب پر آمادہ کرنا۔

(۶) طلبہ کو اُردو کے تاریخی و لسانی مسائل سے آگاہ کرنا۔

(۷) طلبہ میں یہ احساس پیدا کرنا کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔

اساتذہ کو چاہیے کہ اپنی تدریس کے دوران میں ان مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ اگر اُن کے سامنے اس قسم کا کوئی نصب العین نہیں ہے اور محض کتاب کا پڑھا دینا ہی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں تو اُن کی تدریس ایک بے معنی اور فضول چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے بہت ہمت و استقلال کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کام کے لئے اساتذہ کو کم از کم پانچ چھ برس کا زمانہ ملتا ہے اور یہ مدت بہت کافی ہوتی ہے۔ اگر وہ محنت اور توجہ سے کام کریں اور اپنے کام میں دلچسپی بھی لیں تو یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں

آئندہ ابواب میں جو کچھ لکھا جائے گا وہ حقیقت میں ان مقاصد کے حصول کے ذرائع ہوں گے۔ کوشش کی جائے گی کہ اُن تمام تدابیر کا تفصیلی ذکر کیا جائے جو اس سلسلے میں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ امر بہر حال واضح رہنا چاہیے کہ مختلف طلبہ کی مختلف ضروریات ہوتی ہیں

اور اسی باعث تعلیم کے مختلف طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ تمام ہندوستان کے طلبہ کے لئے
ایک ہی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اساتذہ تدریس کے صحیح اصولوں کو سنگِ بنیاد
بنا کر اپنے طریقوں کو مقامی اور وقتی ضروریات کے مطابق تعمیر کریں۔

میرا ہیرو

میری عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ اپنے ہمعصروں کی طرح میں بھی اپنے وقت کا اکثر حصہ کھیل کود میں صرف کرتا تھا۔ زندگی اور زندہ دلی مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میرا دن بھر کا کام کیا تھا؟ خوب شرارتیں کرنا۔ چھوٹوں کو تنگ کرنا۔ بڑوں کا منہ چڑانا اور استادوں کو دق کرنا۔ لیکن ساتھ ہی میرے کچھ خیالات بھی تھے۔ خاص خیالات۔

سائنس اور ریاضی جیسے خشک مضامین سے مجھے نفرت تھی۔ صرف و نحو اور ڈرائنگ کو میں حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ میں کہا کرتا تھا کہ آخر ان مضامین سے انسانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بس مجھے تاریخ سے دلچسپی تھی اور خاص کر اپنے ملک کی تاریخ سے۔ میں بہادر اور شیر دل ترکوں پٹھان شاہسواروں اور عرب تیغ زنوں کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ لوگ بہادر تھے اور شجاع۔ میں ان لوگوں کی پرستش کرتا تھا۔ یہی میری توجہ جذب کر سکتے تھے۔

اکثر اوقات میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ بجائے ہلکی پھلکی چپاتیوں اور نفیس سالن کے میرے لئے موٹی موٹی روٹی اور خراب سا سالن ہوا کرتا۔ بعض دفعہ میں اپنے کپڑوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ یہ فوجی لباس سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ مجھے سوداگروں، ڈاکٹروں، انجنیروں اور پروفیسروں وغیرہ سے سخت نفرت تھی۔ میری ایک آرزو تھی صرف ایک اور وہ یہ کہ میں بھی ہیرو بن جاؤں۔

ہیرو کا مطلب کیا ہے؟ یہ میں خود بھی اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ لیکن اتنا میں ضرور سمجھتا تھا کہ ہیرو وہ ہوتا ہے جو مایوس کن حالات میں فتح حاصل کرے۔ جو اپنے ملکی علم کو بچانے کے لئے خود اپنے جسم کو بارود سے اڑا دے۔ جو تلواروں کے زخم اور بندوق کی گولیاں کھا کر اپنی جان دیدے مگر یہ سب زخم اس کے سینہ پر ہوں پشت پر نہ ہوں۔ مختصر یہ کہ ہیرو کا مطلب کچھ پیچیدہ سا تھا۔

[illegible]

مجھے چھ کارتوس اور ملے۔ ایک تانبے کی لوح بھی جس پر گرد وغبار جما ہوا تھا۔

کارتوس؟ —— مجھے میرا ہیرو مل گیا تھا۔

بڑے احترام سے میں نے ادھر اُدھر جو ہڈیاں پڑی تھیں انھیں اٹھایا اور سب چیزوں کو اپنے بستہ میں ڈال لیا۔

آخر میں نے اپنے ہیرو کو پا ہی لیا۔ اصلی ہیرو۔

جب میں گھر پہنچا تو اس خزانے کو اپنے چھوٹے سے ڈبہ میں بند کر کے قفل لگا دیا اور کنجی اپنی جیب میں ڈال لی۔

کھانے کے وقت میں نے فاتحانہ انداز میں ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو حقیر سمجھنے لگا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میرے پاس ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میرے پاس ایک ہیرو کی نشانیاں ہیں، بالکل اصلی نشانیاں۔ خوشی کے مارے میں کھانا بہت کم کھا رہا تھا یہ دیکھ اماں جان نے مجھ سے پوچھا "جمیل کیا بات ہے تم کھانا بہت کم کھا رہے ہو"

میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ جواب دیا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں خوب کھا رہا ہوں ایک سالم آلو منہ میں رکھ لیا۔

جونہی کھانا ختم ہوا میں کمرے میں پہنچا۔ ڈبہ میں ہڈیاں، کارتوس، لوح سب چیزیں موجود تھیں میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے لگایا۔

اس شام کو میری طبیعت بالکل بدل گئی۔ میں اپنی چھوٹی بہن سے خوب کھیلا اور اُسے بالکل تنگ نہیں کیا۔ اماں جان اور ابا جان نے جو کام کرنے کو کہا اُسے اچھی طرح سے کیا۔

رات کو میں پھر کمرے میں پہنچا اور ان چیزوں کو نکال کر دیکھنا شروع کیا۔ ہڈیوں کا رنگ بھورا تھا۔ کارتوس نیلے تھے اور تانبے کی لوح پر خوب گرد وغبار تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس پر کوئی نام لکھا ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے ہیرو کا نام معلوم کروں جس نے یکے بعد دیگرے چھ گولیاں کھائی تھیں مگر یہ پڑھا نہیں جاتا تھا۔ آخر کار ان سب چیزوں کو ڈبہ میں رکھ کر مقفل کر دیا۔ مجھے رات بھر

[illegible] نہیں، میں نے ان سے کہدیا " سکندر پاشا "
[illegible] انھوں نے فوراً یقین کر لیا۔
[اس] کے بعد تو سکندر پاشا کے ذکر کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہم جب آہستہ آہستہ [illegible]
[illegible] متعلق باتیں کرتے تو لڑکوں کو تعجب ہوتا کہ یہ تینوں کیا کر رہے ہیں۔ تاریخ کے گھنٹے میں جب ہمارا
[ا]ستاد مختلف سپہ سالاروں اور بہادروں کا ذکر کرتا تو ہم مسکراتے اور ایک دوسرے کے کان
میں کہتے " بیچارے کو سکندر پاشا کا پتہ نہیں۔ اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ اگر وہ چند سال اور
زندہ رہتا تو ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ بدل جاتا "، ہم بہت احتیاط کرتے کہ ہمارا راز کوئی
[illegible] معلوم نہ کر لے۔
اگرچہ میں " ہمارا " راز کہتا ہوں مگر دراصل یہ " میرا " راز تھا کیونکہ میں نے توقیر اور علیم سے
[illegible] کارتوسوں اور تانبے کی لوح کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ صرف نصف راز جانتے تھے۔
گھر پر میری حالت بالکل بدل گئی تھی۔ میں اکثر اپنے کمرے میں گھنٹوں بند رہتا۔ میرا بہت
وقت غور و فکر میں گزر جاتا۔ لیکن اس بات کا خدشہ بھی ہمیشہ رہتا تھا کہ میرا راز کوئی معلوم نہ کر لے۔
ایک دن میں ابا جان کے ساتھ سیر کرنے گیا۔ راستے میں مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں،
یکایک ابا جان نے مجھ سے پوچھا " کیا وہ کھدائی ختم ہو گئی ہے۔ میں وہاں کئی دن سے نہیں گیا۔
تم تو اکثر جاتے رہتے ہو۔ کیا تمھیں کام کوئی چیز بھی ملی یا نہیں؟ "
کیا ابا جان کو مجھ پر کچھ شبہ تھا۔ میں نے جواب دیا " میں تو وہاں گذشتہ ہفتہ سے نہیں گیا۔ "
یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ کیونکہ گذشتہ ہفتہ میں مجھے میرا ہیرو مل گیا تھا۔
ابا جان نے مسکرا کر کہا " میں سمجھا تھا تم نے کوئی خزانہ پا لیا ہے۔ کیونکہ تمھاری حالت کچھ
بدل سی گئی ہے کیا سارا خزانہ اپنے لئے ہی وقف کر لو گے؟ "
" نہیں " میں نے جواب دیا " مجھے تو کوئی خزانہ نہیں ملا "
والد صاحب قبلہ نے موضوع بدل دیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے بڑے بھائی کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دیہی صنعتیں اور دیہات کی نئی تعمیر

۱۔ ہندوستانی زندگی میں گاؤں کی اہمیت

ہندوستان کی ترقی کے جو آثار آج کل نظر آرہے ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ امید افزا چیز یہ ہے کہ لوگوں نے اب دیہاتی زندگی کے متعلق غور و فکر کرنا شروع کر دیا ہے۔ مغربی اثر میں آنے کے بعد ہم نے یہ بات بھلا دی تھی کہ ہندوستان ایک دیہی ملک ہے۔ شہروں میں ہم نے مغربی انداز کی تعلیم حاصل کی، اور یہ سوچا کہ اپنے ملک کو جدید ملکوں کے دوش بدوش لانے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کی تقلید میں شہری حالات کو تمام ملک میں پیدا کیا اور پھیلایا جائے۔ لیکن اب خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ ہماری نجات من حیث القوم دیہی اصلاح کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

کانگریس اور رائے عامہ کیوں اب دیہی اصلاح کی طرف متوجہ ہو رہی ہے اس کا سبب دریافت کرنا مشکل نہیں ہے۔ یہ بات اب ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ ہندوستان ایک دیہاتی ملک ہے یہاں کی نوے فیصدی آبادی دیہاتی ہے اور [illegible] فیصدی سے زیادہ اشیائے خام پیدا کرتی ہے۔ اس لئے جس کسی جماعت کے پیش نظر ملک کی مادی اور اخلاقی فلاح و بہبود ہے اسے مجبوراً دیہات کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ اصل ہندوستان صرف گاؤں ہی میں نظر آ سکتا ہے۔ یہ بجائے خود معقول دلیل ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک اور بہتر دلیل بھی موجود ہے۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب میں بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری تہذیب کی جڑ دیہاتی زندگی میں پیوست ہے اور مغربی تہذیب نے شہروں کی گود میں ہوش سنبھالا ہے اور وہیں پل کر جوان ہوئی ہے۔ قدیم یونان کے جمہوری دور میں شہروں کا ہی راگ گایا جاتا تھا۔ یورپ کے عہد متوسط میں طرز زندگی

[illegible]

کیا جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پرانے اعضا کو ہی دوبارہ جسم سے جوڑ دیا جائے کیونکہ کوئی زندہ جسم اپنی زندگی کے مختلف مدارج میں بالکل یکساں نہیں رہ سکتا۔ یہ بدلتا رہتا ہے جب حالات مختلف ہو جاتے ہیں تو ان سے مطابقت کی کوشش کرتا ہے اور یونہی اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ سماج کو ترقی دینے کی کوشش میں ہم اپنی کاہلی اور سہل انگاری سے ماضی کی طرف واپس نہیں جا سکتے اور نہ اس کی غلامانہ تقلید کر سکتے ہیں۔ ہماری جڑیں بے شک ماضی میں پیوست ہوں گی اور یوں ہمارے خیالوں اور کاموں کا اصل اصول وہی ہوگا جو ماضی کی دیہاتی تنظیم میں پایا جاتا تھا۔ لیکن اس کا اظہار ان مختلف حالات کی بنا پر جو اس وقت پائے جاتے ہیں مختلف ہوگا کیونکہ زندگی ورثہ اور ماحول دونوں سے مل کر بنتی ہے۔

بنابریں اپنی قومی زندگی کو از سرِ نو بنانے کی کوشش کرتے وقت یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم ان بنیادی خیالوں کا صحیح اندازہ کریں جن پر ہماری دیہاتی زندگی اور تنظیم قائم ہے یہ خیالات جہاں تک سمجھ میں آتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جماعت کے ہر رکن کے لئے کم سے کم ناگزیر اسباب حیات یقینی طور پر فراہم کرنا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کام کرنے والوں کو معاوضہ جنس کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح ان کی ضرورت کی تمام اشیاء انھیں غذا کی شکل میں مل جاتی تھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے نظام میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ مشترکہ خاندان ایک دوسرا طریقہ تھا جو اسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اور اس سے دولت کی تقسیم میں بھی بہت زیادہ عدم مساوات پیدا نہ ہو سکتی تھی۔

۲۔ مقابلہ اور طلب منفعت کی مطلق العنان خواہش کو قابو میں رکھنا اور اس کی جگہ امداد باہمی کو ترقی دینا۔

ذات پات کے نظام کے ذریعے سے جماعت کا کام اس کے مختلف ارکان میں تقسیم ہوتا تھا اور انھیں اپنا اپنا کام کرنا ہوتا تھا اس سے اس بات کی حفاظت ہو جاتی تھی کہ اگر کسی خاص

تجارت میں نفع زیادہ ہوتا تھا تو ہر شخص دوسروں سے مقابلہ کرنے کے لئے اُسی طرف نہیں لپکتا تھا
اور اس کوشش میں جاتی توازن کو آج کل کی طرح نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مثلاً جب قانون کے پیشے میں
آمدنی زیادہ ہوتی ہے تو ہر شخص وکیل بننے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کا خیال ترک کر دیتا
ہے کہ جماعت کو کتنے وکیلوں کی ضرورت ہے۔ ذات کے نظام سے جماعتی وفاداری اور امداد باہمی
بھی پیدا ہوتی تھی جس کی کمی اُن لوگوں میں جنہوں نے شہر میں تربیت پائی ہے بہت نمایاں ہے۔
۳۔ گاؤں کی زندگی کو اپنی جگہ مکمل بنانا اگر ہر گاؤں اپنی ضروریات کے مطابق کافی
مقدار میں اشیاء پیدا کر سکے اور اپنی ابتدائی ضروریات کے لئے باہر کا محتاج نہ رہے۔
اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مختلف تجارتوں اور پیشوں کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تھی اور
لوگ خارجی حکومتوں کے ناجائز انتفاع اور ان پر انحصار کرنے سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ طرز
حکومت کے اعتبار سے بھی گاؤں اپنی جگہ پر مکمل ہوتا تھا۔ اس کے معاملات کا فیصلہ پنچایت کرتی
تھی۔ اسی طرح ہر گاؤں ایک جمہوریت ہوتی تھی جس کی صدارت کا کام پنچایت کے سپرد ہوتا تھا۔
جو اس بات کا خیال رکھتی تھی کہ دیہاتی زندگی کے تمام شعبے مناسب طور پر کام کریں۔
۴۔ روحانی باتوں کا مرتبہ ارفع و بلند تھا۔
یہ اسی بات سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین ذات راجہ یا تاجر کی نہیں ہے
بلکہ پروہت اور پنڈت کی ہے۔ راجہ چاہے کتنا ہی امیر اور طاقتور کیوں نہ ہو وہ ایک آوارہ گرد مفلس
مہاتما کی عزت کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ محض دولت کمانے کی بہت
زیادہ قدر نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ترک دنیا کو انسانی ترقی کی بلند ترین منزل سمجھا جاتا تھا۔
ان نصب العینوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی بنیاد جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دنیاوی
زندگی تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کی سادگی کی جگہ مقبوضات کی کثرت کی تعریف و توصیف کی جاتی
ہے جس آدمی کے پاس دولت ہو اُس کی عزت کی جاتی ہے اور اُسے بادشاہ کی طرف سے طبقہ
امراء میں جگہ مل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں مغرب میں معاشی تنظیم کی بنیاد سخت اور بے درد مقابلے

وقت ہندوستان سے بڑے بڑے خزانے کھینچ کر یورپ چلے گئے اُن جاگیرداروں کی جگہ بڑے
بڑے ساہوکار پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے اپنے طور پر ایک ایسا نظام قائم کر لیا جو جاگیرداروں کے
نظام سے بہت سی باتوں میں مشابہ تھا۔ اور یوں یہ ساہوکار بھی اسی طرح منافع کمانے لگے جیسے
جاگیردار خراج کے ذریعے سے کماتے تھے۔ یہاں بھی ذہنیت خود غرضانہ نفع طلبی کی تھی اور طریقہ
یہ تھا کہ مشین کے ذریعے سے جتنا ہو سکے نفع حاصل کیا جائے اور اخلاقی پابندیوں کی کوئی پروا
نہ کی جائے۔ ایک واحد آدمی مشین کے ذریعے سے ہزاروں مزدوروں کی محنت کا نفع حاصل
کرنے لگا۔ وہ اپنی جیبیں بھرتا رہا اور چونکہ مشین کا مالک وہی ہوتا تھا اُس کے مزدور بے بس
ہوتے تھے۔ اور اُنھیں اُس کی حرص و آز کو بلا احتجاج کئے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سرمایہ داری
نظام کی ایک سب سے بڑی خرابی ہے کہ یہ نہ صرف نفع طلبی کی ذہنیت اور اُس کی معرفت بدترین
حرص اور خود غرضی کو ترقی دیتا ہے بلکہ مزدور سے دولت پیدا کرنے کے اوزار چھین کر اُس کی
آزادی بھی چھین لیتا ہے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو سرمایہ کی فتح اور مزدور کی غلامی مکمل ہو جاتی
ہے۔ اپنے قرب و جوار کے آدمیوں سے جو ناجائز فائدہ حاصل ہوتا ہے سرمایہ دار اسی پر
قناعت نہیں کرتا بلکہ سرمایہ دار اپنی حریص نگاہوں کو دنیا کے بعید ترین گوشوں تک لے جاتا
ہے۔ کیونکہ اُسے اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں اور اپنے کارخانوں کے لئے خام اشیاء
کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بڑی بڑی رقموں کے ساہوکارے سے وہ ان جگہوں پر قبضہ
کرتا ہے اور اس بات کا پورا انتظام کرتا ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کی حیثیت لکڑہاروں اور
پنہاروں جیسے ہو جائے۔ وہ اُنھیں اپنے ملک میں صنعتی اشیاء پیدا کرنے سے باز رکھتا ہے
کیونکہ ایسی حالت میں اُس کی منڈی اُس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ غرض کہ اس طرح نظام سرمایہ
داری سے نظام شہنشاہیت پیدا ہوتا ہے۔ اور کمزور قوموں کو غلام کر کے اُن سے ناجائز فائدہ
حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی پابندیوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کیونکہ
تجارت بہرحال تجارت ہے اور اُس میں جو چیز قابل لحاظ ہوتی ہے وہ صرف نفع ہوتا ہے۔ بنا بریں

کوئی چیز ساہوکار کو اپنے گندے کام کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر کچھ روک ٹوک کی جاتی ہے تو فوراً جنگ شروع ہو جاتی ہے اور ناقابل بیان کشت و خون اور تباہی پھیل جاتی ہے بسلہ پلار کو اپنا سونا چاہیئے۔ چاہے اُس کی وجہ سے خون کی کتنی ہی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں۔ غریب مزدور کو جس نے مشین کا ایک حقیر پرزا بننے کے لئے پہلے اپنی آزادی کو قربان کیا تھا۔ اب اعلیٰ نصب العینوں کا نشہ دیا جاتا ہے اور اُسے قومی عزت کا محافظ اور وحشیوں کو مہذب بنانے والا کہہ کر ابھارا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خوشی خوشی توپ کی غذا بن کر سرمایہ داروں کے حرص و آز کا شکار ہو جاتا ہے۔ سرمایہ داری کی جو تصویر اوپر کھینچی گئی ہے وہ بہت بھیانک نظر آتی ہے لیکن اگر سرمایہ داری سے اُس کا اوپری خول اوتار دیا جائے اور اُس کی بدنما عریانی کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کے علاوہ اور نظر ہی کیا آ سکتا ہے؟ سرمایہ داری کی جلو میں خود غرضی، باہمی تنازع، جنگ، تباہی اور خوں ریزی کا آنا تا گزر رہا ہے۔

اشتراکیت ان برائیوں کے خلاف ایک کھلے ہوئے احتجاج کی شکل میں رونما ہوئی اس لئے قدرتی طور پر اس سے یہ توقع وابستہ کی جاتی ہے کہ یہ ہمارے سامنے نظام سرمایہ داری کا ایک ایسا نعم البدل پیش کرے گی جو ہماری قوم کے لئے نہایت ہی موزوں ہوگا۔ اشتراکیت نے اس بات کو سمجھ لیا کہ بیان کرنے کا چاہے جو طریقہ اختیار کیا جائے سرمایہ داری کی جڑ دراصل نفع طلبی اور خود غرضی ہے اور اُس نے اس سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ پیدائش دولت کو ایک اجتماعی شکل دے دی جائے جو چیز بھی پیدا کی جائے اگر اُس کی ملکیت جماعت کو حاصل ہو تو خود غرضی اور حرص کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ اشتراکیت نے نفع طلبی کی ذہنیت کو جڑ سے اکھاڑ کر یہ سمجھا کہ اُس نے تمام اُن برائیوں پر فتح پالی ہے جو سرمایہ داری میں پائی جاتی ہیں لیکن اس کا نتیجہ درحقیقت یہ ہوا کہ اگر سرمایہ داری ایک انتہا پر تھی تو اشتراکیت دوسری انتہا پر پہنچ گئی۔ سرمایہ داری میں ہر فرد کو آزادی تھی استطاعت ہونے کی حالت میں ہر شخص کے لئے یہ ممکن تھا کہ ہر موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ خواہ اُس سے دوسروں کو کتنا ہی نقصان

کیوں نہ ہوتا ہو لیکن دوسروں کے نقصان کا انسداد کرنے کی کوشش میں اشتراکیت دوسری
انتہا تک پہنچ گئی اور اُس نے سرے سے افراد کی ذاتی جدوجہد اور مساعی ہی کو یک قلم ختم کردیا۔
جماعت سب کچھ ہو گئی اور فرد کو اس قدر دبایا گیا کہ وہ نظام سرمایہ داری کی طرح دوبارہ ایک بڑے
پہیے کا حقیر پرزہ بن گیا۔ چند اشخاص تمام قوم کے لئے منصوبے بناتے ہیں اور بقیہ تمام لوگوں کے
لئے اُن کے احکام بجالانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اشتراکیت پسند لوگ اس
میں شک نہیں اس کی نہایت پرزور تردید کریں گے کیونکہ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ نظام اشتراکیت
میں صرف چند آدمی جماعت کے کاموں کو نہیں چلاتے بلکہ مزدوروں کی جماعت کے لکھوکھا آدمی
جلسہ مشاورت میں شریک ہوتے ہیں اور جو بات انہیں مطلوب ہوتی ہے اُس کی بابت فیصلہ
کرتے ہیں لیکن اس کی تردید میں یہ کہا جا سکتا ہے اول تو لکھوکھا آدمی جب کوئی فیصلہ کرتے ہیں
اُس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ چند با اقتدار آدمی جو چاہتے ہیں اُس کی موافقت
میں محض رسمی طور پر رضامندی کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں تک پیدائش
دولت کا تعلق ہے اشتراکیت میں ذاتی جدوجہد، قوت تخلیق اور شخصیت کے اظہار کا موقع بالکل
باقی نہیں رہا ہے۔ اور اُن چیزوں کی عدم موجودگی میں اشیا کی تعداد میں اشتراکیت کی وجہ
سے جو اضافہ ہوتا ہے اُس کی پوری قدر و منزلت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ انسان جس چیز کو سب سے
زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ درحقیقت اُس کی انفرادیت ہے۔ یعنی اس بات کی آزادی کہ جس طرح
چاہے سوچے اور عمل کرے اور تخلیقی کام انجام دے لیکن اگر ایک آدمی کو ایک مقررہ نمونے کے
مطابق کام کرنا پڑے تو وہ انسانیت کے عظیم ترین ترکہ یعنی اپنی انفرادیت سے محروم ہو جاتا ہے۔
اور اس سے زیادہ سخت الزام کسی معاشری نظام کے خلاف کوئی دوسرا عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ
جماعت بہرحال افراد کا مجموعہ ہوتی ہے اور جو جماعتی نظام انفرادیت دبا ڈالے تو وہ اپنے مقصد کو
پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

پھر اشتراکیت پسندوں کے پاس اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے کیونکہ نفع طلبی کی بے روک

لوگ سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو وہ بلاشبہ حق بجانب تھے لیکن سرمایہ داری کے مرکزیت پسند طریقۂ پیداوار کو اپنی حالت پر برقرار رکھنے میں وہ ٹھیک نہیں تھے۔ کیونکہ سرمایہ داری کے مرکزیت پسند طریقۂ پیداوار کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو اشیا پیدا کی جانے والی ہیں اُن کے متعلق سوچنے اور منصوبہ بنانے کا کام مرکز کے چند باقتدار آدمیوں کو سونپ دیا جائے اور باقی سب آدمی مشین کے بڑے پہیئے کے ایک حقیر جزو بنا دیئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کرنے والے اشتراکیت کے نظام میں بھی اسی خرابی کا شکار ہو گئے جس کے وہ نظام سرمایہ داری میں شکار تھے یعنی یہ کہ ان کا کام محض مجہول کام کرنا رہا، بلکہ غیر مشروط اطاعت اور فرماں برداری ہو گیا۔ مرکز پر جو لوگ ہیں اُن کے حکم کے مطابق ایک ہی قسم کی اشیا کثیر پیمانے پر پیدا کی جانے لگیں اور اکثر ایسا ہونے لگا کہ ایک آدمی کا کام صرف یہ رہ گیا کہ جب ڈبے تیزی سے یکے بعد دیگرے اس کے سامنے سے گزریں تو وہ ان پر لیبل لگاتا رہے اس کام کی یکسانیت روح کو مردہ کرنے والی ہے۔ اور جس مشین کو انسان نے بنایا تھا اُس نے آخر کار خود انسان کو ہی مشین بنا کر چھوڑا۔ کیونکہ اُس مشین کی طرح جسے وہ چلاتا ہے وہ بھی صرف ایک حرکت کرنا جانتا ہے۔ اور صرف اس وقت کام کرتا ہے جب مرکزی دفتر میں بٹن دبایا جاتا ہے۔ اُپج، جدت، اظہارِ نفس سب مفقود ہو گئے ہیں۔ اور اگر کہیں پائی بھی جائیں تو وہ اس نظام میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ لیکن کیا اظہارِ نفس کی خواہش ایک انسان کا سب سے قوی محرکِ عمل نہیں ہے؟ ایک بچہ کو غور سے دیکھو وہ اُسی وقت سب سے زیادہ خوش نظر آتا ہے جب اُسے سب سے زیادہ موقع اظہارِ نفس کا ملا ہوا ہوتا ہے اور افسردہ ہو جاتا ہے جب اُس پر کسی طرح کی پابندی عائد کی جاتی ہے اور اگر اُسے روکا جائے تو بہت خفا ہوتا ہے۔ آپ اس کی ننھی ننھی اینٹوں سے اسے ایک خوبصورت سا منارہ بنا دیں۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوگا لیکن فوراً ہی اسے گرا دے گا تاکہ دوبارہ وہ خود بنائے۔ چاہے اس کا بنایا ہوا منارہ کتنا ہی کمزور ہو اور آسانی سے گر جائے لیکن وہ اپنے اس ذاتی کارنامے کو دیکھ کر خوشی کے مارے پھولا نہیں سمائے گا۔ یہی حال سیاسیات میں ہے۔ آخر لوگ حکومت

خود اختیاری کا کیوں مطالبہ کرتے ہیں۔ بعض صورتوں میں ممکن ہے کہ بدیشی حکومت نہایت معقول ہو لیکن انسان محض معقولیت ہی کا تو متمنی نہیں ہوتا۔ دراصل وہ تو اظہار نفس کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا دعویٰ ہے کہ اچھی حکومت بھی حکومت خود اختیاری کی نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ چاہے مزدوروں اور کسانوں کی عام حالت سرمایہ داری کے مقابلے میں اشتراکیت کے ماتحت کہیں بہتر ہو کیونکہ سرمایہ داری کی طرح اشتراکیت میں پیداوار انفرادی مفاد کے لئے نہیں ہوتی لیکن جب تک اشتراکیت میں پیداوار کی مرکزیت موجود ہے اس وقت تک تنوع کی گنجائش نہیں ہو سکتی اور نہ عوام کو اظہار نفس کا موقع مل سکتا ہے۔

۳۔ ہندوستانی مشکلات کا حل

عدم مرکزیت اور سودیشی

اگر دنیا کا موجودہ اقتصادی نظام مسئلہ تعمیر قوم کا کوئی حل پیش نہیں کرتا جس کی آج ہمیں ضرورت ہے تو ہمیں کوئی ایسی معقول تدبیر تلاش کرنا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنی قومی عمارت کی تعمیر کر سکیں۔ سرمایہ داری میں یہ مشکل ہے کہ وہ ذاتی نفع حاصل کرنے کی پوری آزادی دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خودغرضی۔ حرص۔ تشدد اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے جذبات کو فروغ ہوتا ہے۔ اشتراکیت نے اس کے تدارک کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ دوسری انتہا کو پہنچ گئی۔ یعنی اس نے ہر طرح کے ذاتی منافع کا انسداد کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی اظہار رائے کا باب قطعی مسدود ہو گیا۔

اس لئے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ آخر ہماری نجات کس چیز میں ہے؟ ہم یہ نہیں طے کر سکتے کہ آیا ہمیں ذاتی نفع کا اصول ترک کر دینا چاہئے یا باقی رکھنا چاہئے۔ اس لئے ہم عجیب گومگو میں ہے۔ لیکن جیسا کہ منطق جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ گومگو کی یہ حالت محض خیالی ہوتی ہے اور ہمیشہ ایک درمیانی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی ہماری نجات اسی درمیانی راستہ میں ہے اگر ہیگل، کا یہ قول صحیح ہے

کا حق۔ تو دعوے میں ہوتا ہے نہ اس کی تردید میں بلکہ ان دونوں کی امتزاجی ترکیب میں ہوتا
ہے جس میں دونوں کے صحیح اجزا شامل ہوتے ہیں تو پھر ہم بھی اپنی مشکل کا حل معلوم کر سکتے ہیں
خوش قسمتی سے ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر ہمارے آباؤ اجداد بھی اسی پر عمل کرتے آئے
ہیں۔ ہماری موجودہ مشکلات کا حل ہے کہ نہ تو انفرادی نفع کا اصول اپنی جگہ پر غلط ہے اور نہ
اجتماعی قبضہ و اختیار میں کوئی برائی ہے۔ البتہ اگر انفرادی نفع کا اصول اپنے حدود سے
تجاوز کر جائے اور اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے لگے تو وہ برا ہے اسی طرح اگر اجتماعی
قبضہ و اختیار کا اصول اپنے حدود سے گذر جائے اور افراد کی آزادی عمل سلب کرلے تو وہ
بھی برا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں کوئی ایسی تدبیر نکالنی چاہیئے جس میں انفرادی نفع اور اجتماعی
قبضہ و اختیار دونوں کی گنجائش ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورت صرف اس طرح ممکن ہو سکتی
ہے کہ پیداوار کی مرکزیت کو ختم کر دیا جائے اور سودیشی کے اصول کو رواج دیا جائے۔ عدم
مرکزیت کا منشاء یہ ہے کہ مرکز سے یہ ہدایت نہ دی جائے کہ کس قسم کی اشیا پیدا کی جائیں اور
کس طرح بلکہ پیدا کرنے والے کے ذوق اور استعداد پر اس معاملے کو چھوڑ دیا جائے صرف
اسی صورت میں عوام کو ذاتی اظہار رائے اور ذاتی عروج کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کے
خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہر شخص کو اپنا من مانا کرنے کی اجازت دے دی جائے تو اس کا نتیجہ وہی
سرمایہ داری ہوگی۔ کیونکہ ایک شخص کو اپنی حرص کی وجہ سے پیداوار پر قابض ہونے کا موقع
ملے گا۔ یہ صحیح ہے لیکن بہرحال اس کا انسداد کرنا ہوگا اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ بڑی مشینوں
سے کام نہ لیا جائے اور زیادہ مقدار میں پیداوار نہ ہو۔ یعنی صرف وہی مشینیں استعمال کی جائیں
جن میں صرف ایک شخص کام کر سکے مثلاً سینے کی مشین۔

علاوہ ازیں ہمیں عوام میں سودیشی کی تبلیغ کرنا ہوگی تاکہ وہ اپنے قریب ترین لوگوں کی بنائی
ہوئی چیزیں دور والوں کی تیار کردہ چیزوں کے مقابلے میں استعمال کرنا اپنا فرض سمجھیں
بالفاظ دیگر ہمیں ہر گاؤں کو کافی بالذات بنانے کے قدیم نظریے کو از سر نو جاری کرنا ہوگا۔ تاکہ

لوگوں کی خاص خاص ضرورتیں خود ان کے گاؤں میں پوری ہو سکیں اور بڑی حد تک باہر کے محتاج نہ رہیں۔ اگر ہر گاؤں اس طرح باہر سے مستغنی ہو جائے اور اپنی خاص خاص ضروریات خود پوری کرنے لگے تو ہر کاریگر صرف اُتنی مقدار میں چیزیں تیار کرے گا جتنی اس کے گاؤں کو ضرورت ہو۔ یعنی پیداوار گاؤں کی مانگ کے مطابق محدود ہو جائے گی۔ اور جب یہ صورت ہوگی تو نہ زائد از ضرورت پیداوار کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ نئے نئے بازار تلاش کرنے کی مشکل درپیش آئے گی۔ پھر کوئی تمام پیداوار پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش نہ کرے گا کیونکہ جب سودیشی کے استعمال کی وجہ سے ہر گاؤں کو اپنے گاؤں کے باہر کی چیزوں کی ضرورت نہ رہیگی تو وہ اسے سعی لاحاصل سمجھے گا۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سودیشی کا صحیح مفہوم واضح کر دیا جائے اور تمام امکانی غلط فہمیاں رفع کر دی جائیں کیونکہ سودیشی اور تنگ خیال جماعت بندی میں واقعی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ تنگ نظر جماعت بندی میں تو ایک شخص اپنی ہی جماعت۔ فرقہ۔ یا طبقہ کی چیزیں استعمال کرنے کی قسم کھاتا ہے اور دوسرے کی اس کے یہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اسے کسی اصول سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو قومی اور بین الاقوامی اتحاد کے لئے منافی ثابت ہوتا ہے۔ فی زمانہ ریڈیو۔ ہوائی جہاز اور تار برقی وغیرہ نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے۔ گویا فاصلے کے لحاظ سے دنیا سمٹ گئی ہے۔ ایسی حالت میں یہ انتہائی حماقت ہوگی کہ دنیا کو چھوٹے چھوٹے محدود حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے جہاں ایک حلقہ کا دوسرے سے کوئی تعلق ہی باقی نہ رہے۔ حامیان سودیشی کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ ان کا منشا تو محض یہ ہے کہ "خیرات پہلے گھر ہی سے شروع ہونا چاہئے" ہم پر سب سے پہلے ہمارے قریب ترین پڑوسی کا حق ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک خاندان کو لیجئے ہر شخص اپنے اہل و عیال اور اپنے افراد خاندان سے زیادہ متعلق اور منسلک ہوتا ہے اس لئے

کروں گا اور اُس کی تمام ناجائز ضروریات بھی پوری کروں گا لیکن حقیقت میں نہ تو یہ خاندان کی صحیح خدمت ہوئی اور نہ ملک و قوم کی۔ بخلاف اس کے اگر میں یہ کہوں کہ خدا نے مجھے ہاتھ پیر اس لئے دئے ہیں کہ میں صرف اپنی اور اپنے متعلقین کی پرورش کروں تو گویا میں اپنی زندگی کو سادہ اور آسان تر بناتا ہوں۔ اس طرح مجھ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور صرف اپنے قریب ترین لوگوں کی خدمت انجام دوں گا۔ تصور کیجئے کہ اگر ہر شخص یہی طرزِ عمل اختیار کرلے تو ملک کی حالت کتنی بہتر اور قابل رشک ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سب کے سب بیک وقت اس پر عمل نہیں کرسکتے لیکن جو کریں گے وہ بہرحال منزل مقصود کو قریب تر کرنے میں مدثابت ہوں گے اگر میں تمام دوسرے ممالک کو نظرانداز کرکے صرف ہندوستان کی خدمت کرنا چاہوں تو میرے اس طرزِ عمل سے کسی ملک کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ میری خدمت مقابلے کی نوعیت کی نہ ہوگی" اپنی چیز کو اس طرح استعمال کرو کہ اُس سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے" یہ نہ صرف ایک اعلیٰ قانونی نظریہ ہے بلکہ ایک زرین اصول ہے۔ اہنسا اور محبت پر عمل کرنے کا ایک معقول ذریعہ ہے۔ ہم اس عقیدے کے علمبردار ہیں اس لئے ہمیں اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ وہ وطن پرستی جس کی بنیاد محبت پر قائم ہو حیات بخش ہوتی ہے لیکن جس کی بنیاد نفرت پر ہو وہ روح کو فنا کردیتی ہے[1]"

گویا سودیشی کی تحریک اپنے مفہوم میں پوری وسعت رکھتی ہے۔ جب ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ساری دنیا ایک "کُل" ہے اور اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے بہت زیادہ منسلک ہیں تو سودیشی کا مفہوم یہ ہوا کہ ایک محدود حلقے کی خدمت ساری دنیا کی خدمت کے مترادف ہے بشرطیکہ اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ دوسروں کو بھی اسی طرح اپنے محدود حلقے کی خدمت کا حق حاصل ہے۔

اسی اصول کے مطابق پھر یہ سوال ہی پیدا نہ ہوگا کہ چند بہتر اور زیادہ اہل پیدا کرنیوالے دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے یا انھیں اپنا غلام بنائے رکھیں گے کیونکہ جیسا کہ ہم

---

(۱) خیالات مہاتما گاندھی از سی۔ ایف۔ انڈریوز۔ ص ۱۲۶۔ ۱۲۷

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تنقید و تبصرہ

البدور البازغہ ۔ مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ۔ حجم ۱۴ جزو تقطیع ۲۰×۳۰ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ۔ قیمت فی نسخہ ۱۲؍ ۔ ملنے کا پتہ: ناظم صاحب مجلس علمی ڈابھیل ملک (سورت)

البدور البازغہ جو تدبیر نفس اور تدبیر منزل سے لے کر تدبیر مدن اور مباحث الٰہیہ تک حاوی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی وہ نادر تصنیف ہے جو اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ ڈابھیل کی مجلس علمی، جملہ علم دوست حضرات کے شکریہ کی مستحق ہے جس نے شاہ صاحب موصوف کی "خیر کثیر" کو شائع کرنے کے بعد اب یہ ان کی دوسری کثیر المنافع کتاب شائع کی۔ اس میں حضرت شاہ صاحب نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی اور جسمانی اور روحانی زندگی کے جملہ اسباب و وسائل اور عادت و کیفیات و مراتب و فضائل وغیرہ کو نہایت صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے اور حقائق شرعیہ و دروسائل الٰہیہ کو اس قدر سلیس اور سہل عبارت میں لکھا ہے کہ ہر استعداد کا شخص بہرہ اندوز ہو سکتا ہے بشرطیکہ عربی جانتا ہو۔ کیونکہ یہ کتاب عربی میں لکھی گئی ہے ۔

ہم کو یہ سن کر اور بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس کتاب کے بعد "مجلس علمی" شاہ صاحب کی مشہور تصنیف "تفہیمات الٰہیہ" کے چھاپنے کا قصد رکھتی ہے ۔ تفہیمات کی اشاعت میں دو امور کی طرف ہم مجلس علمی کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ عربی اور فارسی تفہیمات کے حصے الگ الگ کر دیے جائیں اور دونوں کی اشاعت بھی الگ ہو۔ مخلوط زبانوں میں کسی کتاب کا شائع کرنا پسندیدہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہر حصہ کی فہرست بنا کر کتاب کے شروع میں ضرور لگا دی جائے۔ کیونکہ ہر ایک تفہیم ایک مستقل اور جداگانہ نکتہ ہے ۔ ایک دوسرے سے کمتر تعلق ہے ۔ اگر فہرست نہ ہوگی تو کتاب زیادہ نفع رساں نہ ہو سکے گی ۔

ع ، ا ۔

(١-٥)

"اُردو ادیبوں پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوا ہے وہ ٹیگور کی انگریزی کتاب گیتانجلی
ہے۔ اس اثر کے نتائج زیادہ تر وہ نثری نظمیں ہیں جو رسائل اور اخبارات میں ادبِ لطیف اور ادبِ
جمیل کے عنوانوں کے ماتحت شائع ہوتی ہیں . . . لیکن میرا خیال ہے کہ ٹیگور کے رنگ
میں شعر کہنے کے لئے جس ذہنیت اور جس عروض کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں ابھی تک تیار
نہیں ہوئی یہی وجہ ہے کہ ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ان مشکلات کے ٹیگور کا رنگ
ذاتی ہے۔ بے حد شخصی . . . اس کے طرز کی تقلید کسی سے بن نہ آئے گی جس چیز کی تقلید ہمارے ادب
کے لئے واقعی مفید ہو سکتی ہے وہ ٹیگور کی اس روش اور اس سلوک کی تقلید ہے جو انھوں نے
بنگالی ادب کے ساتھ کیا ہے۔ ہمیں ٹیگور کے انقلابی پہلو کی تقلید کرنا چاہئے . . . . طرز میں تقلید
ادب کی خودکشی کے مرادف ہے۔ ٹیگور کا رنگ اُس کے ذاتی عرفان کا عکس ہے ہر ادیب کی
روش اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہونی چاہئے . . . . . ."

پروفیسر صاحب . . . نے اپنے ترجمہ کے متعلق بہت انکسار سے کام لیا ہے افسوس ہے کہ
ہم اصل بنگالی زبان سے نابلد ہیں اس لئے ترجمے کے بارے میں ہم کوئی صحیح رائے ظاہر
کرنے سے معذور ہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عبارت نہایت صاف سلیس اور رواں ہے
اور ترجمہ نہایت محنت و کاوش سے کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ٹیگور کا کلام
جب دوسرے قالب میں آ کر اتنا حسین ہے تو اپنے اصلی خد و خال میں کیسا حسین و جمیل ہوگا طوالت
کا خوف ہے ورنہ ہم یہاں دو ایک اقتباسات اس کے ضرور دیتے۔ شروع میں ٹیگور کی ایک
بہترین تصویر بھی ہے۔

م، ح، ح

فلسفۂ جمال۔ از جناب [illegible] حسن صاحب ایم اے۔ تقطیع جامعہ کی، حجم چھیاسٹھ صفحات۔ ٹائپ
خوشنما، طباعت اچھی، کاغذ نفیس۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ کتابستان ۱۷ سٹی روڈ
الہ آباد۔

[illegible]

غالب شکن۔ نوشتہ مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی سب رجسٹرار حیدرآباد دکن   تقطیع خرد ضخامت دو جزو۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک خط ہے جو مرزا یگانہ صاحب آیات وجدانی نے سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کو لکھا۔ اس میں انھوں نے مرزا غالب کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں جو اس افراط کا ردعمل ہیں جو غالب مرحوم کے متعلق جدید تعلیم یافتہ جماعت نے کیا ہے۔ مرزا یگانہ نے نہ صرف غالب کے کلام ہی کی تنقیص کی ہے بلکہ اُن کے کمال کے ساتھ اُن کے خلوص اور اخلاق پر بھی حملے کئے ہیں چونکہ وہ ایک نکتہ سنج اور شگفتہ نگار صاحب قلم ہیں اس وجہ سے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ دلچسپ ہے اگر یہ حقیقت سے وہ بھی اسی قدر بعید ہے جس قدر جدید تعلیم یافتہ جماعت کا خیال۔ ایک طرف اگر افراط ہے تو دوسری طرف تفریط ہے۔ اور صحیح راستہ کچھ بین بین ہی ہے۔ آخر میں انھوں نے مرزا غالب کے متعلق کچھ رباعیاں لکھی ہیں جن میں سے چند اس لئے درج کرتا ہوں کہ ان کے خیالات کی نوعیت سے ناظرین آشنا ہو جائیں۔

غالب کے سوا کوئی بشر ہی کہ نہیں   اوروں کے بھی حصے میں ہنر ہی کہ نہیں
مردہ بھیڑوں کو پوچتا ہے ناداں   زندہ شیروں کی بھی کچھ خبر ہے کہ نہیں

اک شاعر کہنہ سال کہہ سکتے ہو   پیٹے کا شریک حال کہہ سکتے ہو
جو چاہو کہو یار۔ مگر یہ تو کہو   غالب کو نمک حلال کہہ سکتے ہو

کیا جانیں ادھورا ہے کہ پورا شاعر   جب منہ میں زباں نہیں تو کیسا شاعر
سچ کہتے ہیں مرزا یگانہ صاحب   غالب نہ ہوگا کوئی گونگا شاعر

وہ جاتے ہیں مرزا یگانہ۔ وہ دیکھ   میدان سخن کے مرد یکتا۔ وہ دیکھ

جذبات پیدا ہو جائیں جو شعر کہتے وقت شاعر کے دل و دماغ میں موجزن تھے۔ وقار صاحب کی یہ ابتدائی کوشش ہے تاہم انھیں اپنے مقصد میں خاصی کامیابی ہوئی ہے اگر انھوں نے مشق جاری رکھی تو کیا عجب ہے کہ ہندوستان کی ترقی کی کوششوں میں اُن کی نظمیں تیز رفتاری اور ہندوستانیوں کے دلوں میں شجاعت و شہامت کا وہ جذبہ پیدا کر دیں جس کی انھیں سخت ضرورت ہے

اس مجموعے میں کل تیرہ نظمیں ہیں۔ جنگ۔ سپاہی کا معبد، سپاہی اپنے بچپن میں۔ سپاہی کا خواب۔ میدان جنگ میں صبح وغیرہ۔ شروع میں جناب برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا پُر مغز دیباچہ ہے جس میں انھوں نے ان نظموں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ کتاب مجلد ہے۔ جلد پر سنہرے حرفوں میں کتاب اور مصنف کا نام چھپا ہے۔

مصطفیٰ کمال پاشا۔ از جناب سید اشفاق حسین صاحب ایم اے۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر قیمت عہ ملنے کا پتہ شیران اسلام بک ڈپو منگلور ضلع سہارنپور۔

جناب سید اشفاق حسین صاحب بچوں کے لئے شیران اسلام کے عنوان سے نامور مجاہدین و شاہان اسلام کی سوانحمریاں مرتب کر رہے ہیں یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اس میں انھوں نے آتا ترک غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے حالات شرح و بسط سے بیان کئے ہیں اسی سلسلے میں ترکی کے موجودہ انقلاب کی تاریخ بھی آگئی ہے۔ کتاب کا انداز بیان بچوں کے لئے بہت مناسب ہے۔ زبان آسان اور دلچسپ ہے۔ البتہ کہیں کہیں خطابت زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر سنہرے حرفوں میں کتاب اور مصنف کا نام ہے۔

رسائل

طلوع اسلام۔ ایڈیٹر سید نذیر نیازی تقطیع رسالہ جامعہ کی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ اچھا کتابت

اُردو زبان میں رسالوں کی بہتات ہے اور نئے نئے رسائل مختلف مقاصد کے ماتحت برابر نکل رہے ہیں لیکن اب تک سوائے مرحوم "صبح امید" کے کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا تھا جو تمام تر سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مباحث پر مشتمل ہو صبح امید بھی اعتدال پسند سیاستدانوں کا ترجمان تھا۔ اس کے مضامین بھی عام دلچسپی کے نہیں ہوتے تھے۔ رسالہ ساربان اس اہم ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اگر وہ اپنے مقصد پر سختی سے قائم رہے اور عام رو میں نہ بہہ جائے۔ اس وقت اس امر کی شدید احتیاج ہے کہ ہندوستان کے عام لوگوں کو اہم سیاسی مسائل کی تعلیم دی جائے اور ماہرین سیاست سے آسان زبان اور سہل انداز بیان میں مضامین لکھوائے جائیں۔ ساربان کے زیر نظر نمبر میں جو جلد کا پہلا نمبر ہے اکثر مضامین سیاسی مباحث پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ہندوستانی باشندوں سے خطاب۔ جدید اصلاحات پر سرسری نظر۔ کانگرس اور وزارتیں۔ ہندوستان کا پروپگنڈا دوسرے ملکوں میں۔ فلپائن کی تحریک آزادی۔ قضیہ اٹلی و ابی سینیا وغیرہ ان کے علاوہ جو مضامین ہیں وہ بھی عمرانی، اقتصادی اور اصلاحی ہیں۔ تنقید و تبصرے کے ماتحت رواں واقعات پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی رسالہ نہایت مفید اور ہر طرح حوصلہ افزائی کا مستحق ہے

انیس - ایڈیٹر جناب شرار بی اے۔ سائز جامعہ کا لکھائی چھپائی اوسط درجے کی۔ کاغذ معمولی۔
حجم ۴۰ صفحے قیمت سالانہ ہے طالب علموں سے صرف دو روپئے۔ مقام اشاعت:
ایلچ پور سٹی۔ برار

یہ رسالہ ایلچ پور برار سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا آٹھواں نمبر ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب رسالے کی ترتیب اور مضامین کی فراہمی میں بہت محنت اور توجہ سے کام لیتے ہیں، اس نمبر میں علاوہ مقامی مضمون نگاروں کے جناب رشید صدیقی صاحب علیگڑھ جناب اسرائیل احمد خاں صاحب اور حضرت جوش ملیح آبادی کے نام بھی ہیں۔ اس نواح میں ابتک کوئی معقول رسالہ نہ تھا شرار صاحب نے انیس نکال کر اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

دُنیا کی رفتار

چین، جاپان اور دول مغرب | شخصیت انفرادی کی طرح شخصیت قومی بھی اپنے بقا و نمو کے لئے قوت کی محتاج ہوتی ہے۔ اور جب یہ قوت نہیں رہتی تو اس کے اجزاء ترکیبی میں انحطاط اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ان چیزوں کی طرح جن کے عمل میں کسی مرکزی ارادہ کی کارفرمائی نہیں ہوتی اور دوسروں کا آلۂ کار بن کر رہ جاتی ہیں، تلاطم مقاصد میں ایک بے مقصد بے شعور تنکا!

یہی وجہ تو ہے کہ آج چین کا مسئلہ حبش کی طرح دراصل ان شکاریوں میں باہمی سمجھوتہ یا تکرار کا مسئلہ ہے جو اسے اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ یعنی چین کا مسئلہ روس اور جاپان کا مسئلہ ہے، انگلستان اور جاپان کا مسئلہ ہے، اگر نہیں ہے تو چین کا مسئلہ نہیں ہے!

قدیم تاریخ کے دُہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ۱۹۲۲ء سے دول مغرب اور امریکہ نے "چین کے مسئلے" کو یوں طے کر رکھا تھا کہ چین کی خود مختاری کی ضمانت ہونی چاہئے، اور بحر الکاہل میں قوتوں کا ایک ایسا توازن قائم کرنا چاہئے کہ کسی کا پلہ بھاری نہ ہو اور بحری قوت میں ایک مقررہ تناسب کو تسلیم کر لیں، خصوصاً جاپان، امریکہ اور برطانیہ کے بیڑوں کی قوت میں ایک خاص تناسب مقرر کر دیا جائے۔ ۱۹۳۱ء تک مسئلہ کا یہ حل کارگر ثابت ہوا لیکن ۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں جاپان نے اس سیاست کا آغاز کیا جس سے اس حل کی ساری کائنات دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ چین کی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ بحر الکاہل میں توازن قوی کا۔ اب دول مغرب اگر اس مسئلہ کا کوئی حل سوچنا چاہیں تو انھیں جاپان سے معاملہ کرنا ہوگا۔ کہ اب چین کا مسئلہ دراصل جاپان کا مسئلہ ہے۔

چین کا علاقہ چھین کر جاپان نے اپنی قیادت میں منچوکو کی ریاست قائم کر دی جس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ مشرق بعید میں روسی اثر کو ایک ضرب کاری لگی۔ روس کی مشرقی توسیع کے مقابلے

اور امریکہ سے ساتھ مساویانہ حیثیت سے تعاون پر تیار نہیں۔ انھیں پہلے جاپان کی قیادت کو تسلیم کرنا ہوگا۔

اور جاپانیوں کا یہ دعویٰ محض شیخی ہی شیخی نہیں ہے۔ وہ اس کی تدبیر بھی کر رہے ہیں اور کامیابی سے کر رہے ہیں، انھوں نے چین کی طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھایا ہے اور تمام صوبوں میں ایسی صورت قائم کرنے کی تدبیریں کی ہیں جو جاپان کو ہر طرح کی معاشی اور سیاسی مراعات دینے پر مجبور ہوں اور اتنی مضبوط نہ ہوں کہ جاپان کی قوت کا مقابلہ کر سکیں۔ وہ چین میں مرکزی حکومت کو کمزور کر کے صوبوں کی حکومتوں کو اپنے اثر میں لینا چاہتا ہے۔ یہی اس نے شمالی جاپان میں کیا ہے۔ فی الحال تو وہ شمالی اور وسطی چین میں اسی قسم کا بالواسطہ تسلط چاہتا ہے۔ "فی الحال" ہم نے دانستہ لکھا ہے ممکن ہے کہ اگر اس تدبیر سے جاپانی اغراض پوری طرح حاصل نہ ہو سکیں تو بلاواسطہ تسلط کا مسئلہ بھی سامنے آئے۔

چین کے شمالی صوبوں میں جاپان کی یہ تدبیر بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ جنوبی چین میں جاپان کا اثر کم ہے لیکن پھر بھی فارموسا کے بالمقابل فوکین میں اس کے قدم جمے ہوئے ہیں۔ کینٹن اور کوانگسی کے جنوبی صوبوں میں بھی اس کے کارندے مصروف ہیں اور ضرورت پڑے تو چانگ کائی شک کی قوت کو بہت کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سب باتوں سے چین میں اس قدر غصہ اور ناراضی ہوگی کہ یہ تدبیریں زیادہ عرصے تک کامیاب نہ ہو سکیں گی وہ غالباً حقائق سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ چین میں تعلیم یافتہ طبقے کا بہت بڑا حصہ جاپانی اثر میں ہے۔ ان لوگوں نے جاپانی مدارس میں پڑھا ہے، جاپانی بے تکلفی سے بولتے ہیں اور انھیں جاپان کے اثر بڑھنے سے شخصی فوائد کی توقع ہے۔ ان لوگوں سے جاپان کو بڑی مدد ملی ہے اور امریکہ اور مغربی ممالک میں پڑھے ہوئے لوگوں کا اثر انھوں نے بہت کچھ کم کر دیا ہے۔ اور آج بھی باوجود جاپان کی ظالمانہ سیاست کے پہلے سے بہت زیادہ تعداد چینی نوجوانوں کی جاپانی مدارس میں جا رہی ہے اور جاپان ان کے لئے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچا رہا ہے اور اس

ات کے قرائن نہایت قوی ہیں کہ جاپان اکثر چینی صوبوں میں اپنے موافق حکومتیں قائم کرا سکے گا۔ اور اندرونی سیاست پر اس اثر کے باعث چان کائی شک پر ایسا دباؤ ڈال سکے گا کہ وہ کسی طرح ہاتھ سے نکل سکے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ خود چان کائی شک کی تعلیم بھی جاپانی ہی ہے۔

چنانچہ اس دباؤ نے ۱۹۳۲ء میں چین کے نظام محاصل کو بدلوا کر جاپان کے موافق کر لیا۔ اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے آئندہ چینی محاصل کی نگرانی پر ایک برطانوی افسر کی جگہ کوئی جاپانی مامور ہو۔ اس سے یہ کام لیا جا سکتا ہے اور غالباً لیا جائے گا کہ برطانیہ اور امریکہ اور دوسری مغربی قوموں کو چین معاشی مراعات دینے سے انکار کرے۔

اس صورت حال کو انگریزوں نے سب سے پہلے سمجھا ہے اور وہ اگر ایک طرف جاپان کے مقابلے کے لئے اپنی قوت کے بڑھانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں تو دوسری طرف چین میں اپنے موجودہ سرمایہ کی حفاظت اور اپنی موجودہ تجارت کے قیام کے لئے جاپان سے سمجھوتے کی فکر میں بھی ہیں۔ انگلستان کا نہایت بااثر سیاسی پرچہ راؤنڈ ٹیبل اپنی ستمبر کی اشاعت میں لکھتا ہے "جاپان کے مقابلے میں اس وقت جو بھی بحری اور بری انتظامات کرنے ہوں اس میں شک نہیں کہ مسئلہ چین کا کوئی مستقل حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہماری عام سیاست سے یہ نتیجہ نکل پائے کہ بحرالکاہل کے علاقے میں ہم جاپان سے ان مشکلات کے باب میں جو ہمارے اور جاپان کے تعلقات کو برابر کشیدہ کرتی رہتی ہیں کوئی مفاہمت کر لیں۔"

دنیا کی یہ سب سے قوی سلطنت جاپان سے کیوں مفاہمت چاہتی ہے؟ اس لئے کہ جیسا ہم نے اوپر بتلایا جاپان نے اپنی سیاست سے چین کو بالکل اپنا دست نگر بنا لیا ہے اور برطانیہ نے اس ملک میں مدتوں کی کوشش سے اپنی تجارت قائم کی ہے اور سرمایہ لگایا ہے۔ چین میں اس وقت سالانہ کوئی ۲۰ کروڑ روپیہ کا انگریزی مال جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ کوئی ڈھائی ارب روپیہ سے بھی زیادہ انگریزی سرمایہ چین میں لگا ہوا ہے۔ چین کی موجودہ معاشی

حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اشیاء صرف کی کھپت ایک عرصے تک نہ بڑھ سکے گی۔ لیکن اشیاء دولت آفریں کی مانگ زیادہ ہوگی۔ یعنی سرمایہ لگانے کے امکانات اور بڑھیں گے لیکن ایسا کرنے میں جاپان سے تصادم ہوگا۔ جاپان کسی دوسرے ملک سے چین میں سرمایہ کی درآمد کو اس لئے شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے کہ غالباً یہ معاشی اثر اس کے خلاف کام میں لایا جائیگا۔ چنانچہ جاپان کوشش کر رہا ہے کہ چین کو سب سرمایہ خود ہی فراہم کرے۔ اور یہاں تک اس میں ساعی ہے کہ خود دوسرے ملکوں سے سرمایہ حاصل کر کے اسے چین میں لگا رہا ہے، لیکن دوسروں کو براہ راست وہاں سرمایہ نہیں لگانے دیتا۔ جاپان کے پاس خود بھی تو غیر محدود سرمایہ نہیں ہے۔

اس حقیقت پر انگریز شاطران سیاست جاپان سے سمجھوتے کی بنا رکھنا چاہتے ہیں چنانچہ راونڈ ٹیبل جو ان معاملات میں سب سے بہتر معلومات رکھنے والا جریدہ ہے، لکھتا ہے:۔

"جاپان کو خود جلد یا دیر میں پردیسی سرمایہ درکار ہوگا۔ اپنی بڑھتی ہوئی تجارت خارجہ کو مالی مدد پہنچانے کے لئے اسے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ منچوریا کے لئے سرمایہ چاہئے اور جوں جوں چین کے وسائل پر اس کا انحصار بڑے گا تو ان کو ترقی دینے کے لئے بھی سرمایہ مطلوب ہوگا۔ پھر جب دنیا کی دوسری منڈیوں میں اس کے مال کی کھپت آخری منزل تک ترقی کر چکے گی تو یہ چین ہی میں اپنی صنعتی پیداوار کے لئے منڈی تلاش کرے گا اور اس کے لئے چینی معیشت کو ترقی دینے کی ضرورت ہوگی اور یہ اسی طرح ممکن ہو کہ چین میں سرمایہ لگایا جائے۔ لہٰذا آخر کار چین میں ہمارے اور جاپان کے مقاصد میں اختلاف کی جگہ یک جہتی سی پائی جائے گی۔

اسلئے ۱۹۳۶ء کے لئے چین میں ہمارا مقصد صاف صاف یہ ہونا چاہئے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ چینی تعاون اور مناسب تحفظ کے ساتھ ساتھ مغربی سرمایہ بھی جاپان کی مدد اور رضامندی سے چین کے وسائل کو ترقی دینے میں کام آئے۔ . . جاپان کی چین میں دوہری حیثیت ہے۔ ایشیا کے قائد کی اور کاروبار میں شریک کی۔ ہمارا فائدہ اس میں ہے کہ اس کی دوسری حیثیت کو تقویت پہنچائیں، جہاں تک حفاظت سے ایسا ممکن ہو اپنے تجارتی اغراض کو جاپان کے تجارتی اغراض سے

مطابق کریں اور اسے یقین دلائیں کہ خود اس کے لئے سب سے بہتر سیاست یہی ہے کہ وہ شنگھائی کے عظیم الشان تجارتی عمارت میں مغرب کو اپنا ساتھی بنائے اور چینیوں کی اپنے ملک کو ترقی دینے میں مدد کرے۔"

قوموں اور ملکوں کی تقسیم پر کس سکون اور اطمینان قلب کے ساتھ اظہار خیال ممکن ہے!!

ایک چینی اخبار سے اقتباس | اس سلسلے میں نین تسین کے ایک مشہور چینی اخبار آئی شی پاؤ سے ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"کئی سال سے جاپان اور برطانیہ کے تعلقات کچھ مذبذب سے ہیں اور ظاہر تو یہ ہو رہا ہے کہ مخالفت کے اسباب موافقت کے امکانات سے زیادہ ہیں۔ لیکن یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ طرفین اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ چنانچہ جاپان کے وزیر خارجہ نے اس اہم مسئلہ پر خاص توجہ شروع کر دی ہے۔ لندن کے جاپانی سفیر مسٹر تسودیرا کو جاپان بلایا گیا ہے تاکہ ان کی مدد سے تعلقات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کی مستقل تدبیر نکالی جائے۔ لندن میں جو جاپانی مشیر تجارتی رہتا ہے وہ بھی ٹوکیو بلایا گیا ہے اور خیال ہے کہ ان کوششوں میں اچھی کامیابی ہوگی۔

سر لیتھ راس جو چین تشریف لائے ہیں کہ یہاں کے معاشی حالات کا مطالعہ فرمائیں، ان کی تشریف آوری بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ براہ راست چین تشریف لائے۔ راہ میں امریکہ میں قیام فرمایا گئے تو وہ ہفتے کے لئے جاپان گئے تاکہ وہاں کے عہدیدار اور ساہوکاروں سے ان خیالات پر مبادلہ خیال کر سکیں جن میں انگلستان اور جاپان کے اغراض مشترک ہیں۔

برطانیہ کی اس کوشش کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ مشرق بعید میں اپنی تجارت اور اپنی نوآبادیوں کی حفاظت چاہتا ہے اور خصوصاً شمالی چین میں اپنے معاشی اور تجارتی مفاد کو محفوظ کرنے کی فکر میں ہے۔ اور اس کے لئے جاپان ہی سے صلاح و مشورہ ضروری ہے۔ اصلی سوال

یہ ہے کہ جاپان برطانیہ سے کیا مانگتا ہے اور آیا برطانیہ اس مطالبے کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں ؟"

پھر ٹوکیو کے مراسلات اور اخباروں کے مضامین سے اقتباسات دے کر یہ جریدہ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ جاپان برطانیہ سے یہ مطالبہ کرے گا کہ وہ مشرقی ایشیا میں جاپان کی مخصوص حیثیت کو باضابطہ تسلیم کرے۔ اور وہاں اپنے مفاد کی پیچ بس اس حد تک کرے جہاں تک کہ جاپانی تعاون کے ساتھ ممکن ہو۔ مزید براں مشرقی ایشیا کی منڈیوں کو دوسری قوموں کے لئے کھلا رکھنے کے معاوضے میں جاپان برطانیہ سے یہ چاہے گا کہ جاپانیوں کو برطانوی نوآبادیوں میں ہجرت کر کے جانے کا اور اس کے تجارتی مال کو ان کی منڈیوں میں مقابلے کا حق حاصل ہو۔

اس جریدہ کے خیال میں انگلستان پہلے مطالبے کو مان لے گا۔ اس لئے کہ انگلستان کی سیاست کی بنا حقائق پر ہے اور واقعات کا تقاضا یہی ہے کہ اسے مانا جائے کوئی اور چارہ ہی نہیں جاپان کو جو حیثیت حاصل ہے وہ تو حاصل ہے ہی، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن دوسرے مطالبے کی نوعیت اور ہے۔ اس باب میں برطانیہ کی نوآبادیاں اس کو ردکیں گی اور خود اس کے معاشی اغراض اسے تسلیم کرنے سے باز رکھیں گے جاپانی۔ برطانی تعلقات کو استوار کرنے میں یہی دشواری ہے اور اسی وجہ سے اس باب میں زیادہ امیدیں نہیں باندھی جا سکتیں لیکن اگر فرض کیجئے کہ یہ سمجھوتہ ہو گیا تو بھی اس کے معنی چینی نقطۂ نظر سے یہ ہوں گے کہ شمالی چین پر معاشی تسلط میں جاپان کے ساتھ اور بھی شریک ہو جائیں گے اور اس کا اقتدار بلا شرکت غیرے نہ ہوگا۔ مگر اس سے چین کو فائدہ ؟"

اپنے نوشتۂ تقدیر کو بھی آدمی کس سکون و رضا سے پڑھ سکتا ہے ؟!

جنش اور جمعیۃ اقوام | جمعیۃ اقوام نے اپنے قیام کے بعد پہلی مرتبہ سیاست کی حقیقی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تھی، اور ہر چند کہ اٹلی کے مقابلے میں برطانیہ کی انصاف پسندی کے محرکات باطنی دنیا کی نظروں سے بالکل چھپے ہوئے نہ تھے مگر پھر بھی تعجب تھا کہ انگلستان کی قیادت میں

NINETEENTH CENTURY

ناقابلِ عمل بتلاتے ہیں کہ "حبش جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کا رقبہ چھیننے تک کے لئے بھی ایک غاصبانہ جنگ کی ضرورت ہو" نوآبادیوں کو جمیعۃ اقوام کے سپرد کر دینے کا بھی امکان نہیں۔ سر ہربرٹ کے نزدیک حل یہ ہے کہ بجائے سیاسی اور ملکی حل کے معاشی حل کی صورت نکالی جائے۔ اس لئے کہ مسئلہ دراصل "کافی غذا اور صنعت کے لئے کافی خام اجناس کا مسئلہ ہے۔ تاکہ سب ملکوں کی آبادی یہی نہیں کہ زندہ رہ سکے بلکہ ترقی بھی کر سکے . . . . . . دنیا اس وقت غذا اور اجناس خام سے پٹی پڑی ہے اور ان کی رسد میں اضافہ کے امکانات تو بے اندازہ ہیں۔ مشکل بس یہ ہے کہ کوئی کسی کو غذا اور اجناس خام بھیج نہیں دیتا جب تک اس کی قیمت ادا نہ کی جائے۔ اور ان کی قیمت زرِ رائج میں ادا نہیں کی جا سکتی جب تک کہ زرِ رائج کی مقدار اتنی نہ بڑھا دی جائے کہ اس اضافہ کی وجہ سے وہ بالکل بے قدر ہو جائے۔ صاف بات یہ ہے کہ ان کی قیمت اگر ادا ہو سکتی ہے تو دوسری اجناس سے یا خدمات سے، اور معاشی قومیت کے مسلک نے اجناس اور خدمات کے ادھر سے اُدھر جانے پر جان بوجھ کر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے۔ اور نتیجہ بھی بالکل صاف ہے یعنی ہماری کوشش کا خاص مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان پابندیوں کو ہٹایا یا یہ نہیں تو کم تو ضرور کیا جائے۔"

جب تک دنیا اور جمیعۃ اقوام سر ہربرٹ کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوں اٹلی تو "ناانصافی" کو مٹانے کے لئے "ناانصافی اور ظلم ہی کے پرانے نسخے کا استعمال کر رہا ہے اور اسے اس سے روکنے والے بھی "ناانصافیوں" کے وجود کو تسلیم کر کے اس نسخے کے استعمال کی مخالفت سے رفتہ رفتہ دست کش ہی ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

فروری [illegible]

جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا

ماہوار رسالہ

زیرادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ [illegible]　　مطبع جامعہ دہلی　　فی پرچہ [illegible]

پیامِ تعلیم

بچوں کا سب سے اچھا ماہانہ رسالہ

با تصویر، نئی ترتیب، نئی شان

اُردو کے تمام رسائل میں طلبہ کے لئے پیامِ تعلیم سے زیادہ مفید کوئی رسالہ نہیں، رسالہ کیا ہے ایک شفیق استاد ہے۔ جغرافیہ، تاریخ، سائنس کے مضامین اور اخلاقی پند و نصائح، کہانیوں، نظموں، معموں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جماعت میں جن مضامین سے لڑکے جی چراتے ہیں، پیامِ تعلیم میں خوشی سے پڑھتے ہیں۔

پیامِ تعلیم میں وہ تمام باتیں ہوتی ہیں، جن کی اسکول کے لڑکوں کو ضرورت ہے اس رسالہ کی یہی خوبی دیکھ کر ماہرینِ تعلیم نے اس کو اسکولوں کے لئے سرکاری طور پر خرید کیا ہے۔ اُردو کے عام گندے لٹریچر سے بچانے کے لئے اسے واحد رسالہ تجویز کیا ہے۔

چندہ سالانہ دو روپے آٹھ آنے، فی پرچہ ۴؍

منیجر "پیامِ تعلیم" - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی — پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد [illegible]	فروری ۱۹۳۶ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

دولت کے لئے انسانوں کی ضرورت کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے میکانی ترقیات کی وجہ سے بیشمار اشخاص بے کار ہوتے جارہے ہیں۔ معمولی کام کاج کرنے والے افراد کی اہمیت کم ہو رہی ہے مگر باینہمہ قسم اور مقدار دولت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کا نتیجہ دولت کی فراوانی اور عالمگیر بیکاری میں نمودار ہو رہا ہے۔ چنانچہ بجز صورت جنگ کے ہر ملک و ہر زمانے میں بیکاروں کی ہمیشہ ایک عظیم تعداد رہی ہے۔ زمانہ جدید میں کہیں کسی ملک میں بھی ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ صلح و امن کے زمانے میں تمام طلبگاران محنت کو کمائی کے معقول وسائل دستیاب رہے ہوں۔ جب وقتاً فوقتاً کساد بازاری مثل وبا کے پھیلنے لگتی ہے تو بے روزگاروں کی تعداد میں اور اضافہ ہوتا ہے اور مفلس، محتاج، فاقہ کش، پریشان افراد کی تعداد کروڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ خلقت انسانی کا یہ جم غفیر کیا زاید از ضرورت مخلوقات عالم میں نہیں شامل کیا جاسکتا؟ کیا بے روزگاروں کی اس عظیم تعداد کا بار کمانے والوں پر نہیں پڑ رہا ہے؟ کیا یہ لوگ حقیقت میں زاید آبادی میں شمار کئے جانے کے مستحق نہیں ہیں؟ اور کیا ان کا وجود بقیہ آبادی کے لئے بجائے سہارے کے بوجھ کے مماثل نہیں ہے؟

میکانی ماحول کے بدل جانے اور فطرت حالات میں تغیر پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسئلہ آبادی کی تحلیل کا دارومدار اب مقدار غذا پر نہیں رہا۔ لہذا عصر جدید میں تعداد آبادی کا تقابل مقدار دولت سے کرنا بے سود و بے معنی ہے۔ کیونکہ تاوقتیکہ لوگ برسر خدمت نہ ہوں اور کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ کماتے نہ ہوں ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس دولت سے مستفید ہوں۔ جو فی الوقت پیدا ہو رہی ہے یا بآسانی پیدا کی جاسکتی ہے۔ سرشت انسانی کی بدترین طینتوں میں وہ انتہائی خودغرضانہ ذہنیت ہے جس کی وجہ سے وہ نہ تو خود دولت سے مستفید ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو متمتع ہونے کا موقع دیتا ہے نہ تو خود اس کثیر دولت کو استعمال کرتا ہے اور نہ مفلسوں، محتاجوں، غریبوں، ننگوں، بھوکوں اور فاقہ کشوں کو اس کثیر دولت سے مفت فایدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ یہی سرشت انسانی ہے جو اپنے نفع کے لئے دوسروں کی مسرتوں کو ہی نہیں دوسروں کی زندگی کو بھی قربان کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔ اپنے عادات و اخلاق پر فخر کرنے والے اور مذہبیت و روحانیت پر ناز کرنے والے

ہندوستانیوں کا طرزِ عمل دیکھئے کہ انتہائی قحط اور پریشانی کے زمانے میں جبکہ لاکھوں مخلوقِ خدا چاول کے
دانے دانے اور روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کے لئے ترس رہی تھی وہ اپنی منڈیوں کا غلہ نفع کی خاطر بیرونی ملک کو
برآمد کر رہے تھے۔ چنانچہ معاشیاتِ ہند کے مسلّم الثبوت استاد رومیش چندر دت لکھتے ہیں:۔
"۱۸۷۷ء میں جب ہندوستان انیسویں صدی کے سخت ترین قحط کے بالکل قریب تھا اس نے
دوسرے سالوں کے مقابلہ میں زیادہ غلہ برآمد کیا" ۵۱

اسی طرح واڈیا اور جوشی نے اپنی مشترکہ تصنیف The Wealth of India
میں لکھا ہے کہ:۔

"تعجب کہ سینکڑوں اور ہزاروں آدمی فاقہ سے ایک صوبہ میں مر رہے تھے قریب کے صوبے
منوں گیہوں اور غلہ دنیا کے دوسرے حصوں کو برآمد کر رہے تھے" ۵۲

ہمیں اسی قسم کے انسانوں کی سرشت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسئلہ آبادی کی ماہیت
اور نوعیت پر غور کرنا چاہئے۔ لہٰذا پیدائشِ دولت کی آسانیوں سے مسئلہ آبادی نہیں حل ہو سکتا اور
صرف دولت کی فراوانی سے افلاس نہیں مٹ سکتا۔ آج اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیدا شدہ دولت
زیادہ سے زیادہ اشخاص کے درمیان تقسیم ہو اور تقسیمِ دولت کے لئے یہ لازمی ہے کہ پیدائشِ دولت میں
زیادہ سے زیادہ اشخاص شریک رہیں تاکہ انھیں اپنی محنت کا معاوضہ ملے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ میکانی ترقی
لوگوں کو پیدائشِ دولت میں شریک ہونے سے محروم کر رہی ہے اور موجودہ نظامِ معاشرت وسیاست کے
تحت انھیں مفت میں دولت ملنی محال ہے لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ تعداد آبادی اور ذرائع معاش یا
تعداد خدمات میں توازن رکھا جائے۔ چنانچہ جدید تحقیق کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اس

---

۵۱ R.C. Dutt: "The Economic History of India in the Victorian age"—Kegan Paul London, 5th edition p. 349.

۵۲ Wadia and Joshi: Wealth of India p. 277.

نظریہ پیش کیا ہے جسے انگریزی میں Optimum Theory of Population
کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ نظریہ موافق توازن آبادی کیا جا سکتا ہے۔

نظریۂ موافق توازن آبادی | نظریۂ موافق توازن آبادی سے مراد یہ ہے کہ ذرائع معاش اور تعداد آبادی میں موافق تناسب رہنا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر ملک میں حقیقی حالات کے تحت آبادی کی ایک خاص تعداد ہی انسانوں کے شایانِ شان معقول معیار آرام پر زندگی گذار سکتی ہے، کیوں کہ ہر ملک و ہر زمانے میں حقیقی حالات کی وجہ سے ذرائع معاش مقررہ ومعینہ ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر ملک کی عمرانی و معاشی قومی وسیاسی، صنعتی وزراعتی، تجارتی وکاروباری فنی وتعلیمی، تمدنی ومعاشی حالت وحیثیت، قابلیت واستطاعت کے موافق اس ملک میں ایک خاص تعداد آبادی ہی کو معقول معیار زندگی پر پالنے کی صلاحیت رہتی ہے۔ اگر ملک کی آبادی اس حد وانتہا کو نہ پہنچ جائے تو ملک میں فلاح وبہبودی کے آثار جا بجا نظر آئیں گے کیوں کہ آبادی کی تعداد سے زیادہ ذرائع معاش کی تعداد ہوگی۔ اسی طرح اگر ذرائع معاش کے اضافے کے ساتھ ساتھ آبادی میں بھی اضافہ ہو تو آبادی اور ذرائع معاش میں موافق توازن رہے گا جس کا نتیجہ عام مرفہ الحالی وخوشحالی ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ذرائع معاش سے زیادہ روزگار کے متلاشی افراد ہوں اور ان طلبگاران روزگار کی تعداد میں تیز رفتاری سے اضافہ ہوتا جائے تو نتیجہ پریشان حالی سراسیمگی، غربت وافلاس ہوگا۔

اس تشریح سے ظاہر ہے کہ ہر ملک میں ایک خاص تعداد افراد کے پالنے کی سکت ہوتی ہے۔ اگر حالات بدل جائیں تو یہ تعداد بھی حالات کے موافقت یا عدم موافقت کی وجہ سے زیادہ یا کم ہو جائے گی۔ مثلاً اگر سیاسی اندھیر کے بجائے ملکی خوش انتظامی قائم ہو جائے مصلحین معاشرت کی کوششوں کی وجہ سے ملک کی عمرانی زندگی معاشی جدوجہد کے لئے فیض رساں ہو جائے، راجا اور پرجا، رعایا اور عہدیدار ایک دوسرے کے بہی خواہ ہو جائیں، عام تعلیم کے علاوہ صنعتی وزراعتی تجارتی وکاروباری تعلیم کا وسیع پیمانے پر انتظام کر دیا جائے، صنعت وحرفت کی سرپرستی معاشرت وسلطنت کرنے لگیں، ملک میں ایسے سپوت پیدا ہوں جن کی رہنمائی قوم تسلیم کرے اور ان کے ہدایات پر عمل پیرا ہو تو لازماً ملک کی

عام استطاعت بڑھ جائے گی اور وہ معقول معیار آسائش پر زیادہ تعداد میں آبادی کو پال سکے گا یعنی ملک کی
متوازن آبادی (Optimum Population) بڑھ جائے گی برخلاف اُسی ملک
میں سیاسی بدنظمی شروع ہو جائے مصلحین معاشرت کا فقدان ہو، رہبران کامل عنقا ہو جائیں،
سپوتوں کے بجائے کپوت پیدا ہونے لگیں، خود غرضیاں حد اعتدال سے تجاوز کر جائیں سلطنت معاشی
جد و جہد میں بیجا مداخلت کرنے لگے، صنعت و حرفت کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہیں، صنعتی و زراعتی
مدرسے بند کر دئے جائیں، پیشہ اور کاروبار کی تعلیم کا معقول انتظام نہ رہے اور عام تعلیم بھی ناقص ہو تو اس
ملک میں زوال کے آثار جا بجا نظر آئیں گے، ذرائع معاش کم ہو جائیں گے اور اس ملک کی آبادی کو معقول سطح
آرام پر پالنے والی صلاحیت کم ہو جائے گی۔ اصطلاحی زبان میں اسی مفہوم کو یوں ادا کیا جاتا ہے کہ اس
ملک کی متوازن آبادی Optimum Population کم ہو جائے گی۔

نظریہ موافق توازن آبادی کو بخوبی سمجھنے کے لئے موجودہ زمانے کے چار مختلف النوع ممالک کی
حالت پر غور کیجئے۔ ایک طرف انگلستان اور جاپان اور دوسری طرف چین و ہندوستان۔

انگلستان اور جاپان معاشی نقطۂ نظر سے بجا طور پر ترقی یافتہ کہلاتے ہیں کیوں کہ علاوہ
سیاسی خوش انتظامی و ملکی آزادی کے ان ملکوں کی عمرانی و معاشرتی کاروباری و تجارتی، زراعتی
و صنعتی، تمدنی و معاشی حالت باوجود کئی خرابیوں اور برائیوں کے بحیثیت مجموعی اطمینان بخش اور نیم ترقی
یافتہ ممالک کے لئے قابل رشک ہے۔ خصوصاً تعلیمی حالت بہت اچھی ہے علاوہ ابتدائی جبری تعلیم کے
ہر قسم کی تعلیم کا معقول انتظام ہے اور لکھو کھا تعلیم گاہوں اور درس گاہوں میں قوم کو تجارتی، زراعتی، کاروباری،
پیشہ وری صنعتی یا فنی تعلیم سے مستفید ہونے کا موقع حاصل ہے اور ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب
و تحریص کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اقبال و خوش نصیبی سے ایسے افراد پیدا ہوتے جاتے ہیں جنہیں قومی ترقی سے
بھی ہمدردی ہوتی ہے اور وہ اپنے اپنے کاموں میں مستغرق ہونے کے باوجود قوم کی تربیت کے لئے
وقت اور موقع ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اور اپنی کوشش سے لاکھوں کو فیض پہنچاتے ہیں۔ کسی کو علم و ادب
کی دھن ہے، کوئی تحقیق و تفتیش میں بے خود ہے، کسی کو کاروبار میں انقلاب پیدا کرنے کی خواہش ہے، کوئی

اپنی جذبۂ بیانی اور سحر بیانی سے قوم کو تیز تر رفتار سے ترقی کرنے کی ہمت دلا رہا ہے، کوئی بڑے بڑے بنک قایم کر رہا ہے کسی کو زراعت سے دلبستگی ہے اور کسی کو نوآبادیات کی ترقی کا شوق ہے، مگر باوجود ان گوناگوں کاموں اور مختلف النوع خدمتوں کے بیشتر کر خصوصیت عام ہے کہ سب کے دل میں قوم کی سچی ہمدردی موجزن ہے۔ غرضکہ ہر ایک اپنی اپنی دُھن میں مست ہے اور اپنی انتہائی صلاحیت سے ہر ممکن طریقہ پر علم و عمل کے ذرایع ملک کی نفع بخش خدمت کرنے میں مگن ہے۔

برخلاف ان ممالک کے چین و ہندوستان کی حالت پر غور کیجئے۔ دونوں محکوم۔ ایک ظاہراً آزاد مگر باوجود ظاہراً آزادی کے حقیقی غلام۔ دونوں غافل دونوں جاہل اور دونوں کاہل! نہ حکومت رعایا کی رفیق و مددگار نہ رعایا حکومت کی ہمدرد و بہی خواہ۔ آپس میں لڑائی، حکومت سے لڑائی، بھائی بھائی سے لڑائی۔ نہ خلوص نہ استقلال نہ ہمت نہ کمال۔ اتحاد و اتفاق باہمی ہمدردی و یکجہتی اولوالعزمی اور جفاکشی بحیثیت قومی خصوصیات کے مفقود ہیں شاذ و نادر ہی ہیں ایسے لوگ ملتے ہیں جن میں فرض شناسی کا جوہر ہو ورنہ عام طور پر لاپرواہی اور بے حسی سب پر طاری ہے۔ ایسی صورت میں ان ممالک کی آبادی اگرچہ ۴۰ کروڑ کی حد سے تجاوز کر گئی ہے مگر حقیقت میں یہ ممالک معقول معیار آرام پر ۱ کروڑ کو بھی نہیں پال سکتے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ اگرچہ ہندوستان کی حقیقی آبادی ۳۵ کروڑ ہے مگر اس کی متوازن آبادی فی الحال موجودہ حالات کا اعتبار کرتے ہوئے صرف ۵ کروڑ تصور کی جا سکتی ہے۔ محض اس لئے کہ چین اور ہندوستان کی حقیقی آبادی موافق توازن آبادی کی حد سے تجاوز کر چکی ہے ان ملکوں میں بیماریوں اور وباؤں کی کثرت ہے، محتاجی اور مفلسی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور غربت و فاقہ کشی کی وہ شدت و وسعت ہے کہ اس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہیں ملتی! شرم و غیرت سے، ندامت و خجالت سے ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ باوجود کئی ہزار سالہ مشرقی تہذیب و تمدن کے اور باوجود صدیوں کی مغربی حکومت کے آج ہندوستان دنیا کا مفلس ترین ملک ہے اور ذرایع معاش کی ایسی قلت ہے کہ اگر سب کو معقول معیار آرام پر زندگی گذارنے کا موقع ملے تو آج ہندوستان کی "متوازن" آبادی ۵ کروڑ کے لگ بھگ نظر آئے گی حالانکہ حقیقتاً یہاں کی آبادی ۳۵ کروڑ سے زاید ہے۔ تو کیا اس کے معنے یہ ہوئے کہ ہندوستان میں کثرتِ آبادی ہے اور یہ ملک

کثیر الآباد ہے جو مغربی علما اور انگریز حکام کی اکثریت اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان کثیر الآباد
ملک ہے مگر اس خیال کی تردید کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ ہندوستان میں توسیع کاشت اور ترقی صنعت
کے بے شمار امکانات ہیں۔ ساتھ ہی ہندوستان کی کثرت آبادی سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ
بڈھوں، اپاہجوں اور معذوروں کے علاوہ ہندوستان کے کروڑہا افراد محتاجی و مفلسی میں مبتلا ہیں اور لاکھوں
بے روزگار پائے جاتے ہیں۔ پھر کیا تعجب اگر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ہندوستان کثیر الآباد ملک ہے اور کثرت
آبادی کے سبب غربت و ناداری کا دور دورہ ہے جس کا نتیجہ بیماریوں اور وباؤں کی کثرت، اور فاقوں اور قحطوں
کی وسعت و شدت میں نمودار ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ اس سوال کے جواب میں کہ آیا ہندوستان کثیر الآباد
ہے اقرار و انکار دونوں ناممکن ہیں۔ اس کا خاطر خواہ جواب اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جبکہ جدید تحقیق
کی روشنی میں کثرت آبادی کا مفہوم واضح کیا جائے۔

کثرت آبادی۔ عمرانی تجزیہ و تشریح

کثرت آبادی کے مفہوم کے متعلق جو عمرانیاتی تحقیق ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے
کہ کثرت آبادی کی دو قسمیں ممکن ہیں جن کو مطلق کثرت آبادی اور اضافی کثرت آبادی
کہا گیا ہے۔ اور اس تشریح کے بموجب وہی ملک مطلق معنے میں کثیر الآباد کہا جا سکتا ہے جو باوجود ممکن
سیاسی خوش انتظامی اور ممکن بہترین معاشی نظام کے اتنے ذرائع معاش فراہم نہ کر سکے جو تمام آبادی کے
لئے کافی ہوں یعنی یہ کہ تمام پیدائش دولت کے طریقے اختیار کرنے، تمام قدرتی دولت کے ذرائع سے
استفادہ کرنے اور تمام معلوم شدہ دریافت کردہ طریقوں کو منطبق کرنے اور انسانوں کی انتہائی اہلیت کے
مطابق بہترین تعلیم اور حکومت کا معقول ترین انتظام کرنے کے باوجود بھی اگر کسی ملک میں اتنی دولت نہ پیدا
کی جا سکے جو تمام آبادی کے لئے کافی ہو تب کہیں ہم اس ملک کو مطلق معنے میں کثیر الآباد کہیں گے ان ممکن بہترین
حالات کے تحت میں جب موجودہ آبادی کے لئے ذرائع معاش ناکافی ہوں اور یہ زاید آبادی کسی طرح بھی
پیدا آور کام نہ کر سکے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں مطلق کثرت آبادی ہے۔ صحرائے اعظم میں بسنے والی آبادی
کی غربت کا بڑا راز یہ معاشی جغرافیائی حقیقت ہے کہ کسی طرح بھی اس صحرائے اعظم کو ایک سرسبز و شاداب
ملک میں نہیں بدلا جا سکتا۔ کم از کم انسانی عقل و فراست سے یہ باہر ہے اور انسانوں کا ذخیرۂ معلومات اس

قسم کا کرشمہ کرنے سے فی الحال قاصر ہے کیونکہ ابھی نوع انسان کو کوئی ایسی ترکیب معلوم نہیں جس سے صحارا ڈیزرٹ مثل شمالی ہندوستان کے زرخیز ہو جائے اور اسی طرح وہاں کروڑوں کی تعداد میں انسانی مخلوق آباد ہو سکے۔ اسی طرح وہ ممالک جہاں قدرتی خزانوں کے دفینے موجود نہ ہوں، جہاں قیمتی دھاتیں مفقود اور مفید دھاتوں کی کانیں معدوم ہوں صنعتی ترقی سے قدرتی طور پر محروم کر دئے گئے ہیں اور کبھی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ کسی طرح بھی بہت زیادہ ذرائع معاش مہیا کر سکیں گے قدرتی مجبوریوں کے آگے عقل انسانی عاجز آجاتی ہے معاشی موانعات کے سامنے فراست بشری قاصر ہو جاتی ہے اسے اپنی مجبوری و بے بسی کا دل شکن احساس ہوتا ہے اور اسے اپنی بے بضاعتی و بے اختیاری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ مجبوری و بے بسی، بے بضاعتی و بے اختیاری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ قدرتی حالات یک لخت خلاف ہوں اور بہتری کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ بہت کم حصہائے ممالک ایسے ہیں جہاں قدرتی موانعات اور معاشی جغرافیائی خصوصیات کی وجہ سے توسیع زراعت و ترقی صنعت و حرفت قطعی طور پر ناممکن ہو۔ یہ تو ہم باور کر سکتے ہیں کہ قطبین کے قرب و جوار کی وسیع زمینوں سے انسان فی الحال متمتع نہیں ہو سکتا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ چین سے غربت، ایران سے افلاس اور ہندوستان سے محتاجی معاشی جغرافیائی اسباب کی بنا پر دور نہیں کی جا سکتی کیونکہ مثل افریقہ اور امریکہ کے یورپ اور ایشیا کے اکثر حصوں میں ترقی صنعت اور توسیع زراعت کے وسیع امکانات ہیں کم از کم معاشی جغرافیائی خصوصیات ایسی نہیں جو ترقی میں سد راہ ہوں لہذا ان ممالک میں یا جہاں افراد کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے یا جماعتوں کی غلط کاریوں اور نادانیوں کے سبب سے اقوام کی بدعقلی اور بدنظمی کی بنا پر کافی ذرائع معاش مہیا نہ کئے جا سکتے ہوں اور آبادی کی ایک کثیر تعداد فلاکت و ناداری، مفلسی و محتاجی تہیدستی و فاقہ کشی میں مبتلا رہتی ہو۔ صرف اضافی کثرت آبادی پائی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ممالک صرف اضافی معنے میں کثیر الآباد ہیں۔

کثرت آبادی کی اس تقسیم سے واقف ہونے کے بعد اب ہم بآسانی اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ ہندوستان کثیر الآباد ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان مطلق معنی

بہت کثیر الآباد نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں اضافی کثرت آبادی پائی جاتی ہے کیوں کہ ہندوستان میں اب
بھی توسیع زراعت کے متعدد ذرائع موجود ہیں اور ترقی صنعت کی بھی بہت گنجائش ہے۔ ماہرین زراعت نے
اندازہ کیا ہے کہ اگر ہندوستان میں توسیع کاشت کے ان تمام ذرائع سے استفادہ کیا جائے جن کا علم بنی نوع
انسان کو ہو چکا ہے تو موجودہ زرعی پیداوار کی مقدار میں دس گنا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ زرعی پیداوار
کے متعلق ہم نے تخمینہ کیا تھا کہ وہ صرف ۵ کروڑ افراد کو انسانوں کے شایان شان معقول معیار آرام پر پالنے
کے لئے کافی ہے لہٰذا اس صورت میں جب کہ ہندوستان کی زرعی پیداوار دس گنی ہو جائے گی ہندوستان
کم از کم ۵۰ کروڑ انسانوں کو معقول معیار آرام پر پال سکے گا اگر توسیع زراعت کے ساتھ ساتھ ہم ترقی صنعت و
حرفت کے لئے بھی کوشاں رہیں تو ہندوستان کے لئے یہ بآسانی ممکن ہے کہ وہ ایک ارب انسانوں کو اعلیٰ
معیار آرام پر پال سکے۔ جو حالت ہندوستان کی ہے اس سے بہتر یا بدتر تمام ممالک مشرق و مغرب کی ہے
ہر جگہ بالخصوص مشرق میں ہم کو یہی صورت حال نظر آتی ہے کہ قدرت کے لامحدود ذرائع کو نظر انداز کیا جا رہا
ہے اور تجارتی دفینوں اور قدرتی ذرائع تکثیر دولت سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے جرمانیہ کے ممتاز
ماہر معاشیات پروفیسر پنگ نے اندازہ کیا ہے کہ وادی میسیپی اور امیزون میں اتنے وسیع قطعات
موجود ہیں جن پر تمام یورپ کی آبادی منتقل کی جا سکتی ہے۔ صرف جنوبی امریکہ میں جس کا رقبہ ہندوستان کے
مجموعی رقبے سے دوگنا ہے ڈیڑھ دو ارب انسانوں کو پالنے کی صلاحیت ہے حالانکہ وہاں کی حقیقی آبادی
صرف ۲۲ کروڑ ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ صرف جنوبی امریکہ میں اب بھی ۱۰ گنے اضافے کی گنجائش
موجود ہے۔ اگرچہ توسیع زراعت و ترقی صنعت کے بے شمار ذرائع ہر جگہ نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی ہر جگہ
دائمی بے روزگاری، شدید افلاس اور وسیع غربت پائی جاتی ہے۔ باوجود ان بے شمار قدرتی ذرائع کے
انسان صدیوں سے مصیبت کی زندگی بسر کر رہا ہے، نوکریاں نہ ملنے کی ہر جگہ شکایت ہے، تعلیم یافتہ
بے روزگاروں کی تعداد ہر ملک میں بسرعت بڑھ رہی ہے اور تقریباً ہر پیشے میں فالتو لوگوں کا وجود مصیبت
کا باعث ہو رہا ہے۔ ایسی عجیب و غریب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بظاہر متضاد نتائج اخذ کئے
جا سکتے ہیں کہ آج دنیا کے کسی ملک میں مطلق کثرت آبادی نہیں پائی جاتی حالانکہ ہر ملک میں اضافی کثرت

نظام الملک کے آباؤ اجداد

سلطنت بخارا میں سمرقند کے قریب ایک قصبہ ملی آباد ہے۔ یہیں نظام الملک کے دادا خواجہ عابد پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اپنے وطن کو چھوڑ کر انھوں نے بخارا میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی جہاں انھیں اپنی قابلیت منوانے کا زیادہ موقع تھا۔ خواجہ صاحب عالم شیخ کے صاحبزادہ تھے جو اپنے زمانہ کے ایک مشہور صوفی اور عالم تھے۔ شاہ بخارا نے انھیں اعظم العلماء کے لقب سے سرفراز کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت بھر میں وہ سب سے زیادہ عالم و فاضل تھے۔ خواجہ عابد کی والدہ میر ہمدان کے خاندان سے تھیں جو سمرقند کے ممتاز سید تھے۔ عالم شیخ کا آبائی وطن دراصل کردستان کا ایک چھوٹا سا گاؤں سہرورد ہے اور وہ اپنا شجرہ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاتے ہیں جو ایک بڑے روحانی رہنما تھے اور جنھوں نے تصوف پر بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں اور یہ بزرگ اپنا شجرہ نسب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول تک پہنچاتے ہیں۔[1]

کہا جاتا ہے کہ عالم شیخ روحانی قوتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے بے شمار مریدوں کو ریاضت اور عبادت

---

[1] شجرہ نسب حسب ذیل ہے

(۱) شیخ شہاب الدین	(۶) شیخ فتح اللہ	(۱۱) محمد درویش
(۲) ابو محمد حنظلہ	(۷) شیخ نجیب اللہ	(۱۲) شیخ محمد مومن
(۳) شیخ قطب الاقطاب زین الدین	(۸) شیخ جاوید المعروف سرمست	(۱۳) میر محمد عالم صدیقی
(۴) شیخ علاؤ الدین	(۹) شیخ فتح اللہ ثانی	(۱۴) عزیزان عالم
(۵) شیخ تاج الدین	(۱۰) شیخ جاوید ثانی	(۱۵) خواجہ میر اسمٰعیل المعروف عالم شیخ

(۱۶) خواجہ عابد

کے طریقے اور آداب بتایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے خواجہ عابد کو مذہبی تعلیم دی اور یہ اپنے والد کی وفات کے بعد بخارا چلے آئے۔ حکومت کے ارباب حل و عقد نے ان کی ذہانت اور قابلیت دیکھ کر انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ چند دنوں کے بعد ان کو شیخ الاسلام بنا دیا گیا جو حکومت میں ایک بہت اہم عہدہ تھا۔

شاہ جہانی عہد حکومت کے انتیسویں برس حج کے لئے مکہ جاتے ہوئے آپ ہندوستان تشریف لائے اور اپنے آپ کو شاہی دربار میں پیش کیا جہاں خلعت کے علاوہ آپ کو چھ ہزار روپے کی تھیلی عنایت کی گئی۔ آپ کو شاہی ملازمت میں ایک عہدہ بھی پیش کیا گیا اور آپ نے وعدہ کیا کہ مکہ سے واپسی کے بعد اس کو قبول کر لیا جائے گا۔

۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں خواجہ عابد حج سے واپس آئے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ شاہ جہاں سخت بیمار ہے اور اس کے لڑکے شاہی تخت حاصل کرنے کے لئے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ سن کر سیدھے اورنگ زیب کے پاس دکن چلے گئے۔ شجاع اور مراد اپنی بادشاہت کا اعلان کر چکے تھے مگر اورنگ زیب احتیاط اور حکمت عملی سے کام لے رہا تھا۔ وہ فوراً بیجاپور سے روانہ ہو کر شمالی حدود میں پہنچ گیا اور بہانہ یہ کیا کہ وہ شاہی احکام کی پیروی کر رہا ہے۔ اس اچانک روانگی کی وجہ سے اکثر تورانی مغل سپاہی بہت بد دل ہو گئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کو اس پھل سے محروم کیا گیا جو انھیں طویل مشقت و محنت کے بعد ملنے والا تھا۔ بہت سے مغل افسر بھی اورنگ زیب کی ملازمت سے الگ ہو گئے۔

یہ حالات تھے جب خواجہ عابد نے اس کی ملازمت میں داخل ہونے کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے انھیں اپنی خاص تورانی فوج میں جو شاہی افواج کا ایک اہم عنصر تھی ایک بڑا عہدہ دے دیا۔ خواجہ عابد عالم و فاضل ہونے کے علاوہ جنگ کے قوانین سے بھی خوب واقف تھے ان کی شرکت کے سبب اورنگ زیب کو بہت فائدہ ہوا کیونکہ ان کی سعی اور کوشش سے ان کے ہم وطن اورنگ زیب کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

۱۱ فروری ۱۶۵۸ء کو اورنگ زیب برہان پور پہنچا اور اپنا وقت گذارنے کے لئے ایک ماہ تک

وہاں ٹھہرا رہا۔ اسی دوران میں دارا شکوہ نے حکومت کے تقریباً تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور تمام وہ سٹرکیں جو بنگال، احمد آباد اور دکن کو جاتی تھیں، بند کر دی تھیں۔ کوئی مسافر یا پیغام بر کہیں آجا نہیں سکتا تھا۔ (خافی خان۔ جلد دوم ص ۲) اورنگ زیب مراد کو اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے پختہ وعدہ کیا کہ شہ تک دشمن پر حملہ کرنے سے قبل وہ اجین میں اورنگ زیب سے آملے گا۔ برہان پور کے قیام میں اورنگ زیب نے خواجہ عابد کو ۲۰۰۰ ذات، ۵۰۰ اسپ اور خان کے لقب سے سرفراز کیا (ماثر الامرا۔ جلد سوم۔ ص ۱۲۱) اجین جاتے ہوئے انھیں ایک خلعت، ایک گھوڑا، ایک ہیروں سے جڑا ہوا خنجر اور ایک جواہرات سے ٹکی ہوئی پیٹی بھی مرحمت ہوئی (عالمگیر نامہ۔ ص۔ ۴۵)۔

جب دارا شکوہ کو اورنگ زیب اور مراد کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو حکم دیا کہ وہ فوراً مالوہ، کی طرف روانہ ہوں تاکہ ان دونوں کو وہیں روک دیا جائے۔ مراد اپنی فوج سمیت اجین میں اورنگ زیب سے آملا۔ ان دونوں کی فوجوں نے راجہ جسونت سنگھ کی فوج پر حملہ کیا جو اجین کے نواح میں دریائے سپرا کے کنارہ موجود تھی۔ ایک خونی جنگ کے بعد راجہ کی فوج کو شکست ہوئی اور اس کے سپاہی مختلف سمتوں میں بھاگ گئے۔ راجہ بھی فرار ہو کر اپنے دار الخلافہ جودھپور میں پہنچ گیا۔

اس لڑائی میں خواجہ عابد نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا چنانچہ اس کے خاتمہ پر انھیں چار ہزاری کا عہدہ دیا گیا۔ (عالمگیر نامہ۔ ص ۷۶، ماثر الامرا حصہ سوم۔ ص ۱۲۱) اورنگ زیب کو ان پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ہزبر ([illegible]) خاں اور ذوالفقار خاں کے ساتھ ان سے بھی کہا گیا کہ دار السلطنت جاتے ہوئے اس کے ساتھ رہیں (عالمگیر نامہ۔ ص ۹۴)

سموگڑھ کی جنگ میں جو جون ۱۶۵۸ء میں ہوئی تھی خواجہ عابد اورنگ زیب کے ساتھ تھے۔ اس میں دارا شکوہ کو شکست ہوئی اور اس کی قوت کا خاتمہ ہوگیا خواجہ عابد بھی ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کو اورنگ زیب نے زر و جواہر سے مالا مال کر دیا اور جن کی تعریف و توصیف بھی کی تھی۔ وہ لوگ جو اورنگ زیب پر کافی اثر رکھتے تھے اور جنھوں نے لڑائیوں میں اپنی قوت و مردانگی کا ثبوت دیا تھا ان کے

نام یہ ہیں خواجہ عابد، مخلص خاں اور منعم خاں۔ اورنگ زیب اپنے دشمنوں کے خلاف لڑائی کا جو خاکہ سوچتا تھا اس میں ان تینوں سے ضرور مشورہ لیا جاتا تھا۔

اورنگ زیب جب سریرآئے حکومت ہوا تو پہلے چار سال ملک میں امن و امان قائم کرنے پر صرف ہوئے اور اس تمام مدت میں خواجہ عابد بڑے امتیاز سے کام کرتے رہے داراشکوہ، شجاع اور جسونت سنگھ کے خلاف جو مہمات بھیجی گئیں ان میں یہ بھی شامل تھے ان لڑائیوں میں بحیثیت سپاہی کے انھوں نے بہت شہرت حاصل کی (عالمگیر نامہ ص ۲۴۰، ۴۰۰) چوتھے سال اور کے فوائح میں ان کو ہرات کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ جہاں میووں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور بعض اوقات تو لوٹ مار کرتے ہوئے دہلی کی دیواروں تک آجاتے تھے ایک سال تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے، اس کے بعد شیخ میراں[۱] کی جگہ انھیں صدر کل کے عہدہ پر متعین کیا گیا۔ یہ ایک بہت اہم عہدہ تھا کیونکہ اس کا عہدہ دار شاہی وزارت کا رکن سمجھا جاتا تھا اور خیرات کے لیے معافی کی زمینوں کی تقسیم اسی کے ذمہ ہوتی تھی ۱۶۶۳ء میں خواجہ عابد کے عہدہ میں اور اضافہ ہوا اور ایک ہاتھی بھی انھیں مرحمت کیا گیا (عالمگیر نامہ ص ۸۵۵) صدر کل کے عہدہ پر تقریباً چھ سال تک یہ فائز رہے۔

۱۶۶۸ء میں صدر کل کے عہدہ پر شیخ میراں کے لڑکے رضوی خاں کو مقرر کیا گیا اور انھیں صوبہ اجمیر

---

[۱] میراں سید جلال بخاری جو شیخ میراں کے نام سے زیادہ مشہور ہیں جہانگیر کے عہد میں خراسان سے ہندوستان آئے۔ لاہور میں ملا عبد السلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جو ایک مشہور عالم تھے اور فقہ و حدیث میں پچاس سال تک درس دیتے رہے۔ شاہ جہاں نے شیخ میراں کو اپنے شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا عہد شاہ جہانی کے اٹھائیسویں سال انھیں پانچ سو ذات اور پچاس اسپ کا منصب دیا گیا جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو انھیں تین ہزاری کا منصب دیا گیا اور اگلے سال سید ہدایت اللہ قادری کی بجائے صدر کل بنا دئے گئے بڑھاپے کی وجہ سے وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے تھے اس لئے ۱۶۶۲ء میں وہ الگ ہو گئے اور دو سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا (ماثر الامرا جلد سوم ص ۵۱۹)۔

[illegible]نام یہ ہیں خواجہ عابد، [illegible] اورنگ زیب اپنے دشمنوں سے [illegible]
[illegible]تھا اس میں ان تینوں سے ضرور مشورہ لیا جاتا تھا۔

اورنگ زیب جب [illegible] حکومت ہوا تو پہلے چند سال ملک میں امن و امان قائم کرنے پر [illegible]
[illegible] اس تمام مدت میں خواجہ عابد بڑے امتیاز سے کام کرتے رہے۔ داراشکوہ، شجاع اور
[illegible] خلاف جو مہمات بھی [illegible] شامل تھے ان لڑائیوں میں بحیثیت سپاہی کے [illegible]
[illegible] تے سال اورنگ زیب کے [illegible] ان کو [illegible]
[illegible] عالمگیر نامہ [illegible] بعض اوقات تو [illegible] کرتے ہوئے [illegible]
[illegible] اس کے بعد شیخ [illegible]
[illegible] عہدہ پر مامور رہے، [illegible] شاہی وزارت کارکن
[illegible] کیونکہ اس کا عہدہ دار [illegible] کے عہدہ میں اضافہ
[illegible] میں خواجہ عابد کے عہدہ میں [illegible]
[illegible] کے عہدہ پر تقریباً چھ سال تک

[illegible] شہزادہ
[illegible] کی
[illegible] اپنے نام
[illegible] کی طرف
[illegible] بیٹے مجاہد خاں
[illegible] کسی مناسب

[illegible] گیا اور انہیں صوبہ [illegible]

[illegible] تعاقب میں روانہ کیا
[illegible] سے بخوبی واقف
[illegible] میں شامل تھے۔ پچاس
[illegible] دی گئیں (مآثر عالمگیری ص ۲۰۳)
[illegible] عوض ایک خاص خلعت اور ایک گھوڑا مرحمت ہوا اور قلیج خاں کے خطاب سے

[illegible] چند ہی باتوں کی وجہ سے قلیج خاں شاہ عالم کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ
[illegible] تھا۔ چونکہ اس کے خیالات شہزادہ سے بالکل مختلف تھے اس لئے بغیر اجازت حاصل
[illegible] ہو کر شاہی جماعت میں آکر مل گیا۔ جب اورنگ زیب کو یہ خبر ملی تو اس نے اہتمام
[illegible] کوتوال کو حکم [illegible] قلیج خاں کو نظر بند کر لیا جائے بعد میں صلابت خاں کے سپرد ہوا لیکن اس کی تابعیت

میں بحیثیت صوبیدار بھیجا گیا۔ (ماثر عالمگیری ص ۶۲) تین سال کے بعد ان کو ملتان کا صوبیدار بنادیا گیا جہاں وہ چار سال تک رہے۔ (ماثر عالمگیری ص ۱۱۰) اس تمام مدت میں اورنگ زیب کو ان پر کامل اعتماد رہا۔ عہد حکومت کے تیرہویں سال اورنگ زیب نے ان لوگوں کو خاص خلعت دیئے جن پاس کو پورا بھروسہ تھا ان میں اسد خاں عمدۃ الملک وزیر اعظم، مرتضیٰ خاں، حسن علی خاں اور طاہر خاں کے علاوہ خواجہ عابد بھی تھے سنہ ۱۶۷۰ء میں خواجہ عابد کو دارالسلطنت واپس بلایا گیا اور حاجیوں کی جماعت کے سردار مقرر ہوئے (المصنف ص ۳۴۱)۔ جماعت حجاج کا سردار ہر سال شہنشاہ مقرر کیا کرتا تھا۔ سردار کا فرض یہ تھا کہ وہ شاہی تحفے مکہ اور مدینے لے جائے روانگی کے وقت انہیں شہنشاہ کی طرف سے ایک خاص خلعت دیا گیا جو بہت بڑا امتیاز تھا۔ عام طور سے جماعت حجاج کا سردار اس شخص کو بنایا جاتا تھا جس کی علم و فضیلت کی شہرت ملک بھر میں ہو۔ (ماثر عالمگیری ص ۱۴۳) حج سے واپس آنے کے بعد خواجہ عابد سنہ ۱۶۷۹ء تک دربار شاہی میں مقیم رہے اس سال شہنشاہ امن و امان اور اپنی حکومت قایم کرنے کے لئے راجپوتانہ روانہ ہوا۔

مرزا راجہ جے سنگھ کی سفارش پر راجہ جسونت سنگھ کو معاف کرکے سرحدی چوکیوں کا نگراں محافظ بنادیا گیا تھا۔ جمرود میں اس کے انتقال پر راجپوتانہ میں ایک زبردست شورش شروع ہوگئی جس کا خاتمہ ایک طویل جنگ کے بعد ہوا۔ راجہ جسونت سنگھ کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لئے شہنشاہ نے فیصلہ کیا کہ ریاست مارواڑ کا الحاق سلطنت میں کرلیا جائے۔ اس نے اجیت سنگھ کو جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اصلی وارث ماننے سے انکار کردیا۔ عسکران راجہ جسونت سنگھ کا وزیر تھا اس کے لڑکے درگا داس نے اجیت سنگھ کا لشکر اپنے ہاتھوں میں لیا۔ یہ فتنہ اس قدر بڑھا کہ شہنشاہ کو سلطنت سے کمک منگوانا پڑی اور اجمیر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اس لئے بنگال سے شہزادہ اعظم اور دکن سے شہزادہ معظم کو طلب کیا اور شہزادہ اکبر کو حکم دیا کہ راجپوت علاقہ پر چاروں سمتوں سے حملہ کیا جائے۔ رانا اودے پور بھی اس بغاوت میں شریک تھا۔ جب اس نے شاہی افواج کے حملہ کی خبر سنی تو وہ سب مال و متاع خاندان اور ساتھیوں کو لے کر پہاڑی قلعوں میں بھاگ گیا (خافی خاں جلد دوم ص ۲۶۳) جودھپور اور تقریباً تمام میدانی شہر فتح کرلئے گئے اور تمام

سنہ ۱۰۹۸ھ میں قلیچ خاں نے محاصرہ گولکنڈہ میں خوب کارہائے نمایاں کیے۔ وہ حملہ کرنے والی فوج کا افسر تھا۔ ایک بار جب وہ حملہ کر رہا تھا تو دشمنوں نے گولہ باری شروع کر دی اس کے دائیں بازو پر ایک گولہ آکر لگا جس کی وجہ سے وہ سخت زخمی ہوا لطف اللہ خاں موقع پر پہونچ گیا اور اُسے خیمے میں لے آیا اس قدر شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ خیمے تک گھوڑے پر سوار رہا اور اُترنے سے انکار کر دیا۔ جب اورنگ زیب کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اُسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے علاج کے لئے فوراً جراحوں کو بھیجا۔ دوسرے دن اسد خاں (عمدۃ الملک) وزیر اعظم شہنشاہ کی طرف سے خیریت مزاج پوچھنے کے لئے آیا جب وہ قلیچ خاں کے خیمہ میں پہنچا تو اس کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا بائیں ہاتھ سے قہوہ پی رہا ہے اور جراح اس کے دائیں کاندھے کے زخم سے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور ہڈیاں نکالنے میں مصروف ہیں اس نے حسب عادت مسکرا کر وزیر اعظم سے کہا کہ وہ جلد ہی اچھا ہو جائے گا اور شہنشاہ کی خدمت میں اپنے فرائض شروع کر دے گا۔

مگر موت کے سامنے کوئی علاج کارگر نہیں ہوا تین دن کے بعد قلیچ خاں کا انتقال ہو گیا اور قلعہ گولکنڈہ کے پاس آصف نگر میں اسے دفن کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا دایاں بازو جو گولہ سے اڑ گیا تھا قصبہ قیصت پور میں مدفون ہے۔ جہاں کہ وہ پایا گیا تھا۔ قلیچ خاں کی یادگار اب تک صرف خاص سے منائی جاتی ہے۔

اورنگ زیب کے دل میں قلیچ خاں کی بہت عزت تھی اُس کی بیماری کے دوران میں شہنشاہ نے اُس کے بیٹے غازی الدین فیروز جنگ کو حسب ذیل خط لکھا تھا۔

میں خود سلطنت کے بہی خواہ اور قابل فرزند کی خیریت مزاج دریافت کرنے کے لئے آنا چاہتا تھا لیکن اپنے دل میں کہا کہ میں اُس کی تکلیف دہ حالت کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ اسی لئے میں عمدۃ الملک کو اس کے دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں دے کر اور اپنے دل کا حال سنانے کے لئے بھیجتا ہوں اس وقت صرف انگور مل سکتے ہیں۔ لیکن طبیبوں نے کہا ہے کہ سلطنت کے اس ستون کے لئے یہ مفید نہیں رہیں گے۔ اس لئے فیصلہ کیا ہے کہ میں خود بھی انگور نہیں کھاؤں گا۔ اگر خدا نے چاہا تو اس کی صحت کے بعد ہم دونوں یہ پھل کھائیں گے۔

اے خدا میری خواہش بہت محدود ہے"

خدا کرے میں اُسے پورا کر سکوں' (رقعات عالمگیری)

ایک مرتبہ اورنگ زیب نے شہزادہ اعظم کو خط لکھا تھا جس میں قلیج خاں کی مثال دے کر اُسے سمجھایا تھا کہ اُس کی تقلید اور پیروی کرنی چاہیئے اس نے لکھا تھا۔

مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ قلیج خاں اپنے سپاہیوں کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہے وہ ان کو قہوہ پلاتا ہے، ناشتہ کے وقت ناشتہ اور کھانے کے وقت کھانا کھلاتا ہے۔ جب سپاہی اس سے رخصت ہوتے ہیں تو وہ ان کو خوشبو لگاتا ہے اور پان دیتا ہے۔ وہ تمام قسم کے کھانے سپاہیوں کے گھروں پر بھیجتا ہے تاکہ ان کی عورتیں اور بچے یہ شکایت نہ کریں کہ مرد ہی ہر قسم کی نعمت سے لطف اٹھاتے ہیں اس کے بعد اس نے کسی فقیر کا قصہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے اس سے پوچھا کہ آج کل کا زمانہ بہت خراب ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ شکر کرو اس سے زیادہ خراب نہیں ہے۔ اس سے اورنگ زیب کا مطلب یہ تھا کہ اس کا زمانہ اس قدر خراب نہیں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کیونکہ اس کے زمانہ میں قلیج خاں جیسے آدمی رہتے ہیں۔ (ایضاً)

قلیج خاں کے پانچ بیٹے تھے سب سے بڑے کا نام شہاب الدین خاں تھا جو غازی الدین خاں فیروز جنگ کے لقب سے زیادہ مشہور ہے سلطنت مغلیہ میں جو سب سے بڑا امتیاز ہو سکتا ہے وہ غازی الدین خاں نے حاصل کیا تھا دو حقیقی بھائی تھے مجاہد خاں[۵۱] اور محامد خاں[۵۲] اور دو سوتیلے بھائی

---

۵۱ اس کا اصلی نام محمد عارف تھا۔ کچھ دنوں خیر آباد میں فوجدار رہا عہد عالمگیری کے اٹھارویں سال اس کی جگہ عنایت خاں مقرر ہوا (مآثر عالمگیری ص ۱۴۱) چوبیسویں برس شہزادہ محمد اکبر کو چھوڑ کر شاہی حمایت میں آجانے پر اُس کو خلعت دیا گیا اور منصب میں بھی ترقی ہو گئی (مآثر عالمگیری ص ۱۹۹)۔

۵۲ معلوم ہوتا ہے اس نے کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا تھا اور معمولی زندگی بسر کی تھی۔

سبحان قلی خاں شاہ بخارا کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں اپنے باپ کے پاس چلا جائے لیکن شاہ بخارا کو اس سے انسیت اور دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اس کے جانے پر راضی نہیں ہوتا تھا ایک دن سبحان قلی خاں کہیں باہر سیر و تفریح کے لئے گیا۔ شہاب الدین اور دو درباری خواجہ یعقوب اور رستم بے بھی اس کے ساتھ تھے۔ شہاب الدین نے ان دونوں درباریوں کو راضی کرلیا کہ وہ بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ اس کو ہندوستان جانے کی اجازت دیدے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا وہ واقعی اپنے دوست کو خوش کرنا چاہتے تھے یا وہ اسے اپنی راہ سے ہٹانا چاہتے تھے کیونکہ شہاب الدین کا بادشاہ پر بہت کافی اثر تھا۔ بہر حال انھوں نے یہ معاملہ سبحان قلی خاں کے سامنے پیش کردیا جب وہ خوش اور مزہ میں تھا۔ وہ لوگ جو اپنے آقا سے کچھ حاصل کرنا چاہیں کسی مناسب موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں یہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئے اس کے بعد بادشاہ نے نوجوان شہاب الدین کو اپنے حضور میں بلایا اور سورہ فاتحہ تلاوت کی یہ سورۃ اس وقت تلاوت کی جاتی ہے جب کوئی کسی سے جدا ہوتا ہے بعد ازاں بادشاہ نے کہا تم ہندوستان جارہے ہو تم یقیناً بڑا نام پاؤگے" اور واقعی اس کے الفاظ بالکل ٹھیک نکلے۔ شہاب الدین نے اتنا بڑا عہدہ اور امتیاز حاصل کیا جس پر فرمانروایان بلخ و بخارا بھی حسد کرسکتے تھے۔ (ماثر عالمگیری ص ۹۱ ماثر الامراص ۴۷۲)

عہد عالمگیری کے بارہویں سال شہاب الدین ہندوستان پہنچا جبکہ اس کی عمر مشکل بیس برس کی تھی شہنشاہ اس سے اچھی طرح پیش آیا اور اس کو تین سو کا منصب دیا گیا۔ شہنشاہ نے اس نوجوان پر اور شفقت فرمائی اور اس کی شادی نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہ جہاں کی بیٹی صفیہ خانم سے کرائی (تاریخ فاتحہ)

تقریباً دس برس تک یہ اپنے باپ کے ساتھ مختلف قسم کے تجربات حاصل کرتا رہا جب شہنشاہ نے اپنے تمام معتمد افسران اور امرا کو راجپوتانہ بلایا تو شہاب الدین بھی شہنشاہ کے ہیڈ کواٹر اجمیر چلا آیا۔ اس کی جرأت اور بہادری سب سے پہلے اس وقت معلوم ہوئی جب اس نے حامد خاں کی سرکردگی میں راٹھوروں کا ان کے پہاڑی قلعوں میں تعاقب کیا تھا اس خدمت کے بدلے اسے خلعت اور

بخشی شہنشاہ کی طرف سے عنایت ہوئی (ماثر عالمگیری ص ۱۹۴)

اس مہم سے واپس آنے کے بعد شہنشاہ نے آدھی رات کو اُسے بلا بھیجا اور کہا وہ فوراً حسن علی خاں کی خبر لائے کیونکہ ایک مدت سے اس کا کچھ پتہ نہیں تھا خبر رسانی کے تمام ذرائع بالکل ختم ہو چکے تھے اور حسن علی خاں اودے پور کی شمال گھاٹیوں میں محصور ہو گیا تھا اس سے شہنشاہ کو بہت پریشانی تھی شہاب الدین کو اس کے حالات کا بالکل علم نہیں تھا اس علاقہ میں جنگلات تھے اور ان میں جنگلی جانور اور ڈاکو رہتے تھے مگر ان خطرات کے باوجود اس نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر وہ روانہ ہوا اور دو ہی دن میں سب حالات معلوم کر لئے۔ اس خدمت کے عوض شہنشاہ نے اسے خان کا لقب دیا۔ یہ شہاب الدین کی جرأت اور مردانگی تھی جس کی وجہ سے حسن علی خاں اور اس کی فوج تباہی سے بچ گئی حسن علی خاں کو فوراً کمک پہنچائی گئی اور چند ہفتوں بعد اس نے رانا اودے پور کو شکست فاش دی جس سے رانا کی قوت کا خاتمہ ہو گیا اور اسے اراولی پہاڑیوں کی طرف فرار ہونا پڑا۔

اس کے فوراً بعد ہی شہاب الدین خاں کو حکم ملا کہ وہ سروہی کی طرف روانہ ہو کر درگا داس کو روکے جو اجمیر پر حملہ کرنے کی تجویز کر رہا تھا تاکہ شہزادہ محمد اکبر کے لئے ہندوستان کا تخت حاصل کرے۔ شہاب الدین نے شہزادہ کی فوج میں نفاق ڈلوا دیا۔ سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ اپنے بھائی حامد خاں کو اپنی تجویزوں کے متعلق خفیہ اطلاع دی اگرچہ شہزادہ نے حامد خاں کو بہت بڑا عہدہ دے رکھا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شاہی افواج میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ وہ شہزادہ محمد اکبر کے پاس گیا اور کہا کہ اگر اس کو اجازت مل جائے تو وہ جا کر اپنے بھائی شہاب الدین کو اپنی طرف ملائے جب اس کو اجازت مل گئی تو وہ بہت سا روپیہ اور دوسری چیزیں لے کر اپنے بھائی سے آملا حامد خاں کے الگ ہونے پر بہت سے دوسرے عہدہ دار شہزادہ اکبر سے الگ ہو گئے اور بہت کم اس کے ساتھ رہ گئے۔ شہزادے نے میر اتی خاں کو بھی اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ شہاب الدین کو اس کی طرف آنے پر آمادہ کرے (ماثر عالمگیری ص ۱۹۹)۔

جب شہزادہ اکبر کی فوجیں اجمیر کے قریب پہنچیں اور حملہ کی تیاریاں شروع کیں تو رات کے وقت

بہت سے لوگ شہاب الدین سے جا ملے۔ صرف چند آدمی ضیاء الدین محمد شجاعی کی سرکردگی میں اور
فوج باقی رہ گئی (خافی خاں جلد دوم ص ۲۷۵) شہزادہ بہت دل برداشتہ ہوا اور بھاگ کر
کے پاس پہنچا جس نے اس کی بہت خاطر کی' راہیری قلعہ کے پاس ایک مکان رہنے کو دیا اور گذ
کے لئے ایک رقم مقرر کردی (خافی خاں ص ۲۷۷)۔

شہاب الدین کا مقصد بغیر خون بہائے پورا ہو گیا اور وہ اجمیر واپس ہوا شہنشاہ نے اس کا
ہاتھ لیا۔ اورنگ زیب شہزادہ اکبر کی تیاریوں سے خائف نئی کمک کا منتظر تھا۔ اس نے پہاڑیوں ،
اور خیموں کے اردگرد خندقیں کھدوادی تھیں۔ شہاب الدین کے پہنچنے پر شہنشاہ کو اطمینان ہو گیا
بلکہ اس نے سروہی سے اجمیر تک ۱۲۰ میل کا فاصلہ طے کیا ہے اور شہزادے کے بہت سے سپا
اپنی طرف کر لیا ہے آسے داروغہ عرض ؟ مقرر کر دیا جو صرف ان آدمیوں کے لئے مخصوص تھا جس پر شہ
کو پورا اعتماد ہوتا تھا۔ اس عہدہ دار کا کام یہ تھا کہ عرضیوں پر دوبارہ غور کر کے بادشاہ کی منظوری کے
پیش کرے اس کے دوسو ساتھی بھی شاہی عنایت سے سرفراز ہوئے۔ سراق خاں کو جس نے اپنا
مال و متاع شہزادہ اکبر کے خیمہ میں چھوڑ دیا تھا ایک خلعت اور دو ہزار روپیہ نقد دئے گئے اور دوسو
منصب عطا ہوا۔

جون ۱۶۸۱ء میں بیکانیر کے شیام سنگھ کی وساطت سے اورنگ زیب نے اودے پو
رانا سے صلح کر لی تاکہ دکن جا کر سنبھاجی اور شہزادہ اکبر کے خطرناک اتحاد کا خاتمہ کر دے سنبھاجی یہ
کہ اکبر کو اورنگ زیب کے مقابلہ میں تخت ہندوستان پر بٹھا دے اور اس کے علم کے نیچے راجپو
جمع کرے۔ (ص ۱۰۰) ابتدا ہی سے شہنشاہ کی
تھی کہ میواڑ کے راجہ جے سنگھ سے صلح کر لی جائے۔ اس نے ایک پیغام برکی زبانی راجہ سے یہ کہا
کے خلاف جو قدم اس نے اٹھایا تھا وہ سیاسی ضرورت کے سبب تھا اس نے اس کو یقین دلایا کہ اس
ریاست کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور یہ کہ آسے چاہئے کہ وہ شہنشاہ کی مدد کرے تاکہ میواڑ
کی روح فنا ہو جائے۔ (آداب عالمگیری آصفیہ کتب خانہ ذاتی قلمی نسخہ) مگر دگا داس نے رانا سے کہا

علاقہ میں فوجی چوکیاں قایم کی جائیں ۔ روانہ ہونے سے قبل آپ سے ایک تیر وکمان دس ہزار روپیہ نقد اور فوج کے اخراجات کے لئے دو من سونا دیا گیا (مآثر عالمگیری ص ۲۴۲) معلوم ہوتا ہے کہ واپس آنے کے چند ماہ بعد آپ سے شاہ عالم کی مدد کے لئے کوکن کان روانہ کیا گیا (مآثر عالمگیری ص ۲۴۰) اس کی خدمات کے عوض شاہ نے اسے ایک خلعت' پانچ رکابیں اور شاہی طعام بھیج کر اپنی خاص شفقت کا اظہار فرمایا ۔ غالباً اسی موقع پر آپ سے غازی الدین خاں کا لقب بھی دیا گیا تھا (مآثر الامرا جلد دوم ص ۵۷۴)

قلعہ رائے گڑھ کے نواح میں غازی الدین خاں (شہاب الدین) کا مقابلہ ایک مرہٹہ فوج سے ہوا جو سنبھاجی کی سرکردگی میں تھی اس نے مرہٹہ فوج کو شکست فاش دی اور باقی ماندہ سپاہی بھاگ کر قلعہ میں محصور ہو گئے ۔ چونکہ اس کے پاس محاصرہ کا سامان نہیں تھا اس لئے قلعہ کے بیرونی حصوں میں آگ لگا کر وہاں سے چلا آیا اس لڑائی میں بہت سے مرہٹہ سردار مارے گئے اور بہت سے سردار گرفتار ہوئے گرفتار ہونے والوں میں بیداجی اکوجی ملہار راو اور راو سبحان چند قابل ذکر ہیں ۔ شہاب الدین نے انھیں شاہی دربار روانہ کر دیا یہاں انھوں نے اورنگ زیب کی اطاعت اور مدد کا دل سے وعدہ کر لیا اس لئے انہیں خلعت اور تحایف دئے گئے (مآثر عالمگیری ۔ ص ۲۴۹) غازی الدین خاں کو خوب مال غنیمت ہاتھ آیا ۔ جب سید اغلان اور شاہ محمد چوبدار نے مژدہ فتح سنایا تو شہنشاہ کو بہت مسرت ہوئی ۔ اول الذکر پیغام بر کو ایک ہاتھی مرحمت کیا گیا اور دوسرے کو ایک خلعت اور دو سو روپیہ نقد عطا ہوئے ۔ شہاب الدین کو فیروز جنگ کا لقب دیا گیا اور نقارہ بجوانے کی اجازت بھی عطا ہوئی ۔ ۵۰۰ خلعت اس کے ساتھیوں کو دئے گئے ۔ (مآثر عالمگیری ص ۲۵۲) ۔

اورنگ زیب کو خوب معلوم تھا کہ مرہٹوں سے جنگ کافی طویل رہے گی ۔ اس نے ان کو بہت سی شکستیں دینے کے بعد بیجاپور کی فتح کا بیڑا اٹھایا اس لئے نومبر ۱۶۸۳ء میں ہیڈ کوارٹر احمد نگر منتقل ہو گیا ۔ بیجاپور سے جنگ کا بہانہ تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی ۔ شہنشاہ نے سکندر عادل شاہ شاہ بیجاپور کو لکھا تھا کہ وہ اس کی مرہٹوں کے خلاف جنگ میں مدد کرے ۔ اپنے ملک سے فوج کے لئے اجناس بھیجے اور مغل فوج کو بغیر کسی شرط کے اپنے علاقہ میں سے گزرنے کی اجازت دے ۔ سکندر نے ان مطالبات کا جواب ٹال دیا ۔

اس نے کہا کہ سلطنت بیجاپور میں اس کے افسران نے بغیر اجازت جو فوجی چوکیاں قائم کرلی تھیں انہیں فوراً توڑ دیا جائے اور یہ کہ وہ تمام خراج جو مغل حکومت نے اس کے آباؤ اجداد سے وصول کیا ہے واپس کر دیا جائے اس لئے کہ ان کو اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ اورنگ زیب کو یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ سکندر خفیہ طور سے مرہٹوں کی مدد کر رہا تھا اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ بیجاپور کو سلطنت مغلیہ میں ملحق کر لیا جائے۔

مارچ ۱۶۸۵ء میں ایک بہت بڑی فوج شہزادہ اعظم کی سرکردگی میں بیجاپور کا محاصرہ کرنے کو روانہ کی گئی۔ سکندر نے اپنی سلطنت کی حفاظت سید مخدوم عرف شرزہ خاں کے سپرد کی جو فن جنگ میں قابل تھا اور آدمیوں پر کافی اثر رکھتا تھا اس نے بھیم نائک کو بھی لکھا کہ وہ مغلیہ فوجوں کو تنگ کرے مغلوں نے بیجاپور کی فوج کو دریائے تنگ بھدرا کے کنارے پر سخت شکست دی اور بہت نقصان پہنچایا۔ مغل فوجوں کو بیجاپور کی فوجی جماعتیں بہت تنگ کرتی تھیں مگر اعظم بڑی احتیاط سے بڑھتا رہا اور آخرکار بیجاپور کا محاصرہ کر کے فوجی چوکیاں قائم کر دیں تاکہ شولاپور میں شہنشاہ سے براہ راست تعلق قائم کر سکے مگر بھیم نائک اور سیدی مسعود نے یہ چوکیاں کاٹ ڈالیں شاہ گولکنڈہ ابوالحسن نے بھی انباجی پنڈت کی سرکردگی میں ایک دستہ فوج سکندر کی مدد کے لئے بھیجا حالانکہ اورنگ زیب اسے تنبیہ کر چکا تھا۔ ان فوجوں نے ارد گرد کے ملک پر قبضہ کر لیا اس لئے جنس وغیرہ شہزادہ اعظم کی فوج تک نہیں پہنچنے پاتی تھی اس سے شہزادہ کی فوج میں قحط پڑ گیا جس سے شہنشاہ بہت پریشان ہوا غلہ بہت مہنگا ہو گیا اور سپاہی دل برداشتہ ہو گئے یہ سن کر شہنشاہ نے اپنے بیٹے کو مشورہ دیا کہ محاصرہ اٹھا دیا جائے۔ شہزادہ نے محاصرہ اٹھانا اپنی ذلت خیال کی اور تجربہ کار افسران سے مشورہ لیا اس نے خاص طور سے حسن علی خاں ماشیہ شاہی کی رائے پوچھی جو فن جنگ کا زبردست ماہر تھا حسن علی خاں نے کہا "فائدہ اس میں ہے کہ محاصرہ اٹھا یا جائے" دوسروں نے اس کی تائید کی اس پر شہزادہ نے سب کو مخاطب کر کے کہا "آپ لوگ اپنی رائے دے چکے۔ اب میری رائے سنئے۔ میں میرے دو بیٹے اور بیوی یہیں رہیں گے اور یہاں سے نہیں جائیں گے جب تک ہمارے دم میں دم باقی ہے آپ جو

کرشولاپور سے روانہ ہوکر بیجاپور کے قریب رسول پور میں ۲۲ جولائی کو پہنچ گیا شہنشاہ کی موجودگی سے سپاہیوں کے دل بڑھ گئے انھوں نے خندقیں کھودنا شروع کیں اور قلعہ کی خندق کو بھرنا شروع کیا غازی الدین خاں فیروز جنگ نے قلعہ فتح کرنے کی ایک تجویز تیار کی جسے شہنشاہ نے منظور کر لیا اورنگ زیب نے اُسے سعادت خاں کے ہاتھ ہیرے کی ایک انگوٹھی بھجوائی (ماثر عالمگیری ص ۲۷۹)۔

ادھر محصورین دل شکستہ اور پست ہمت ہو گئے تھے آدمی اور گھوڑے ختم ہو رہے تھے اس کے علاوہ وہ فیروز جنگ اور دوسرے بہادروں کے حملے کی تاب نہیں لا سکے اس لئے وہ مجبور تھے کہ قلعہ مغلوں کے حوالہ کر دیں۔ ۱۰ ردسمبر ۱۶۸۶ء کو شرزا خاں اور عبدالرؤف نے فیروز جنگ سے ملاقات کی اور سکندر کی طرف سے شرائط طے کیں دوسرے دن انھیں شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا ۱۲ ردسمبر کو اورنگ زیب بڑی شان و شوکت سے قلعہ میں داخل ہوا۔

جب شیخ ہدایت کیش واقعہ نویس کل نے اس محاصرہ اور فتح کا حال لکھ کر شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا تو اورنگ زیب نے خود اپنے ہاتھ سے اس جملہ کا اضافہ کیا " میرے فرزند ارجمند فیروز جنگ کی کوششوں سے یہ محاصرہ کامیابی سے ختم ہوا۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۳۲۲) دوسرے القابات کے علاوہ فیروز جنگ کو یہ بھی امتیاز حاصل ہوا کہ اُسے فرزند ارجمند کہا گیا یہی الفاظ شہنشاہ نے اُس خط میں استعمال کئے تھے جو امیر خاں صوبیدار کابل کے نام لکھا گیا تھا کسی نے اس قلعہ کے فتح کی تاریخ یہ کہی ہے۔ سدِ سکندر گرفت (خافی خاں ص ۳۲۲)۔

(باقی آئندہ)

ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں مسلمانوں کی اہمیت

(ذیل میں ہم الہ آباد کے مشہور لیڈر پنڈت سندرلال صاحب کا وہ خطبہ درج کرتے ہیں جو انھوں نے دکن کی ہندی پرچار سبھا کے سامنے پڑھا تھا۔ اس خطبہ سے جس وسعتِ قلب کا اظہار ہوتا ہے وہ عام طور پر ہندو لیڈروں اور مسلمانوں کے رہنماؤں میں نہیں پائی جاتی۔ ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے مایوسی کے اس زمانہ میں اس قسم کی پُر امید تحریریں کارکنوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے ان کے پورے خطبہ کو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ پنڈت جی نے اپنے خطبے کے لئے جس زبان کو استعمال کیا ہے وہ بھی عام ہندی سے مختلف ہے اس میں بھی رواداری پائی جاتی ہے انھوں نے اردو اور ہندی کو ملا کر ایک مشترک زبان لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر [illegible] صاحب نے ان کے خطبے کے بہت کم الفاظ بدلے ہیں)۔

دکن کی ہندی پرچار سبھا کے کارکنوں، بہنوں اور بھائیو!

ہندوستان میں کون ایسا پڑھا لکھا ہوگا جو اپنے دیس کی حالت کو سدھارنے کی کچھ بھی چاہ رکھتا ہو اور جس کی نگاہیں دکن کی ہندی پرچار سبھا اور اس کے کارناموں کی طرف نہ گئی ہوں۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں جب آپ کے یہاں کے یاتریوں کی جماعت الہ آباد پہنچی تو وہاں کے اور بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی ان کے ساتھ مل کر بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ ان میں سے چند کے ساتھ میرا تعارف برسوں پہلے کا تھا۔ آپ کے "یاتریوں" کا خلوص، ان کی وہ بے غرض خدمت جس میں غرور کا پتہ نہ چلتا تھا ان کے دیش پریم سے بھرے ہوئے دل جن میں تنگ خیالی اور فرقہ پرستی کی گنجائش تک نظر نہ آتی تھی۔ ان کے نہایت پاکیزہ خیالات اور ان کی اعلیٰ کارگزاریاں —— ان سب نے مل کر میرے دل پر وہی اثر ڈالا جو شمالی ہند کے ہزاروں اور باشندوں کے دلوں پر ڈالا ہوگا۔

ایک اور چیز تھی جس نے پہلے سے میرے دل کو اس اثر کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ میرے گہرے دوست پنڈت بنارسی داس چترویدی نے یہاں سے جا کر مجھے جو حالات سنائے تھے۔ آپ کے

یاتریوں کے خیالوں، تمناؤں اور حوصلوں میں مجھے ان کی زندہ تصویر دیکھنے کو مل گئی۔ جماعت کے رہنماؤں کے تقاضے سے متاثر ہو کر میں نے وعدہ کر لیا کہ کسی موقع پر دکن آ کر زیادہ نزدیک سے آپ کی ان مبارک کوششوں کا مطالعہ کروں گا۔ وعدہ اور قرضہ برابر۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں پہلا زوردار تقاضا ہوا۔ اس وقت سب کاموں سے بے تعلق ہو کر میں نے کچھ لکھنے پڑھنے کا کام ہاتھ میں لے رکھا تھا جو ابھی تک پورا نہیں ہوا اور ممکن ہے ابھی کئی سال لے لے۔ بغیر یکسوئی کے اس طرح کا کام کم از کم میرے جیسے کمزور انسان کے لئے ناممکن ہے۔ میں نے جیوں تیوں کر کے اس سال ٹال دیا۔ اس سال پھر تقاضا ہوا۔ اب کی بار ٹالنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اس لئے آپ کی جماعت کا قدرداں، آپ کے رہنماؤں کی کارگذاریوں کا قایل اور آپ کے پریم میں بندھا ہوا میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔

سارے ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان کو قومی زندگی کے لئے ضروری اور اہم سمجھتے ہوئے بھی اس قسم کی تحریک سے میں زیادہ تر اپنے کو الگ رکھتا رہا ہوں۔ اس کے وجوہ ہیں۔ لیکن آپ کی جماعت کے ساتھ مہاتما گاندھی کے گہرے تعلق اس کے خاص رہنماؤں کے روشن خیالات اور کاکا کالیلکر، پروفیسر شستری، پنڈت رام نریش تری پاٹھی اور منشی پریم چند جی جیسے جانبے تعصب ادیبوں کے نام دیکھ کر جنھوں نے مجھ سے پہلے چار برس تک اسی نیک فرض کو ادا کیا ہے۔ غرض ان تینوں باتوں نے مل کر آپ کی دعوت منظور کرنے کے بارے میں میرے تامل کو دور کر دیا۔

مجھے اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید جیسا کام کو اپنی کئی نسلوں کی کمزوریوں اور اپنے چاروں طرف کی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے ہم شمال میں نہ کر سکے، باوجود کچھ کوششوں کے جن کی گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے ہم نے ایک حد تک اور زیادہ پیچیدہ کر دیا۔ جیسے جائے قومیت کو سیمنٹ بنانے کے ہم نے اور زیادہ پھوٹ اور اختلافات کا سبب بنا دیا۔ اس بڑے کام کو اس دلدل سے نکال کر اس کا اصلی سندر روپ دینا اور دکن کی نہایت موافق آب و ہوا میں اس سے سچ مچ ہندی قومیت کے پیدا کرنے کا کام لینا آپ ہی کے لئے مقسوم ہو چکا ہے۔

قومی زبان کے بنانے میں دکن کی بڑی خدمت | ہماری آج کل کی ہندوستانی زبان کی پیدائش کی جگہ شمال میں تھی۔

ہر ایک یورپ کے ایک ایک ملک کے برابر ہے تمام ہندوستان کی خوبصورتی کو اور زیادہ دوبالا کرتا ہے اور اس اختلاف کو ایک خاص حد تک قائم رکھتے ہوئے اس میں یکتائی پیدا کرنا ہندوستانی قومیت کا فرض ہے۔

یوں تو ہر دیس اور ہر پردیس کی زبانیں سدا بدلتی رہیں گی مگر قومی زبان کا فایدہ یہ ہے کہ جب کہ ایک گجراتی دوسرے گجراتی کے ساتھ گجراتی میں بات کرے، اور ایک بنگالی دوسرے بنگالی کے ساتھ بنگالی میں۔ ایک گجراتی ایک بنگالی کے ساتھ یا ایک پنجابی ایک مدراسی کے ساتھ جب بات چیت کرے تو قومی زبان میں کرے اور ہمالیہ سے راس کماری تک اور مشرقی بنگال سے شمال مغربی سرحد تک ہمارے تمام صوبوں کا باہمی کاروبار اسی زبان میں ہو۔ ہر ہندوستانی کو اس پر ناز ہو۔ اس کے پیدا کرنے میں سب کا حصہ ہو ہر صوبہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے جاننے والے ہوں اور تمام ہندوستان کے جسم کی نسوں میں اس کی روانی اسی طرح کی ہو جس طرح خون کی جسم میں ہوتی ہے۔ بغیر اس کے ہندوستانیت یا قومیت کی خواہش نہ ہم میں ابھر سکتی ہے اور نہ دیر تک قائم رہ سکتی ہے۔

قومیت میں یقین | مگر اس کے لئے سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں قوم یا قومیت کی ٹھیک ٹھیک تمنا ہو۔ جسے قوم کو اپنی یکتائی میں یقین نہیں وہ ایک قومی زبان کے پیدا کرنے میں معاون نہیں ہو سکتی۔ بدقسمتی سے اس زبردست سوال پر ہمارے دلوں میں ابھی تک بے حد گتھیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس بارے میں ہمارا تعصب اور ہماری لاعلمی دونوں انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ یہی ایک خاص وجہ ہے کہ قومی زبان کا قیام ہو یا قومی آزادی کا حصول کہیں بھی اپنی کوششوں میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔

ان گتھیوں میں سب سے زبردست گتھی یہ ہے کہ ہم ابھی تک ہندو اور مسلمان، برہمن اور غیر برہمن، گجراتی اور بنگالی اور دوسری جگہ اس سے بھی چھوٹی چھوٹی قسم کی تنگ خیال تمناؤں سے اوپر نہیں اٹھ سکے۔ یہاں تک کہ قوم اور اسی طرح تہذیب یا کلچر کی جو وسیع تمنائیں ہمارے دماغوں میں پیدا ہونی چاہئے تھیں جن سے ہمیں ایک ہندوستانی قوم اور ایک ہندوستانی تہذیب کے قیام میں امداد مل سکتی ان کی بجائے

آج کل کے ادب میں ہندو قومیت اور مسلمان قومیت، بنگالی قوم اور گجراتی قوم، ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب، برہمن کلچر اور غیر برہمن کلچر جیسی آوازیں جو ہمارے اختلاف کو بڑھانے والی ہیں اور جو ہمارے دیس کے اندر ایک قومیت یا ہندوستانیت کے قیام میں زبردست رکاوٹ ہیں اکثر سننے میں آتی رہتی ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہماری آج کل کی گری ہوئی حالت میں ان چھوٹی چھوٹی تمناؤں میں بھی کچھ حقیقت کا شائبہ ہے۔ لیکن یہ ہمارا نصب العین، ہمارا معیار، ہمارا مشن نہیں ہے۔ ان سب میں اختلاف، پھوٹ اور نفرت کی دو خاص لہریں ہیں جن میں سے اس وقت دیس کے کچھ حصہ میں ایک کا اور دوسرے حصہ میں دوسرے کا زیادہ زور دکھائی دے رہا ہے۔ یہ دونوں زہریلی لہریں یہ ہیں — ایک طرف ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کے اختلاف میں یقین اور اس اختلاف کو قائم رکھنے کا خیال اور دوسری طرف برہمن تہذیب اور غیر برہمن تہذیب کے اختلاف میں یقین اور اسے قائم رکھنے کی فکر۔

ہندو اور مسلم تہذیبیں ان دونوں میں میں ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کے اختلاف کے بارے میں آپ کا کچھ زیادہ وقت لینا چاہوں گا کیونکہ یہ اختلاف ہی ہماری بیشتر قومی مصیبتوں، ہماری اس وقت کی مشکلوں یہاں تک کہ اردو اور ہندی کے جھگڑوں کی بنیاد ہے۔ اس تباہ کن اختلاف کی جڑیں ہماری ایک دوسرے کی طرف سے اور اپنے ملک کی تاریخ کی طرف سے وہ زبردست لاعلمی اور وہ افسوسناک غلط فہمیاں ہیں جو ہمارے اندر کی تنگ خیالیوں کی وجہ سے قائم ہیں اور جنھیں ہمارے اسکولوں اور کالجوں کی درسی کتابیں اور فرقہ پرست ذہنیت کے لوگوں کا زہریلا پروپگنڈا زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اس تھوڑے سے وقت میں ناممکن ہے کہ میں مذہب اسلام اور مسلم تاریخ کے مختلف پہلوؤں کو یا ہندوستانی تاریخ کے مسلم عہد کے سرسری خاکہ کو بھی آپ کے سامنے رکھ سکوں یا اسلام اور ہندو دھرم پر تبصرہ اور تنقید کرکے دونوں کی بہترین خوبیوں کو آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ مگر اس بارے میں ہماری لاعلمی اتنی نقصان رساں شکل اختیار کر چکی ہے اور ایک دیس کے دو رہنے والوں، ایک قوم کے دو فرزندوں، ایک خاندان کے دو سگے بھائیوں میں ایک دوسرے سے ناواقفیت اتنی بڑھ گئی ہے اور آپس کے پریم کے لئے ایک دوسرے کو جاننا اتنا ضروری سا ہے کہ میں بہت ہی مختصر طریقے پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینا

اس کے بانی، ہندوستان سے باہر کے اس کے کارنامے، اور اس کی ہندوستانی تاریخ پر ڈالنا چاہوں گا۔

اسلام اور اس کا بانی اسلام کی پیدائش آج سے تیرہ سو سال پہلے ایشیا کے عرب دیس میں ہوئی تھی۔ اسلام اور اس کے بانی محمد صاحب کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے اُس وقت کے عربوں کی حالت کو جان لینا ضروری ہے۔ عرب کے لوگ اس وقت مذہبی حیثیت سے ہزاروں لچر اوہام پرستیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ معاشرتی حیثیت سے وہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں باہمی پریم یا اتحاد کی جگہ آئے دن خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اخلاقی حیثیت سے ان کی سیرت بہت گندی اور گنہگار تھی۔ سیاسی حیثیت سے عربوں کا ملک چار حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ شمال کا حصہ روم کے شہنشاہوں کے قبضہ میں تھا۔ مشرقی حصہ پر ایران کے بادشاہوں کی حکومت تھی۔ جنوب اور مغرب کا بہت بڑا حصہ حبش کے عیسائی شہنشاہ کے ماتحت تھا۔ صرف بیچ کا تھوڑا سا حصہ نام کو ابھی تک آزاد تھا مگر اس پر قبضہ کرنے کے لئے بھی روم اور ایران دونوں کی طرف سے کوششیں جاری تھیں۔ ایک اس طرح کے دیس اور اس طرح کے لوگوں میں آج سے ۱۳۶۵ سال پہلے محمد صاحب کا جنم ہوا۔

محمد صاحب کی کوششوں اور ان کی سیرت کو بھی میں دوسرے تاریخ لکھنے والوں کے الفاظ میں ہی بیان کرنا چاہوں گا۔ محمد صاحب کی کوششوں اور ان کی کامیابیوں کو بیان کرتے ہوئے ریورینڈ ڈبلیو آر ڈبلیو سٹیفنس اپنی کتاب "عیسائیت اور اسلام، انجیل اور قرآن" میں لکھتا ہے :۔

"جو برائیاں محمد صاحب کے وقت میں عرب میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی تھیں جن کی قرآن میں بڑے زوروں کے ساتھ برائی کی گئی ہے اور جن کی قطعی ممانعت کی گئی ہے وہ یہ ہیں :۔ شراب خوری، زناکاری اور ایک ساتھ کئی عورتوں سے بے روک شادی، بیٹیوں کا قتل، بے تحاشا جوا، سود خواری کے ذریعہ لوٹ، اور جادو ٹونے میں یقین۔ محمد صاحب کی تعلیم کے ذریعہ ان برائیوں میں سے کچھ بالکل مٹ گئیں اور باقی کم ہو گئیں۔ جس سے عربوں کے اخلاق میں بڑی ترقی ہوئی اور یہ بات اس اصلاح کے کوشش اور اس کے اثر دونوں کا ایک حیرت انگیز اور نہایت وسیع ثبوت ہے۔ بیٹیوں کا قتل اور شراب خوری کا بالکل

بلکہ ایک محب وطن اور سیاست داں کی حیثیت سے بھی افضل تھے۔ وہ مادی اور روحانی دونوں طرح کا تعمیری کام کرنے والے تھے۔ انھوں نے ایک بڑی قوم کو تعمیر کیا اور ان دونوں سے بڑھ کر ایک کہیں زیادہ بزرگ مذہب کو پیش کیا۔ جب کبھی مستقبل میں انسانوں کے درمیان اس وقت کے مقابلہ میں فرقہ وارانہ طرف داری کم ہو جائے گی اور لوگ معقولیت کے ساتھ انسانیت دوست مذہب کو ماننے لگیں گے اس وقت محمد صاحب بھی آج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عزت کے ساتھ دیکھے جائیں گے۔ فی الحقیقت محمد صاحب بڑے لوگوں میں بھی بہت بڑے تھے۔"

اس طرح کے کئی اقتباسات محمد صاحب کے مختلف یورپین سیرت نگاروں کی کتابوں سے دیئے جا سکتے ہیں۔ مگر صرف ایک اور۔ انگلینڈ کا مشہور مصنف ٹامس کارلائل محمد صاحب کی پوری سیرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی کتاب "ہیروز" ہیرو ورشپ اور ہیرواک ان ہسٹری" میں لکھتا ہے:۔

" وہ زندگی کا ایک جلتا ہوا انگارا تھا جسے گویا قدرت نے اپنی شاندار گود سے نکال کر پیدا کیا تھا سنسار کے خالق کے حکم سے وہ سنسار کو روشن کرنے آیا تھا........... وہ ایک خاموش بزرگ ہستی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی زندگی کے خاص مقصد کی طرف پوری لو لگائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے جنھیں خود فطرت مخلص ہونے کے لئے مقرر کرتی ہے۔ جب کہ دوسرے لوگ رائج الوقت نظریوں اور سنی سنائی باتوں کے پیچھے آنکھ بند کرکے چلتے رہتے ہیں اور اسی میں مطمئن رہتے ہیں وہ اپنے آپ کو ان نظریوں کے فریب میں مبتلا نہ کر سکتا تھا۔ وہ اکیلا اپنی روح کو لے کر حقیقت کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ موجودات کا عظیم ترین راز ــ خوفناک گرجگمگاتا ہوا راز۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چمک اٹھا۔ کوئی لچر چیز اب اس ناقابل بیان سچائی کو اس کی آنکھ سے اوجھل نہ کر سکتی تھی۔ جو آدمی اس سچائی کے ساتھ جسے ہم سچائی ہی کہہ سکتے ہیں اپنے زندگی کے مقصد کو کھوجنے میں لگ جائے اس میں سچ مچ ایک خدائی طاقت شامل ہوتی ہے۔ اس طرح کے آدمی کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سیدھے مادر فطرت کے دل سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ لوگ انھیں اس طرح سنتے ہیں جس طرح کسی دوسرے کی بات نہیں سنتے انھیں سننا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اور سب محض ہوائی قلعے معلوم ہوتے ہیں شروع سے ہزاروں طرح کے خیال زائروں اور آوارہ گرد لوگوں کی

طرح اس شخص کے دل میں چکر لگاتے رہے۔ میں کیا ہوں؟ یہ اتھاہ چیز جس میں میں رہتا ہوں اور جسے لوگ کائنات کہتے ہیں آخر ہے کیا۔ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں کیا مانوں؟ میرا مقصد کیا ہے؟ غار حرا اور کوہ سانی کی اندھیری چٹانوں نے ریگستان کی سخت گیر تنہائیوں نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس ابدی گردش نیلے اور خاموش آسمان نے جو سر کے اوپر پھیلا ہوا تھا اور جس پر تارے جگمگا رہے تھے کوئی جواب نہیں دیا۔ کہیں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اخیر میں اس کی اپنی روح کو اور جو کچھ خدائی الہامی قوت اس کے اندر موجود تھی اسے جواب دینا پڑا۔"

محمد صاحب کی سیرت، ان کی تعلیمات ان کی کوششوں اور ان کے کارناموں کو بیان کرنے کا یہ وقت نہیں۔ شاید سنسار کے کسی دوسرے بڑے آدمی کو بدنام کرنے کی اتنی کوشش نہیں کی گئیں جتنی محمد صاحب کو۔ اس کے بھی وجوہ ہیں جن میں اس وقت پڑنا فضول ہے۔ ایک ہندی کی کتاب میں میں نے اس سامان کی ایک لمبی فہرست پڑی تھی جسے محمد صاحب رحلت کے وقت چھوڑ گئے تھے۔ اس میں ایک سگار کا ڈبہ بھی تھا اور ایک شاہی تخت۔ جب کہ تنباکو اس وقت عرب بھر میں کہیں دیکھنے کو بھی نہ تھا اور محمد صاحب زندگی بھر کبھی کسی طرح کے شاہی تخت پر نہیں بیٹھے۔

محمد صاحب کی بیشتر زندگی مشکلوں اور سخت تکلیفوں میں گذری۔ اپنی عمر کے آخری دس سال میں وہ نئی آزادی حاصل کی ہوئی آزاد عرب قوم کے بادشاہ رہے۔ ان دس برسوں کے اندر بھی ان کی زندگی بہت سادہ، محتاط اور تپسیا کی زندگی تھی۔ حکومت کے پیسے یا زکوٰۃ کے روپیہ سے ایک کوڑی اپنے یا اپنے کنبہ والوں کے لئے لینا وہ حرام سمجھتے تھے۔ متعدد بار کئی کئی دن انھیں فاقے سے گذر جاتے تھے۔ عرب کے بادشاہ ہونے کے دنوں میں بھی انھوں نے کبھی لگاتار تین دن تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ وہ سدا اپنے کپڑوں کو خود پیوند لگاتے تھے۔ اپنی چپلوں کو خود گانٹھتے تھے اپنے اونٹ کو خود کھریرا کرتے تھے۔ اپنی بکریوں کو خود دوہتے تھے۔ اپنے مکان میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے تھے۔ کھجور کی چٹائی یا ننگی زمین پر سوتے تھے۔ ایک بار سخت بیماری کے دنوں میں پیٹھ پر بوریئے کا نشان دیکھ کر کسی نے اجازت مانگی کہ گدا نیچے بچھا دیا جائے۔ محمد صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں آرام کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا

حضرت محمد کی تمام مذہبی تلقین کا لب لباب دو لفظوں میں ہے۔

اوّل ۔ ایک خدا پر اعتقاد

دوم ۔ نیک کام کرو

حضرت محمد کی بیس سال کی خاص خاص تلقینوں کا مجموعہ قرآن مجید ہے میں نے قرآن کو بہت مرتبہ شروع سے آخر تک بڑے غور سے پڑھا ہے دنیا کے دوسرے مذہبوں کی جانب قرآن کی رائے اور اپنے مذہبی اصولوں کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مولانا ابو الکلام آزاد اپنی کتاب 'ترجمان القرآن' میں لکھتے ہیں۔

قرآن نے نہ صرف ان سب مذہبوں کے قایم کرنے والوں کو سچا مانا ہے جن کے ماننے والے اس وقت اس کے سامنے موجود تھے بلکہ صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھ سے پہلے کتنے ہی رسول اور ہادی دین ہو چکے ہیں میں سب کو سچا مانتا ہوں اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ماننا بھی خدا کی حقیقت سے انکار کرنا سمجھتا ہوں اس نے کسی مذہب والے سے یہ نہیں چاہا کہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ دے بلکہ اگر کبھی چاہا تو یہی چاہا کہ سب اپنے اپنے مذہبوں کی اصلی حقیقت پر عمل کریں کیونکہ سب مذہبوں کی حقیقی تعلیم ایک ہی ہے نہ تو اس نے کوئی نیا اصول پیش کیا اور نہ کوئی نئی راہ عمل ہی بتائی۔ اس نے ہمیشہ انہی باتوں پر زور دیا جو دنیا کے سب مذہبوں میں سب سے زیادہ جانی پوجھی باتیں رہی ہیں ایک اللہ کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ اس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے تو یہی کہا ہے " کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم کو پھر سے تازہ کر لو۔ تمہارا ایسا کر لینا ہی مجھے قبول کر لینا ہے "

قرآن کے دوسرے سورہ میں کہا گیا ہے " بلاشبہ راہ نجات کھلی ہوئی ہے یہ کسی خاص ملت کے لئے نہیں ہے جس کسی نے خدا کے آگے سر جھکایا اور جس کے اعمال نیک ہیں وہ چاہے یہودی ہو چاہے عیسائی ہو اور چاہے کوئی اور ہو وہ اپنے رب سے ثمرہ حاصل کرے گا اس کے لئے نہ کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم "

اس قسم کی بیشمار آیتیں قرآن میں سے اقتباس کی جا سکتی ہیں۔

سلطنت عرب | حضرت محمدؐ کی تعلیم نے نیم مہذب بدکردار صدیوں کے غلام اور آپس کے نفاق کے مرض میں مبتلا عربوں میں ایک نئی روح پھونک دی جس کی بدولت عربوں نے دیکھتے دیکھتے نہ صرف اپنے ملک ہی میں ایک آزاد قومی حکومت قایم کرلی بلکہ باہر نکل کر اس زمانہ کی ایرانی سلطنت اور رومن سلطنت جیسی دو زبردست طاقتوں کو شکست دے کر حضرت محمدؐ کے انتقال سے ۸۰ سال کے اندر اندر یورپ میں چین کی سرحد سے لے کر پچھم میں ہسپانیہ تک وہ عظیم الشان سلطنت قایم کی جو کم و بیش ایک ہزار سال تک قایم رہی اور جو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت خیال کی جاتی تھی تمام مغربی ایشیا تمام شمالی افریقہ اور آدھے یورپ پر عربوں کی حکومت تھی۔ یہ عرب سلطنت دنیا کے لئے ایک برکت ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس بارے میں تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں تب بھی اس سوال کی عظمت کو دیکھتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈال لینا بھی ضروری ہے۔ یہاں پر بھی پہلے ہمیں اسلام کے سامنے آنے سے پہلے مغربی دنیا کی حالت کو سمجھ لینا چاہئے۔

ظہور اسلام سے قبل یورپ کی حالت مسٹر جے ایچ ڈینیسن Emotion as the Basis of Civilization نامی انگریزی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"پانچویں اور چھٹی صدی میں مہذب دنیا فنا کی سرحد پر کھڑی تھی"

شہنشاہ قسطنطین رومن عیسائی مذہب کو رومن سلطنت کا مذہب بنانے کا اعلان کر چکا تھا۔ شہنشاہ تھیوڈوسیس نے یہ ہدایتیں جاری کردی تھیں کہ عظیم رومن سلطنت میں کسی دوسرے مذہب یا دین کے ماننے والے کو رہنے کی اجازت نہ دی جائے سلطنت میں ایک خاص محکمہ اس لئے قایم کیا گیا تھا کہ گھر گھر جاکر لوگوں کے مذہب کا پتہ لگایا جائے۔ شام، عراق، مصر، ایشیائے کوچک اور یونان میں جو صدیوں پہلے سے اس زمانہ کی تہذیب کے سب سے بڑے مرکز تھے لاکھوں آدمیوں کو اپنے قدیم مذہبی خیالات نہ چھوڑ سکنے کے جرم میں موت کی سزا دی جانے لگی یونان جیسے ذیشان قدیم ملک کا ایک ایک پرانا مندر گرادیا گیا ان میں بیشمار بودھ مٹھ بھی تھے۔ ان مندروں اور مٹھوں کی جاگیریں ضبط کرلی گئیں اگر کسی مکان یا مندر سے عود وغیرہ کے جلنے کی خوشبو آتی تھی اور یہ پتہ لگ جاتا تھا کہ یہ خوشبو مریم یا عیسائی دیوی

کے علاوہ کسی اور بت کے سامنے جلائی جا رہی ہے تو اس مکان میں فوراً آگ لگا دی جاتی تھی اس قسم کی
چھوٹی چھوٹی باتوں پر کہ کوئی شخص اپنے گھر کے اندر عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتا ہے یا انسان کا بیٹا عیسیٰ میں
خدائیت کو مانتا ہے یا کہ ایسٹر کا تہوار اسی روز مناتا ہے جس روز رومن سلطنت میں اجازت ہے
یا کسی اور روز ہفتہ کے روز پاک دن مناتا ہے یا اتوار کے روز اس طرح کی باتوں پر قصوروار کو موت
کی سزا دی جاتی تھی۔

ان مذہبی تعصبات اور ان مظالم کے ساتھ فلسفہ کی تعلیم اور علم و فضل کا چل سکنا محال تھا ہندوستان
مصر اور یونان کے نجومی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے زمین کے گول ہونے کا پتہ لگا چکے تھے لیکن
انجیل میں لکھا تھا کہ زمین چپٹی ہے رومن سلطنت بھر میں جہاں کہیں کوئی ایسی کتاب ملتی تھی جس میں لکھا ہو کہ
زمین گول ہے اسے فوراً پھونک دیا جاتا تھا اور کتاب کے ساتھ گھر کے مالک کو بھی مع بال بچوں کے آگ کے
حوالے کر دیا جاتا تھا اطالیہ یونان مصر شام وغیرہ میں سینکڑوں بیش قیمتی کتب خانے جلا دئے گئے ہزاروں
اشخاص نے اپنے اپنے کتب خانے اس لئے پھونک ڈالے کہ کہیں کسی کتاب میں کوئی ایسی بات
نہ مل جائے جس کی وجہ سے ان کو اور ان کے بال بچوں کو آگ میں جلنا پڑے۔ یونانی تہذیب کے عروج
کے زمانہ سے یونان ایشیائے کوچک شام اور مصر بھر میں متعدد کالج اور ہزاروں بڑے بڑے مدرسے تھے
جن میں افلاطون اور ارسطو جیسوں کی کتب فلسفہ بقراط جیسوں کی کتب طب یا رکلیوس اور ٹالمی جیسوں کے
علم نجوم اقلیدس اور اپولونیس جیسوں کے علم ریاضی آرکمیڈیز جیسوں کے مادی سائنس وغیرہ کی تعلیم لاکھوں
طالب علموں کو دی جاتی تھی وہ سب مدرسے اور دار العلوم روم کے عیسائی حکمرانوں کی ہدایت کے مطابق
ایک دن بند کر دئے گئے کیونکہ ان کی تعلیم انجیل کی تعلیم کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔

بقراط کو آج تک یورپ کے لوگ ابو الطب کہتے ہیں۔ عیسائی مذہب سے پہلے بقراط کی قائم
کی ہوئی یونانی علم طب کے مطابق رومن سلطنت بھر میں ہزاروں طبیب لاکھوں مریضوں کو دوائیں دے کر
اچھا کرتے تھے۔ اب پاپائے روم اور حکمران روم نے مل کر حکم نافذ کر دیا کہ دواؤں کے ذریعہ کسی مریض کا
علاج کرنا خلاف مذہب اور گناہ ہے۔ بیماروں کو اچھا ہونے کے لئے عیسائی گرجا میں جا کر حضرت مریم کی

مورت (بت) کے سامنے (نذر) پیش کرنا چاہیئے اس سے دعا مانگنی چاہیئے اور عیسائی پادریوں سے گنڈے تعویذ لینے چاہئیں یا عیسائی صلیب کی لکڑی یا عیسائی ولیوں کی ہڈیوں سے اپنا بدن چھلانا چاہیئے اس کے خلاف چلنے والے کو یا کسی بھی بیمار کو دوا دینے والے کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔

یہ سب ایمان ہے کہ مغرب کے اس زمانے کے تمام عالم کا صرف ایک پھیکا اور نامکمل خاکہ ہے جبکہ اسلام اور عربوں کا دنیا کے اسٹیج پر ظہور ہوا۔ عیسائی رومن حکمران جسٹینین ا کی تمام لڑائیوں میں (اور جسٹینین کی تمام لڑائیاں مذہبی لڑائیاں ہوتی تھیں جو عیسائی پادریوں کے فتوؤں کے ساتھ شروع ہوتی تھیں اور جن میں ہر لڑائی کے بعد جسٹینین کے عیسائی مہنت (درویش) آس پاس کے تمام علاقہ میں جاکر تلوار ہاتھ میں لئے ایک ایک آدمی سے پوچھتے تھے کہ تم روم کے عیسائی مذہب کو مانتے ہو یا نہیں اور انکار یا پس وپیش کرنے والے کو فوراً تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے) صرف جسٹینین کی ان مذہبی لڑائیوں میں ماہرین تواریخ کے مطابق سب ملاکر دس کروڑ انسان اس زمین پر سے اٹھ گئے۔ جینیس کی اس بات میں گہری سچائی ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی کے درمیان مہذب زمانہ عالم فنا کے منہ پر کھڑا ہوا تھا۔ جہالت اور ظلم کی ایک زبردست گھٹا دنیا کے تمام اس حصہ کے اوپر چھائی ہوئی تھی اور یورپ کے ان تمام حصوں میں جو عرب سلطنت کے باہر رہ گئے ایک ہزار برس تک چھائی رہی۔

ہندوستان کے باہر اسلام کے کارنامے | جسٹینین کے مرنے سے چار سال کے اندر حضرت محمدؐ پیدا ہوئے اسلام اور عربوں نے نمودار ہو کر اس حالت میں کیا کچھ کیا اس حالت کو کہاں تک درست کیا یہ بات تاریخ کے مطالعہ سے ہی تعلق رکھتی ہے کل مذہبی آزادی اور رواداری سب مذہبوں کی بنیادی وحدت رعایا کے مذہبی خیالات اور رسم ورواج میں حکومت کی غیر جانبداری وغیرہ کے بلند اصول اس سے سینکڑوں برس پہلے ہندوستان ایران مصر اور یوروپ میں پہونچ چکے تھے لیکن اب وہ صرف یونانی کتابوں کے اندر بند تھے رومن حکمران جولیس نے جو زرتشت کے مذہب کی مصر کی شاخ کا ماننے والا تھا اور جس کا شمار ہندوستان کے اشوک چندرگپت اکبر اور ایرانی شہنشاہ دارا کے ساتھ دنیا کے بڑے سے بڑے صلح جو شہنشاہوں میں کیا جاتا ہے روم اور یوروپ کو پھر سے ان اصولوں پر چلانا چاہا مگر عیسائیوں کے مذہبی اندھے پن کی

رہ کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکا ایک کٹر مذہب عیسائی کے ہاتھوں اسے اپنی جان دینی پڑی جولیس کے بعد
کے شہنشاہ پھر عیسائی ہوتے جہالت اور ظلم کی گھٹا اور زیادہ کالی ہوتی چلی گئی۔

عربوں کی سلطنت پہلی طاقت تھی جس نے کامیابی کے ساتھ عیسائی یوروپ کو مذہبی رواداری کا سبق
پڑھایا اور ایک مصیبت زدہ دنیا کے اندر پھر سے پوری پوری مذہبی آزادی کے اصول کو قایم کیا۔ عربوں کی طاقت
کے اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کا سب سے بڑا راز یہی تھا کہ مصیبت زدہ رعایا ہر جگہ ان کا بڑی خوشی کے ساتھ
استقبال کرتی تھی جس ملک کو وہ لوگ فتح کرتے تھے اس میں سب سے پہلے ان کا کام ہوتا تھا کہ تمام
رعایا کے لئے مذہب کے معاملوں میں پوری آزادی کا اعلان کر دیا جاتا تھا سب کے مندروں گرجاؤں اور
دیگر عبادت گاہوں کی حفاظت کا بار یہ لوگ اپنے اوپر لیتے تھے قدرتی طور پر سائنس صنعت وحرفت کھیتی اور
تجارت نے عربوں کے زمانہ حکومت میں اتنی ترقی کی جس کا پہلے خیال بھی نہ تھا۔ عراق میں پہنچتے ہی عربوں کا
پہلا کام تھا چیلڈین تہذیب کے زمانہ کی دجلہ اور فرات نامی ان خوبصورت نہروں کو پھر سے صاف اور جاری
کرانا جو صدیوں سے بند پڑی تھیں۔ مصر میں عربی فاتح عمر نے لاکھوں مزدور لگا کر اس نہر سویز کو صاف کرایا
اور اسے نئے سرے سے تیار کرایا جو صدیوں سے سوکھی پڑی تھی اور جب سے اس کے بعد صدیوں تک
برابر یوروپ اور ایشیا کے درمیان بڑے سے بڑے جہاز آتے جاتے رہے آج کل کی نہر سویز عمر کی ہی
کھدائی ہوئی ہے جسے فرانسیسیوں نے پچھلی صدی میں پھر سے صاف کرایا۔ ایک عمر تک کے تمام لڑکوں اور
لڑکیوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم جاری کرانے کا سہرا دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلے شاید خلیفہ عمر ہی کو
حاصل ہوا۔ پرانی یونیورسٹیاں پھر سے جاری کی گئیں سلطنت بھر میں ہزاروں نئے اسکول قایم کئے گئے
ہزاروں کتب خانے کھولے گئے نجوم اور سائنس کے مطالعہ کے لئے جا بجا رصدگاہیں اور دار العمل قایم کئے گئے
تمام قدیم یونانی کتابوں کے عربی اور دیگر زبانوں میں ترجمے کئے گئے۔ چین اور ہندوستان جیسے ملکوں میں
علم کی تلاش کی گئی۔ تعلیم کو مذہب سے آزاد کیا گیا۔ خلیفہ کے ماتحت عیسائی، یہودی اور بودھ تک یونیورسٹیوں
کے پروفیسر اور مدرسوں کے سرکاری انسپکٹر مقرر ہوتے تھے۔ اس زمانے کی اطالیہ اور شمالی فرانس کے
اندر کسی انسان کے پاس زمین کے نقشہ کا گلوب مل جاتا تھا تو اس کی سزا موت تھی عربی ہسپانیہ میں جغرافیہ

کی تعلیم مکوب کے ذریعہ دی جاتی تھی جب کہ سیکڑوں برس بعد انگلستان میں ایک بھی پختہ سڑک نہ تھی اور برسات کے دنوں میں لندن کا کوئی آدمی بغیر گھٹنوں یا کم سے کم ٹخنوں تک کیچڑ میں پاؤں رکھے اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا اس زمانہ میں عربوں کے ماتحت ہسپانیہ میں سنگ مرمر کی عمارتیں اور شاندار محل بنے ہوئے تھے۔

گیارھویں بارھویں اور تیرھویں صدی میں عربی زبان یورپ کی تعلیم فلسفہ اور سائنس کی زبان تھی۔ فرانس یا انگلستان میں کوئی انسان ایسا نہ مل سکتا تھا جسے دلدادہ علم کہلانے کا شوق ہو اور جو عربی جانتے اور عربی بول سکنے کا اعزاز نہ رکھتا ہو۔ بلاشبہ ساتویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی تک یورپ کے اندر صرف عربوں نے ہی فلسفہ اور سائنس کے شعبوں کو زندہ رکھا ڈریپر کے الفاظ میں "علم کا جھلملاتا ہوا چراغ اس وقت روشن رکھا گیا جبکہ وہ بجھنے ہی کو تھا عربوں ہی نے اسے ہم تک پہنچایا۔ عرب ہی یورپ کے اندر سائنٹیفک کیمسٹری ظہور میں لائے یونانیوں نے مختلف علوم کو جس جگہ چھوڑا تھا عربوں نے انہیں بہت زیادہ ترقی دی۔

عربوں کے زمانہ حکومت میں لوگوں کے اخلاق میں جو حیرت انگیز اصلاح ہوئی اور سائنس نے جو بے مثل ترقی کی اسے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کا نتیجہ بتاتے ہوئے تاریخ نگار مسٹر جے ڈبلو ڈریپر A History of the Intellectual Development of Europe (یورپ کی ذہنی ترقی کی تاریخ) نامی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"ایشیا اور یورپ کے لوگ اپنی روزمرہ کی رہنمائی کے لئے اور یورپ اور امریکہ کے لوگ سائنس کی روشنی کے لئے قرآن کے کتنے زیادہ رہین منت ہیں۔......... جب یورپ اس سے زیادہ مہذب نہیں تھا جتنا اس وقت (افریقہ کا ملک) کیفر یریا ہے اس وقت عرب نہ صرف سائنس میں ترقی کر رہے تھے بلکہ نئی سائنس پیدا کر رہے تھے فلسفہ، ریاضی، نجوم، کیمیا، طب کے میدانوں میں ان کی فتوحات ان کے فوجی فتوحات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شاندار، زیادہ دیرپا اور اسی لئے زیادہ اہم ثابت ہوئیں۔

ڈینسن جس کا اقتباس ہم اوپر درج کر چکے ہیں اسلام سے قبل کی مغربی دنیا کی حالت عیسائی رومی سلطنت کے ذریعہ اس کی تباہی اور اسلام کے ذریعہ اس کے احیاء پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔
اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تہذیب جس کی تعمیر میں چار ہزار برس صرف ہوئے تھے ٹکڑے

آنے سے پہلے ہندوستان کے مسلمان حاکم ہندوستان کی رعایا کے ساتھ تعصب اور تنگ دلی سے کام لیتے تھے۔ تاریخ اس کے بالکل خلاف ہے تاریخ نگار ڈبلیو ایم ٹارنس (ایشیا کی سلطنت) نامی کتاب میں لکھتا ہے۔

دہلی کے ابتدائی شہنشاہوں کے دور سے سترھویں صدی تک تمام مذہبوں کے ساتھ مکمل رواداری کا سلوک کیا گیا کیا وہ لوگ جنھوں نے ایسوں کے مقبرے بنائے ہیں جو اس زمانہ میں یوروپ کو مذہب کے نام پر قتل کئے جانے والوں کے لئے ایک زبردست قبرستان بنانے میں لگے ہوئے تھے اور ضمیر کی پابندی کرنے والے مفرورین سے امریکہ کی نئی بستیاں بسا رہے تھے ہندوستان کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں کیا وہ بے شرمی کے ساتھ یہ دعویٰ کر کے کہ ان کی تہذیب اس زمانہ کی ہندوستانی تہذیب سے زیادہ سچی تھی تاریخ کا گلا گھونٹ سکتے ہیں اگر اس دعوے کے ثبوت میں انہی کی لکھی ہوئی تاریخ پر اعتبار کر کے انہی کو شہادت کے لئے بلا لیا جائے تو کیا حالت دکھائی دے گی ایک طرف ان کے مذہبی جنون سے بھرے ہاتھوں سے (سترھویں صدی کے عیسائی مذہب کی پریسبیٹیرین شاخ کے) کونیٹر لوگوں کا خون کیتھولک طبقہ کے لوگوں کا خون اور پیورٹین طبقہ کے لوگوں کا خون تیزی سے ٹپک رہا ہے اور دوسری طرف اس تمام عرصہ میں وہ نئی پھانسیاں کھڑی کرتے جا رہے تھے نئی بیڑیاں گھڑ رہے تھے اور ایکٹس آف یونیفارمٹی نام کے خوفناک قانون پاس کر رہے تھے (جن کے مطابق یوروپ کے ہر ایک ملک میں اس فرقہ کو چھوڑ کر جسے اس زمانہ کے حکمراں مانتے تھے باقی عیسائی فرقوں کے بھی لاکھوں آدمی زندہ جلا دئے گئے یا انتہائی تکلیف دے دے کر مار ڈالے گئے)۔

کوئی ہندو یا مسلمان اپنے پیدائشی عقیدوں کی وجہ سے کسی پبلک ملازمت کے ناقابل نہ سمجھا جاتا تھا مسلمان بادشاہ خوشی کے ساتھ بڑے بڑے ذمہ دارانہ عہدے پڑھے لکھے اور ہوشیار برہمنوں کے سپرد کر دیتے تھے اور مہاراجاؤں کے درباروں میں بہت سے مسلمان عزت و حشمت حاصل کر لیتے تھے۔ حیدر علی کے وہ وزیر جنھوں نے ایک عرصہ تک اس کی موت کو چھپائے رکھا نہایت اعلیٰ ذات کے ہندو تھے اور جب مرشد آباد میں افسر خزانہ کا تقرر ہونے والا تھا تو نواب ناظم نے نند کمار کو

بجائے پورنیا خاں کے مقرر کرنا چاہا تو اس کو متعصب لوٹیپو کو مذہبی مجنون کہا جاتا ہے لیکن جنوبی ہندوستان کی حکومتیں (جب ہم نے ان کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا) مذہبی تعزیر کے قوانین کے سسٹم سے نا آشنا تھیں جو کہ اس زمانہ میں خود ہماری اور دیگر یورپین سلطنتوں کے نہایت عزیز انسٹی ٹیوشن تھے۔ آئرلینڈ میں کوئی کیتھولک زمینداری کا وارث نہ ہو سکتا تھا نہ فوجی افسر بن سکتا تھا اور نہ جوڈیشل محکمہ کا جج ہو سکتا تھا فرانس میں ہگونو فرقہ کے ایک ایک جولاہے کو سمندر پار بھیج دیا جاتا تھا اور سویڈن میں سوائے لوتھرس فرقہ کے اور کوئی جیوری میں شامل نہ ہو سکتا تھا اور ہسپانیہ میں سوائے حکمرانوں کے اور کسی عیسائی فرقہ کے پیرو کی تجہیز و تکفین عیسائی رسم و رواج کے مطابق نہ ہو سکتی تھی اسی زمانہ میں سنی اور شیعہ برہمن اور سکھ آزادی کے ساتھ ہندوستان کے ہر شہر اور دربار میں امتیاز اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے مقابلہ کرتے تھے"

ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی طرز حکومت کی تاریخ موٹے طریقہ پر ایک ہزار سال تک کے مختلف خاندانوں کی تاریخ ہے اتنے طویل عرصہ تک کسی بھی ملک یا مذہب کی تاریخ میں اچھے اور برے ہر طرح کے لوگ مل سکیں گے لیکن اگر ہم بے تعصبی سے اس تمام تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہندو یا مسلمان کسی بھی ہندوستانی کو اس پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ایک اورنگ زیب کو چھوڑ کر پہلے کے اور بعد کے باقی تمام ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کا زمانہ مذہبی رواداری کی نظر سے دنیا کی تاریخ میں ایک معیاری زمانہ تھا بابر ہمایوں اکبر جہانگیر شاہجہاں اور اس کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا تھا دونوں مذہبوں کی یکساں قدر کی جاتی تھی اور مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کسی طرح کا بھی تعصب نہ کیا جاتا تھا۔ دلی کے مغل دربار کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے خاص خاص تیوہار بڑے جوش اور دھوم دھام کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ دسہرے کے دن شہنشاہ کا جلوس نکلتا تھا جس میں ہاتھیوں اور گھوڑوں کو خوب سجایا جاتا تھا اور ہندو اور مسلمان امرا سج بن کر ساتھ ساتھ شامل ہوتے تھے رکشا بندھن (سلونو) کے دن برہمن لوگ اور ہندو رؤسا اور سردار شہنشاہ کی کلائی پر راکھی ہندوؤں کے رواج کے مطابق

متبرک دھاگا) باندھتے تھے۔ دیوالی کی رات کو شاہی محلوں کے اندر روشنی ہوتی تھی اور جوا تک کھیلا
جاتا تھا۔ شوراتری اور یم دوتیا عید اور شب برات بھی اسی شان سے منائی جاتی تھی۔ ہر شہنشاہ کی
طرف سے بےشمار مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں اورنگ زیب متعصب تھا لیکن اورنگ زیب کے
دربار میں بھی ہندو وزیر اور اس کی فوج میں ہندو سپہ سالار موجود تھے۔ اورنگ زیب کا وزیر مالیات
آخر تک ہندو رہا آج تک شمالی ہندوستان بھر میں بہت سے ہندو مندروں کے پجاریوں اور مالکوں
کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں اورنگ زیب نے ان مندروں کو جاگیریں عطا کی
ہیں اس طرح کے دو فرمان ابھی تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اریل میں سومیشور ناتھ کے
مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔ دو سو برس سے زاید تک مغل سلطنت میں گائے ذبح کرنے کی
قانونی ممانعت تھی اور اس پر سختی کے ساتھ عملدرآمد ہوتا تھا۔

تاریخ انسانوں کی تاریخ ہے اور اس میں سے ہر طرح کی انسانی کمزوریوں کی مثالیں ڈھونڈ
کر نکالی جا سکتی ہیں۔ ہندو اور بودھ بھی ایک دوسرے کے ساتھ لڑے جینیوں اور ہندوؤں نے ایک دوسرے
پر مظالم کئے شیو اور شکتی فرقوں نے (جو دونوں ہندوؤں ہی کے فرقے ہیں) ایک دوسرے کے
سر توڑے ہندو اور مسلمانوں میں بھی جب لڑنے کی امنگ اٹھی ایک دوسرے سے لڑے۔ لیکن
ہندوستانی تاریخ کی دو باتوں سے کسی بھی بے تعصب مطالعہ کرنے والے کو انکار نہیں ہو سکتا۔
ہندوستانی تاریخ کے ماہر خصوصی میجر باسن داس وسو مرحوم نے چند سال ہوئے گروکل کانگڑی
کے کنووکیشن ایڈریس میں کہا تھا۔

یہ صاف ہے کہ مذہب کے نام پر اور فرقہ وارانہ اختلافات کی بنا پر جس طرح زبردست حیوانی مظالم
اس زمانہ کے ہر ایک یورپین ملک میں ہو رہے تھے وسیع الخیال ہندوستان میں ان کا کہیں نام بھی نہ
تھا۔ اور جس طرح کی رواداری اور باہمی محبت کا سلوک مسلمانوں کے بیشتر دور حکومت میں ہندوؤں اور
مسلمانوں میں موجود تھا یورپ میں کہیں اس کا سایہ بھی نہ تھا؛ رعایا کی بہبودی۔ خوشحالی۔ مالی آسودگی
کی نظر سے مغل شہنشاہوں کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بلاشبہ طلائی دور تھا۔ دولت پیداوار

اور خوشحالی کی جو چہل پہل ہندوستان میں شاہجہاں کے زمانہ میں دیکھنے میں آتی تھی وہ شاید ہی دنیا میں کسی دوسرے ملک کو نصیب ہوئی ہو۔ اس مقولہ کے ثبوت میں ہندوستانی تاریخ نگاروں کے علاوہ اس زمانہ کے بیشمار انگریز اور دیگر غیر ملکی سیاحوں کے بیانات نقل کئے جاسکتے ہیں۔ قومی زندگی کے مختلف حصوں سوسائٹی کے رسم ورواج علم سیاسیات سائنس فن وہنر صنعت وحرفت تجارت وغیرہ میں مسلم دور سلطنت کے اندر ہندوستان نے جو بے نظیر ترقی کی مشہور تاریخ نگار سر جادو ناتھ سرکار نے اسے اپنی کتاب میں اور حال ہی میں مختصر صورت سے "ہندوستان کو مسلم حکومت کے دس عطیے" نامی اپنی ایک تحریر میں اور دیگر بہت سے تاریخ نگاروں نے بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اسلام کیسے پھیلا ایک اور افسوس ناک غلط فہمی بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے پھیلنے کے بارے میں ہے ڈی ڈبلو آرنلڈ نے اپنی کتاب *The Preaching of Islam* تبلیغ اسلام میں دنیا کے ایک ایک ملک میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کو خاصی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے سر جادو ناتھ سرکار نے بھی اس مضمون پر کچھ روشنی ڈالی ہے ڈاکٹر تاراچند نے اپنے عالمانہ مضمون *The Influence of Islam on Indian Culture* (ہندوستانی تمدن پر اسلام کا اثر) میں ہندوستان کے ایک ایک صوبہ میں اسلام کے پھیلنے کے اسباب اور طریقے لکھے ہیں دیگر عالموں نے بھی اس مضمون پر خاصی روشنی ڈالی ہے آرنلڈ نے دکھلایا ہے کہ وہ فرضی مبلغ اسلام جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن مجید کی جلد ہوتی تھی تاریخ میں کہیں ڈھونڈنے پر نہیں ملتا۔ ہندوستان کے ایک ایک صوبہ کے حالات اس بارے میں کافی وضاحت سے مل سکتے ہیں۔ اسلام سب سے زیادہ ملکوں میں اور اس زمانہ میں پھیلا جن میں اسلام کا سیاسی اثر یا تو اس زمانہ تک پھیلا نہ تھا اور اگر پھیلا تھا تو نہایت کمزور تھا۔ سیاسی اثر کے مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کا پھیلنا رکا ہے بند ہو گیا ہے بڑھا نہیں ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ جنوب سے شروع ہوئی نہ کہ شمال سے اور یہ اس زمانہ میں جبکہ یہاں اسلام کی حکومت کا پتہ بھی نہ تھا۔ آگرہ اور دہلی کے آس ضلعوں میں جو صدیوں مسلمان سلطنت کے مرکز رہے ہمیشہ تین چوتھائی سے زیادہ

آبادی ہندوؤں کی رہی اور ابھی تک ہے اس مضمون کو وضاحت سے بیان کرنے کا وقت میرے پاس
نہیں ہے لیکن زبردستی لوگوں کو مسلمان بنائے جانے کے جو قصے لوگوں میں کہیں کہیں رائج ہیں اگر وہ
سچے بھی ہوں جو ان میں سے بلاشبہ ۹۰ فی صدی فرضی ہیں) تو بھی جن تمام ہندوستانیوں نے
مذہب اسلام قبول کیا اُن میں سے ہزارویں حصے نے بھی اس طرح کی کسی زبردستی کی وجہ سے نہ
کیا۔ شروع کی صدیوں میں زیادہ تر ہندوؤں کی چھوٹی کہلانے والی ذاتوں کے لوگوں نے ہی بڑی بڑی تعداد
نئے مذہب کو اختیار کیا اور ان کے ایسا کرنے کا سبب صاف تھا ایک طرف ایک اللہ ایک رسول
نہ کوئی دیوی نہ دیوتا سیدھے سادے اصول بنی نوع انسان میں کُل مساوات نہ کوئی اونچا نہ کوئی
نہ خدا اور اس کی پرستش کرنے والے کے درمیان کسی ولی یا مرشد کی ضرورت مذہب کی نگاہ میں
اور غریب بادشاہ اور فقیر عالم اور جاہل سب برابر دوسری طرف بیشمار دیوی دیوتا بہت
شاستر سخت مذہبی اعمال کی پابندیاں ذات پات اونچ نیچ۔ نہ بغیر برہمن پروہت کے پیدائش کی رسوم
اور نہ شادی اور موت کی رسومات ادا ہو سکیں۔ پھر اس پر ایک مذہب کے ماننے والوں میں آپس میں
سلوک جس پر مجھے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اگر ہم آٹھویں صدی سے بارھویں صدی تک ہند
کی مذہبی اور مجلسی حالت کا صحیح طور پر مطالعہ کریں (اور یہی وقت ہندوستان میں مذہب اسلام
پھیلنے کا تھا بارھویں صدی کے بعد کا نہیں) اور ساتھ ساتھ ان ہزاروں معیاری کیرکٹر رکھنے والے
فقراء کی زندگیوں کا مطالعہ کریں جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کی
راجاؤں کے دربار میں زبردست عزت تھی تو اسلام کے پھیلنے اور فروغ پانے کے اسباب اور طریقے
ہمیں آئینہ کی طرح دکھائی دے جائیں۔

اس زمانہ کی تقریباً سبھی تاریخی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈی ڈبلو آرنلڈ لکھتے
ہندوؤں کی نیچ قوموں پر اپنی کے ہم مذہبوں نے توہین اور نفرت کی جو بھرمار کی اور ان قوموں
میں کے کسی شخص نے اگر اپنی حالت بہتر بنانا چاہی اس کے راستہ میں جو ناقابل عبور رکاوٹیں ڈالیں
یہ باتیں ایک ایسے مذہبی نظام سے زبردست اختلاف رکھتی ہیں جس میں کوئی اچھوت نہیں اور

لیکن قوم یا نیشن ایک اور صرف ایک ہے ہندوستانی قومیت یا نیشنلزم کا تعلق ملک کے ساتھ ہے
مذہب کے ساتھ نہیں جس ملک کے اندر رہنے والوں کو پوری مذہبی آزادی نہیں کوئی کسی بھی مذہب کا ماننے
والا ہو سب کی یکساں قدر نہیں اور سب کو قومی زندگی میں یکساں حقوق نہیں حاصل ہیں وہ ملک بنی نوع
انسان کی ترقی میں معاون نہیں ہو سکتا اور جتنی جلدی دنیا سے مٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے آج سے
قریب ۷۰ سال پہلے نئے ہندوستان کے مشہور فلسفی اور سیاست داں شری آربندو گھوش نے اس بارے
میں ایک بڑا خوبصورت مضمون اپنے مشہور اخبار کرم یوگی میں شائع کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اس دنیا میں
پہلے بھی بیشمار آدمیوں نے متعدد بار ماں کے درشن کرنے کی کوشش کی مگر انھیں پوری کامیابی نہ ہو سکی بجائے
ماں کی مکمل صورت کے درشن کرنے کے انھیں صرف ایک ہی پہلو کی زیارت ہو سکی شواجی نے ماتا کے درشن
صرف ہندو ماتا کی شکل میں کیے گرو گوبند سنگھ نے ماں کا درشن کرنا چاہا انھیں صرف پنج آب ماتا کے
درشن ہوئے بنکم بابو نے ماتا کے درشن کرنے چاہے انھیں صرف بنگال ماتا کے درشن حاصل ہوئے وغیرہ
لیکن بھارت ماتا (ماں ہند) کی مکمل زیارت صرف جدید نیشنلزم کو ہی حاصل ہو سکی۔

تاریخی نظر سے آربندو بابو کی تصویر مکمل طور پر سچ نہیں ہے لیکن اس میں حقیقت کا بہت کچھ جزو
ہے مگر صرف فلسفیانہ یا نفسیاتی نظر سے ہمارے مستقبل کے نصب العین ہماری معیاری نظر سے ان کی بات
سولہ آنے سچی اور نہایت اہمیت رکھتی ہے۔

ہمیں بڑی تکلیف کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آربندو بابو کے وقت سے اگرچہ سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے
سنہری زمانہ کی طرح کبھی کبھی ہمیں ماتا کے مکمل درشن کی جھلک دکھائی دے گئی ہے تب بھی بیشتر ہمارے
اور ہماری معبود دیوی کے درمیان زیادہ سے زیادہ پردے پڑتے چلے گئے ہیں۔

اس کے بھی وجوہ ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں ہم میں بھی کمزوریاں ہیں سیاسیات کی شطرنج کے
ہم اتنے شاطر کھلاڑی نہیں ہیں دوسرے کا جادو ہمارے سر پر بھی چڑھ کر بولنے لگتا ہے ٹھیک ہماری
اسی وقت کی سی حالت میں انگلستان چار سو برس تک رومن لوگوں کی جوتیاں کھاتا رہا اس وقت
کے انگلستان کی تاریخ اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ انگلستان کا ایک ایک شہر ایک ایک گوشہ باہمی نفاق کا ایک

پھوٹ، محسن کشی، وطن سے غداری اور اپنے ملک اور اہل ملک کو برباد کر کے غیر ملکی حکمرانوں کو خوش رکھنے والوں سے خوب بھرا ہوا تھا۔ خدا کے فضل سے ہماری حالت اس سے بدرجہا بہتر ہے ہمیں یقین ہے کہ اپنے مرض کا علاج کرنے میں ہمیں اب صدیاں نہیں لگ سکتیں لیکن ہمیں اپنے چاروں طرف آنکھیں کھول کر دیکھنا ہوگا ہمیں اپنی کمزوریوں کو سمجھنا ہوگا اور انھیں دور کرنا ہوگا۔

جو لوگ تمام ہندوستان کے اندر ایک ہندو قوم اور ایک ہندو سلطنت کا خواب دیکھ رہے ہیں یا جو ہندوستان میں یا دنیا میں پھر سے خالص اسلامی دور قایم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں میں ان کی نیت پر شبہ نہیں کرتا لیکن وہ دانستہ یا نادانستہ اس بدقسمت ملک کی بیڑیوں کو اور زیادہ جکڑ رہے ہیں اس کی بدقسمتی اور اس کی مصیبتوں کو دیرپا بنا رہے ہیں اس کے تنگ اصول انسانی قوم کے لئے مفید نہیں ہیں دنیا ان اصولوں کو اس تنگ نظری کے مرض کو مٹا کر رہے گی ایسا نہ ہو کہ اس کا یہ روگ قومی جسم میں اتنا پیوست ہو جائے کہ مرض کے مٹنے کے ساتھ ساتھ مریض بھی ختم ہو جائے۔

(ماہی آئینہ)

تھا پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر کراہتی ہوئی آواز میں بجا تی اور لوگوں کو اپنی قابلِ رحم حالت کی طرف متوجہ کرتی تو لوگ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے، جس طرح ایک زخمی، نیم مردہ اور گھناؤنا منظر پیش کرنے والے کتے کو سڑک کے کنارے پڑا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔

وہ اپنا سارا دن شہر کی مختلف سڑکوں پر گزارتی تھی۔ رات کو سونے کے لئے اور آرام —— آرام !! —— کرنے کے لئے اسے دو تین مقامات معلوم تھے۔ انہی میں سے کسی مقام پر جا کر پڑ رہتی اور صبح کر دیتی۔ شہر کے ایک ایسے حصے میں جو نو رسا اور عمائدین کا مرکز تھا تین عالیشان مکان آس پاس واقع تھے۔ ان مکانوں کے درمیان زمین کا ایک نہایت مختصر قطعہ اس طرح پڑا تھا گویا کسی کی ملکیت نہیں۔ بڑھیا نے اس پر اپنا قبضہ جمالیا تھا اور وہ جاڑوں کی اکثر راتیں اسی کنج میں گزارتی تھی۔ ہرچند کہ وہاں چھت یا سائبان کی قسم سے کوئی چیز نہ تھی، تاہم چونکہ جگہ تنگ اور اونچی دیواروں سے گھری ہوئی تھی اس لئے سرد ہوا سے ایک حد تک محفوظ تھی اور ایک بے سروساماں انسان کو رات کی سردی سے بچنے کے لئے اس سے بہتر مقام میسر نہ آسکتا تھا۔

اس روز جب وہ شام کو اس کنج میں پہنچی اور حسبِ معمول اپنا کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی —— وہ کمبل جو شاید اس کا ہم عمر تھا —— تو اس نے یہ نہ دیکھا (وہ یہ دیکھ ہی نہ سکی) کہ آسمان پر بادل جمع ہو رہے ہیں۔ پھر جب ان بادلوں نے گرجنا شروع کیا تو غالباً اُن کی دہلا دینے والی آواز بھی اس کے بہرے کانوں تک نہ پہنچ سکی اور اس کو آنے والے طوفان سے آگاہ نہ کر سکی۔ جب بالکل رات ہو گئی، زمین سے لے کر آسمان تک اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا، تو اس نے چمکتی ہوئی بجلی کی روشنی دیکھی۔ لیکن کُندیٔ حواس کے باعث وہ اب بھی خطرے کو محسوس نہ کر سکی اور بے خبری کے عالم میں پڑی رہی۔ تھوڑی دیر میں ہوا بہت زیادہ ٹھنڈی ہو گئی اور تیزی کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کا نیم عریاں جسم جس نے بہت سے موسمی شدائد برداشت کئے تھے عام انسانی جسم کی طرح حسّاس نہ تھا۔ تاہم وہ اس تند اور سرد ہوا سے متاثر ہوا۔ اور موسم کے ناخوشگوار اثرات اس نے محسوس کئے بڑھیا نے بوسیدہ کمبل کو ہر طرف سے سمیٹا اور ٹانگوں کو اس حد تک سکیڑا کہ وہ بالکل ایک گٹھری معلوم ہونے لگی۔ لیکن سرد ہوا کی تندی اور تیزی میں فرق نہ آیا۔ اس کی خنکی بڑھتی ہی گئی۔ بڑھیا کو کسی طرح نیند نہ آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی —— شاید اس امید میں کہ ہوا تھم جائے، سردی کم ہو جائے تو پھر سو رہے۔ لیکن اس کو کئی گھنٹے یوں ہی بیٹھے رہنا پڑا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جب وہ اس طرح بیٹھی سرد ہوا کے طمانچے برداشت کر رہی تھی تو اس کا دل کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ شاید ان خوش نصیب انسانوں کے تصور سے ہم آغوش تھی جو اپنے عالیشان اور سنگین مکانوں میں مصروفِ راحت تھے، جو رات کی برفانی ہواؤں سے محفوظ تھے، جو خون کو رگوں میں منجمد کر دینے والی سردی سے بے خوف تھے۔ جن کے پاس نرم بستر تھے، گرم لحاف تھے اور سرخ انگاروں سے بھرے ہوئے آتشدان تھے۔ یا شاید وہ اس دورِ افتادہ اور بچھڑے ہوئے زمانے کو یاد کر رہی تھی جب اس کی زندگی میں سردی اور تاریکی نام کو نہ تھی۔ دھوپ تھی اور روشنی تھی، عزیزوں کی محبت تھی اور محبت کی گرمیاں تھیں۔ گرمی، جاڑا اور خزاں سب موسم آتے تھے، اپنی اپنی جدتیں اپنے ساتھ لاتے تھے اور دنیا میں بکھیر کر چلے جاتے تھے۔ نہ دن کو سڑکوں کی خاک پریشان تھی، نہ رات کو سرد ہوا کے طمانچے۔

رات کے ٹھیک گیارہ بجے ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہوئی۔ بڑھیا اس ترشح کے صحیح معنی شاید ابھی سمجھی بھی نہ تھی کہ موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ یہاں تک کہ دو چار لمحوں کے اندر موسلا دھار بارش کا سماں بندھ گیا۔ وہ چیخی، چلائی۔ مدد کے لئے لوگوں کو پکارا: "سرکار" "حضور" "بیگم صاحب" "میں بھیگ گئی" "میں مر گئی" "مجھے بچاؤ" کے آوازے بلند کئے مگر کسی نے اس کے حال پر توجہ نہ کی، کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ اس کی دردناک پکار کا جواب کسی طرف سے نہ ملا۔ جب چیختے چیختے تھک گئی تو رونے لگی، اپنی مکروہ اور بھدی آواز میں آہ وزاری کرنے لگی لیکن — گویا یہ اس کے نالہ و فریاد کا جواب تھا — بادل اور زور سے گرجنے لگا، بارش زیادہ شدید ہو گئی، ہوا کے جھونکے طوفانی موجوں کے تھپیڑے بن گئے، درختوں کی وزنی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر خوفناک آوازیں پیدا کرنے لگیں، نالے ندیاں بن کر بہنے لگے، رفیع الشان عمارات کی بلندیوں سے آبشار رواں ہو گئے، مکانوں کی پختہ چھتوں پر اور زمین کی چادروں پر مینہ کا شور بھوتوں اور جنوں کا رقص معلوم ہونے لگا، فضا بحرِ مواج کا نمونہ بن گئی، عالم تیرہ و تار ہو گیا۔ دنیا متلاطم ہو گئی، اور اس تلاطم میں، اس ہولناک سیلاب میں، اس ہیبت انگیز اور قیامت خیز طوفان میں بڑھیا کی فریاد غرق ہو گئی — اپنی تمام مظلومیت اور بیچارگی، تمام ناتوانیوں اور ناکامیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

اب جب کبھی رات کو زور کی بارش ہوتی ہے، تیز اور تند ہوائیں چلتی ہیں، بجلیاں کڑکتی ہیں، اور بادل گرجتے ہیں تو ان عالیشان مکانوں کے رہنے والوں کو باد و باراں کے طوفان میں خوفناک انسانی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ﴿

سرمایہ جمع کرنے کا حق ہوگا لیکن وہ اس کو ذاتی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے اور نہ ہی ایسوسی ایشن کے مرکزی دفتر سے انھیں کوئی امداد ملے گی۔ ان نمائندوں کو ماہ بماہ اپنے کام کی روداد اور آمد و خرچ کا حساب مرکز میں بھیجنا پڑے گا۔

اعزازی کارکن | اعزازی کارکن نمائندوں اور معمولی ارکان کے علاوہ ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ دیہات کی بنی ہوئی چیزیں خود استعمال کریں اور دوسروں میں اُن کا پرچار کریں اور دیہاتیوں کی جو خدمت اُن کے بس میں ہو کریں اُن کو ہر تیسرے مہینہ اپنی کارگذاریوں کی روداد مرکزی دفتر میں پیش کرنا ہوگی۔

تنخواہ دار کارکن | اُن کارکنوں کے علاوہ جو ضلعوں کے نمائندے خود مقرر کریں گے اور خود ہی اُن کو تنخواہ دیں گے نیز ایسوسی ایشن کے مرکزی دفتر کے ملازموں کے ماسوا بورڈ ایسے کارکن بھی ملازم رکھے گا جو دیہاتوں میں آباد ہو کر ایسوسی ایشن کے پروگرام کے مطابق سدھار کا کام کریں گے۔ یہ کارکن عام طور پر ایسے علاقوں میں مقرر کئے جائیں گے جہاں پہلے سے ایسوسی ایشن کے نمائندے نہ ہوں گے۔ ان کارکنوں کو گذر اوقات کے لئے دس روپے ماہوار دئے جائیں گے۔

شرکاء | ہر شخص جو ایسوسی ایشن کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہے اور اُسے کم از کم سو روپیہ سالانہ چندہ دیتا ہے وہ ایسوسی ایشن مذکور کا شریک متصور ہوگا۔ اور جو شخص ایک ہزار روپیہ یکشت دے گا وہ ایسوسی ایشن کا شریک دائمی سمجھا جائے گا۔

مشیر | مشیر وہ ہیں جو اپنی ذاتی مصروفیتوں کے باوجود ایسوسی ایشن کو ضرورت کے وقت مفید مشوروں سے بلا معاوضہ ممنون کریں۔

ان شعبوں کے علاوہ ایسوسی ایشن اپنے پروگرام میں ملحقہ اداروں اور منظور شدہ اداروں سے بھی کام لے گی۔

ملحقہ ادارے | ملحقہ اداروں میں آشرموں اور اس قسم کی دوسری قومی انجمنوں کا شمار ہوگا جن کا مقصد دیہات کی اصلاح اور دیہاتیوں کی خدمت کرنا ہے اور نیز اُن کے اغراض و مقاصد میں کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے ایسوسی ایشن سے اصولاً تضاد واقع ہوتا ہو۔

منظور شدہ ادارے | منظور شدہ اداروں سے مراد وہ دکانیں اور اشخاص ہیں جو ایسوسی ایشن کے زیر اثر دیہات کی بنی ہوئی چیزیں مہیا کریں اور اُن کو فروخت کریں۔ یہ لوگ ایسوسی ایشن کے تجارتی کارندے ہوں گے اس وقت تک ایسوسی ایشن کی طرف سے حسب ذیل اشیاء کی خرید و فروخت کے متعلق اجازت نامے دئے جاچکے ہیں۔ چکی کا پسا ہوا آٹا۔ گڑ۔ شہد۔ ہاتھ کا نکالا ہوا چاول۔ کولھو کا تیل۔ ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ۔ گھی۔ دال اور خشک پھل۔

مالیات | ایسوسی ایشن کا نصب العین لامرکزیت ہے اور وہ نہایت خلوص سے اُس پر عمل پیرا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے پروگرام میں مقامی طور پر مالی امداد کا انتظام کیا ہے۔ اُس کے نمائندے اپنے کام کے لئے اپنے اپنے حلقوں سے چندہ فراہم کریں گے البتہ ایسوسی ایشن کا مرکزی دفتر اپنے ہمدردوں سے عطیات یا چندے قبول کرتا ہے اور نیز اُسے اپنے معمولی شرکاء اور دائمی شرکاء سے سالانہ چندے بھی وصول ہوتے ہیں۔ امید ہے آگے چل کر مرکزی دفتر کا کام ملحقہ اداروں اور منظور شدہ اداروں کی فیسوں سے چل جایا کرے گا۔

ارکان کی تعداد | ۳۰ر نومبر ۱۹۳۵ء تک ایسوسی ایشن کے مختلف ارکان کی تعداد حسب ذیل تھی۔

معمولی ارکان	۴۲۳	منظور شدہ دکانیں	۲۷
نمائندے	۷۱	ملحقہ ادارے	۵

نشر و اشاعت | ایسوسی ایشن نے جن چیزوں کے متعلق اس وقت تک قابل اعتماد معلومات فراہم کی ہیں اُن پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے ہیں۔ نیز ایسے اغراض و مقاصد کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھے گئے ہیں اور اس وقت ہفتہ وار "ہریجن" ایسوسی ایشن کا ترجمان ہے۔ یہ اخبار انگریزی۔ گجراتی اور ہندی میں شائع ہوتا ہے۔ کارکنوں کو چاہئے کہ وہ مفید مشوروں کے لئے اس کا مطالعہ کریں۔

انجمن کا پروگرام | ظاہر ہے کہ دیہات کے تمام مسائل کو سلجھانا ایسوسی ایشن کے بس میں نہیں۔ مزید برآں بعض مسائل تو صرف حکومت کے کرنے کے ہیں کیوں کہ اُن کے لئے تمام ہندوستان پر سیاسی اور اقتصادی اختیارات

چاول سے پورا فائدہ اٹھانے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، اس کو یہ بتانا چاہئے کہ کتنے چاول کے لئے کتنا پانی کافی ہے۔ کیوں کہ چاول اُبالنے کے بعد جو زاید پانی پھینک دیا جاتا ہے، اس میں بہت ہی غذائیت موجود ہوتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُسے ہاتھ کا کوٹا ہوا چاول استعمال کرنا چاہئے۔ اس سے صرف یہ فائدہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنا روپیہ ٹل کی نذر کرنے سے بچ جاتا ہے، بلکہ یہ علمی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے، کیونکہ مل کی گرمی سے وٹامن (ب) ضائع ہو جاتا ہے۔ چاول کو صاف نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ایسا کرنے میں چاول کا رنگ بگڑ جاتا ہے، اور در اصل اسی میں وٹامن (ب) موجود ہوتا ہے، جو کہ غذائیت رکھنے کے علاوہ بیری بیری سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ سارے طبیب، اس امر پر متفق ہیں کہ ناصاف چاول، صاف کئے ہوئے چاول سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں پروٹین، چربی اور معدنیات نسبتۃً زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ناصاف چاول سے کبھی قبض نہیں ہوتا، درآنحالیکہ صاف چاول ہمیشہ قبض کرتا ہے۔ ان اسباب کے پیش نظر، ایسوسی ایشن اس امر پر زور دیتی ہے کہ ہر وہ شخص جس کو کسانوں کے دکھ درد کا احساس ہو، وہ خود بھی ناصاف، ہاتھ کا کوٹا ہوا چاول کھائے، اور کسانوں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مزید برآں طب کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہاتھ کا پسا ہوا گیہوں اور سادہ گڑ، مشین کے آٹے اور نفیس شکر سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مشین کی گرمی، ان کی غذائیت کو زائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن ہاتھ کے پسے ہوئے گیہوں اور گڑ کے استعمال کرنے کا پروپیگنڈا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، ایسوسی ایشن کے زیر نگرانی عام اناج، ساگ، پھلوں اور سبزیوں پر تحقیق کی جا رہی ہے، تاکہ کسانوں کے لئے کوئی متوازن خوراک مقرر کر دی جائے، ایسوسی ایشن امید کرتی ہے کہ وہ ان طریقوں سے کسانوں کے فاقہ زدہ جسموں میں نئی زندگی اور جان ڈال دے گی۔

ایسوسی ایشن کی کارکردگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پہلا کام کسانوں کی معاشی زندگی کو سدھارنا ہے۔ آج کسان بڑی ہی بُری حالت میں ہے۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی فائدہ مند پیشہ نہیں رہا۔ جب سے بڑے پیمانہ کی مشنری آگئی ہے، اس کی سب چھوٹی چھوٹی صنعتیں جو پہلے اس کی ضروریات کی کفالت کرتی تھیں، برباد ہو گئی ہیں۔ چنانچہ اب اس کا ایک ہی

سہارا ہے' یعنی زمین' لیکن یہاں بھی ایک مصیبت آپڑی ہے' آدمی زیادہ ہیں اور زمین بہت کم۔ پھر کیا کیا جائے ؟
اس نقطہ پر پہنچ کر " دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن " کو یہ لازم آتا ہے کہ وہ گاؤں کی موجودہ صنعتوں
کے واقعی حالات کا مطالعہ کرے۔ اُن میں سے جو پھل پھول رہی ہیں' جو مر رہی ہیں یا مر چکی ہیں' سب کو غور سے
دیکھے۔ مقامی حالات سے ہم آہنگ صنعتوں کو رائج کرے' از سرِ نو زندہ کرے یا اُن کو ترقی دے۔ پھر ان کی
زاید پیداوار کے لئے نئی منڈیاں ایجاد یا تخلیق کرے۔ ایسا کرنے میں' دساور کی مشین سے بنی ہوئی صنعتوں کے
ساتھ مقابلہ نہیں ہوگا' کیوں کہ باہر کی منڈیوں سے مقابلہ کرنا' ہمارے سودیشی آیڈیل کے خلاف ہے۔
سودیشی کا یہ مقصد ہے کہ دیہاتی' اپنی ضروریات کے مطابق' اپنے ہاتھ سے چیزیں تیار کریں۔ آخر ہم اپنے
ان کی روئی کو' کپڑا بننے جاپان یا لنکا شائر کیوں بھیجیں' جب کہ دیہاتی یہ کام خود سر انجام دے سکتے ہیں ؟
کیا ایک وہ غریب آدمی' جس کی آمدنی دس روپے ماہوار سے بھی کم ہو' اپنے کپڑوں کی دُھلائی صفائی یورپ
میں کرائے گا ؟ کتنا لغو خیال ہے۔ غریب آدمی کو اپنے کپڑے خود ہی دھو لینے چاہئیں۔ اس کے بس کی بات
نہیں ہے' کہ وہاں کی دھوبی مزدوری' اور کرایہ وغیرہ اور کثیر اخراجات کا متحمل ہو سکے۔ لیکن غریب دیہاتی
ہمیشہ اس لغویت کا شکار رہتا ہے' وہ اپنی خام پیداوار کو یورپ بھیجتا ہے اور جو چیزیں وہاں سے بن کر آتی
ہیں' ان کو استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے' وہ یہ سارا کام خود کر سکتا ہے۔ اس
صورت حالات سے یہ ان کا نتیجہ نکلتا ہے کہ دیہاتی پر دوہرا ظلم ہوتا ہے۔ اس کو تیار شدہ چیز کے لئے
زاید روپیہ دینا پڑتا ہے' اور وہ کام کاج سے بھی محروم رہتا ہے۔ یہ بات کہنے میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے
کہ جاپان اور لنکا شائر دیہاتی کو خود کپڑا تیار کرنے کی زحمت سے بچا لیتے ہیں۔ یہ دلیل صرف ان لوگوں
کے لئے کچھ معنی رکھتی ہیں' جن کی آمدنی کے ذرائع دیہاتی کے پیشوں سے مختلف ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس
جماعت کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصہ کسانوں پر مشتمل ہے' جو ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر
ہی روٹی کماتے ہیں۔ ان کے لئے ایک پائی بھی بہت زیادہ قیمت رکھتی ہے اور اگر ان کو کام کرنے کا کوئی موقع نہ
ملے۔ تو یہ ان کی موت کے مترادف ہے۔ اس وجہ سے ایسوسی ایشن اس امر کو اپنا اولین فرض سمجھتی ہے کہ
ہندوستان کی خام اجناس' باہر نہ جانے پائیں' دیہاتی خود اپنے ہاتھ سے کام کرے۔ اپنی ضروریات کو

پیداکریں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کی دولت جو باہر کے ملکوں کی طرف بہی جاتی ہے، اس کا رُخ پھر گاؤں کی طرف موڑ دیا جائے تاکہ دیہاتیوں کی حالت بہتر ہو جائے۔ قدیم زمانہ میں، ہندوستانی گاؤں خود اپنی ضرورتیں مہیا کر لیا کرتے تھے اور ان کی روئی، سلک، دری، پیتل اور ہاتھی دانت وغیرہ کی صنعتیں، دوسرے ملکوں کے لئے باعثِ رشک تھیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج ہندوستان صرف ایک زراعتی ملک ہی بن کر رہ جائے۔ اور اس سے بھدی بات یہ ہے کہ اگر گاؤں کے لوگوں کی صنعت سے محرومی برابر جاری رہی تو عوام کی حالت بالکل تباہ ہو جائے گی اب بھی یہ عالم ہے کہ وہ فاقوں میں مبتلا ہیں۔ اگر اس طریقہ کار کی روک تھام نہ کی گئی اور دیہاتیوں کو زراعت کے ساتھ ساتھ اور پیشے نہ سکھائے گئے تو ان کے لئے مستقبل میں کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

اس کے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تباہی سے بچنے کے لئے، قدیم دیہاتی صنعتوں کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہئے بلکہ تمام ہندوستان میں نئی بڑے پیمانے کی مشینری کو فروغ دینا چاہئے، جو کہ دیہات کے بے کاروں کو اپنے میں جذب کر لیں گی۔ اس تجویز میں یہ نقص ہے کہ یہ ہمارے ملک کے مخصوص حالات کے مطابق نہیں ہے۔ کسان زمین کو چھوڑ کر کارخانوں میں کام نہیں کر سکتا کیونکہ زمین اس کی توجہ کی طالب ہے۔ اس کو دراصل، اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ جب اسے کھیتی باڑی کے کام سے فراغت ہو، تو وہ عارضی طور پر کسی صنعت کو لے بیٹھے۔ علاوہ ازیں، فیکٹریاں محض کہہ دینے سے تو بن نہیں جاتی ہیں اور ہمارے یہاں بے روزگاری اس قدر عام ہے کہ اس کو دور کرنے کے لئے بے شمار فیکٹریاں بنانا پڑیں گی، بفرضِ محال اگر آدمی کارخانوں میں کھپ بھی جائیں تو مصنوعات کو بیچنے کے لئے منڈی کہاں ملے گی؟ دنیا میں پہلے ہی زائد پیداوار کا طوفان آیا ہوا ہے اور منڈیاں حاصل کرنے کے لئے شدید مقابلہ جاری ہے۔ اس وجہ سے فیکٹریاں بڑھا دینے کا خیال، قطعاً ناقابلِ عمل ہے۔ اور فیکٹری لگانا تو اُس حالت میں مفید ہوتا ہے، جب مزدور کم ہوں، اور مال کی مانگ زیادہ ہو۔ لیکن ہم بالکل برعکس حالت سے دوچار ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک طرف تو لاکھوں ایسے آدمی ہیں جنھیں کوئی کام نہیں ملتا، اور دوسری طرف قطع نظر اس سے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، لیکن بہت زیادہ دستی مال باہر سے آتا رہتا ہے۔ جو سلسلہ

ہمیں درپیش ہے وہ محنت کو بچانے کا نہیں' بلکہ اس کو کہیں نہ کہیں لگانے کا ہے۔ یہ خواہش کارخانے نہ چلنے سے پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں تو آبادی کا ایک قلیل حصہ جذب ہو سکتا ہے۔ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے' یعنی دیہاتیوں کو ایسی صنعتیں سکھائی جائیں' تاکہ وہ اپنی ضروریات کو آسانی سے مہیا کر سکیں' اور انھیں دور دراز نہ بھٹکنا پڑے۔ اس طرح سے ساری پیداوار گاؤں کے بہت سے خاندانوں میں بٹ جائے گی' اور جب پیداوار اس طرح سے بٹ جائے تو جیسا کہ اب ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف دولت تھوڑے سے آدمیوں کے پاس جمع نہیں ہو سکے گی۔ آدمی' اپنے لئے اور اپنے قریبی پڑوسیوں کے لئے کام کریں گے اور تجارتی سرمایہ داروں اور برآمد کرنے والے تاجروں کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ گاؤں کے آدمیوں کو برآمد کرنے والے نہ ان کی اشیاء خام سے محروم کر سکیں نہ وہ غیر ملکیوں پر اپنی ضروریات رسد کے لئے انحصار کریں گے بلکہ وہ صرف اپنی ذات پر بھروسہ کریں گے اور اپنی ابتدائی احتیاجات کو اپنی محنت سے پورا کریں گے اور زائد پیداوار کو فروخت کریں گے اس نظام میں گاؤں والوں سے ناجائز نفع حاصل نہ کیا جائے گا اور وہ ان تاجروں سے جو ان سے تجارتی اغراض کے لئے مال پیدا کرانا چاہیں گے " ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے ہم اس کے پیدا کرنے پر بالکل قانع ہیں اگر تم اپنے لئے ہم سے دولت پیدا کرانی چاہتے ہو تو تمھیں جو دام ہم مانگیں وہی ادا کرنا پڑیں گے" چنانچہ ایسوسی ایشن کا مقصد اس طرح صنعتوں کو زندہ یا جاری کر کے دیہاتی کو مستغنی بنانا ہے تاکہ وہ سہولت کے ساتھ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود پیدا کر سکے۔

اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ ہم کسی ایسے حصہ زمین پر نہیں رہ رہے ہیں جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو ہم چاہیں یا نہ چاہیں کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء کثیر تعداد میں آئیں گی اور گاؤں کی اشیاء کے لئے ان سے مقابلہ ناممکن نہ ہو گا۔ لیکن جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے ایسوسی ایشن کا مقصد مقابلہ میں شریک ہونا نہیں ہے بلکہ صرف ذاتی اور اپنے قریبی ہمسایوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دولت پیدا کرنا ہے۔ مثلاً میں کاتتا ہوں اور پہننے کے لئے کپڑا بنا لیتا ہوں۔ پھر جب میں کھدر صرف اپنے لئے تیار کرتا ہوں تو کارخانہ کے کپڑے کی قیمت سستے ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میں اپنے کپڑے کے لئے کوئی نقد رقم ادا ہی نہیں کرتا ہوں۔ لیکن

یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیہاتی بذات خود تمام اُن چیزوں کو جن کی اسے ضرورت ہے پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسے ان چیزوں کو جنھیں وہ خود پیدا نہیں کر سکتا (مثلاً کاغذ، جوتا) کھلے بازار خریدنا پڑے گا اور ان حالات میں گاؤں کا بنا ہوا کاغذ اور جوتا کارخانے کی بنی ہوئی اشیاء سے مقابلہ کرنے لگیں گے۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ وقت گذرنے اور پیداوار کے طریقوں میں ترقی ہو جانے کے بعد گاؤں کی بنی ہوئی اشیاء کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء سے گھٹیا نہ رہیں گی۔ بلکہ اس کے برخلاف بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی قدر بالکل اسی طرح بڑھ جائے گی جیسے مغرب میں ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کو کارخانہ کی پیدا کی ہوئی اشیاء پر ترجیح دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ قیمت کے معاملہ میں بھی یہ دریافت کیا گیا ہے کہ جب مزدور ہندوستان کی طرح کثیر اور سستے ہوتے ہیں تو ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کارخانہ کی اشیاء کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جب تمام توجہ اور انسانی ذہانت اس بات کے لئے مرکوز کر دی جائے گی کہ ایسی مشینیں ایجاد کی جائیں جو بڑے پیمانہ پر پیداوار حاصل کریں اور انفرادی طور پر چلائی جا سکیں (جیسے سینے کی مشین) جس کا کہ ایسوسی ایشن ارادہ رکھتی ہے تو پیداوار کس آسانی سے بڑھائی جا سکتی ہے اور محنت اور وقت کو بچایا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء اتنی ہی سستی ہو جائیں گی جیسی کہ کارخانہ کی اشیاء ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے پروگرام میں ایسی مشین کو جو مذکورہ بالا سینے کی مشین کی طرح مزدور کی انفرادی طور پر مدد کرے گی خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ایسی بڑے پیمانہ کی مشین کی جو پیداوار کو مرکز کے ماتحت لاتی ہے اور مزدور کو غلام بناتی ہے ہمارے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک ملک کی تمام صنعتیں چھوٹے پیمانہ پر نہیں چلائی جا سکتیں مرکزیت پسند طریقہ پیداوار کی بھی ضرورت رہے گی مثلاً عام منفعت کی صنعتوں میں۔ لیکن یہ پھر افراد کے ہاتھ میں نہیں رہیں گی بلکہ حکومت کے انتظام اور نگرانی میں آجائیں گی اور قطعاً عوام کے مفاد کے لئے کام کریں گی۔ بڑے پیمانہ کی صنعتیں خریداروں کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں بھی چلا سکتی ہیں۔ مگر ایسی صنعتیں ایسوسی ایشن کے موجودہ کام میں شامل نہیں ہیں اس لئے ان کے متعلق یہاں بحث نہیں کی جا سکتی۔

سودیشی کے اصول کے مطابق جو صنعتیں دیہات میں چلائی جائیں انھیں دیہاتیوں کی ضروریات سے متعلق ہونا چاہئے نہ کہ شہریوں اور غیر ملکیوں کی ضروریات سے۔ لیکن بعض حالات میں گاؤں والے ایسی اشیاء بھی پیدا کر سکتے ہیں جن کی انھیں

خود ضرورت نہ ہو بشرطیکہ ان کی فوری طلب موجود ہو۔ کیوں کہ اس صورت میں بھی پیداوار ایک معلوم طلب سے متعلق ہو جائے گی) نیز دوسری شرط یہ ہے کہ ان کی پیداوار کے لئے اشیاء خام مقامی طور پر موجود ہوں اور ان اشیاء کی پیداوار سے کئی آدمی جلد سے لگ سکیں مثلاً گاؤں والے اگر فاؤنٹین پن یا گھڑیاں بنانے لگیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ ان کے بنانے کے لئے جس مشین اور اشیاء خام کی ضرورت ہے وہ مقامی طور پر دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ ان کی طلب شہریوں تک محدود ہے اور اس کے لئے ان سے صرف چند خاندان روزگار سے لگ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں مغرب نے ان صنعتوں کو مکمل کرنے کے لئے اس قدر فکر اور سرمایہ صرف کیا ہے کہ دیہات والے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن مثال کے طور پر گڑ کے پیدا کرنے میں یہ بات نہیں ہے۔ اس کی طلب کثیر ہے اور اس سے بہت سے گاؤں میں کئی کئی خاندانوں کو روزگار مل سکتا ہے۔ ایسوسی ایشن اسی قسم کی صنعتوں کو ترقی دے گی۔

رہا سوال ایسی صنعتوں کا جن میں گاؤں والے تجارتی اغراض کے ساتھ مصروف ہوں ان کے لئے ایسوسی ایشن کا مطالبہ ہے کہ کاریگر کو کمترین اسباب حیات کے لائق اجرت فراہم کرنے کی ضمانت لی جائے۔ چنانچہ وہ موثر طریقے اختیار کر رہی ہے کہ جو اشیاء اس کی معرفت فروخت ہوں ان سے کاریگر کو کم از کم اس قدر اجرت ضرور مل سکے۔ ہمارے ملک میں سب سے کم اجرت والی ایک صنعت سوت کاتنے کی ہے جس سے موجودہ زمانہ میں کاتنے والوں کو ایک پیسہ فی گھنٹہ ملتا ہے اس چیز کو اب اور زیادہ برداشت نہ کیا جائے گا۔ کاتنے والے کو اسباب حیات کے لائق اجرت دی جائے گی اور اس کا تخمینہ یہ معلوم کر کے کیا جائے گا کہ سائنس کی تحقیقات کے مطابق ایک جوان بالغ کے لئے کم از کم غذا کی کس قدر ضرورت ہے۔ یہ بے شبہ صحیح ہے کہ آج گاؤں والوں کی غذا اس کمترین معیار سے بہت کم ہے لیکن ایسوسی ایشن اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ جب وہ گاؤں والوں کو اس بات کی تعلیم دینا چاہتی ہے کہ وہ اچھی اور صحت بخش غذا کھائیں تو وہ گاؤں والوں کو اس کی خریداری کے ذرائع بہم پہنچانے سے غفلت نہیں کر سکتی۔ اجرت کی بنیاد ایک کارگزار مزدور کی آٹھ گھنٹے کی محنت ہوگی۔ اس نظام کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ کھدر اور گاؤں کی ایسی اشیاء کی قیمت جو مقررہ کمترین اجرت سے کم قیمت پر فروخت ہو رہی ہیں بڑھ جائے گی اور قدرتی طور پر ان اشیاء کی فروخت گھٹ جائے گی۔ لیکن گاندھی جی جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اس

بات سے نہیں گھبرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ گاؤں والے کے استحصال ناجائز اور غیر انسانی اجرت سے تو یہ بہتر ہے کہ ان اشیا کی تجارت تباہ ہو جائے۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہماری اسکیم میں گاؤں والا خود اپنی ضروریات زندگی کو پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ گاؤں والا اپنی بنیادی احتیاج کو خود فراہم کرنے سے قاصر رہے گا۔ عملاً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اسے اپنا فرض سمجھیں گے کہ زیادہ قیمتیں ادا کریں تاکہ وہ ایک ایسے نظام کی حمایت نہ کریں جس میں عوام کی مجبوری اور لاچاری سے ناجائز نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ کمترین اجرت کو تسلیم کرانے کا محرک ایک اخلاقی جذبہ ہے عملی دشواریاں بلاشبہ پیدا ہوں گی۔ لیکن اپنے اقدام کے حق و انصاف میں اعتقاد ہی ان کی تسخیر میں ہماری اعانت کرے گا۔ اور آخر میں ہمیں اس قابل بنائے گا کہ ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ حق و انصاف ہی بہترین معاشی اصول ہے۔

ان لوگوں کا جو ایسوسی ایشن سے متعلق ہیں ایک خاص فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ گاؤں کی ایک تفصیلی پیمائش کریں کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون سی صنعتیں اس وقت چلائی جارہی ہیں ان کی حالت کیا ہے، صنعتوں کے لئے کون اشیاء خام موجود ہیں اس سے پہلے کون سی صنعتیں رائج رہ چکی ہیں ان صنعتوں کے جو طریقے تھے ان میں سے کتنے باقی ہیں اور انھیں کس طرح نفع بخش طریقہ پر دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسوسی ایشن قدرتی طور پر اپنی خاص امداد ان صنعتوں کو دے گی جن کا رواج عام ہے جن کے لئے سرمایہ کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے جن سے بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور جن کا ہر گاؤں بغیر بیرونی امداد کے آسانی سے انتظام کر سکتا ہے۔ وہ صنعتیں جو ان شرائط کو پورا کرتی ہیں اور جنھیں اس وجہ سے فائدہ کے ساتھ دوبارہ زندہ یا جاری کیا جا سکتا ہے حسب ذیل ہیں:۔ سوت کی کتائی اور بنائی۔ چمڑے کی دباغت، تیل نکالنا، گڑ اور کاغذ بنانا۔ آخر الذکر کو چھوڑ کر ان میں سے ہر ایک کے لئے اشیاء خام تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ ان کے لئے بہت کم سرمایہ کی ضرورت ہے۔ جس مہارت کی ضرورت ہے وہ آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے اور ان کی طلب بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ انھیں ایسوسی ایشن کے پروگرام میں فی الفور داخل کر لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چمڑا رنگنے کو لیجئے۔ ہر گاؤں میں مردہ جانور ملتے ہیں اس وقت انھیں عموماً پھینک دیا جاتا ہے اور انھیں یا تو ہریجن کھانے کے لئے کاٹ لیتے ہیں یا انھیں کتوں، کووں اور گدھوں کے کھانے کے لئے ڈال دیا جاتا ہے۔ چمڑا اور ہڈیاں عموماً تمام

ضائع ہو جاتی ہیں اور جب لاش کو کھلی ہوا میں سڑنے دیا جاتا ہے تو اس سے قرب وجوار میں گندگی پھیلتی ہے۔ اس کی جگہ ایسوسی ایشن کی نگرانی میں لوگوں کو یہ سکھایا جارہا ہے کہ لاش کے کیا مختلف استعمال ممکن ہیں۔ لاش کی کھال اُتاری جاتی ہے۔ کھال کو نمک لگایا جاتا ہے اور پھر اسے دباغت کی جگہ لے جایا جاتا ہے جہاں اسے صاف کر کے چمڑا بنایا جاتا ہے۔ کھال کے صاف کرنے میں جو گوشت نکلتا ہے اس سے سریش بنایا جاتا ہے۔ اوجھڑی سے چربی علیحدہ کی جاتی ہیں اور آنتوں سے تانت نکالی جاتی ہے جو ٹینس کے بلے اور وائلن کی تان بنانے میں استعمال کی جاتی ہے۔ گوشت اور ہڈیوں کو پانی میں سات آٹھ گھنٹے اُبالا جاتا ہے۔ چربی سطح پر آ جاتی ہے۔ اس طرح جو چربی علیحدہ ہو جاتی ہے اسے پہیوں کو چکنا کرنے اور دوسرے صنعتی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ خوب اُبالی ہوئی ہڈیوں اور گوشت کو دھوپ میں خشک کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کو پیس کر اس کا سفوف بنا لیا جاتا ہے۔ یہ سفوف بہت قیمتی کھاد ہے اور آسانی سے بازار میں فروخت کیا جا سکتا ہے۔ سینگوں کے کنگھے، چاقو کے دستے اور ایسی ہی اور چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اس کام کے لئے ہڈیوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مردہ جانور کے تقریباً ہر حصہ سے جو مختلف کام لئے جا سکتے ہیں۔ اور ان سے جو مختلف صنعتیں پیدا ہوتی ہیں جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے ہمارے ملک کی کس قدر کثیر دولت ضائع ہو رہی ہے۔ ایسوسی ایشن سے جو لوگ متعلق ہیں یہ ان کا کام ہوگا کہ وہ ان وسائل کی تحقیقات کریں اور جو چیزیں اب بظاہر بے کار نظر آتی ہیں ان سے گاؤں والوں کے لئے دولت اور روزگار پیدا کریں۔

صوالم کے تحت افلاس کا ایک سبب یہ ہے کہ گذشتہ صدی میں ذہین اور پڑھے لکھے لوگ دیہات سے کھنچ کر شہروں میں آبسے ہیں اور انھوں نے اونچی تعلیم پا کر گورنمنٹ کے محکموں میں عہدے اور کلرکوں کی جگہیں حاصل کر لی ہیں اور گاؤں ان کے فیض سے محروم ہو گیا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ تاجر اور آڑتی بھی بن گئے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ دیہات کی صنعتیں ان قابل افراد کی رہنمائی سے محروم ہو کر زوال کی طرف مائل ہو گئی ہیں۔ کسی صنعت کے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے تین قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے تاجر، ماہر صنعت اور ادنیٰ مزدور۔ تاجر اور ماہر صنعت تو اس نئے دور میں ترک سکونت کر کے شہروں میں جا بسے ہیں لیکن ادنیٰ مزدور جو کوئی کام ذہانت سے نہیں کر سکتے صرف وہ گاؤں کی صنعتوں کا کام چلانے کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔

اس لئے ہمیں گاؤں کے طریقہ پیداوار کی موجودہ خرابیوں پر افسوس نہ کرنا چاہئے۔ دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن
اس صورت حال کا علاج گاؤں کے کاروبار میں تجارتی طریقے اور فنی مہارت رائج کر کے کرنا چاہتی ہے اور اس
طرح ان تین عناصر میں جو صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہیں دوبارہ توازن قائم کرنا چاہتی ہے۔ اوپر کی مثال کو اگر
سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گاؤں میں جو اسراف پسند طریقے مردہ جانوروں کو ختم کرنے
کے لئے رائج ہیں وہ سب اس جہالت کا نتیجہ ہیں جن کی وجہ سے گاؤں والے لاش سے مختلف قسم کے فائدے
اور وہ طریقے جن سے یہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں اختیار نہیں کر سکتے۔ فنی علم کی ضرورت ہے جس کی گاؤں
والوں میں کمی ہے۔ صرف اس علم کے ذریعہ سے ہی گاؤں والے زیر بحث طریقوں کو اختیار کر سکتے ہیں۔ جب فنی
ماہر گاؤں والوں کو نئے طریقے بتلا دے گا اس وقت ماہر تجارت کی صنعت کو تنظیم دینے اور اس کو معقول کاروباری
بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ضرورت ہوگی۔ دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن کو توقع ہے کہ وہ اس قسم کے ماہروں
کو شہر سے نکال کر دوبارہ دیہاتوں میں دیہاتی صنعتوں کو زندہ کرنے اور ترقی دینے کے لئے بھیج سکے گی۔

دوسرا اہم کام جو ایسوسی ایشن نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ پیداوار کے بہتر طریقوں کی علمی تحقیقات کا ہے تاکہ
اس ذریعہ سے گاؤں والوں کی پیداوار کی مقدار اور نوعیت کو بڑھایا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے مختلف قسم کی
(مثلاً تیل نکالنے والی، گھی دودھ کی، شہد پالنے والی، کاغذ بنانے والی چمڑے کو رنگنے والی، سوت کاتنے اور
بننے والی) صنعتوں کے متعلق مرکزی دفتر میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور رفتہ رفتہ اور دوسری صنعتیں بھی اس میں
شامل کر لی جائیں گی۔ تمام ملک کے دیہاتی کام سے باخبر رہنے کے علاوہ ایسوسی ایشن کو توقع ہے کہ وہ پیداوار
دولت، حفظان صحت اور غذا کے متعلق ملک کے ایک حصہ میں جو بہتر طریقے رائج ہیں ان کی اشاعت دوسرے
حصوں میں بھی کر سکے گی۔

توقع یہ کی جاتی ہے کہ بہت جلد ایسوسی ایشن کے پاس دیسی صنعتوں کا ایک عجائب خانہ ہو جائے گا
جہاں نہ صرف تمام ملک کی دیسی اشیاء کی نمائش ہوا کرے گی بلکہ ان کے بنانے کے جو مختلف طریقے رائج ہیں ان
کی بھی نمائش ہوگی تاکہ جو لوگ انھیں دیکھنے آئیں انھیں عملی فائدہ حاصل ہو اور وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ کس حد
تک ملک کے ایک حصہ میں جو طریقے رائج ہیں وہ نفع کے ساتھ دوسرے حصے میں اختیار کئے جا سکتے ہیں اور نئے

گرہست ہوتی ہیں اور اس حیثیت سے ہندوستان کے مستقبل کی کنجی ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مائیں بچوں کی جو تربیت کرتی ہیں ملک کا مستقبل اسی سے وابستہ ہے۔ اگر ان میں سودیشی کی روح پیدا کرادی جائے اور اگر وہ اپنے بچوں کو اپنے پڑوسیوں کے حقوق سے واقف کرادیں تو دیسی صنعتوں کی انجمن کا کام تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ میدان بہت وسیع ہے اور اس میں عورت مرد، ہندو اور مسلمان، کانگریسی اور غیر کانگریسی ہر ایک کی جدوجہد کی گنجائش ہے۔ لہٰذا ایسوسی ایشن سب کو بلا امتیاز و تفریق آگے بڑھنے اور مدد کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ماہِ نو

کاغذ کی کشتیاں

روز روز، ندی میں، کاغذ کی کشتیاں ڈال دیتا ہوں۔ اُن پر بڑے بڑے سیاہ حرفوں میں اپنا نام لکھ دیتا ہوں اور اپنے گاؤں کا۔

مجھے خیال ہے کہ کسی اجنبی ملک میں کوئی انھیں پائیگا اور مجھے جانے گا!

میں کشتیاں اپنے باغ کے ننھے ننھے خوشبودار پھولوں سے بھر دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ صبح کے یہ پھول رات کو کسی زمین پر اُتار لئے جائیں گے۔

کاغذ کی کشتیاں ڈال دیتا ہوں اور آسمانی بادلوں کے، ہوا سے بھرے ہوئے بادبان دیکھتا ہوں۔

معلوم نہیں کون انھیں میری کشتیوں سے مقابلہ کرنے کو بہا رہا ہے!

جب رات آجاتی ہے تو میں اپنے بازوؤں میں منہ چھپا لیتا اور خواب دیکھتا ہوں کہ میری کاغذ کی کشتیاں ستاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں چلی جارہی ہیں! نیند کی پریاں ان میں سوار ہیں اور انکی پھولوں کی ٹوکریوں میں خواب بھرے ہوئے ہیں!.....

پرستان

اگر لوگ میرے بادشاہ کے محل کو جان لیں تو یہ ہوا میں غایب ہو جائے گا!

اس کی دیواریں سفید چاندی کی ہیں اور چھت چمکیلے سونے کی!

رانی سات دالان والے محل میں رہتی ہے اور اس کے جواہر کی قیمت سات سلطنتوں کے برابر ہے!

آؤ اماں ! میں تمہارے کان میں کہہ دوں کہ میرے بادشاہ کا محل کہاں ہے ؟
وہ دیکھو، بالاخانہ کے اس کونہ میں جہاں 'تلسی' کا گملا ہے !
سات سمندر پار ساحل پر شاہزادی سوئی ہے۔
سوا میرے دنیا میں کوئی نہیں جو اسے پا سکے ۔
اس کے ہاتھ میں کڑے ہیں اور کان میں بیچ موتیوں کے بندے !
اس کی زلفیں زمین پر لوٹ رہی ہیں !
جب میں جادو کی چھڑی سے چھوؤں گا تو وہ جاگ اٹھیگی اور جب مسکرائے گی تو اس کے منہ سے لعل نکلیں گے۔
لیکن آؤ اماں، میں تمہارے کان میں کہہ دوں ۔———
شاہزادی بالاخانہ کے اس کونہ میں ہے جہاں 'تلسی' کا گملا ہے !
جب دریا جا کر نہانے کا وقت آجائے تو بالاخانہ پر اس چبوترہ کے پاس جاؤ ۔
میں کونہ میں جہاں دیوار کے سائے ملتے ہیں، بیٹھتا ہوں———
میرے ساتھ صرف بلی آسکتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کہانی والا حجام کہاں رہتا ہے۔
لیکن آؤ اماں، میں تمہارے کان میں آہستہ سے کہہ دوں کہ کہانی والا حجام کہاں رہتا ہے ؟
وہ دیکھو، بالاخانہ کے اس کونہ میں جہاں تلسی کا گملا ہے ! ۔۔۔۔

—•—

کہاں سے ؟

"میں کہاں سے آیا ہوں ؟ تم نے مجھے کہاں سے پا لیا ہے ؟" ننھے نے اماں سے پوچھا۔
اماں نے کچھ روتے ہوئے کچھ ہنستے ہوئے ننھے کو سینہ سے چمٹا کر کہا،۔
"تم میرے   دل میں آرزو بن کر چھپے تھے میری جان ! تم میرے بچپن کے کھلونوں میں تھے
جب میں مٹی کے دیوتا بناتی اور توڑ دیتی تھی تو در اصل تمھیں بناتی اور توڑتی میرے لال !

"تم میرے دیوتاؤں میں تھے۔ میں جب انھیں پوجتی تو تمھیں پوجتی تھی! میری تمام امیدوں
میں، محبت میں آرزوؤں کی زندگی تم ہی تم تھے' میرے تھے! نہ فنا ہونے والی خوشی میں' جو ہماسے گھر
میں ہے' تمھاری ہی روح ہے' میرے پیارے! ... دوشیزگی میں جب میرا دل اپنی پنکھڑیاں کھول رہا
تھا' تم اس کی خوشبو تھے! ... میرے پرشباب جسم واعضا میں تمھاری نرمی تھی' تمھارا گداز! جیسے سورج
نکلنے سے پہلے آسمان پر روشنی! ... جنت کے ننھے دلارے! صبح کی روشنی کے ساتھ آنے والے!
تم ہستی کے آبشار میں بہتے بہتے آخر میرے دل کے ساحل سے آلگے ہو! ... جب تمھارے چہرہ کو
دیکھتی ہوں تو ایک طلسم میں کھو جاتی ہوں! تم جو سب کے ہو' صرف میرے ہوگئے ہو! ...
"کھو دینے کے ڈر سے میں تمھیں سینہ سے چپٹائے رکھتی ہوں! کون سے جادو نے میرے ان
کمزور بازوؤں میں دنیا کی دولت کو گھیر رکھا ہے؟! ...

۱۷۔ صحرائے تنپانتر

اماں آسمان کے کنارے پر اجالا ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں کیا بجا ہے؟
کھیل میں اب جی نہیں لگتا اس لئے اب تمھارے پاس آیا ہوں۔ آج سنیچر ہے' چھٹی کا دن۔
کام بند کردو اماں۔ آؤ کھڑکی کے پاس بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ پری کی کہانی والا صحرائے تنپانتر کہاں ہے؟
بارش کے سایہ نے دن کو چھپا لیا ہے۔
خوفناک بجلی اپنے ناخنوں سے آسمان کو نوچ رہی ہے۔
جب بادل گڑگڑاتے اور بجلی چمک جاتی ہے تو مجھے ڈر جانے میں بڑا اچھا لگتا ہے اور میں تم سے
لپٹ جاتا ہوں۔
جب بھاری بھاری قطرے گھنٹوں تک بانس کے پتوں پر ٹپاٹپ کرتے رہتے ہیں اور کھڑکیاں
ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑاتی ہیں میرا جی چاہتا ہے' اماں کہ تنہا کمرہ میں تمھارے ساتھ بیٹھوں اور پری
کی کہانی والے صحرائے تنپانتر کے بارے میں تم سے سنوں! -

اماں یہ صحرا کہاں ہے ؟ کس سمندر کے ساحل پر، کس پہاڑی کے دامن میں، کس بادشاہ کی سلطنت میں ؟

وہاں کھیتوں میں آریاں نہیں ہیں نہ کوئی راستہ جس سے گاؤں والے شام کو اپنے گاؤں میں جا سکیں یا سوکھی لکڑی جمع کرنے والی عورتیں اپنے بوجھ بازار میں لیجا سکیں۔ صحرائے تنپانستر میں بالو پر زرد گھاسوں کے گچھے ہیں اور صرف ایک درخت جس پر عقلمند چڑیوں کے جوڑے کا گھونسلہ ہے۔

میں خیال کر سکتا ہوں کہ آج ایسے بدلی والے ایک دن، بادشاہ کا چھوٹا بیٹا ایک بھورے گھوڑے پر سوار صحرائے تنپانستر میں تنہا، شاہزادی کی تلاش میں جا رہا ہے جو نامعلوم سمندروں کے اس پار دیو کے محل میں قید ہے۔

دور کے آسمان میں جب بارش کا دھندلکا آتا ہے اور بجلی دکھ بھری چیخ کی طرح یکایک جھلک جاتی ہے، کیا اس وقت وہ اپنی بدنصیب اماں کو یاد کرتا ہے ؟ جسے بادشاہ نے چھوڑ دیا ہے اور جو اپنی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی گوسالہ میں جھاڑو دے رہی ہے ؟

دیکھو اماں، دن ختم ہونے سے پہلے ہی اندھیرا ہو چلا اور وہاں سامنے گاؤں والی سڑک پر کوئی راہ گیر نہیں۔

چراگاہ سے گوالا کا لڑکا بھی سویرے ہی چلا گیا اور کسان بھی کھیت چھوڑ چھوڑ کر اولتی کے نیچے چٹائیوں پر بیٹھے ناراض بدلیوں کو دیکھ رہے ہیں۔

اماں میں نے سب کتابیں الماری میں چھوڑ دی ہیں ــــــ اس وقت سبق یاد کرنے کو مت کہو۔
جب میں بڑھ کر اباکے اتنا بڑا ہو جاؤں گا تو سب کچھ جان لونگا جو جاننا چاہئے۔
لیکن آج اماں مجھے بتا دو کہ پری کی کہانیوں والا صحرائے تنپانستر کہاں ہے ؟

۱۸۔ بارش کا دن

خاموش بدلیاں جنگل کے سیاہ کناروں پر جمع ہو رہی ہیں۔

تھے، باہر مت جاؤ!

تاڑ کے درخت جھیل کے کنارے قطار میں کھڑے اور آسمان سے سر ٹکرا رہے ہیں۔
کوے اپنے بھیگے ڈینوں کو سمیٹے املی کی شاخوں پر چپ چاپ بیٹھے ہیں اور دریا کے مشرقی کنارے پر
تاریک اندھیرا چھایا جا رہا ہے۔

احاطے سے بندھی ہوئی ہماری گائے زور زور سے ڈکرا رہی ہے
تھے، یہاں ٹھہرو جب تک میں اسے گوسالہ میں لے آؤں۔

پانی سے جل تھل کھیتوں میں آدمی مچھلیاں پکڑنے کو جمع ہیں جو تالاب کے پانی کے ساتھ بہتی ہوئی
آ رہی ہیں۔ ایک ننھے بچے کی طرح جو اپنی ماں کو چڑھانے کے لئے ہنستا ہوا بھاگ گیا ہو، بارش کا پانی تنگ
گلیوں کی نالیوں میں سے بہہ رہا ہے۔

سنو، گھاٹ پر کوئی ملاح کو پکار رہا ہے۔
تھے، دن کی روشنی بہت مدھم ہے اور گھاٹ اب بند ہو گیا۔

آسمان، پاگلوں کی طرح برستے ہوئے پانی پر سوار معلوم ہوتا ہے، دریا کا پانی بے صبر اور
پُر شور ہے، عورتیں سویرے ہی گنگا سے اپنے گھڑے بھر بھر کر لے گئیں۔

چراغ اب جلا دینا چاہئے۔
تھے، باہر مت جاؤ!

بازار جانیوالی سڑک بالکل ویران ہے۔ دریا کو جاتی ہوئی گلی چکنی ہو گئی ہے۔ ہوا بانس کی
شاخوں کے جال میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی طرح چیخ اور تڑپ رہی ہے۔

۲۶۔ ثروت!

ہاں، تمہاری ثروت بیوقوف ہے! وہ بالکل بچی ہے!
سڑک کی روشنیوں اور ستاروں میں اسے کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

کھیل میں جب ہم ٹھیکریوں کا کھانا بناتے ہیں تو وہ سمجھتی ہے کہ وہ سچ مچ کا کھانا ہے اور انھیں منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔

جب میں کتاب کھول کر اسے 'ا ب ت' پڑھنے کو کہتا ہوں تو وہ اپنے ہاتھوں سے ورق پھاڑ ڈالتی ہے اور خوشی سے چیخ پڑتی ہے۔ اس طرح تو تمھاری بچی سبق پڑھتی ہے!

جب میں غصے میں آنکھیں نکال کر اس کو ڈانٹتا ہوں اور اسے شریر کہتا ہوں تو وہ ہنس پڑتی ہے جیسے یہ کوئی بڑا مزے دار کھیل ہوا۔

سب جانتے ہیں کہ ابا یہاں نہیں ہیں۔ لیکن اگر کھیل میں میں زور سے "ابا" کہہ کر پکارتا ہوں تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے جیسے کہ سچ مچ ابا نزدیک ہی ہیں۔

جب دھوبی گدھوں پر کپڑے لاد کر لاتا ہے اور میں گدھوں کا کلاس قائم کرتا ہوں اور خود کو کہتا ہوں کہ میں ماسٹر صاحب ہوں تو وہ بے وجہ چلاتی ہے اور مجھے "بھیا" کہتی ہے۔

تمھاری بچی چاند کو پکڑنا چاہتی ہے۔ کیسی احمق ہے۔ وہ سراج (لڑکے) کو "پھول" کہتی ہے۔ اماں تمھاری ثروت بیوقوف ہے، وہ بالکل بچی ہے!

۲۲۔ پھول

جب طوفانی بدلیاں آسمان پر گڑگڑاتی ہیں اور جون کی جھڑیاں آتی ہیں،
نم پوروا ہوا دلدل پر سے ہوتی ہوئی بانس کی شاخوں میں بانسری بجانے کو آتی ہے۔
اس وقت پھولوں کا جھنڈ یکایک نکل آتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہاں سے؟ اور گھاس پر مستانہ خوشی میں ناچتا ہے۔

اماں سچ سچ میرا خیال ہے کہ پھول بھی زمین کے نیچے اسکول میں جاتے ہیں
وہ دروازہ بند کر کے سبق پڑھتے ہیں اور اگر وقت سے پہلے آنا چاہیں تو ماسٹر انھیں کونوں میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

برسات میں انھیں تعطیل ہوتی ہے!

جنگل میں شاخیں ٹکراتی ہیں اور دیوانی ہوا میں پتیاں کھڑکھڑاتی ہیں۔ بجلی والی بدلیاں سب
جناتی ہاتھوں سے تالیاں بجاتی ہیں اور پھول بچے اپنے گلابی، پیلے، اور اُجلے لباسوں میں اٹھلاتے ہیں۔

تم جانتی ہو اماں، ان کا گھر آسمان میں ہے، جہاں ستارے ہیں۔
تم نے دیکھا ہے وہ وہاں جانے کے کتنے مشتاق ہیں؟ جانتی ہو وہ کیوں اتنی جلدی میں ہیں؟
البتہ میں قیاس کرسکتا ہوں کہ وہ اپنے ہاتھ کس کے لئے پھیلائے ہیں۔
میری طرح ان کے بھی اماں ہیں!

شبِ بہار

گھٹائیں جھوم رہی ہیں، ہوائیں رقصاں ہیں — فضا ہے مست، زمانہ اسیرِ غفلت ہے
ان آنسوؤں کی مرے دوست! وجہ کچھ بھی نہیں — شبِ بہار میں رونے کی مجھ کو عادت ہے

چاندنی راتیں

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی — کبھی ہنسا کبھی آہیں بھریں، کبھی رویا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں — میں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

نغمہ اور محبّت

آبِ دریا میں ہے جس طرح روانی پنہاں — جیسے الفاظ میں ہوتے ہیں معانی پنہاں
نغمہ گر! یونہی ترے درد بھرے نغموں میں — ہے مرے دردِ محبت کی کہانی پنہاں

خود فراموشی

اپنے سُروں میں ایک غزل گا رہا ہوں میں — گو درد کی کسک سے مرا دل ہے بیقرار
یونہی ڈبو کے درد کو گیتوں کے شور میں — ناخوشگوار کو میں بناتا ہوں خوشگوار

کیفِ برشگال

رات کا وقت ہو، گھٹائیں ہوں — بھیگی بھیگی خنک فضائیں ہوں
چوٹ کھایا ہوا ہو دل اختر — اور برسات کی ہوائیں ہوں

[illegible]

(٥)

[illegible]

(٨)

[illegible]

(١)



ہوائے تند ہے، گرداب ہے، پُر شور دھارا ہے — لئے جاتے ہیں ذوقِ عافیت سی شے سفینوں میں

میں ہنستا ہوں مگر اے دوست اکثر ہنسنے والے بھی — لئے پھرتے ہیں سجدوں کی تڑپ اپنی جبینوں میں

مری غزلیں پڑھیں سب اہلِ دل اور مست ہو جائیں — شرابِ عشق لایا ہوں میں لفظی آبگینوں میں

کسی شاعر کی اب اس سے زیادہ قدر کیا ہوگی

مرے اشعار کے چرچے ہیں اختر نازنینوں میں

تنقید و تبصرہ

رسائل

ہدائے نسواں۔ رفیق الطلبہ۔ انجمن طلبۂ قدیم مشن کالج کا سالنامہ۔ تشریعت۔ رامز حیات۔
دی ویج ٹیچر۔ سلسلۂ داستان گو۔ ایشیا۔

ہدائے نسواں | ایڈیٹر انور بزمی الہ آبادی۔ سائز ۲۰×۳۰/۸۔ یہ رسالہ علیا حضرت ہز ہائی نس حضور نواب سلطان جہاں صاحبہ مرحومہ کی یادگار میں نکلا ہے۔ علامہ اقبال اور محترمہ بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی ہے اور امۃ الکریم صاحبہ اس کی نگراں ہیں۔ رسالے میں علمی ادبی اخلاقی مذہبی اور اصلاحی مضامین نظمیں اور اصلاحی افسانے بھی ہیں۔ آخر میں صنعت و حرفت۔ امور خانہ داری، کشیدہ کاری وغیرہ مستقل عنوانات ہیں۔ عورتوں کے لئے مفید رسالہ ہے۔ البتہ خیالستان کے زیر عنوان علامہ اقبال پر جو مضمون ہے وہ کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ فہرست مضامین کی بھی ضرورت ہے۔ تفریحی صفحہ بھی مردوں کے اخبار یا رسالے کے لئے زیادہ موزوں تھا۔

رفیق الطلبہ | (شش ماہی) ایڈیٹر رفیق احمد ذکریا و میر جہانگیر حسین۔ سائز جامعہ کا ضخامت حصہ اردو ۶۵ صفحے حصہ انگریزی ۲۰ صفحے کتابت و طباعت نہایت نفیس قیمت عہ ملنے کا پتہ اینگلو اردو ہائی اسکول، [illegible]

یہ خوب صورت رسالہ اینگلو اردو ہائی اسکول کے بچے سات سال سے نہایت سلیقے اور نفاست سے نکال رہے ہیں۔ زیر نظر نمبر میں سوائے دو ایک کے سب مضمون بچوں ہی کے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت محنت اور توجہ سے لکھے ہیں نظمیں بھی اچھی ہیں۔ متعدد اسکولوں کے پرچے ہماری نظر سے گزرے ہیں مگر ہم نے یہ حسن ترتیب یہ خوش سلیقگی اور یہ نفاست کسی پرچے میں نہیں دیکھی۔ یہ دیکھ کر اس پرچے کی اہمیت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس علاقے میں صرف یہی ایک رسالہ اردو زبان کا ترجمان ہے۔ رسالے میں بچوں کے ساتھ بچیوں کے مضامین بھی ہیں آخر میں انگریزی کے بھی ۲۰ صفحے ہیں جن میں اسکول کے حالات کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک ایک دو صفحے کے مضمون ہیں شروع

ملنے کا پتہ بھوانہ بازار لائل پور۔

دی ویلج ٹیچر (سہ ماہی) تقطیع چھوٹی۔ حجم ۸۰ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت مدارس متعلقۂ انجمن سے [illegible] مع محصول دیگر مدارس سے [illegible]۔

یہ رسالہ انجمن اساتذہ صوبۂ ورنگل نے چند فاضل مدرسین کی زیر ادارت دیہاتی استادوں کی اصلاح و رہنمائی کی غرض سے نکالا ہے۔ زیر نظر نمبر پہلی جلد کا پہلا پرچہ ہے۔ اس میں مخاطبے کے علاوہ زیادہ تر مضامین منصوباتی طریقے یا پروجکٹ میتھڈ سے متعلق ہیں۔ بہت سے مدرسین نے اپنے تعلیمی تجربے بیان کئے ہیں جو دلچسپ کار آمد اور قابل تقلید ہیں۔ آخر میں مہدی یار جنگ کا خطبۂ صدارت ہے جو آنھوں نے مدرسین کے ایک جلسے میں پڑھا تھا۔

ابتدائی تعلیم کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اس کے لئے آئے دن نئے نئے اصول وضع ہورہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس امر کی بھی کوشش کی جارہی ہے کہ استادوں میں ان طریقوں پر پڑھانے کی اہلیت پیدا ہو۔ اور اس اعتبار سے یہ رسالہ دیہاتی و شہری دونوں جگہ کے مدرسین کے لئے یکساں مفید ہے۔ فاضل مرتب نے دیہاتی مدرسوں کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ کچھ حیدرآباد ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے ہر جگہ یہی حالت ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ رسالہ ان کے لئے صحیح رہنمائی کا کام دے گا۔

سلسلۂ داستان گو مہتمم علی احمد صاحب بی اے عثمانیہ تقطیع [illegible] لکھائی چھپائی اوسط درجے کی کاغذ معمولی۔ قیمت [illegible] سالانہ ملنے کا پتہ مہتمم سلسلۂ داستان گو محبوبیہ کارخانہ جلد سازی روبرو معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن۔

یہ رسالہ ہر مہینے کتابی صورت میں شائع ہوتا ہے اور صرف افسانوں کے لئے مخصوص ہے ہر مہینے ٹائٹل پر کسی خاص افسانے کی مناسبت سے ایک تصویر بھی ہوتی ہے۔ زیر نظر نمبر میں رقاصہ کی تصویر فنی اعتبار سے خوب ہے۔ افسانے بھی اچھے خاصے ہیں۔ امید ہے کہ علی احمد صاحب کی یہ جدت مقبول ہوگی۔

ایشیا (مصور) ایڈیٹر جناب ساغر نظامی سائز بہت بڑا ضخامت ۱۲۲ صفحات لکھائی چھپائی اعلا
عمدہ سالانہ قیمت پرچے پر درج نہیں اس نمبر کی قیمت ۱۲ مقام اشاعت ادبی مرکز سیپٹ اسٹ
میرٹھ۔

یہ جاری ہم کو رسالہ جناب ساغر نظامی نے میرٹھ سے بہت اہتمام کے ساتھ جاری کیا ہے
نظر نمبر اکتوبر اور نومبر کا مشترک نمبر ہے شروع میں مادر ہند کے نام کوہ ہمالیہ کا پیام ہے جو پیو پال رچ
لکھا ہے اس کے بعد بھکاری کی صدا کے عنوان سے ایک ہندی آمیز نظم ہے پھر مرتب کے قلم سے اوکا
ہیں۔ جن میں مضمون نگاروں اور ان کے مضامین نظم و نثر کا تعارف ہے اور اردو ہندی کے مسئلے پر ا
خیال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلا مضمون ایشیا پر ہے جو اگرچہ مخ
لیکن جامع ہے۔ اس کے بعد حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک بہت اچھی نظم ہے۔ پھر اختر رائے پوری
کا ایک مضمون ہے جو انھوں نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ اس کے بعد موسیو پال رچرڈ کی ایک کتا
اقتباس ہے پھر مشہور محب وطن صوفی آربندو گھوش کے مختصر سوانح حیات ہیں اسی طرح دوسرے
نظم و نثر ہیں۔ آخر میں بائیس تئیس صفحے کا ایک اخلاقی ڈرامہ ہے۔ جو محنت اور توجہ سے لکھا گیا ہے،
رسالہ بحیثیت مجموعی شاندار ہے مضامین نثر اور نظموں کا معیار خاصا بلند ہے۔ اور ہر قسم کا تنوع موجود
ظاہری خوش نمائی میں بھی خاص سلیقے سے کام لیا گیا ہے ایک سہ رنگی اور ایک چار رنگی تصویر ہے ان کا
ز تصویریں مضمون نگاروں کی ہیں۔ سر ورق بھی بہت خوش نما ہے۔

ساغر صاحب کہنہ مشق ایڈیٹر ہیں اس سے پہلے بھی وہ پیمانہ اور دوسرے ادبی رسالوں کو
دے چکے ہیں، اس لئے ان سے ایسا ہی رسالہ نکالنے کی توقع تھی ہمیں امید ہے کہ وہ اسے مستقل طور پر جاری رکھیں

کتب:۔

انشائے لطیف۔ افسانہ نگاری۔ ہمارے افسانے۔ جشن اور العالیہ۔ آداب المراسلت
سلطان الہند۔ علاج الانسان باجزاء الحیوان۔ گرشن جی۔ حسن کار۔

انشائے لطیف | از جناب لطیف الدین احمد صاحب۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۷۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر کاغذ سفید بیز۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

جناب لطیف الدین احمد صاحب سے جو رسائل میں ل احمد کے نام سے معروف ہیں۔ اُردو داں حضرات اچھی طرح روشناس ہیں۔ یہ ان ہی کے چند رومانی افسانوں کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں یہ کل ۱۵۔ افسانے ہیں۔ ان میں سے چار مختار ہیں یعنی ان کا پلاٹ کسی مغربی افسانے سے لیا گیا ہے باقی طبعزاد۔ تمام افسانے عشق و محبت کے رومان ہیں اکثر افسانوں کا ہیرو وہی ہے جس کا کیرکٹر قصے کی مناسبت سے بدلتا رہتا ہے۔ لیکن اس کی ایک چیز سب میں مشترک ہے اور وہ اس کی رومانیت پسندی ہے دوسرے افسانوں کے کرداروں میں بھی کم و بیش یہی خصوصیات ہیں جناب لطیف الدین احمد صاحب کو اس قسم کے افسانے لکھنے میں غیر معمولی کمال حاصل ہے۔ وہ مخصوص طرز انشاء کے مالک ہیں ممکن ہے کہ لوگوں کو ان کی بعض الفاظ ترکیبیں اور جملے ثقیل معلوم ہوں لیکن عام طور پر ان کی عبارت میں ایک خاص دل کشی اور ندرت ہوتی ہے جو اوروں کے یہاں بہت کم ہے۔ کتاب مجلد ہے اور اس پر سنہرے حرفوں میں کتاب و مصنف کا نام لکھا ہوا ہے اور پڑوسٹ کور بھی ہے۔

افسانہ نگاری | از جناب سید وقار عظیم صاحب ام اے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۱۸۷ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر قیمت عہ ملنے کا پتہ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد۔

افسانہ نویسی کا ذوق اُردو زبان میں برابر ترقی پذیر ہے اور بعض اچھے اچھے لکھنے والے اس ملک میں پیدا ہو گئے ہیں لیکن اب ضرورت اس امر کی تھی کہ اس فن لطیف کے اصول و قواعد کا بغور مطالعہ کیا جائے اور افسانہ لکھتے وقت ان اصول کو پیش نظر بھی رکھا جائے انگریزی میں اس قسم کی کتابیں بہت سی ہیں اُردو میں متفرق مضامین کے علاوہ سب سے پہلے عبدالقادر سروری صاحب لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی تھی لیکن اُن کی تصنیف کا موضوع وسیع تھا اور انھوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول وغیرہ بھی شامل کر لئے تھے۔ اب جناب وقار عظیم صاحب نے ایک اور کتاب لکھی ہے۔ اس کا

جو کچھ کرتے ہیں وہ اُن کے لئے تو مضر ہے ہی لیکن اس سے زیادہ ستم خود افسانے پر ہے جو بجائے بلندی کی طرف جانے کے پستی کا رخ کرنے پر مجبور ہے ۔۔۔۔"

آخر میں انھوں نے اُردو کے چند مشہور و غیر مشہور افسانہ نگاروں پر تنقید بھی کی ہے جناب مولف نے قصداً افسانہ نگاروں کے محاسن زیادہ گنائے اور قابل اعتراض پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالی ہے اس کی وجہ بھی انھوں نے ایک حد تک معقول بتائی ہے ۔ تاہم اگر وہ اُن کے نقائص بھی شائستہ الفاظ میں اُجاگر کر دیتے تو یہ چیز نومشق حضرات کے لئے خاص طور پر مفید اور سبق آموز ہوتی ۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں بھی بعض اچھے اچھے نام چھوٹ گئے ہیں مثلاً پروفیسر محمد مجیب صاحب فیاض محمود صاحب اور بعض دوسرے حضرات ۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ حضرات جناب مصنف کی شرائط کے ماتحت انتخاب میں آسکتے تھے ۔ ان معمولی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر کتاب پوری محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے ۔ اور ایک طرح سے اُن کی پہلی کتاب افسانہ نگاری کا گویا دوسرا حصہ ہے اور یہ وقار صاحب نے سچ کہا ہے کہ دونوں کتابوں میں سے ایک میں بھی پوری دلچسپی نہیں آسکتی جب تک دونوں کتابیں ساتھ نہ پڑھی جائیں ۔"

جبش اور اطالیہ | مرتبہ جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی اے ۔ حجم ۸۰ صفحات ۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت ۸/ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن ۔

سوال واقعات میں سب سے اہم آج کل اٹلی و جبش کی آویزش ہے اختر صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہے کہ اس وقتی مسئلے پر مستند معلومات ایک جگہ جمع کر دیں ۔ کتاب کے شروع میں قاضی عبدالغفار صاحب کا ایک دیباچہ ہے اس کے بعد شیخ چاند صاحب ام اے ۔ ال ال بی کے قلم سے جبش کے جغرافی حالات ہیں پھر سبط حسن صاحب بی اے نے جبش کی تاریخ لکھی ہے ۔ منظر حسین صاحب نسیم نے جبش کی تہذیب و معاشرت پر خامہ فرسائی کی ہے جبش کے دور حاضر پر اختر صاحب رائے پوری کا مضمون ہے ۔ جبش اور عرب کے تعلقات کی وضاحت ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پی اچ ڈی نے کی ہے پھر جبش اور اطالیہ پر سبط حسن صاحب کا مضمون ہے ۔ پھر لیگ ، استعمار اور جبش اور اس کے بعد جبش کے مستقبل پر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

دنیا کی رفتار

جنگ حبش اور سیاست مغرب | موسیو لاوال اور سر سیموئل ہور نے جنگ کو ختم کرانے کے لئے جو شرائط تجویز کئے
تھے ان کا حشر تو اچھا نہ ہوا۔ اب نہ سر سیموئل انگلستان کے وزیر خارجہ ہیں نہ موسیو لاوال فرانس کے
وزیر اعظم۔ دونوں ملکوں میں ان کے جانشین اٹلی کے اتنے بھی حامی نہیں جتنے کہ یہ لوگ تھے۔ اور دونوں
ملکوں کی رائے عامہ بھی اٹلی کے رویہ کو بہت ناپسند کرتی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس رائے عامہ
کا علم لاوال اور ہور کو نہ تھا۔ غالباً صورت حال میں ایسے عناصر موجود تھے جن کی وجہ سے اٹلی کو بالکل اپنا
مخالف بنا لینا، ان ملکوں کی آئندہ سیاست کے لئے مفید نہ ہوتا۔ اور یہ عناصر اب بھی موجود ہیں۔ اس
لئے کیا تعجب ہے کہ پھر کچھ دن میں کسی طرف سے حبش اور اٹلی میں صلح کرا دینے کی کوششیں شروع ہوں
یعنی اٹلی کے مطالبات کو کچھ کم کر کے مان لیا جائے اور حبش کی شجاعانہ مدافعت کی داد بس یوں دینا
تجویز ہو کہ ملک تو "شہنشاہ" کا رہے مگر حکم اٹلی کا ہے۔ کہ سچ تو یہ ہے کہ حبش سے ہمدردی
صرف ایک دکھاوے کی بات ہے، اصل چیز تو دول مغرب کے اپنے اپنے اغراض
ہیں۔ اور حبش کے معاملہ پر دول مغرب کا ادھر یا ادھر ہونا دراصل یورپی سیاست کی چالیں ہیں۔
مغربی بساط سیاست کا مرکزی مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ دول یورپ میں کونسا نیا توازن قائم ہو،
عہد نامہ ورسائی سے جن ملکوں کو نقصان پہنچا ہے وہ اپنے نقصان کی تلافی کس طرح کریں، خود بزور
بازو کریں، یا جمعیۃ اقوام کی پنچائت میں تصفیہ کرائیں اور عہد ناموں کی ناموافق دفعات کو بدلوائیں۔

فرانس کی خواہش تو یہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد کے عہد ناموں میں کوئی تغیر ہی نہ ہو اور ان عہد ناموں
کے ذریعہ اس نے جو حصار اپنی حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا وہ اپنے حال پر قائم رہے۔ برطانیہ چاہتا ہے
کہ جو غیر مطمئن دول ہیں ان کی بھی بات رہ جائے، عہد ناموں میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں، مگر جمعیۃ
اقوام کی وساطت سے۔ یعنی خود برطانیہ کی نگرانی میں۔ پھر فرانس اور برطانیہ دونوں اس فکر میں بھی ہیں کہ

جمعیتہ ان کے قبضہ میں ہے۔ اس لئے فرانس نے جمعیتہ میں اپنے نئے دوست روس کو شریک کرایا ہے۔ ادھر جرمنی کی قومی اشتراکیت سب کے لئے تشویش کا باعث ہے اس لئے کہ ابھی کوئی نہیں جانتا کہ اپنی فوجی، بحری اور ہوائی قوت کو بڑھانے کے موجودہ دور سے گذر جانے کے بعد جرمنی کس کا ساتھی اور کس کا مخالف ہوگا۔

فرانس و اٹلی | اس بے اطمینانی اور تشویش کی حالت میں، خصوصاً جرمنی کی ابھرتی ہوئی قوت کے خوف سے جسے فرانس جمعیتہ اقوام اور عہد نامہ ورسائی کے ہتھکنڈوں سے دبائے نہ رکھ سکا، فرانس کی اغراض کا تقاضا یہ ہے کہ اٹلی سے اس کی ان بن نہ ہو۔ اور اٹلی کہیں اس کے خلاف جرمنی سے نہ مل جائے۔ فرانس کی آبادی ۴ کروڑ کی اور جرمنی کی ۷ کروڑ۔ یہ سات کروڑ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ان کو گرمانے کے لئے قومی عزت کو برقرار رکھنے کا طلسم ہے۔ عہد نامہ ورسائی نے انھیں جن اسلحہ سے محروم کیا تھا ان کے حصول کی خواہش ان میں جنون کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہے۔ فرانس کیسے اس قوت میں اٹلی کی طاقت کو ملنے دے سکتا ہے۔ اس کا تو لازمی طور پر مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اٹلی سے سازباز کرے تاکہ جو عظیم الشان فوج فرانس اور اٹلی کی سرحد پر رکھنی پڑتی ہے وہ جرمنی کی سرحد پر رکھی جاسکے اور اٹلی بھی فرانس کی سرحد سے فوج ہٹا کر برنر کے درہ کو جرمن اقدام سے محفوظ کرنے کے کام میں لائے۔ چنانچہ اس نے جرمن میں قومی اشتراکیت کی فتح کے ساتھ ہی اٹلی سے اپنے پرانے جھگڑے چکانا شروع کئے اور بہت کچھ دب کر سب متنازعہ امور کا تصفیہ جیسے تیسے کر ہی لیا۔ وہ اس وقت کہ جرمنی کی فوجی تیاریاں پوری قوت سے جاری ہیں کیسے اٹلی کا ساتھ چھوڑ کر سب کئے کرائے کام کو تباہ کرے اور اٹلی کی قوت کو جو شکست کے بعد بھی بہر حال ایک قابل لحاظ قوت رہے گی آنے والے معرکہ میں جرمنی کا حلیف بنا دے۔ یہی وجہ تھی کہ موسیو لاوال نے سر سیمول ہور کو چکر دے کر پیرس کے شرائط صلح منوائے تھے۔ اور اگرچہ موسیو سورو کے متعلق خیال یہ ہے کہ وہ اٹلی کی پالیسی کی حمایت نہ کریں گے مگر ملکی مفاد کا تقاضا انھیں بھی مجبور کرے گا کہ وہ اٹلی کی حمایت کریں چاہے دبی زبان ہی سے سہی۔ تاکہ اٹلی پر فرانس کا کچھ احسان رہے اور جمعیتہ سے بھی باہر نہ نکل جائے۔ کہ اگر ایسا ہوا تو وہ سارا نظام جو عہد نامہ ورسائی کے بعد قائم ہوا تھا درہم برہم ہو جائے گا اور سرحدوں کی تشکیل نو کا کام جمعیتہ کے اثر

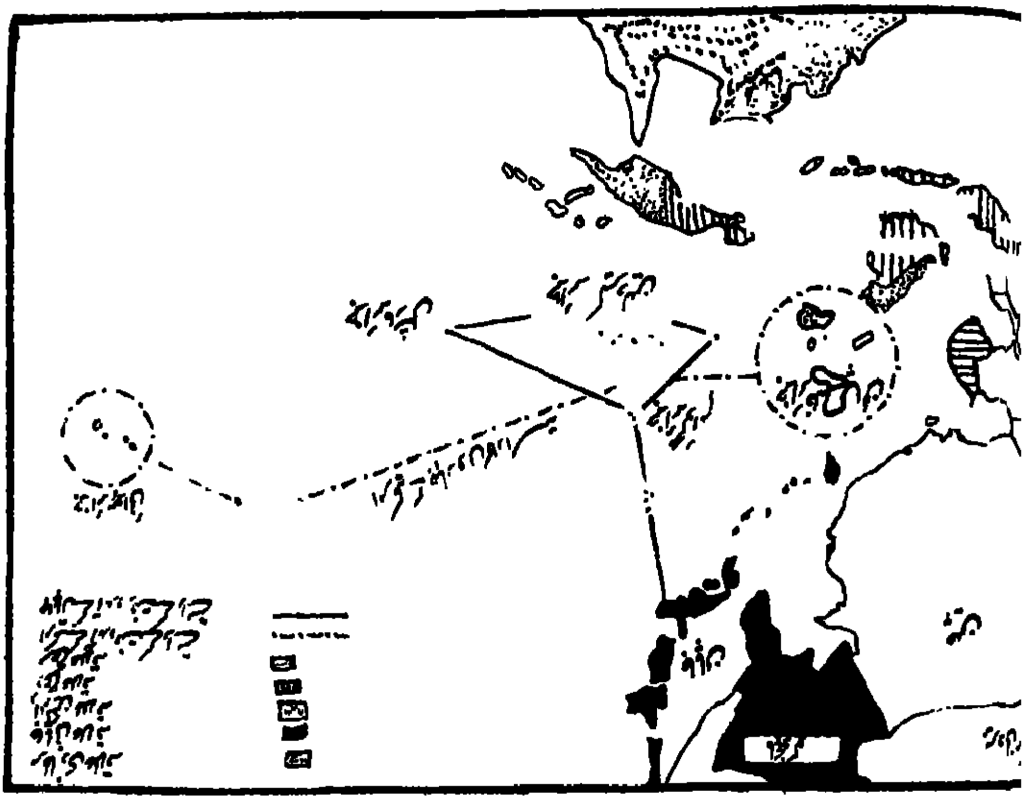
نکل جائیں کم ہے۔ مگر پیرا سی مضمون میں یہ بھی ہے کہ۔ "لیکن یہ بھی لازم ہے کہ جب صلح کی کانفرنس بیٹھے تو وہ اٹلی کے مسئلہ کے بنیادی عناصر پر ضرور نظر کرے۔ اور یہ دو ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہ اٹلی نہایت شدید دشواریوں سے دوچار ہے۔ اس کا ملک مقابلۃً کم زرخیز ہے اور اس کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان ہر سال ۷ لاکھ ۰ ہزار اطالوی اپنے دیس سے جاکر دوسرے ملکوں میں بسے۔ آج ملک میں آنے والوں اور ملک سے جانے والوں کی تعداد کا مقابلہ کیجئے تو ایک آدمی بھی زیادہ باہر نہیں جارہا ہے۔ نہایت ضروری ضروری اجناس کے لئے اٹلی دوسرے ملکوں کا دست نگر ہے۔ خود ملک کے اندر لوگوں کی ضروریات فراہم کرانے میں مسولینی نے معجزے دکھائے ہیں لیکن اس کی بھی کوئی حد ہے۔ صلح کی کانفرنس کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ اس کی ضروریات کو معقولیت سے پورا کیا جائے۔ اور اسی وجہ سے ہمیں امید ہے کہ اس کانفرنس میں جرمنی، جاپان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہوں گی تاکہ ان وسیع تر مسائل پر توجہ کی جاسکے، دنیا کی تجارت میں جو رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں وہ ہٹائی جاسکیں، ہجرت کرکے دوسرے ملکوں میں بسنے کے لئے پھر آسانیاں پیدا ہوں، تمام نوآباد علاقوں میں سب کے لئے دروازہ یکساں کھلا رہے۔۔۔۔۔۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان ۵ کروڑ آدمی یورپ سے جاکر امریکہ میں بسے، آج ایک آدمی نہیں جاسکتا۔ اگر بین الاقوامی تجارت کے کل پرزے پھر سے چلنے لگیں تو آبادی کی نکاسی کے امکانات کچھ افریقہ ہی تک محدود نہیں ہیں۔ ریگستانی افریقہ میں ۱ کروڑ انسانی بستے ہیں اور زرخیز جنوبی امریکہ میں صرف ۸ کروڑ۔"

غرض اٹلی سے اگر ڈر ہے اور ناراضی تو ساتھ ہی اس کے مسائل کے حل کرنے کے لئے دوسروں کو ساتھ بیٹھنے کی بھی فکر ہے۔ تاکہ نہ صرف اپنے ہی اغراض پر نہ بیٹھے دوسرے یہ کہ اٹلی ہمیشہ کے لئے جمعیۃ سے الگ ہوکر جاپان، امریکہ، اور جرمنی کی طرح جو اسے پہلے سے ترک کرچکے ہیں سیاست عالم میں مزید پیچیدگی کی وجہ نہ بنے۔

جرمنی اور اٹلی | بین الاقوامی سیاست میں تو حبش کی جنگ دراصل جمعیۃ اقوام اور اٹلی کا جھگڑا بن گئی ہے اور جرمنی چونکہ مدت ہوئی جمعیۃ ہی کو خیرباد کہہ چکا اس لئے بظاہر اس قضیہ سے الگ تھلگ ہے۔

لیکن دراصل اس کا رد یہ بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ اگر جرمنی چاہے تو اٹلی کے ساتھ تجارت بڑھا کر جمعیتہ نے جو معاشی کارروائی اٹلی کے خلاف کی ہے اسے تقریباً کالعدم کر دے۔ لیکن جرمنی نے فی الحال اس جھگڑے میں بالکل غیر جانبداری کا اعلان کیا ہے۔ مگر یہ غیر جانبداری دراصل دو متضاد رجحانات میں احتیاط کی درمیانی راہ ہے۔ کہ بعض عناصر ایسے ہیں جن کی وجہ سے جرمنی کو اٹلی کا ہمنوا ہونا چاہئے تھا، اور بعض ایسے ہیں جو اسے اٹلی کے مخالف گروہ میں کھینچ سکتے ہیں۔ اٹلی اور جرمنی کی موجودہ حکمران جماعتوں کے سیاسی مسلک میں جو مشابہت ہے۔ پھر اٹلی اور جرمنی دونوں کے دل میں جو یہ خواہش ہے کہ جنگ عظیم کے بعد کے معاہدے ختم ہوں اور مختلف ممالک اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر آپس میں عہد و پیمان کر لیں پھر ان دونوں کا یہ مشترک عقیدہ کہ ہر چند حتی الوسع سیاسی امور کو مفاہمت اور گفت و شنید سے طے کرنا اچھا ہے لیکن بالآخر فیصلہ تلوار کا ہوتا ہے، اسے نیام میں رکھنا اچھا ہے لیکن اس پر زنگ آنے دینا دانشمندی نہیں۔ یہ سب چیزیں اس کی متقاضی تھیں کہ جرمنی اٹلی کا ساتھ دیتا۔ مگر ان کے مقابلہ میں دوسری زیادہ اہم چیزیں ہیں۔ جمعیتہ کی قوت کو ٹوٹتے، اور جرمنی کی قوت کو ابھرتے دیکھ کر فرانس نے روس سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اس طرح مغربی سیاست میں اپنی اہمیت کو ختم ہونے سے بچا لیا ہے۔ جرمنی جانتا ہے کہ اس معاہدہ کی زد اس پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ برطانیہ اور شمالی یورپ کی دوسری قوموں سے اتحاد کی فکر میں ہے۔ خصوصاً برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کر رہا ہے۔ برطانیہ چونکہ اس وقت اٹلی کے ساتھ نہیں اس لئے جرمنی آیندہ برطانوی اعانت کی امید پر اٹلی سے الگ ہے۔

دوسرا مسئلہ آسٹریا کا ہے جرمن قوم میں، بلا امتیاز عقاید سیاسی، آسٹریا کو جرمنی کے ساتھ ملانے کی خواہش عرصہ سے ہے اور بہت قوی ہے۔ اس خواہش کے پورا ہونے میں اگر کوئی حائل ہے تو اٹلی جس نے رفتہ رفتہ آسٹریا کو اپنے حلقہ اثر میں لے لیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی جرمنی اٹلی کی شکست بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ اس کی شکست دراصل جمعیتہ کے جمہوریت پسند ممالک کی فتح ہوگی اور اس فتح کا اثر جرمنی کی اندرونی سیاست پر بہت برا پڑے گا۔ مگر اٹلی کو اس شکست سے بچانے کے لئے



چند نایاب قلمی تحائف

کلماتِ طیبات سائز ۵ × ۸½ انچ، متن کا سائز ۶ × ۳ انچ، ۱۱ سطریں، ۱۵۶ صفحات، خط نستعلیق عمدہ۔ اورنگ زیب عالمگیر کے غیر مطبوعہ چیدہ نایاب رقعوں کا مجموعہ، قیمت دس روپے (عہ)

گلستانِ سعدی سائز ۵½ × ۹ انچ، متن کا سائز ۳½ × ۶¾ انچ، ۱۳ سطریں، قلم واضح، خط نستعلیق صاف، مطلا و مذہب لوح از اول تا آخر، طلا کار حاشیہ ہر صفحے پر شرح معانی، سنہ کتابت ۱۲۵۵ھ ہجری، قیمت پچیس روپے (مہ)

شاہنامہ فردوسی سائز ۱۵ × ۹ انچ، متن کا سائز ۱۱ × ۶ انچ، ۲۵ سطریں، ۴ کالم قلم خفی، خط معمولی، تقریباً ۵ رنگین تصاویر تحریر ۱۱۹۵ھ ہجری تا ۱۲[illegible] قیمت مجلد ستر روپے (معہ)

رقعاتِ ابوالفضل سائز ۶½ × ۱۰½ انچ، متن کا سائز ۸ × ۴ انچ، ۱۵ سطریں خط مسوط[illegible] سنہ تحریر ۱۲۲۷ھ ہجری علامہ ابوالفضل کے غیر مطبوعہ رقعات، قیمت مجلد [illegible]

نل دمن فارسی تحریر ۱۲۰۹ھ ہجری، سائز ۷½ × ۱۱½ انچ، متن کا سائز ۹ × ۵½ انچ، ۱۷ سطریں خط نستعلیق عمدہ۔

ترجمہ اردو گلستانِ سعدی از میر شیر علی افسوس۔ حسب فرمائش مسٹر جان گلکرسٹ۔ تحریر ۱۲۶۲ھ ہجری سائز نل دمن کے مطابق ۱۹ سطریں۔ دونوں کتابیں یک جا مجلد۔ قیمت ہر دو کی مجلد پچیس روپے (مہ)

شرحِ دیوانِ حافظ سائز ۷½ × ۱۱½ انچ، متن کا سائز ۴¾ × ۸½ انچ، ۱۹ سطریں، قلم خفی نستعلیق خط۔ قیمت مجلد دس روپے (عہ)

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین، ایم اے، پی ایچ ڈی — پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۹	مارچ سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن) ... نے جامعہ ... میں چھپوا کر شائع کیا

ދިވެހި ތާރީޚު

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حال ہی میں معاشی دستور العمل (Economic plan) اختیار کرنے کی تجویزیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اور صوبہ متحدہ کی کونسل میں مسٹر جنیا متی کی یہ تجویز کہ اس صوبے کے لئے ایک پنج سالہ دستور العمل تیار کیا جائے معاشی تحقیقاتی بورڈ کے زیر غور ہے۔ صوبہ مدراس نے بھی ایک معاشی کونسل قائم کی ہے اور یہ کونسل غالباً منجملہ دیگر امور کے معاشی دستور العمل اور بے روزگاری کے مسائل پر بھی توجہ کرے گی۔ لیکن یہ تمام کوششیں جو اس وقت تک کی گئی ہیں اس سے کوئی امید افزا نتیجہ پیدا ہونے کی توقع نہیں قائم ہوتی بلکہ جس انداز سے اب تک کام کیا گیا ہے اس سے تو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ ابھی تک بے روزگاری کے اسباب و علل تحقیق کرنے کی حقیقتاً کوئی خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

تعلیم یافتہ اور بے روزگاروں کی تعریف

اس موضوع پر بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ اور بے روزگاری کا مفہوم اچھی طرح واضح کر دیا جائے، صوبہ متحدہ کی بے روزگاری کمیٹی نے تعلیم یافتہ کی تعریف یہ کی ہے کہ ایک شخص جس نے ورناکیولر فائنل یا اس سے اعلیٰ کوئی امتحان پاس کیا ہو، یہ تعریف ممکن ہے کہ بعض کاموں کے لئے کارآمد ہو لیکن ہم چونکہ معاشی نقطۂ نظر سے بے روزگاری کے مسئلے پر بحث کرنا چاہتے ہیں اس لئے تعلیم یافتہ کی تعریف ہمارے لئے یہ ہونا چاہئے کہ "وہ شخص جس کا معیار زندگی تمام آبادی کے معیار زندگی سے زیادہ بلند ہو۔ نیز یہ کہ اس کی قوت، دولت۔ آفرینی بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو، چنانچہ معاشی نقطۂ نظر سے تعلیم یافتہ کی تعریف صرف معیار زندگی اور قوت دولت آفرینی کے اعتبار سے کی جاسکتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ معیار زندگی اور قوت دولت آفرینی کے متعلق ضروری اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوسکتے اس لئے یہ تعریف ہمارے لئے بے سود ہے، بہرحال یہ ذہن نشیں کرنا ضروری ہے کہ اگر معاشی نظر سے اس مسئلے کا تجربہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقے کا معیار زندگی عام آبادی کے معیار زندگی سے بلند ہوتا ہے۔ اور قوت دولت آفرینی بھی زیادہ ہوتی ہے گو یہ ممکن ہے کہ معیار دولت آفرینی معیار زندگی سے نسبتاً کم درجے کا ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ بے روزگاری اور معیار زندگی کا
ایک اضافی تعلق ہے یعنی اگر کسی شخص کی آمدنی اتنی نہیں کہ وہ اپنے معیار زندگی کو قائم رکھ سکے تو اسی
حد تک معاشی نقطہ نظر سے گویا وہ بے روزگار سمجھا جائے گا۔ یونیورسٹی کے اکثر گریجوٹ اگر چاہیں تو
انھیں کوئی نہ کوئی روزگار، کچھ نہیں تو ایک مزدور ہی کی حیثیت سے مل سکتا ہے اور جو لوگ روزگار سے
لگے ہیں ان میں سے اکثروں کی آمدنی ایک اچھے کاریگر کی آمدنی سے کم ہی ہوتی ہے۔ اس لئے ان لوگوں
کا شمار بھی ایک حد تک بے روزگاروں میں کیا جائے گا، ایک قابل گریجوٹ جس نے اپنی روزی کمانے کے
لئے جوتے پر پالش کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ اور اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ وہ کسب حلال کے لئے
ہر قسم کی محنت اور مزدوری کرنے کا ایک سبق ہم لوگوں کو دینا چاہتا ہے اس کا بھی شمار اس تعریف
کے ماتحت بے روزگاروں میں کیا جائے گا۔ روزگار سے لگنے کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص اتنا کما سکے کہ
اپنے معیار زندگی کے مطابق وہ خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش کر سکے، بلکہ بعض لوگوں کے
نزدیک مزید برآں اس کی آمدنی میں اتنی اور گنجائش بھی ہونا چاہئے کہ وہ آیندہ ترقی اور فراغت
سے زندگی گذارنے کا انتظام بھی کر سکے۔

مسئلے کی تشریح

اس میں شک نہیں کہ موجودہ کساد بازاری سے بے روزگاری بہت بڑھ گئی ہے لیکن یہ نہ
سمجھنا چاہئے کہ بے روزگاری کلیۃً یا زیادہ تر کساد بازاری کی وجہ سے ہے۔ بلکہ اس کی تہ میں بہت
سے اسباب مستقل طور پر کار فرما ہیں، کساد بازاری سے قبل بھی بے روزگاری اور برابر بڑھتی جا رہی
تھی، کساد بازاری کے نتائج اور بے روزگاری کے اسباب میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے اس موضوع
پر گفتگو کرتے وقت بہت زیادہ غلط مبحث اس زمانے میں کیا گیا ہے۔ اس وقت میں کساد بازاری کے
اسباب سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ صورت حال گو اس وقت بہت نازک ہو گئی ہے مگر بہر حال
عارضی ہے اور امید ہے کہ رفتہ رفتہ اصلاح پذیر ہوتی جائے گی۔ میں اس مضمون میں بے روزگاری کے

مستقل اسباب پر اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ اس وقت بھی باقی رہیں گے جب کساد بازاری کا یہ زمانہ ختم ہو جائے گا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی معاشی نظام میں جہاں قوانین وراثت اور املاک میں جلد جلد تبدیلیاں نہ واقع ہوئی ہوں۔ قومی آمدنی کا جو حصہ کسی ایک کے حصے میں آتا ہے وہ کم و بیش قائم رہتا ہے۔ پریٹو نے سب سے پہلے اس معاشی اصول کی تحقیق کی تھی۔ بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو جب تک کہ قومی آمدنی کی تقسیم میں مختلف طبقات کا حصہ معین اور قائم ہے اس وقت تک مختلف طبقات کی آبادی کے اضافے کی بھی کچھ حد مقرر ہونی چاہئے۔ یہ حد بالعموم اونچی آمدنی والے طبقے میں نسبتاً جلد آجاتی ہے، بمقابلہ کم آمدنی والے طبقات کے، اور کوئی قوم ایک عرصے تک کسی ایسے طبقے کا بار نہیں اٹھا سکتی جس کا معیار زندگی عوام الناس کے معیار زندگی سے بہت زیادہ بلند ہو۔ اگر اونچے طبقے کی آبادی میں زیادہ اضافہ ہو جائے اور اس طبقے کی آمدنی میں اسی نسبت سے اضافہ نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس طبقے میں یا تو بے روزگاری پھیلے گی یا معیار زندگی کم ہو جائے گا یا دونوں مشکلات کا بیک وقت سامنا ہوگا، اور اگر یہ خواہش ہے کہ اس طبقے کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ بھی ہوتا رہے اور معیار زندگی بھی نہ گھٹے تو دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو قومی آمدنی میں مجموعی طور پر اسی قدر اضافہ کیا جائے جس نسبت سے کہ اس طبقے میں آبادی بڑھتی ہے یا پھر قوانین املاک اور وراثت میں اس قسم کی تبدیلیاں کی جائیں کہ قومی آمدنی کا بیشتر حصہ اس طبقے کے حصے میں آجائے۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ تعلیم یافتہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے کم از کم ورنیکولر فائنل کا امتحان پاس کیا ہے تو اس زمانے میں اوسطاً ۲۵ ہزار اشخاص کا سالانہ اضافہ صرف صوبہ متحدہ میں اس طبقے کے اندر ہو رہا ہے، پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ گذشتہ ۳۰ سال کے اندر کم و بیش اسی قدر تعداد کا اضافہ ہوتا رہا ہے نیز یہ کہ ان میں سے ہر شخص امتحان پاس کرنے کے بعد کم از کم ۳۰ سال زندہ بھی رہتا ہے تو یہ تعلیم یافتہ طبقہ ۳ فیصدی کے حساب سے سال بہ سال بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ تو کم از کم تخمینہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے

کیا جائے۔ زرعی پیداوار کی طلب کے مقابلے میں مصنوعات کی طلب زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے کہ اور گو اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ پیٹ بھر کر کھانے سے بھی محروم ہے اور اس لئے ابھی غلے کی طلب میں اضافے کی بہت گنجائش ہے۔ پھر بھی مصنوعات کے مقابلے میں زرعی مال کی طلب محدود ہی ہوتی ہے۔ اور مصنوعات کی طلب میں اضافے کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ معیار زندگی جتنا بلند ہوتا جائے گا اسی قدر مصنوعات کی طلب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس لئے ملک کی مجموعی قومی آمدنی میں حقیقی اضافے کی توقع صرف صنعتی ترقی سے ہو سکتی ہے۔

لیکن جب کبھی صنعتی ترقی کا ذکر کیا جاتا ہے تو بالعموم اس کا مطلب بڑے پیمانے کی صنعتوں سے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں، چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی اور بالخصوص ان صنعتوں کی تنظیم زیادہ ضروری ہے۔ جن کا تعلق زراعت سے ہے۔ ان صنعتی ممالک میں جہاں بڑے پیمانے کی صنعتوں کا زیادہ رواج ہے۔ گھریلو صنعتوں کو بھی ساتھ ساتھ ترقی دی گئی ہے اور ہندوستان کے مخصوص معاشی حالات میں گھریلو صنعتوں کی اہمیت دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

زراعت اور صنعت و حرفت کے وسائل کی تنظیم تو خیر ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی چند باتیں توجہ طلب ہیں۔ مثلاً بجلی کی قوت سے کما حقہٗ فائدہ اٹھانا ذرائع نقل و حمل کو اور زیادہ ترقی دینا۔ زراعت اور صنعت و حرفت کے لئے سرمائے کی فراہمی اور مصنوعات فروخت کرنے کے لئے منڈیوں کی تنظیم وغیرہ۔ انیسویں صدی میں جو غیر معمولی معاشی ترقی بعض ممالک نے حاصل کی وہ بھاپ کی قوت استعمال کرنے کی بدولت تھی لیکن آج کل بجلی کی قوت بھاپ کی جگہ لیتی جا رہی ہے اور اس طرح ایک جدید دور انقلاب شروع ہو گیا ہے کوئلے کی بجائے بجلی اور پٹرولیم کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں بجلی کی قوت سے کام لینا زیادہ مفید اور ارزاں ہوگا اس لئے کہ کوئلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں مصارف بار برداری بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت

ہے کہ بجلی کے جتنے خزانے میسر آئیں سب سے فائدہ اُٹھایا جائے اور کام لیا جائے اس کے علاوہ کوئلے سے پٹرولیم تیار کرنے کے انتظامات بھی تجارتی نقطۂ نظر سے تحقیق طلب ہیں۔ انگلستان میں تو کوئلے سے پٹرول نکالنے کا تجربہ کامیاب ثابت ہو چکا ہے اور اب اس سے تجارتی فائدہ بھی اُٹھایا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی کوئلہ کافی مقدار میں موجود ہے اسلئے اگر کوئلے سے پٹرولیم تیار کرنے کی تدابیر تجارتی حیثیت سے مفید ہوں تو جہاں بجلی نہ پہنچ سکے اس کی جگہ پٹرولیم سے کام لیا جا سکتا ہے

ہندوستان میں ذرائع آمد و رفت یعنی ریل اور سڑکیں خاصی ترقی یافتہ حالت میں اس وقت بھی ہیں لیکن اب ضرورت ہے کہ موٹروں کی آمد و رفت کے لئے چھوٹی چھوٹی سڑکوں کو اور زیادہ پھیلایا جائے تھوڑے فاصلوں کو طے کرنے کیلئے ان علاقوں میں جہاں مسافروں کی آمد و رفت زیادہ نہیں ہے ریل کے مقابلے میں موٹر کا سفر کم خرچ ہوگا اسلئے موٹروں کے ذریعے نقل و حمل کو اس صورت سے ترقی دینے کی ضرورت ہے کہ ریلوں سے مقابلے کی بجائے موٹریں ریلوں کی معاون بن جائیں اور ان علاقوں سے ریل کا تعلق پیدا کر دیں جہاں سے ریل نہیں گذرتی

جہاں تک ملک کے بنکوں اور ساہوکاروں کا تعلق ہے موجودہ حالت بہت زیادہ ناقابل اطمینان ہے اور اس کی از سر نو تنظیم کی ضرورت ہے سب سے بڑا نقص تو یہ ہے کہ صنعتی کاروبار کے لئے سرمایہ حاصل کرنے کا کوئی معقول انتظام موجود نہیں اس لئے پہلے تو اس قسم کے بنکوں کی شدید ضرورت ہے جو صنعتی کاروبار کے لئے سرمایہ فراہم کر سکیں حال ہی میں صوبجات متحدہ میں صنعتی مالیات کی ایک کمیٹی نے صنعتی بنک قائم کرنے کی تجویز کی ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ تجویز معقول ہے لیکن مجھے کمیٹی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ کل پچیس لاکھ کے سرمایے سے ایک بنک قائم کیا جائے اس لئے کہ اس وقت بھی صوبہ متحدہ کے بڑے بڑے صنعتی کارخانوں میں ۸ کروڑ سے زیادہ سرمایہ لگا ہوا ہے ظاہر ہے کہ اس قدر چھوٹے سرمائے کے بنک سے پورے صوبے کے صنعتی کاروبار کو اگر کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے تو بہت ہی قلیل ہوگا ضرورت ہے کہ اور زیادہ وسیع پیمانے پر صنعتی بنک ہر ہر صوبے میں قائم کئے جائیں اور ان کا رشتہ ملک کے مرکزی ساہوکاروں سے ضرور قائم کر دیا جائے۔

یوں تو ہر قسم کے مصنوعات کے لئے منڈی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بڑے پیمانے پر جو کارخانے قائم کئے گئے ہیں وہ اپنے مال کی نکاسی کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی لیتے ہیں۔ البتہ

چھوٹی چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لئے منڈی تیار کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ جب تک حکومت چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے لئے منڈی تیار کرنے کی کوشش نہ کرے گی ان صنعتوں کا احیا مشکل ہے۔

معاوضے کے کاموں کو وسیع پیمانے پر شروع کرنے کا مناسب اور موزوں ترین وقت میرے نزدیک یہی ہے اس لئے کہ اس وقت حکومت صرف ۳ فی صدی کی شرح سود پر قضا چاہے قرض لے کر ان تعمیری کاموں میں لگا سکتی ہے۔ اتنی کم شرح سود پر اس صدی کے آغاز سے اس وقت تک کبھی روپیہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے محکمہ معاشیات کے لئے یہ موقع ہے کہ بلا کسی پس و پیش کے اگر وہ چاہے تو بڑی سے بڑی اسکیموں کا آغاز کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ معاشی اور کاروباری نقطۂ نظر سے بھی اس کی تجاویز صحیح اور مفید ہوں

معاشی امور کے علاوہ محکمہ معاشیات کو بعض دیگر تمدنی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کرنا ہوگی۔ مثلاً تعلیم حفظان صحت، اور طبی امداد، اس کے علاوہ ایک چیز اور ہے۔ جس کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ سکونتی مکانوں کا معاملہ ہے، جس پر میرے نزدیک معیار زندگی بلند کرنے کا دارو مدار ہے۔

نظام تعلیم کی اصلاح

تعلیم یافتہ طبقے کی بے روزگاری کا بہت گہرا تعلق مروجہ نظام تعلیم سے بھی ہے ہمارے نظام تعلیم کا سب سے بڑا نقص . اس کے بندھے ٹکے اصول ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ایک اچھے نظام تعلیم کی خصوصیت یہ ہونا چاہئے کہ نوجوانوں کو آئندہ زندگی کی ضرورت کے لئے پوری طرح تیار کر دے اور چونکہ زندگی کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے تعلیم میں بھی تنوع ہونا چاہئے۔ مگر ہندوستان کے نظام تعلیم میں یہ بات بالکل مفقود ہے۔ ہمارے ملک میں صرف ایک ہی طرح کے مدارس ہیں ایک ہی نصاب تعلیم ہے اور سب

کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہر لڑکا یونیورسٹی میں جاتا ہے اور کوئی دوسری راہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے سب سے پہلے تو اس نقص کو دور کرنا چاہئے اور اسکول ہی میں مختلف حرفوں اور فنوں کی تعلیم کا انتظام کر دینا چاہئے۔ تاکہ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکے کسی کاروبار میں لگ سکیں۔

اسکول کی مدت تعلیم کے مدارج دوبارہ مقرر کرنے پر حکومت صوبہ متحدہ نے اپنی ایک قرارداد میں زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بات اتنی زیادہ اہم نہیں ہے جتنی یہ کہ اسکول کی تعلیم کے مقاصد میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ ثانوی تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد طلباء یونیورسٹیوں میں داخل ہو جائیں۔ اسکول کی تعلیم خود کافی بالذات ہونا چاہئے اور یہ اسی طرح ممکن العمل ہے کہ یونیورسٹیوں کے داخلے کے لئے علیحدہ ایک امتحان مقرر کیا جائے اور اسکول کے نظام تعلیم سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام ثانوی مدارس حرفہ ہی کی تعلیم کے لئے مخصوص کردئے جائیں بلکہ میری رائے یہ ہے کہ حرفہ کی تعلیم عام تعلیم سے علیحدہ ہونا چاہئے ایک ہی مدرسے میں عام تعلیم کے ساتھ حرفہ کی تعلیم کا جہاں کہیں انتظام کیا گیا ہے کامیاب نتائج نہیں نکلے ہیں۔

عام تعلیم کے نصاب میں بھی اصلاح کی بہت ضرورت ہے تاکہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد طالب علم کسی پیشہ کے لائق بن جائے۔ اس وقت مدرسے کے نصاب میں خالص علمی اور ادبی رنگ اتنا زیادہ غالب ہو کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد سوائے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اور کوئی دوسرا کام طالب علم نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر شروع ہی سے طلباء میں ایسی صلاحیتیں اور ذوق پیدا کرنے کا خیال رکھا جائے کہ طلباء انٹرنس کے بعد کسی تجارت میں یا کسی اور کاروبار میں لگ جائیں تو بہتر ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں دوسرا نقص یہ ہے کہ عام تعلیم اور حرفتی تعلیم کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، حرفتی تعلیم کا انتظام محکمہ صنعت و حرفت کے سپرد ہے اور زرعی تعلیم محکمہ زراعت سے متعلق ہے۔ اگر مختلف قسم کے حرفہ اور زراعت

کی تعلیم پر اتنا زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اس کے مقابلے میں گویا ادبی تعلیم کی کوئی اہمیت ہی نہیں اور اندیشہ ہے کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کے حامی اپنے جوش میں ادبی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو کہیں بالکل نظر انداز نہ کردیں اگر ایسا ہوا تو یہ صورت بھی اسی قدر افسوسناک ہوگی، جتنا کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کو نظر انداز کرنا۔ اس لئے کہ حقیقی قومی ترقی اس وقت تک بالکل نہیں ہوتی جب تک افراد قوم خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں کام کررہے ہوں۔ قومی تمدن، قومی اخلاق اور قومی روایات کے حامل نہ ہوں۔ یہ خصوصیات صرف تمدنی اور ادبی تعلیم ہی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ آج کل ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں خود اعتمادی کام کرنے کی اُپج اور حوصلہ بالکل نہیں ہوتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی صنعتی اور تجارتی پستی کی اصل وجہ یہ ہے کہ کافی سرمایہ دستیاب نہیں ہوسکتا۔ یا ماہر کاریگر موجود نہیں اور حکومت سرپرستی نہیں کرتی۔ لیکن میرے نزدیک ان سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں اپنے بل بوتے پر کام کرنے کی 'اُپج' حوصلہ اور ہمت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ ہماری تمدنی اور ادبی تعلیم کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ ہمارے نوجوانوں میں اس قسم کی خصوصیات پیدا کی جائیں اور جب تک یہ نہیں کیا جائے گا زندگی کے کسی شعبے میں خواہ تجارت ہو، یا صنعت و حرفت، نہ تو رہنمائی پیدا کرنے والے نوجوان پیدا ہوں گے اور نہ ملک کی ترقی کی کوئی امید کی جاسکتی ہے۔

ان مسائل پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے سنٹ انیڈریوز یونیورسٹی کے رکٹروں کے دو خطبے یاد آجاتے ہیں، بیری کا خطبہ "حوصلہ اور ہمت" پر، اور نان سین کا خطبہ (اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے جذبہ) پر۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں جسمانی طاقت اور وہ ہمت پیدا کی جائے جس سے کرۂ ہوائی مسخر کیا جائے۔ اور قطبین تک ہماری فتوحات پہنچ جائیں۔ بلکہ خیال اور ذہن کی دنیا میں بھی ہمت اور حوصلے سے کام لے سکیں۔ اس لئے کہ یہ خیال ہی کی قوت ہے جس سے زندگی کا کارخانہ چل رہا ہے

[illegible]

بھی بہت زیادہ پھیل رہی ہیں باایں ہمہ آبادی بڑھتی جارہی ہے۔

مثل تمام افلاس زدہ اور غیر تعلیم یافتہ ممالک کے ہندوستان میں بھی شرح پیدائش اور شرح اموات زیادہ ہیں[ط] انگلستان میں فی ہزار نفوس سالانہ ۲۲ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ۱۲ افراد مرتے ہیں لہذا انگلستان کی شرح بقا دس فی ہزار سالانہ ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں فی ہزار نفوس سالانہ ۴۵ بچے پیدا ہوتے ہیں مگر ۳۵ مرتے ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان کی شرح بقا صرف دس فی ہزار سالانہ رہ جاتی ہے مگر چونکہ آبادی ۳۵ کروڑ پر مشتمل ہے لہذا سالانہ ۳۵ لاکھ اشخاص کا اضافہ ہورہا ہے اور ان کا بار زیادہ تر زراعت اور کماؤ پوتوں پر پڑ رہا ہے۔

زراعت کے متعلق تو ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ہندوستان کا اہم ترین ذریعہ معاش ہے جس پر آبادی کے تقریباً ۷۰ فی صدی اشخاص کا دارومدار ہے۔ ہم سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں کہ زراعت پر آبادی کا بار سال بہ سال بجائے کم ہونے کے بتدریج بڑھ رہا ہے جس کی اصل وجہ صنعتی تنزل اور تجارت کی سست ترین رفتار ترقی ہے صنعتی تنزل اور تجارت کی سست رفتاری کی وجہ جیسا کہ ہم میں سے اکثر کو معلوم ہے حکومت اور معاشرت کی غفلت ولاپرواہی ہے کاروبار کی سرپرستی حکومت و معاشرت کی طرف سے جھینک جھینک کے کی جاتی ہے۔ بجز معدودے چند فنی تعلیم گاہیں عنقا ہیں اور

[ط] "It is well known that the tendency to multiplication is greatest where men have no stake in existence, where they have no prospect of improving their condition... Poverty accentuates the process of multiplication; multiplication intensifies poverty." Prof. P.A. Wadia and G. N. Joshi: "The Wealth of India" Macmillan, London, 1925, p. 74.

اسی طرح تجارتی اور پیشہ وری تعلیم کا انتظام انتہائی طور پر غیر تشفی بخش ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ ملک میں کاروبار چلانے والے، معتبر، محنت پسند اور حوصلہ مند اشخاص کی تعداد بہت ناکافی ہے۔ اُجرتوں کو قومی ضروریات اور جدت پسند زمانے کے رجحانات سے ناواقفیت ہے۔ تجدید کا حوصلہ تو درکنار تقلید کا مادہ بھی نہیں چنانچہ ہماری بیشتر صنعتیں یورپ و امریکہ کی صنعتوں سے کم از کم نصف صدی پیچھے ہیں۔ ندامت سے اقرار و اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ صنعت بھی جسے علم و ادب سے سب سے گہرا تعلق ہے یعنی طباعت و اشاعت زبوں حالت میں ہے۔ دیسی زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر نہیں ہندوستان میں چھپی ہوئی اکثر انگریزی کتابوں ہی کو دیکھئے آپ فوراً امریکی اور یورپی صنعت کی بلندی اور ہندوستانی طباعت کی پستی کو محسوس کریں گے جو حال طباعت و اشاعت کا ہے اس سے بدتر عالم جمود و سکون میں ہندوستانیوں کی اکثر صنعتیں، کارخانے، تجارت گاہیں اور کاروبار ہیں۔

ان حالات کے تحت یہ کس طرح ممکن ہے کہ ذرائع معاش میں اضافہ ہو سکے؟ یا یہ کہ ہندوستانیوں کو خدمات کے مواقع زیادہ ملیں اور زیادہ تعداد میں نوکریاں ہندوستانیوں کے لئے مختص کی جائیں دنیا میں بغیر محنت و مشقت کے، بغیر ایثار و قربانی کے۔ بغیر جدوجہد کے بغیر کوشش و مستقل مزاجی کے اور بغیر بخت و اقبال کے کسی کو ثمر نہیں ملتا۔ بخت و اقبال پر ہمارا زور نہیں، مگر کیا محنت و مشقت کو، ایثار و قربانی کو، کوشش و مستقل مزاجی کو ہم اپنا مطیع نہیں کر سکتے؟ بہر طور حکومت کی مصلحتوں اور قوم کی خصوصیتوں کی وجہ سے آج ہندوستان کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ذرائع معاش کی رفتار اضافہ نہایت سست اور آبادی میں اضافے کی رفتار نہایت تیز ہے۔ آپ کو سن کر سخت حیرت ہوگی کہ جدید مردم شماری کی رُوئداد کے مطابق ہندوستان میں ان لوگوں کی تعداد جو کسی نہ کسی طرح بھلے برے طور پر کماتے ہیں صرف ۱۶ کروڑ ۸۸ لاکھ ہے[۵] حالانکہ ہندوستان میں ۱۵ تا ۵۵ عمر کے افراد کی تعداد

---

۵ دیکھئے Statistical Abstract for British India from 1922-23 to 1931-32 سرکاری اشاعت مطبوعہ دہلی ۱۹۳۳ء صفحہ ۴

ان بر سر روزگار لوگوں کی تعداد میں ان پیشہ وروں کا بھی لحاظ کیا ہے جنکے ذرائع معاش غیر پیدا آور ہیں چنانچہ سرکاری اصطلاح کے بموجب یہ Unproductive Means of occupation ہیں۔ اِن لوگوں کی تعداد جو غیر پیدا آور خدمت انجام دینے کے باوجود کمانے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں ۴۷ لاکھ ہے۔

۱۰ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے[۵۰]۔ بالفاظ دیگر اگر ہم ۱۵ برس سے کم اور ۵۵ سے زیادہ عمر والے افراد کی تعداد اس خیال سے منہا کر دیں کہ وہ پیدائش دولت میں حصہ نہیں لیتے۔ تب یہ تلخ حقیقت ایک ڈراؤنی شکل میں نمودار ہوتی ہے کہ ہندوستان میں ان لوگوں کی تعداد جو بے روزگار ہیں ۱ کروڑ ۹۰ لاکھ ہے ان ۱ کروڑ ۹۰ لاکھ بے روزگاروں کا بار کماؤ پوتوں پر پڑ رہا ہے اور آپ کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں ایسے لوگ نظر آئیں گے جو دس دس بارہ بارہ کو پال رہے ہیں اور اس بوجھ سے خود لپا ہوئے جا رہے ہیں ان ایک کروڑ ۹۰ لاکھ بے روزگاروں کے جم غفیر میں ۵ ہزار سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو ہماری اور آپ کی طرح ڈگری یافتہ ہیں۔ کوئی بی۔ اے ہے، کوئی ایل، ایل، بی ہے۔ کوئی ایم۔ اے ہے، کوئی ایم۔ ایس سی ہے کوئی پی، ڈی ہے مگر باوجود ان ڈگریوں کے بے روزگار ہیں[۵۱]! اور ان ۵ ہزار میں ۳۰ برطانوی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ ڈگری یافتہ ہیں جنھیں کہیں کوئی خدمت نہیں ملتی۔

یہ ہے ہندوستان کی عظیم بے روزگاری اور قلت معاش کا حال۔ اسی بے روزگاری اور قلت معاش کی وجہ سے قومی صحت ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ بیماری کی شدت وکثرت ہے۔ وبائیں آئے دن پھیلی رہتی ہیں عام شرح اموات زیادہ اور بچوں کی شرح اموات زیادہ تر ہے جس کثرت سے ہندوستان میں شیر خوار معصوم بچے مرتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو ان اعداد سے ہوگا کہ سالانہ جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں ۵ سال کے اندر ہی فی لاکھ اطفال میں ۵۵ ہزار موت کا شکار ہوتے ہیں!!

اس طرح سالانہ بھارت ماتا نصف کروڑ شیر خوار، معصوم اور بھولے بھالے صغیر سن بچوں کو

---

[۵۰] ملاحظہ ہو "Statistical Abstract" from 1922-23 to 1931-32 مطبوعہ دہلی ۱۹۳۴ء صفحہ ۴۵

[۵۱] ایک موقر اخباری اطلاع کے بموجب مگر حیرت ہے کہ ہٹن صاحب نے ڈگری یافتہ بے روزگاروں کی تعداد ۲۵ ہزار سے کم یعنی صرف ۲۲۲۲ بتائی ہے۔ سرکاری اعداد وشمار میں شبہ کرنا کفر ہے مگر قرائن سے سرکاری اعداد صحیح نہیں معلوم ہوتے ہٹن صاحب نے یہ اعداد Census of India کی رپورٹ ۱۹۳۱ء جلد اول صفحہ ۳۲ پر دئے ہیں۔

ملک الموت کے سپرد کرتی ہے۔ اس تلخ داستان کے سلسلہ ناتمام کا خاتمہ صرف ضمنی طور پر ہی کیا جا سکتا ہے اور اب صرف اس سوال کا جواب دینا باقی رہ جاتا ہے کہ ان حالات کے تحت مسئلہ آبادی کو کیوں کر حل کیا جا سکتا ہے!

مسئلہ آبادی کی تحلیل

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ زمانے میں مسئلہ آبادی کا دار و مدار مقدار دولت پر نہیں رہا بلکہ اس کا تعلق ذرایع معاش سے ہو گیا ہے کیونکہ اس میکانکی عہد میں پیدائش دولت بہت زیادہ آسان ہو گئی ہے اور اس کثیر مقدار دولت کو پیدا کرنے کے لئے نسبتاً و مقابلتہً بہت کم اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے نظریہ موافق توازن آبادی کے بیان سے اس امر کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر ملک و ہر زمانے میں موجودہ حالات سیاسی و معاشرتی کے مدنظر ملک میں صرف ایک خاص تعداد آبادی ہی کو انسانوں کے شایان شان معقول معیار زندگی پر پالنے کی صلاحیت رہتی ہے۔ نیز ہم نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ آج اکثر ممالک میں اضافی کثرت آبادی پائی جاتی ہے اس تحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ مسئلہ آبادی کو کیوں کر حل کیا جا سکتا ہے

تحلیل مسئلہ آبادی کی صرف دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہو اسی رفتار سے ذرایع معاش فراہم کئے جائیں تاکہ کوئی شخص جو محنت کا متلاشی ہو۔ روزی نہ ملنے کی وجہ سے ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ناممکن ہو کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اسی رفتار سے ذرایع معاش میں بھی اضافہ کیا جائے تو پھر مسئلہ آبادی کو حل کرنے کی دوسری صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آبادی کی رفتار کو کم کیا جائے۔ ذرایع معاش کی رفتار اور اضافہ آبادی کی رفتار میں تناسب اور موافق توازن قائم رہنا چاہئے ورنہ بہت زیادہ عرصے تک یہ عدم تناسب قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ قوانین قدرت کا اٹل دستور ہے کہ بنی نوع انسان کو موقع دیا جائے کہ وہ خود دانش مندی سے، محنت و مشقت سے، باہمی رواداری و باہمی اختلاط سے، یک جہتی اور باہمی امداد

سے ، آبادی کے مسئلے کو حل کرے اور صرف اسی صورت میں مداخلت کرے جب کہ انسانی مخلوق اس اہم ترین
مسئلہ کی تحلیل سے بے فکر ہو جائے ۔ مثل جانوروں کے اپنی پود بڑھاتی رہے اور اس بڑھتی ہوئی آبادی
کے لئے ذرائع معاش فراہم نہ کرے جب اس ابدی جہالت اور گمراہی میں قومیں زندگی بسر کرتی ہیں تو
قدرت کچھ دنوں صبر و تحمل سے کام لے کر انسانوں کو متعدد مواقع دیتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو محسوس
کریں ۔ ان غلط کاریوں سے باز آئیں اور گذشتہ بد اعمالیوں کی تلافی کریں مگر جب ان پر بھی انسان جہالت
اور گمراہی میں مبتلا رہتا ہے تو مجبوراً قدرت کو مداخلت کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اس
مسئلے کو حل کر دیتی ہے[۵] ۔ بھونچال طوفان ، آندھیاں اور زلزلے اگر ہزاروں کو صفحۂ ہستی سے نیست
و نابود کر دیتے ہیں تو خوفناک بین الاقوامی لڑائیاں اور بھیانک جنگیں لاکھوں کو فنا کر دیتی ہیں اس پر بھی
جو زائد آبادی بچ رہتی ہے وہ قحطوں اور بالخصوص وباؤں کے ذریعے کروڑوں کی تعداد میں ملک عدم
پہنچائی جاتی ہے ! بے شمار مرتبہ انسان کو ان غلط کاریوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا ! اور بے شمار ایسے اجتماعی
گناہوں کا کفارہ انسانوں کو اپنی روحانی راحت اور اپنی جسمانی حیات سے ادا کرنا پڑا ۔ متعدد مرتبہ
بنی نوع انسان کو یہ تلخ تجربہ ہوا کہ قدرت کا انتقام نہ صرف بے رحمانہ ، جابرانہ اور ظالمانہ ہوتا ہے

---

۵ " The practical question for the mass of mankind is not whether the population shall be kept down or not, but whether the population shall be kept down by preventing the conception of children or by bringing them into the world and then slaughtering them abortion, exposure, starvation, neglect, illusage, plague, pestilence and famine battle, murder and sudden death." Bernard Shaw: " The Intelligent Women's Guide to Socialism and Capitalism." Constable, London, 1928, p. 89.

بلکہ یہ بھی کہ جب وہ انتقام پر آتی ہے تو اچھے برے میں، نیک و بد میں، عاقل و جاہل میں امیر و غریب
میں تفریق و امتیاز نہیں کرتی۔ انسان کو پے در پے یہ تلخ تجربے ہوئے مگر اس کے باوجود آج
بھی وہ اجتماعی طور پر اسی قدر جاہل اور گمراہ ہے جس طرح آج سے صدیوں قبل وہ جہالت و گمراہی
میں مبتلا تھا۔

تمام علوم عمرانی اس بات پر متفق ہیں کہ ترقی کے صحیح معنی یہی ہیں کہ ہر نسل کا معیار آرام و معیار زندگی
گزشتہ نسل کے معیار زندگی اور معیار آرام سے بلند تر ہو۔ ترقی کا مفہوم چاہے کچھ ہو یہ لازمی ہے کہ آئندہ
آنے والی نسلوں کا معیار زندگی موجودہ نسل کے معیار زندگی سے بہتر و بلند تر ہو۔ یہ ایک قطعی فیصلہ ہے
جس میں شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں اسی طرح تمام موقر معاشیین و عمرانیین اس امر پر متفق ہیں کہ
معیار زندگی کے ساتھ ساتھ معیار آرام کا بلند تر ہونا بھی لابدی اور ضروری ہے۔ اس بات سے بھی
تمام علمائے معاشیات و عمرانیات متفق ہیں کہ معیار آرام کو بلند تر کرنے کے لئے پیدائش دولت سے اہم تر
تقسیم دولت میں منصفانہ طریق اور مساوات قائم کرنا ضروری ہے یعنی یہ کہ جب تک پیدائش دولت کی
افزونی کے ساتھ ساتھ تقسیم دولت میں مساوات اور انصاف کا زیادہ لحاظ نہ کیا جائے قوم کا معیار آرام
بلند تر ہونا ناممکن ہے۔ ہمیں اس تحقیق کے مد نظر ہندوستان کے مسئلہ آبادی پر غور کرنا چاہئے لہٰذا ہندوستان
کے مسئلہ آبادی کا لب لباب یہ ہے کہ کیا جس رفتار سے ہندوستان کی آبادی بڑھ رہی ہے اسی
رفتار سے ذرائع معاش میں بھی اضافہ ہو رہا ہے؟ اور کیا ملک کے موجودہ ذرائع معاش موجودہ
آبادی کے لئے کافی ہیں؟ ان دونوں کا جواب معاشیات ہند کی تمام مستند کتابیں اور حکومت ہند کی
تمام روئیدادیں نفی میں دیتی ہیں۔ کس قدر ناواقف اور کوتاہ نظر ہیں۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ توسیع زراعت
کے بے شمار امکانات ہیں، ترقی زراعت کے لامحدود ذرائع ہیں، دنیا کے طول و عرض میں ہزاروں
نہیں لاکھوں نہیں بلکہ بلا مبالغہ اب بھی کروڑ ہا ایکڑ زمین بے کار پڑی ہے کیا ان سے استفادہ نہیں
کیا جا سکتا؟ طعن آمیز لہجے میں اشتراکیت کے مشہور حامی فریڈرش انگلز (FRIEDRICH ENGELS)
نے صحیح کہا ہے کہ کثرت آبادی کا ذکر ہی مضحکہ انگیز ہے: صرف وادی مسی سی پی اور

آموذ میں اس قدر غیر افتادہ زمین ہے کہ اس پر تمام یورپ کی آبادی منتقل کی جاسکتی ہے، اب تک دنیا کی قابل کاشت زمین کا صرف ایک تہائی حصہ زیر کاشت ہے اور اس تہائی حصہ زمین کی پیدائش دریافت شدہ طریقہ ہائے زراعت ہی کے انطباق سے چھ گنی بلکہ اس سے بھی زیادہ کی جاسکتی ہے [لہ]!

اس میں شک نہیں کہ فریڈرکس اینگلز کا خیال بڑی حد تک صحیح ہے۔ معاشی جغرافیہ کے نقطہ نظر سے توسیع زراعت و ترقی صنعت و حرفت کے جو وسیع امکانات ہیں ان کا ذکر کیا جائے تو وہ الف لیلہ کا قصہ معلوم ہو حالانکہ حقیقت میں یہ امکانات نظری نقطہ نظر سے ظہور میں آسکتے ہیں ساری دقتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ ان امکانات کی عملی ترجمانی ہونے لگتی ہے۔ قومی بغض و حسد کا بنی نوع انسان پر ایسا تسلط ہے کہ آزاد توطن کی عام اجازت ہونا تو درکنار امریکہ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں بسنے والے یہ بھی نہیں جانتے کہ دنیا کے ہم نسل، ہم مذہب، ہم قوم اور ہم رنگ افراد اُن کو اُن کے

لہ اصل عبارت یہ ہے۔ "Es ist aber tachalich, von Übervölkerung zu reden, so lange das 'Tal des Mississipi wüsten Boden genug besitzt, um die ganze Bevölkerung von Europa dorthin verpfanzen zu können. So lange erst ein Drittel der Erde für bebaut angesehen werden und die Produktion dieses Drittels selbst durch die Anwendung jetzt schon bekannter Verbesserungen um das Sechsfache und mehr gesteigert werden kann."

ماخوذ از Karl Diehl & P. Mombert مرتبہ "Bevölkerungslehre" مطبوعہ بمقام Braun Karlsruhe سنہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۲۵۔

ملک میں بسیں۔ جو خود دوسرے ممالک سے آئے تھے وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ انہی کی ذات اور ایمان والے
ان ہی کی تہذیب اور تمدن پر چلنے والے ان ہی کی پیروی کریں۔ چنانچہ بین الاقوامی آزاد توطن کی اب
کسی ملک میں اجازت نہیں۔ صرف محدود پیمانے پر بین الاقوامی توطن کی اجازت ہے وہ بھی زیادہ تر صرف
عیسائیوں، گوروں، تعلیم یافتہ لوگوں اور پیسہ والوں کے لئے، مگر ان کے لئے بھی توطن آسان نہیں کیونکہ
نئے دن توطن میں نئی نئی دقتیں پیدا کی جا رہی ہیں! کچھ دنوں سے تو دنیا یہ عجیب و غریب منظر بھی دیکھ
رہی ہے کہ ایک ہی شہنشاہیت بلکہ ایک ہی سلطنت میں بین الصوبہ داری توطن میں بھی دقتیں پیدا
کی جا رہی ہیں۔ جب طاقت ور اور مختار قوموں کے افراد کو توطن کی اجازت نہیں ملتی تو غریب ہندوستانیوں
کا کیا ذکر! ان کا جو حشر غیر ممالک میں نہیں بلکہ شہنشاہیت برطانیہ کے دوسرے علاقوں میں ہو رہا ہے
وہ ایک درد انگیز اور عبرت انگیز داستان ہے لہذا ہندوستانیوں کے مسئلہ آبادی کو حل کرنے
کے لئے یہ خیال عملی اعتبار سے لایعنی ہے کہ ہم توطن اختیار کر سکتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں غیر ممالک جا کر
وہاں از سر نو آباد ہو سکتے ہیں۔ ساری دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ہمارا جانا نفع بخش ہو سکتا ہو
اور ہم وہاں جا سکتے ہوں، جا سکنا تو درکنار ہم وہاں سے بھی نکالے جا رہے ہیں جہاں ہم میں سے چند
جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یہی حال توسیع زراعت اور ترقی صنعت و حرفت کا ہے۔ دنیا میں آج جو شور
ہے وہ قلت غذا کا نہیں بلکہ غذا کی فراوانی کا!! تجارت کی سرد بازاری کا سبب یہ نہیں کہ دولت کی
پیدائش کم ہو گئی ہے بلکہ یہ کہ تیار شدہ مال کے خریدار مفقود ہوتے جا رہے ہیں! کاروبار پر پستی اس لئے
نہیں چھائی ہوئی ہے کہ کارخانے نہیں بلکہ اس لئے کہ کارخانے نفع بخش طور پر نہیں چلائے جا سکتے۔ ان
حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا یہ کہنا مہمل نہیں ہے کہ توسیع زراعت و ترقی صنعت و حرفت کے بے شمار
ذرائع چونکہ موجود ہیں۔ لہذا اضافہ آبادی کی وجہ سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوتا اور تحدید آبادی کی فی الحال
کوئی ضرورت نہیں اس قسم کے مہمل خیالات عملی نقطۂ نظر سے ناقابل لحاظ ہیں محض اس لئے کہ وہ عملاً ظہور میں
نہیں آ سکتے! مسئلہ آبادی کا دارومدار توسیع زراعت اور ترقی صنعت و حرفت کے امکانات پر نہیں ہے
اور نہ اس امر پر کہ کس قدر دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ بلکہ مسئلہ آبادی کا تمام دارومدار ان حقائق پر ہے

اگر کس قدر دولت در اصل پیدا ہوتی ہے اور وہ کیوں کر تقسیم ہوتی ہے! ہو سکتا تو بہت کچھ ہے دیکھنا
ایسے ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں کر ہو رہا ہے۔ امکانات تو یقیناً موجود ہیں۔ توقعات بھی قائم کی جا رہی
ہیں۔ اُمیدیں بھی کی جا رہی ہیں۔ اور دعائیں بھی مانگی جا رہی ہیں۔ مگر نہ تو امکانات ظہور میں آئے ہیں
نہ توقعات پوری ہوتی ہیں۔ نہ امیدیں بر آتی ہیں اور نہ دعائیں سنی جاتی ہیں نہ تو اتنی دولت پیدا
ہوتی ہے جس قدر کہ پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ پیدا شدہ دولت معقول طور پر تقسیم ہونے پاتی ہے لہٰذا بحث
یہ نہیں ہے کہ تمام یورپ کی آبادی کے لئے وادی مسی سپی وامیزون میں جگہ ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ آزاد توطن
کی عام اجازت ہے یا نہیں! سوال یہ نہیں ہے کہ دولت پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ دولت مساوی
طور پر تقسیم ہو رہی ہے یا نہیں! معاشئین نے اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ صرف پیدائش دولت
سے افلاس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ تقسیم دولت کا مسئلہ بھی حل کیا جائے مگر ہم
تقسیم دولت کے مسئلے کو حل کرنے سے گریز کر رہے ہیں ساتھ ہی پیدائش دولت میں میکانیت کا حصہ سال
بسال بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے تقسیم دولت میں اور دولت کی نکاسی میں ناقابل بیان دقتیں پیدا
ہو رہی ہیں۔ نیز ہماری سیاست و معاشرت تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنے کے بجائے تقسیم
دولت کی ناہمواریوں کو قانوناً روا اور اخلاقاً جائز رکھ کر دولت کی مساوی تقسیم میں مزید دقتیں پیدا کر رہی
ہے! ہماری معیشت سیاست اور معاشرت کی غفلت اور نادانی کا یہ حال ہے با ایں ہمہ آبادی تیز رفتاری
بڑھتی جا رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ خصوصاً ہندوستان میں یہ ہے کہ ہمارا معیار زندگی بلند ہونے نہیں پاتا
تعلیم و تربیت کے ذریعے اگر ہم ذرائع معاش میں اضافہ کرتے ہیں تو اس سے بھی ہمارا معیار زندگی بلند
نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ذرائع معاش کی رفتار اضافہ سے زیادہ آبادی کی رفتار اضافہ ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ ملک کے طول و عرض میں آج بھی اسی قدر غربت پائی جاتی ہے جس طرح آج سے صدیوں قبل
پائی جاتی تھی اور بے شمار افراد بھوک اور فاقہ کشی کی مصیبتیں جھیل رہے ہیں اور خصوصاً قحط
یا خشک سالی کے زمانے میں ناقابل برداشت دقتوں کا سامنا کرتے ہیں شرح پیدائش کی زیادتی
اور شرح اموات کی زیادتی کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ یہاں کی شرح بقا معمولی ہے۔ مگر

ذرائع معاش میں اضافہ کی رفتار چونکہ نہایت سست ہے ۔ اس لئے
ہندوستان کے اضافہ آبادی کا بار بہت بڑھ رہا ہے ۔ حالیہ تحقیق اور معاشیات
ہند کے حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسئلہ آبادی ہند کی تحلیل کی صرف یہی
صورت ہو سکتی ہے کہ ضبط تولید یا تحدید نسل کی تحریک کو وسیع ترین پیمانے
پر کامیاب بنانے کی ممکنہ کوشش کی جائے اس کا ذریعہ نہ صرف تعلیم ہو
بلکہ یہ بھی کہ جا بجا سرکاری طور پر تمام شفاخانوں میں ضبط تولید کے لئے عمل گاہیں
قائم کی جائیں ۔ ہندوستان میں ان لوگوں کی عظیم اکثریت ہے جو اس تحریک کے سراسر
مخالف ہیں اور نام نہاد مذہبی اعتقادات اور فرقہ وارانہ تعصبات کی وجہ سے
اس قسم کی تمام تجاویز پر حقارت آمیز الفاظ میں سخت تنقید کرتے ہیں مگر نفس موضوع
پر متانت و سنجیدگی ، علمیت و عقلیت سے تبصرہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ چونکہ
ہندوستان کی غربت کا ایک بڑا سبب ہندوستان کی اضافی کثرت آبادی ہے ۔ لہٰذا
ہندوستان کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ اپنی آبادی کی تعداد میں کمی کرے جس کا
معقول ترین طریقہ ضبط تولید اور تحدید نسل ہے ۔ بالخصوص اس لئے کہ ہندوستان
کے لئے خارجی توطن عملاً ناممکن ہے اور توسیع زراعت وصنعت و حرفت
کی معقول توقع نہیں جو کچھ سست ترین رفتار سے ترقی و توسیع زراعت
وصنعت و حرفت میں ہو رہی ہے ۔ وہ معیار زندگی اور معیار آرام کی بلندی کے لئے
صرف ہونی چاہئے نہ کہ مزید اضافہ آبادی کی پرورش کے لئے ۔ اگر ہندوستان کو سوراج
یا پورنا سوراج مل جائے تب بھی اس کے لئے کم از کم نصف صدی کے لئے ناممکن ہو گا
کہ وہ ۳۵ کروڑ افراد کو معقول معیار آرام پر پال سکے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ کروڑ افراد
کو پال سکے گا اور موجودہ حکومت یا نیم غلامی کی حالت میں تو معقول معیار آرام پر زیادہ سے زیادہ
۱۰ کروڑ افراد پل سکتے ہیں لہٰذا ہر لحاظ سے ہندوستان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تعداد میں

کمی کرے جس کے لئے بہترین طریقہ تحدید نسل اور ضبط تولید ہے۔

ضبط تولید یا تحدید نسل کا مفہوم

ضبط تولید سے مراد وہ طریق ہے جس کی بدولت افزائش انسانی میں موانعات پیدا کئے جائیں اور جنسی یا صنفی تمتع Sexual Satisfaction میں رکاوٹ پیدا کئے بغیر پیدائش اطفال کو محدود کیا جائے۔ یہ ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں بکثرت بچے ماں باپ کی مرضی کے خلاف پیدا ہوتے ہیں اور محض اس وجہ سے کہ اکثر والدین میں بچوں کی پرورش و نگہداشت، تعلیم و تربیت کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ قبل از وقت فوت ہو جاتے ہیں یا غربت و جہالت میں گذر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں[۵]۔

---

[۵] ہندوستان کی اعلیٰ شرح اموات کا ذکر کرتے ہوئے مولوی الیاس برنی صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ پریشانی صدمہ اور زیرباری کے سوا ہندوستان کی اعلیٰ شرح پیدائش کا اور کیا نتیجہ ہے۔ جہاں موت کا بازار اس قدر گرم ہو وہاں پیدائش کی کیا خوشی۔ اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ بچے کم پیدا ہوں اور زیادہ زندہ رہیں، افلاس و ناداری، عام جہالت اور اصول حفظ صحت کی ناواقفیت بھی کثرت اموات کا باعث ہے۔ ممکن ہے کہ مالی حالت کی درستی اور تعلیم کی اشاعت سے شرح اموات کچھ گھٹ جائے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ شرح پیدائش میں کچھ تخفیف ہو۔ والدین کی نوعمری میں کمزور بچے پیدا نہ ہوں اور وہی لوگ شادی بیاہ کریں جو بچوں کو اچھی طرح پرورش بھی کر سکیں" (معیشت الہند جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۹ء صفحہ ۵۰) رائے بھگوان داس کیلانے جو کتاب دنیات کے متعلق ہندی بھاشا میں لکھی ہے اس میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے چنانچہ صاحب موصوف لکھتے ہیں:- "इस समय विशेष आवश्यकता यह नहीं है कि नागरिकों की संख्या बढ़े, वरन यह है कि नागरिक सुयोग्य, सुशिक्षित, स्वस्थ और बलवान हों" ("भारतीय नागरिक और उन की उन्नति के उपाय" लेखक :

خواہش اولاد ایک فطری جذبہ ہے جو ہر تندرست انسان میں پیدا ہوتا ہے اور اس جذبے کو کافی تشفی ہو جاتی ہے۔ جبکہ دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ بچے پیدا ہو جاتے ہیں مجھے کسی شخص سے ملنے کی حسرت ہی رہی جس کی آمدنی قلیل ہو اور جو تین یا چار بچوں کا باپ ہونے کے باوجود اولاد ہونے کی تمنا رکھتا ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اس اولاد کو بھی چاہے جو اس کی خواہش اور تمنا کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے جنسی جذبات اور اس کی مجبوریوں کا نتیجہ ہو۔ انسان کی جنسی احتیاجات تمام

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) भगवानदास केला। प्रकाशक: भारतीय ग्रन्थमाला वृन्दावन। सन् १९३० ई० ।)

پی واٹل نے جو کتاب ہندوستان کے مسئلہ آبادی کے متعلق ۱۹۱۶ء میں لکھی تھی P.W. Wattal.

"The Population Problem in India. Bennett, Coleman, Bombay, 1916."

آپ اس میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی اعلیٰ شرح پیدائش کو کم کرنا چاہئے رانا ڈیوے نے اسی موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس میں تو وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "What we want is not only that there should be no increase in our numbers, but that our population should go on declining for some years to come." (S.T. Ranadive. "Population Problem of India." Longmans, Bombay 1930, p. 206.)

ایک مقالے میں جو ہندوستان کی سالانہ معاشی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا میں نے لکھا ہے کہ:-

"Our population should lessen not by hundreds or thousands but by millions and crores."

"The Problem of India over population." تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے مطبوعہ Indian Journal of Economics کانفرنس نمبر بابت جنوری ۱۹۳۸ء صفحات ۲۸۳ تا ۲۸۹ اور ۵۵۰ تا ۵۵۳۔

جسمانی احتیاجات سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہیں اور ان ہی کی تسکین کی خاطر وہ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے جس کا نتیجہ اکثر صورتوں میں پیدائش اولاد ہوتا ہے۔ یہ غیر ضمنی اور غیر ضروری اولاد والدین کی خوشی کا باعث نہیں ہوتی وہ ان کی تمناؤں کا نتیجہ ان کی آرزوؤں کا ثمر، اُن کی خواہشوں کا پھل نہیں ہوتی بلکہ یہ فالتو اولاد اُن کی مالی پریشانیوں کا باعث ان کی فکروں کا سرچشمہ اور ان کے سوہان روح کا باعث ہوتی ہے کیوں کہ یہ اولاد ان کی دلی مرادوں کا نہیں بلکہ ان کی خواہشات نفسانی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میں ایسے متعدد اشخاص کو جانتا ہوں جو یہ معلوم کرکے کہ ان کی رفیق حیات ایک نئی ہستی کو عالم وجود میں لانے والی ہیں۔ یہ خیال کرکے خاموش ہوجاتے ہیں کہ از ماست کہ بر ماست! میرے عزیزوں اور قریبی دوستوں میں بھی ایسے متعدد احباب ہیں جو باوجود قلیل آمدنیوں کے کثیر العیال ہیں۔ مگر وہ عقلاً کثیر العیالی کو دولت اولاد سے تعبیر کرنے پر آمادہ نہیں۔ باوجود شفقت پدری کے وہ کثرت اولاد کو ایک بار محسوس کرتے ہیں اور اگرچہ وہ پہلی اولاد کی آمد کے خوشی خوشی منتظر رہتے ہیں مگر دفعہ دفعہ کی ولادتوں کے سلسلہ لا انتہاہی کو پسند نہیں کرتے یہ اور بات ہے کہ وہ ماحول کی مجبوری اور علم و عمل کی ناواقفیت کی وجہ سے اس سلسلے کو حسب دل خواہ محدود نہیں کرسکتے۔

تحدید نسل اور ضبط تولید کی ضرورت لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کے لئے نہیں بلکہ معقول اور متوسط آمدنی والے انسانوں کے لئے ہے تاکہ خود ان کی اور ان کی اولاد کی زندگی کثرت اطفال کی وجہ سے ایک بارگراں نہ ہوجائے۔ اور راحت و آرام کے بجائے کوفت اور مصیبت میں ان کی زندگی گذرنے لگے۔ موجودہ ہندوستان کی فرقہ دارانہ اور نام نہاد مذہبی فضا میں ہم توقع نہیں کرسکتے کہ تحدید نسل کے زرین مسلک پر وسیع پیمانے پر عمل شروع ہوسکے گا۔ سلطنت کے لئے یہ ناممکن بھی ہوگا کہ وہ اس طریقے کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی طرف سے کسی قسم کی پیش قدمی کرے اور اس کو مخالفین میں مقبول عام بنانے کے لئے تبلیغ کرے اور ابھی سے قانون کے ذریعے لوگوں کو مجبور کرنے کی بے سود کوشش کرے۔ خود ہماری دانش مند اور مصلحت آمیز حکومت اس اصول کو تسلیم نہ کرے گی کہ تحدید نسل اور ضبط تولید کے مخالفین میں ان خیالات کی اشاعت کرے

مگر حکومت یہ ضرور کر سکتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکومت کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ تحدید نسل کے خواہش مندوں اور ضبط تولید کے موافقین کی ہر ممکن امداد کرے۔ تمام بڑے بڑے دواخانوں میں ضبط تولید کے متعلق لوگوں کو مشورہ دینے کے لئے اور بہ وقت ضرورت طلب گاروں کو عملی امداد دینے کے لئے Birth Control Clinics قائم کرے۔ اس کی شدید ترین ضرورت کا احساس آپ کو اس وقت ہو سکے گا جب کہ ان بے شمار خاندانوں کی مالی پستی اور ان لکھوکھا معصوم بچوں کا خیال کریں جو والدین کی غربت اور والدین کی بیماریوں کی وجہ سے یا تو قبل از وقت فوت ہو جاتے ہیں یا نہیں تو زندہ درگور رہتے ہیں وہ بھی کس طرح کہ ان کی فطری طاقت اور توانائی غذا کی قلت اور قسم غذا کی خرابی کی وجہ سے ماہ بماہ بد تر ہوتی جاتی ہے اور وہ گوناگوں بیماریوں اور وباؤں میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل یا دائم المریض بن جاتے ہیں۔ اگر صحیح اور تندرست اولاد کو ہماری معاشی پستی بیکار کو دائم المریض، ہزاروں کو نحیف اور ناتواں اور لاکھوں کو موت کا شکار بناتی ہے تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ کثرت اولاد کے بجائے معقول تعداد اولاد رہے اور ہر شخص اپنی مالی حیثیت کے مطابق پرورش اولاد کی ذمہ داری لے؟ ہندوستان میں نہ صرف ان غریبوں کی اولاد مصیبت اور آفت میں ہے بلکہ ان سے بد تر حال ان بدقسمتوں کا ہے جن کے والدین جذامی ہیں، مخبوط الحواس ہیں اور امراض خبیثہ میں مبتلا ہیں۔ جن کے امراض کی وجہ سے ان کی معصوم اولاد نابینا، اپاہج اور مخبوط الحواس پیدا ہوتی ہے۔

ہماری قابل ناز تہذیب و شائستگی، ہماری قابل فخر حکومت و سلطنت، ہمارا قدیم و باوقار تمدن، ہمارا ترقی یافتہ اور روشن خیال زمانہ، حیوان، جانوروں، پرندوں، اور مویشیوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لئے کوشش کر رہا ہے مگر کیا یہی حکومتی اور قومی ادارے انسانوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لئے کوشش نہیں کریں گے؟ ہمارا روحانیت پر ناز کرنے والا ہندوستان اگر جدت کی صلاحیت نہیں رکھتا تو کیا معقول اور مفید طریقوں کو منطبق کرنے کی بھی اور ان پر عمل پیرا ہونے کی بھی استعداد نہیں رکھتا؟ ہم میں جدت کی صلاحیت نہیں تو کیا ہم میں تقلید کی بھی توفیق

نہیں؟ اگر ہم بے زبان مویشیوں اور پرندوں کی حفاظت کرتے ہیں تو کیا ہم میں معصوم بچوں کی جان اور صحت کے تحفظ کا احساس نہیں؟ کیا وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب کہ ہم اپنی غفلت سے بیدار ہو کر دلیری اور جواں مردی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کوشش کریں گے۔

نظام الملک کے آبا و اجداد

(بسلسلہ گذشتہ)

ابوالحسن نے بیجاپوریوں کی مدد کے لئے انباجی پنڈت کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ بھیجا تھا اورنگ زیب نے اس بات کو فراموش نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ گولکنڈہ کی کثیر دولت اور بیش بہا مال و متاع سے بھی شہنشاہ بے خبر نہیں تھا۔ محاصرۂ بیجاپور کے دوران میں مغل جاسوسوں نے ابوالحسن کا ایک خط اپنے قبضہ میں کیا جس میں اس نے اپنے نمائندوں کو لکھا تھا کہ وہ چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج خلیل اللہ خاں کے ماتحت بطور کمک بیجاپور روانہ کرنا چاہتا ہے۔ تجویز یہ تھی کہ یہ فوج بائیں جانب سے اور سنبھاجی کی فوج دائیں جانب سے اگر شاہی فوجوں سے جنگ شروع کرے گی (ماثر عالمگیری ص ۲۶۰) یہ سن کر شہنشاہ نے شاہ عالم کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج حیدرآباد کو فتح کرنے کے لئے روانہ کی۔ جب شاہی فوجیں مالکھید پہنچیں تو شہزادہ شاہ عالم نے بہت کوشش کی کہ خلیل اللہ خاں سے صلح ہو جائے اور جنگ نہ ہو مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ شہزادہ یہاں دو ماہ مقیم رہا تاکہ بارش تھم جائے۔ شہنشاہ نے جب سنا کہ شہزادہ ابھی آگے نہیں بڑھا ہے تو اس نے شاہ عالم کو ایک سخت خط لکھا۔ جب شہزادہ کو یہ خط ملا تو وہ حیدرآباد کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں شاہی فوجوں نے شیخ منہاج اور رستم راؤ کی فوجوں کو شکست فاش دی، اب حیدرآباد تک راستہ صاف تھا۔ جب ابوالحسن نے اس شکست کی خبر سنی تو وہ بہت خوفزدہ ہوا اور اپنے چند ملازموں کے ساتھ رات کو فرار ہو کر قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی۔ حیدرآباد میں بے چینی اور اضطراب پھیل گیا۔ شاہی فوجوں نے شہر پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ شاہ عالم نے اپنے افسران کو یہ ہدایات دے کر شہر میں مقرر کیا کہ لوٹ مار نہ ہونے پائے اور ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ چند دنوں کے بعد ابوالحسن اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ سالانہ ایک کروڑ

بیس لاکھ ہن (سونے کا سکہ) ادا کرے گا اور اپنی ملازمت سے مدنا اور اکنا AKanna کو الگ کرے گا۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۲۰۸) اس کے بعد شاہی فوجوں نے ابوالحسن کی سلطنت کو خالی کر دیا۔

بیجا پور کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے اپنی توجہ پھر گولکنڈہ کی طرف کی۔ یہ بہانہ کرکے کہ وہ گلبرگہ میں گیسو دراز جنگ کے مقبرہ کی زیارت کرنا چاہتا ہے وہ سلطنت گولکنڈہ کی حدود میں داخل ہوگیا اور فیروز جنگ کو قلعہ ابراہیم گڑھ[1] کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ یہ قلعہ اس سڑک پر واقعہ تھا جو حیدرآباد کو جاتی تھی۔ اس کی خدمات کے صلہ میں فیروز جنگ کو ایک خلعت اور ایک ہاتھی مرحمت کیا گیا۔ مندرجہ ذیل لوگ اس کے ساتھ تھے۔ دلیر خاں، شارزا خاں، جمشید خاں، مالاجی گوپال رائے، کمال الدین، راؤ دلپت، صف شکن خاں، آقا علی خاں، عبدالقادر خاں، جہانگیر قلی خاں، صوفی خاں، عودت سنگھ بہادر اور سر براہ خاں چیلا، ان سب لوگوں کو خلعت، گھوڑے، ہاتھی، لقب اور ترقیاں دی گئیں (ماثر عالمگیری ص ۲۸۴) فیروز جنگ گولکنڈہ کے قریب شہنشاہ سے آملا۔ شہنشاہ نے اسے سپہ سالار بنا کر قلعہ گولکنڈہ کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ قطب شاہی افواج کی مزاحمت کے باوجود فیروز جنگ قلعہ کے بالکل نیچے پہنچ گیا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے اچانک حملہ سے فتح کرے۔ قلیچ خاں حملہ کرنے والی فوج کے آگے تھا۔ اس کے ایک گولہ آلگا اور تین دن کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ فیروز جنگ نے باقاعدہ محاصرہ شروع کر دیا۔ خلاف توقع محاصرہ نے طول کھینچا۔ محصورین نے شیخ نظام اور عبدالرزاق کی وجہ سے بہت صبر و استقلال سے کام لیا۔ فیروز جنگ نے صف شکن خاں کو حکم دیا کہ وہ قلعہ کی خندق کے پاس اونچے اونچے ٹیلے بنا کر قلعہ پر گولہ باری کرے۔ شہنشاہ کی موجودگی سے سپاہیوں کے دل اور بڑھ گئے۔ جب سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو صف شکن نے اس حسد سے کہ فیروز جنگ کی شہنشاہ کے دل میں زیادہ عزت ہے میر آتش کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ صلابت خاں اور اس کے بعد

---

[1] بعد میں یہ قلعہ فیروز گڑھ کے نام سے مشہور ہوا (ماثر الامرا، جلد دوم ص ۸۷۵)۔

عزت خاں اس عہدہ پر مقرر کئے گئے۔ محصورین نے کبھی کبھی جرأت سے حملے کر کے ٹیلوں کو گرا دیا۔ اور عزت خاں کو گرفتار بھی کر لیا۔ بارش نے وہ تمام کام جو فیروز جنگ اور اس کے ساتھیوں نے محنت سے کیا تھا خراب کر ڈالا۔ خافی خاں کے الفاظ میں انھوں نے ایک سال کا کام ایک مہینہ اور کچھ دنوں میں پورا کر لیا۔ (جلد دوم ص ۴۳۶)۔

قلعہ کی تسخیر میں دیر اس لئے ہوئی کہ افسر ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے۔ ان حالات سے شہنشاہ کو سخت تکلیف پہنچی۔ اس حسد کو دور کرنے کے لئے اس نے محمد اعظم کو سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ شہنشاہ کی آنکھوں کے سامنے فیروز جنگ کو دو تیر لگے تھے جب وہ قلعہ پر حملہ کر رہا تھا اور اس وجہ سے وہ زخمی بھی ہو گیا تھا۔ (ماثر عالمگیری ص ۲۹۵ اور خافی خاں جلد دوم ص ۴۵۴)۔

۱۴ مئی ۱۶۸۶ء کو فیروز جنگ نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کو دیواروں پر زینے لگا کر قلعہ فتح کرے گا قلعہ کے برج کے نیچے ایک زینہ لگایا گیا اور چند بہادر دیوار تک پہنچ گئے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک کتا قریب ہی گھوم رہا تھا۔ اس نے آدمیوں کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ اس آواز سے سپاہیوں کا ایک دستہ جاگ اٹھا۔ انھوں نے حملہ آوروں کو تلوار کے گھاٹ اتار ڈالا اور جو زینہ پر چڑھ رہے تھے ان کا گولوں سے خاتمہ کر دیا۔

حاجی شفیع ارنگ زیب کا خاص ملازم تھا۔ جب اس نے سنا کہ فیروز جنگ نے زینے لگا کر قلعہ فتح کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ بغیر نتیجہ معلوم کئے علی الصبح شہنشاہ کے پاس گیا۔ اورنگ زیب ابھی نماز میں مشغول تھا۔ جب شہنشاہ نے اس سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو اس نے کہا قلعہ فتح ہو گیا ہے۔ یہ پر مسرت خبر سن کر شہنشاہ نے حکم دیا کہ فتح کے نقارے بجائے جائیں۔ لیکن جب حقیقت کا پتہ چلا تو شہنشاہ اور دوسرے لوگ بہت مایوس ہوئے۔ (خافی خاں جلد دوم۔ ص ۴۴۲)۔

مرزا محمد نعمت خاں جس کا تخلص عالی تھا۔ اس حادثہ پر نظم و نثر میں غیر مہذب مضمون لکھے ہیں۔ (واقعہ نعمت خان عالی)۔

ستمبر ۱۶۸۷ء میں روح اللہ خاں نے ابوالحسن کے ایک معتمد افسر عبداللہ خاں سے لال مست خاں کی وساطت سے خفیہ بات چیت شروع کی۔ عبداللہ خاں قلعہ کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کا محافظ تھا۔ آپس کے فیصلے کے مطابق اس نے ۲۱ر ستمبر کی رات کو دروازہ کھول دیا اور مغل فوجیں قلعہ میں داخل ہوگئیں۔ فتح کے نقارے بجائے گئے اور قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ابوالحسن کو گرفتار کر کے جاں سپر خاں کی حفاظت و نگرانی میں دولت آباد بھیج دیا گیا۔ مال غنیمت میں ۸ لاکھ ۱۵ ہزار ہن ۲ کروڑ پچاس ہزار روپیوں کے علاوہ جواہرات اور سونے چاندی کے قیمتی ظروف بھی تھی۔ (خافی خاں، جلد دوم ص ۳۶۷)۔

قلعہ کی تسخیر کے بعد فیروز جنگ کو ہفت ہزاری کے علاوہ ایک خلعت، مکمل اسلحہ جات اور جواہرات سے لگی ہوئی چھڑی دی گئی۔ (ماثر عالمگیری ص ۲۹۶)۔

اب شہنشاہ نے حکم دیا کہ گھومنے والی بڑی بڑی جماعتیں گولکنڈہ اور بیجاپور کے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے بھیجی جائیں۔ فیروز جنگ کو پچیس ہزار سواروں کے ساتھ قلعہ ادونی جو تنگ بھدرا کے جنوب میں ہے فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ یہ قلعہ سیدی مسعود کے قبضہ میں تھا جو سکندر عادل شاہ کا غلام افسر تھا۔ محاصرہ بیجاپور کے دوران میں یہ بہت سے جواہرات اور خزانہ لے کر یہاں چلا آیا تھا۔ (ماثر عالمگیری ص ۳۰۸)۔

ادونی کے نواح میں پہنچ کر فیروز جنگ نے سیدی مسعود کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ بغیر خون بہائے قلعہ خالی کر دے۔ لیکن جب اس نے انکار کر دیا تو فیروز جنگ نے خندقیں کھدوانا شروع کیں اور قلعہ پر گولہ باری ہونے لگی۔ جو لوگ مقابلہ کے لئے نکلے انھیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ جب سیدی مسعود نے دیکھا کہ مقابلہ فضول ہے اور کوئی دم میں قلعہ فتح ہوا چاہتا ہے تو اس نے قلعہ خالی کر دیا، وہ قلعہ سے باہر آیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ شاہی فوجوں نے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کا نام بدل کر امتیاز گڑھ رکھ دیا۔ ادونی کی فتح سے شہنشاہ کو بیحد مسرت ہوئی۔ فوراً فتح کے نقارے بجوائے گئے۔ فیروز جنگ نے سیدی مسعود سے اچھا سلوک کیا۔ اور اس کے بیٹوں کو اورنگ زیب کے حضور میں بھیج دیا گیا۔ اورنگ زیب نے قصداً سیدی مسعود کو دربار میں نہیں بلایا اس لئے کہ اس میں بیچارہ کی ذلت تھی۔

اس کی غیر موجودگی میں شہنشاہ نے اسے ہفت ہزاری کے منصب کے علاوہ مرادآباد کا فوج دار
مقرر کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نائب مقرر کیا گیا تھا کہ وہ سب انتظامات کرے اس لئے
کہ شہنشاہ نے حکم دیا تھا کہ جب تک سیدی مسعود زندہ ہے وہ فیروز جنگ کی ملازمت میں رہے گا۔
(ماثر عالمگیری ص ۳۱۶) جب اس کے بیٹے قلعہ ادونی کی کنجیاں جو سونے کی تھیں لے کر دربار
میں حاضر ہوئے تو انھیں تحائف اور انعامات دئے گئے۔ فیروز جنگ کے عہدہ میں بھی اضافہ ہوا[1]

ادونی اور اس کے گرد و نواح کا نظم و نسق قائم کرنے کے بعد فیروز جنگ بیجاپور میں اورنگ
زیب سے آملا۔ شہنشاہ نے اُسے کئی تحفے مرحمت کئے۔ وہاں یہ خبر ملی کہ سنبھاجی اور اس کے
افسر بہادر گڑھ اور گلشن آباد میں بدامنی پھیلا رہے ہیں۔ شہنشاہ نے فیروز جنگ اور شیخ نظام
(مقرب خان) کو اس طرف روانہ کیا۔ تاکہ اس حصہ میں مغلوں کا اقتدار پھر قائم کریں۔ شیخ
نظام ابوالحسن کا ساتھ چھوڑ کر مغلوں سے آملا تھا۔ جب مغلوں کی فوجیں گولکنڈہ کے محاصرہ میں
مصروف تھیں، اُس وقت سنبھاجی اور اس کے مشہور جنرل سنتاجی نے مغل علاقہ میں لوٹ مار مچا
رکھی تھی۔ انھوں نے تازہ فوج فراہم کرکے اپنی طاقت میں بہت اضافہ کر لیا تھا۔

جب مرہٹوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو نومبر ۱۶۸۸ء میں شاہی خیمہ
میں طاعون پھیل گیا۔ اس کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ بہت کم لوگ جو اس میں گرفتار
ہوئے زندہ بچے۔ بہت سے افسروں کے علاوہ شاہ بیگم اورنگ آبادی محل مہاراجہ جسونت سنگھ
(جس کی پرورش شاہی خاندان میں ہوئی تھی) اور فاضل خاں صدر ہلاک ہوگئے۔ اس وبا
میں تقریباً ایک لاکھ جانیں ضائع ہوئیں۔ شہنشاہ کو بیجاپور سے اکلوج ضلع شولاپور میں

---

[1] خافی خاں کے نزدیک سیدی مسعود نے فیروز جنگ کی وساطت سے شہنشاہ سے
درخواست کی تھی کہ اُسے دربار کی حاضری سے معاف رکھا جائے اور اس کی بجائے اس کے
بیٹوں کو حاضر ہونے کی اجازت مرحمت ہو۔ (جلد دوم ص ۲۷۲)۔

آنا پڑا۔ بہادر گڑھ روانہ ہونے سے پیشتر فیروز جنگ بھی اس مرض میں مبتلا ہوا اور اس کی بینائی جاتی رہی۔ (ماثر عالمگیری ص ۳۱۸، ۳۱۹) اس حادثہ کی وجہ سے وہ مرہٹوں کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لے سکا اور سنبھاجی کو گرفتار کرنے کا فخر شیخ نظام (مقرب خاں) کو ملا۔ اس کو خانِ زماں بہادر فتح جنگ کے لقب کے علاوہ پچاس ہزار روپئے نقد ایک خاص خلعت، جواہرات کے ساز و سامان کے ساتھ ایک گھوڑا، سنہری ساز و سامان کے ساتھ ایک ہاتھی اور ایک جواہرات میں جڑا ہوا خنجر ملا۔ اس کے موجودہ عہدہ میں بھی اضافہ ہوا۔ شیخ نظام کے بڑے لڑکے اخلاص خاں کو پنج ہزاری کا منصب اور خانِ عالم کا خطاب ملا، شیخ سیراں اور شیخ عبداللہ اس کے چھوٹے بھائیوں کو منور خاں اور اختصاص خاں کے لقب عطا ہوئے۔

اب شہنشاہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مرہٹوں کے تمام قلعوں کو فتح کرکے رہے گا۔ اس نے یہ مہم فوراً شروع کر دی، اعتقاد خاں نے جو بعد میں ذوالفقار خاں نصرت جنگ مشہور ہوا۔ کون کان پر حملہ کیا اور اکتوبر ۱۶۸۹ء میں رائے گڑھ کے مشہور قلعہ کو فتح کر لیا۔ سیواجی کی بیواؤں، سنبھاجی اور راجہ رام کی بیویوں، بیٹیوں اور لڑکوں کو گرفتار کرکے شاہی حضور میں بھیج دیا۔ ذوالفقار خاں نصرت جنگ کو تین ہزار روپیہ نقد، ایک خاص خلعت اور جواہرات سے لگا ہوا تیر و کمان عطا ہوا اور عہدہ میں بھی اضافہ کیا گیا۔ (ماثر عالمگیری ص ۳۳۲)۔

اس ہزیمت سے سنبھاجی کے بھائی راجارام نے فیصلہ کر لیا کہ وہ از سرِ نو فوج جمع کرکے مغلوں کو اپنے علاقہ سے باہر نکال دے گا۔ اس نے سنتاجی گارپاوے کو سپہ سالار مقرر کیا۔ اس نے نئی بھرتی شروع کر دی اور سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج مغربی دکن میں شاہی فوجوں کے خلاف لڑنے کے لئے بھیج دی گئی۔ دس ہزار سپاہی راجارام کے ماتحت تھے۔ باقی سپاہیوں کو تین برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تین حصے لوٹ مار کرنے کے لئے سنتاجی، پارسوجی بھونسلا، اور سندوجی راؤ نمبالکر کی سرکردگی میں تھے۔ ان دستوں کی لوٹ مار سے شہنشاہ سخت تنگ آگیا۔ بلگاؤں کے نواح میں سنتاجی نے مغلوں سے کئی قلعے

چھین لئے تھے۔ دوسرے دستوں نے بھی شاہی فوجوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ان افسروں میں سنتاجی پراسن آبادی اور مغل افواج کے لئے دہشت اور خوف کا باعث ہوگیا تھا۔ کرناٹک میں مغل فوجیں جو ذوالفقار خاں کی سرکردگی میں تھیں اس نے اچانک حملے مغربی دکن میں شروع کردئے۔ قاسم خاں کو اس کے خلاف روانگی کا حکم ہوا۔ سنتاجی نے اُسے سخت شکست دی اور قلعہ دودیری پر قبضہ کرلیا۔ ہمت خاں جو قاسم خاں کی مدد کے لئے روانہ ہوا تھا اس کی مٹھ بھیڑ راستہ ہی میں سنتاجی کی فوجوں سے ہوگئی اور ہمت خاں مارا گیا۔

سنتاجی اپنے انتہائی عروج پر تھا مگر اس وقت دھانا جادو سے اس کا جھگڑا ہوگیا۔

دھانا جادو کو اس بات پر سخت غصہ تھا کہ سنتاجی کو سپہ سالار مقرر کردیا گیا ہے، دھانا جادو نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے رقیب سے بزور شمشیر اس جھگڑے کا فیصلہ کرے گا چنانچہ اس نے نئے سپاہیوں کی بھرتی شروع کردی۔ سنتاجی نے نئی بھرتی نہ ہونے دی اور دھانا جادو کی زندگی کے لئے وبال بن گیا۔ سنتاجی نے اس کا پیچھا مرہٹہ علاقہ میں کیا۔ مارچ ١٦٩٧ء میں بیجاپور کے نواح میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ شہنشاہ نے بھی یہ حکم دے رکھا تھا کہ سنتاجی کا تعاقب کیا جائے اس لئے کہ اس نے ملک کی اس حد میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ فیروز جنگ کو یہ خبر ملی کہ سنتاجی پچیس ہزار سواروں کے ساتھ بیجاپور سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ فیروز جنگ نے بھی مناسب سمجھا کہ سنتاجی سے مقابلہ نہ کیا جائے۔ وہ اپنی فوج بڑھانے کے لئے بیجاپور روانہ ہوگیا۔ اس دوران میں اُسے اطلاع دی گئی کہ دھانا جادو اور ہنومنت راؤ سنتاجی کے خلاف متحد ہوگئے ہیں اور ایک فوجی جنگ ہونے والی ہے۔ وہ اس جانب روانہ ہوگیا اور راستہ میں اُسے خبر ملی کہ سنتاجی کو شکست فاش ہوئی ہے اور وہ فرار ہوگیا ہے۔ اس کی فوج کا خاتمہ ہوگیا ہے اور بہت سے سپاہی دشمن سے جا ملے ہیں۔ سنتاجی اب تنہا رہ گیا ہے اور اس کے چند وفادار سپاہی مختلف سمتوں میں بھاگ گئے ہیں۔

ناگوجی نے جو پہلے شاہی فوج میں تھا اور بعد میں اپنے ہم وطنوں سے جا ملا تھا سنتاجی کو گرفتار کرکے قتل کر ڈالا۔ وہ سنتاجی سے بدلہ لینا چاہتا تھا کیوں کہ اس نے اس کے بھائی کو ایک

معمولی سی غلطی پر مروا ڈالا تھا۔ سنتاجی کی طبیعت میں بحد غصہ تھا اس لئے وہ مرہٹہ فوج کے ایک حصہ میں سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔

خافی خاں کے نزدیک سنتاجی تھکا ماندہ ایک ندی میں نہا رہا تھا جب ناگوجی مانے نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر ایک تھیلے میں رکھ کر یہ تھیلا زین کے پیچھے باندھ لیا۔ وہ دھنا جادو کے پاس جا رہا تھا کہ یہ تھیلا زمین پر گر گیا لیکن اسے خبر نہ ہوئی۔ اتفاق سے فیروز جنگ کے جاسوس سنتاجی کے تعاقب میں ادھر سے گزرے۔ انھوں نے تھیلا کھول کر دیکھا تو اس میں سنتاجی کا سر تھا جسے انھوں نے پہچان لیا۔ وہ فوراً یہ سر فیروز جنگ کے پاس لائے۔ اس نے یہ سر فوراً شہنشاہ کے پاس بھجوا دیا اور نگ زیب نے پیغام بر کو خوش خبر خاں کا لقب دیا۔ بعد میں یہ سر دکن کے مختلف شہروں میں گھمایا گیا۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۴۴۴، مآثر عالمگیری ص ۲۸۴)

اب شہنشاہ دکن اور کرناٹک میں مرہٹوں کے خلاف مہمات شروع کرنے کے علاوہ عادل شاہی اور قطب شاہی علاقوں کے نظم و نسق کی طرف بھی متوجہ ہوا۔ اس نے فیروز جنگ کو برار کا نظم و نسق ٹھیک کرنے کے لئے روانہ کیا۔ دو سال کے بعد ۱۶۹۹ء میں اُسے واپس بلا یا گیا اور مرہٹوں کے تازہ حملوں کے متعلق اس کی رائے پوچھی گئی۔ بعد ازاں اسے اسلام پوری میں عمدۃ الملک اسد خاں کی جگہ پر مقرر کیا گیا۔ اسلام پوری ایک بہت اہم فوجی مقام تھا[1]۔ شہنشاہ کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ فیروز جنگ کی بصارت جاتی رہی ہے چنانچہ اس نے خواہش ظاہر کی کہ فیروز جنگ ایک ہی جگہ مقیم رہے اور دوسرے افسروں کی طرح مختلف مقامات پر جانے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] اس جگہ کا اصلی نام برہم پوری تھا۔ اورنگ زیب نے اس کا نام بدل کر اسلام پوری رکھ دیا۔ یہیں سے وہ فوجیں روانہ کی جاتی تھیں جو جنوب میں بیجا پور اور شمال میں دریائے سنجرا کے علاقہ میں مرہٹہ حملوں کو روکتی تھیں۔ یہ وہ اہم مقام تھا جہاں سے حربی مہمات کی ابتدا کی جاتی تھی۔

ایک سال کے بعد بہادر گڑھ سے واپسی پر شہنشاہ کو اسلام پوری کے قریب سے گذرنا پڑا۔ حسب معمول وہ فیروز جنگ کی فوج کا معائنہ کرنے کے لئے آیا۔ اُسے دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ رکھ رکھاؤ اور خیموں کی حالت نہایت عمدہ ہے۔ سپاہی نہایت منظم ہیں۔ توپ خانہ اتنا بڑا ہے کہ کسی شاہی افسر کے پاس نہیں۔ فیروز جنگ نے شہنشاہ کی خدمت میں بہت سے تحائف پیش کئے مگر اس نے ایک چھوٹا سا نیچہ قبول کیا اور اس کا نام "غازی بچہ" رکھا۔ واپسی پر شہنشاہ اپنے ساتھ کچھ بڑی توپیں بھی لے گیا اور یہ حکم جاری کیا کہ کسی افسر کو توپوں کی ایک خاص تعداد سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں۔ ایک خط شہزادہ بیدار بخت کو لکھا گیا کہ "فیروز جنگ جس کا عہدہ صرف ہفت ہزاری ہے اسلحہ جات پر اپنے پاس سے روپیہ صرف کرتا ہے۔ اس میں توڑے دار بندوقیں اور چھوٹے بڑے گولے بھی شامل ہیں۔ اس کے پاس سب ضروری سامان موجود ہے' اس کے لئے وہ شاہی خزانہ سے کچھ زیادہ نہیں لیتا ہے۔ تم جو اُس سے کہیں زیادہ لیتے ہو روپیہ فضول برباد کر دیتے ہو۔ تم ایسی چیزوں پر روپیہ صرف کرتے ہو جن پر نہیں کرنا چاہئے (ماثر عالمگیری ص ۴۷۹) ؎

فیروز جنگ دو سال تک اسلام پوری ہی میں مقیم رہا۔ لیکن اس دوران میں وہ برار کے نظم و نسق میں برابر دلچسپی لیتا رہا۔ فیروز جنگ کو رستم خاں پر کامل اعتماد تھا۔ اس کی سفارش سے شہنشاہ نے رستم خاں کو برار کا نائب صوبہ دار مقرر کر دیا تھا (ماثر عالمگیری ص ۴۹۴) جب نیما جی سندھیا نے رستم خاں کو شکست دے کر اُسے گرفتار کر لیا تو اورنگ زیب نے فیروز جنگ کو پھر برار بھیجا تا کہ وہ حکومت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے اور مرہٹوں کو آگے نہ بڑھنے دے۔ نیما جی سندھیا نے برار اور مالوہ پر جوابی حملے شروع کر دئے تھے۔ اس نے اور بہت سے مرہٹہ سرداروں نے ایک

؎ سیف خاں کو حکم دیا گیا تھا کہ بغیر شاہی حکم کے بیدار بخت کو اور روپیہ نہ بھیجا جائے۔ (دیکھئے فرمان عالمگیری' آصفیہ کتب خانہ' فارسی قلمی نسخہ نمبر ۱۲۷۵ (تاریخ)۔

بڑی فوج اس مقصد کے لئے جمع کر لی تھی کہ مغل صوبوں میں لوٹ مار مچائی جائے۔ تارا بائی نے اپنے بیٹے سیوا جی کی جگہ جس کی عمر ابھی دس برس کی بھی نہیں تھی حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے عہد میں نیما جی سندھیا نے وسط ہند میں اپنے آپ کو مضبوط کر لیا تھا۔ شاہی فوجوں کو مرہٹوں کے خلاف مسلسل ہزیمتوں کا سامنا ہوا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ نیما جی سندھیا اور دانا جادو نے اپنی تمام کوششیں اس بات پر صرف کر دی تھیں کہ لوگوں میں خودی سوچ پیدا ہو جائے اور مغل اقتدار کا خاتمہ کر دیا جائے۔

نیما جی سندھیا نے رستم خاں کو شکست فاش دینے کے بعد دریائے نربدا کو عبور کیا اور اس کے حملوں کا اثر مالوہ تک پہنچ گیا۔ اس نے بندیلکھنڈ کے چتر سال سے گفت و شنید کی کہ وہ مغلوں کے خلاف اس کے ساتھ شامل ہو جائے (ماثر عالمگیری ص ۴۰۲) فیروز جنگ نے نیما جی سندھیا کا تعاقب کیا۔ سرونج کے نواح میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مرہٹوں کو بری طرح شکست ہوئی اور ان کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز جنگ اس ہاتھی تک پہنچ گیا تھا جس پر نیما جی سندھیا سوار تھا۔ مگر وہ ہاتھی پر سے کود گیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔ وہ تمام ساز و سامان مغل فوجوں نے واپس لے لیا جو برار میں نیما جی سندھیا رستم خاں سے چھین چکا تھا۔ نیما جی سندھیا نے چتر سال کے ساتھ بندیلکھنڈ کے جنگلات میں پناہ لی۔ ان خدمات کے بدلہ میں فیروز جنگ کے منصب میں اضافہ ہوا، ایک کروڑ دام نقد انعام میں دئیے گئے اور سپہ سالار کا لقب عطا کیا گیا (ماثر عالمگیری ص ۴۱۰) دلیر خاں جو فیروز جنگ کے ماتحت ایک بڑا افسر تھا اسے ہفت ہزاری کا منصب ملا۔

فیروز جنگ کو نیما جی سندھیا کے خلاف مقامی مغل افسروں سے زیادہ مدد نہیں ملی تھی اس لئے کہ یہ افسر مرہٹوں کی جرار فوج سے ڈر کر اپنے قلعوں میں بند ہو گئے تھے اور میدان میں آ کر ان کا مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ جب شہنشاہ کو صوبہ کے انتظام کے متعلق اس حالت کی اطلاع کی گئی تو اس نے سختی سے اس طرف توجہ کی اور منڈو کی فوجداری سے نوازش خاں کو الگ کر کے خاندیس بھیج دیا

مگر بعد میں وہ پھر اپنی پہلی جگہ پر بحال ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ سرکاری تبدیلیوں کا کچھ اثر نہیں ہوگا شہنشاہ نے صوبہ مالوہ کی صوبیداری پر بیدار بخت کو مقرر کر دیا اور شائستہ خاں کے بیٹے ابوظفر کو بنگال کی صوبیداری سپرد کی گئی جہاں ان دنوں نسبتاً زیادہ امن تھا (ماثر الامرا، جلد اول ص ۲۹۳)[۵۱]

فیروز جنگ نے نیما جی سندھیا کا تعاقب جاری رکھا اور فروری ۱۷۰۴ء میں وہ بھام گڑھ سے چتر سال کے خلاف چندیری اور دھامونی کے راستہ سے گڑھ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے جنرل خنجر خاں نے جو ہراول کا افسر تھا اپنے اچانک حملوں سے دشمن کی فوجوں کے کئی دستوں کو بھگا دیا۔ اس کے بعد فیروز جنگ برہان پور اور وہاں سے برار واپس آیا اس لئے کہ وہاں اس کی موجودگی کی سخت ضرورت تھی۔

نیما جی سندھیا نے نربدا کی کئی مغل چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کئی ماہ تک شمالی ہندوستان اور دکن کی شاہراہوں کو مرہٹوں نے بند کئے رکھا۔ ابتدائے مارچ ۱۷۰۴ء سے سرکاری خطوط

---

۵۱ شہنشاہ نے ابوظفر خاں کو مندرجہ ذیل خط سخت الفاظ میں لکھا تھا " باوجودیکہ فیروز جنگ مرہٹوں کا تعاقب کر رہا تھا کیا تم قلعوں میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے؟ اب فیروز جنگ سرونج کے قریب نیما کو شکست دے کر اس کا تعاقب کر رہا ہے اور وہ بندیلکھنڈ اور گڑھ کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اگر تم میری ملازمت میں رہنا چاہتے ہو تو اپنے قلعہ سے نکلو، فوج لو، فوجداروں کو جمع کرو اور دشمنوں کی ہزیمت خوردہ فوج اور باغی افغانوں پر حملہ کرو جو اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر کسانوں کو تنگ کر رہے ہیں انھیں قتل کر دو اور اپنے علاقہ سے نکال دو۔ نوازش خاں کو برہان پور بھیج دو۔ منڈو کو اپنی جاگیر سمجھو اور نئے قلعہ دار کے حوالہ دھار کر دو۔"

نوازش خاں کو اس طرح خطاب کیا گیا تھا " نصرت جنگ کی درخواست پر تمھیں ملازمت پر برقرار رکھا گیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے تم اپنے آپ میں نہیں تھے۔ منڈو کو چھوڑ کر دھار میں پناہ لینے کا مطلب کیا ہے؟ برہان پور آؤ اور بیدار بخت کے ماتحت کام کرو۔ میں تمھیں دکن میں جاگیریں دوں گا لیکن اگر تم پسند کرو تو بیس ہزار سالانہ تنخواہ ملے گی۔ (رقعات طیبات آصفیہ نمبر ۱۱۲ انشا)۔

کتابت کے تقریباً ۵۰ ہتھیلے اور ۵۰ چلیں کی ٹوکریاں جو کابل اور کشمیر کے صوبیداروں نے شہنشاہ
کی خدمت میں روانہ کی تھیں دریائے نربدا کے کنارہ پر رکھی رہیں۔ اس لئے کہ فوجدار کے پاس ان
اشیاء کو منزل مقصود تک پہنچانے کا کوئی سامان نہیں تھا (سرکار جلد پنجم ص ۲۴۶)۔

۲؍ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت فیروز جنگ
بحیثیت صوبیدار برار ایلچ پور میں مقیم تھا۔ دکن کے تقریباً تمام بڑے بڑے امرا نے شہزادہ اعظم
کی اطاعت قبول کی۔ بعض نے تو اس لئے کہ وہ واقعی شہزادہ موصوف کو چاہتے تھے اور بعض نے
اس وجہ سے کہ ان میں مخالفت کی طاقت نہیں تھی۔ لہٰذا انھوں نے عقلمندی سے کام لیا اور
اعظم کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوگئے جب شہزادہ اعظم اورنگ آباد کی طرف روانہ ہوا تو چن
قلیچ خاں (نظام الملک) اور اس کا چچیرا بھائی محمد امین بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اعظم نے
چن قلیچ خاں کو خان دوران کا خطاب مرحمت کیا تاکہ اسے اپنی طرف کرلے اور اس کے ذریعہ سے
تورانی فوج کو۔ لیکن وہ جلد ہی شہزادہ کے مغرور اور حقارت آمیز رویہ سے جو وہ اپنے افسروں
اور سرداروں سے روا رکھتا تھا بد دل ہوگئے۔ اعظم ہمیشہ قدیم بہادروں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا
اس نے توپ خانہ کی افسری سے بڑے ذلیل طریقہ سے تربیت خاں کو الگ کرکے اس کی بجائے
ایک کم ذات نوجوان کو افسر مقرر کردیا۔ (ارادت خاں ص ۱۲) شہزادہ اس قدر مغرور تھا کہ
چن قلیچ خاں اور محمد امین اس کے اس رویہ سے تنگ آگئے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سے
الگ ہوجائیں، اور اس معرکہ میں جو تخت حاصل کرنے کے لئے اورنگ زیب کے بیٹوں میں ہونے
والا تھا غیر جانبدار رہیں۔ دونوں نے اپنی فوج کے ساتھ شہزادہ سے علیحدگی اختیار کرلی اور
اورنگ آباد کے نواح میں بہت سے اضلاع پر قبضہ کرلیا (خافی خاں جلد دوم ص ۵۰۲)۔

اعظم کو معلوم تھا کہ فیروز جنگ بھی اس لڑائی میں حصہ لینا نہیں چاہتا جو شہنشاہ کے انتقال
کے بعد ہونے والی تھی۔ اگرچہ وہ فیروز جنگ سے سخت ناراض تھا اس نے یہی مناسب خیال کیا کہ
شمالی ہندوستان روانہ ہونے سے قبل اسے اپنی طرف سے برہان پور کا مستقل مقرر کردے۔ تاکہ

وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کر سکے جو اس کے لئے نقصان کا باعث ہو اس لئے کہ اُس حد میں کام بخش موجود تھا۔

ماثر الامراء کے بیان کے مطابق جب ذوالفقار خاں اورنگ آباد کے نواح میں اعظم سے آملا تو شہزادہ نے اُس سے کوئی مشورہ طلب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ذوالفقار خاں نے یہ کہا تھا "عقل و دانش کا تقاضہ ہے کہ اپنے خاندان کو دولت آباد ہی میں چھوڑ جائیے جس طرح آپ کے والد ماجد نے کیا تھا جب وہ انھیں حالات میں دارا شکوہ سے لڑنے روانہ ہوئے تھے۔ سپاہی بہت تنگی کی حالت میں ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے خزانہ میں سے دو ماہ کی پیشگی تنخواہ ان کو دے دیجئے۔ اچھا یہ ہے کہ درہ فرداپور کی بجائے درہ دیول گھاٹ میں سے گذرا جائے تاکہ اس طرح آپ فیروز جنگ کے ہیڈ کوارٹر کے قریب سے گذر سکیں ۔ اس سے فیروز جنگ کو موقع ملے گا کہ آپ کے ساتھ شامل ہو جائے" شہزادہ نے بڑے غرور سے جواب دیا "یقیناً اپنے خاندان کو دولت آباد میں چھوڑ جانا زیادہ مناسب تھا اگر دشمن دارا شکوہ کی طرح ہوتا۔ ہم جانتے ہیں معظم کی حالت کیا ہے۔ اس کے آدمی صرف آداب جانتے ہیں۔ انھیں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں اور میں اپنے آدمیوں سے بڑے بڑے کاموں کی توقع رکھتا ہوں۔ جہاں تک فیروز جنگ کا تعلق ہے میں نہیں چاہتا کہ اندھے کی خاطر سیدھا راستہ چھوڑ دوں" (جلد دوم ص ۸۰۲-۸۰۷)۔

جنگ جاجو نے جو آگرہ کے نواح میں لڑی گئی تھی ہندوستان کے تخت کا فیصلہ معظم کے حق میں کیا۔ اعظم اور اس کا بیٹا بیدار بخت مارے گئے اور معظم نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے معافی اور صلح کی حکمت عملی اختیار کی۔ ان تمام لوگوں کے ساتھ جو بہادر شاہ کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ جنھوں نے اعظم اور کام بخش کا ساتھ دیا تھا بڑا اچھا سلوک کیا گیا۔ جب چند حاسدوں نے نئے شہنشاہ سے یہ کہا کہ اعظم کے ساتھیوں پر اعتماد کرنا خطرناک غلطی ہے تو اُس نے یہ جواب دیا کہ اگر اس وقت اس کے بیٹے دکن میں ہوتے تو صورت حالات کا یہی تقاضہ تھا کہ وہ اپنے چچا کے ساتھ رہیں۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۴۰۰)۔

شہنشاہ نے سلطنت کے بڑے بڑے امرار کو دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اسی قسم کی دعوت فیروز جنگ کو بھی بھیجی گئی۔ وہ بہادر شاہ سے بہت ڈرتا تھا کیونکہ گول کنڈہ کے محاصرہ میں اسی کی رپورٹ پر شہنشاہ نے شہزادہ کو قید کر دیا تھا۔ لیکن ان خطوط سے جو بہادر شاہ کے وزیر اعظم منعم خاں نے بھیجے تھے آسے اطمینان ہو گیا۔ ارادت خاں کے الفاظ میں "تجربہ کار مدبر نے جو زمانہ کے انقلابات سے خوب واقف تھا اس میں اپنا فائدہ سمجھا کہ ملک معظم اس کے گذشتہ قصور کو معاف کر دیں، آسے تباہ و برباد نہ کریں اور وہ شہنشاہ کی اطاعت قبول کرے" اس نے وزیر اعظم کے وعدوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور احمد آباد گجرات کی صوبیداری قبول کر لی۔ اس نے زبدا کو عبور کیا اور بغیر کسی شورش کے دکن سے روانہ ہوا لیکن وہ ڈر سے دربار میں حاضر نہیں ہوا۔ (ص ۵۲)۔

فیروز جنگ نے یہ رعایت حاصل کر لی کہ وہ بذات خود شہنشاہ کے حضور میں حاضر نہیں ہو سکا اس لئے کہ اٹھارہ برس سے اس کی آنکھوں میں بینائی نہیں ہے۔ اور خود شہنشاہ عالمگیر نے اس کی گذشتہ خدمات کی وجہ سے آسے ذاتی حاضری سے معاف کر دیا تھا۔

شہنشاہ کے احکام کے بموجب فیروز جنگ نے گجرات کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لیا ہوگا کے دیوان عبد الحمید، میر علی خاں بخش اور محمد بیگ خاں نے نئے صوبیدار کا استقبال کیا۔ پہلا کام جو فیروز جنگ نے کیا یہ تھا کہ اس نے صوبہ کے مختلف حصوں میں نئے تھانیدار اور فوجدار مقرر کئے۔ اس نے سید عاقل خاں کو شہزادہ جہاندار شاہ کی جاگیر کا متصدی مقرر کیا۔ اسے بشہرپور کی تھانیداری کے فرائض بھی سپرد ہوئے۔ یہاں کا تھانیدار پہلے اس کا بھائی میر عبد الوہاب تھا جو شرپسند کے خلاف ایک لڑائی میں مارا گیا تھا مصنف، مراۃ احمدی کے والد کو بدستور واقع نگار بنے دیا گیا (مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۸۲)۔[۵۱]

---

[۵۱] اور تقرر حسب ذیل ہوئے۔ معتمد خاں، قلعہ در قلعہ چمپانیر۔ میر عبد البقا کو توال اور انسپکٹر گھٹا پاچھ

بہادر شاہ کو جب یہ خبر ملی کہ جودھ پور کے راجہ اجیت سنگھ نے بغاوت کر دی ہے اور وہ شہنشاہ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس نے جودھ پور کے نائب فوجدار جعفر علی کو شکست دے کر اجمیر اور دوسرے شاہی علاقہ پر قبضہ کر لیا ہے تو اس نے فیروز جنگ کو حکم دیا کہ وہ راجہ اجیت سنگھ کے خلاف روانہ ہو اور راجپوتانہ کے اس علاقہ میں جہاں بدامنی ہے امن قائم کر دے۔ فیروز جنگ کو جب شاہی احکام ملے تو اس نے اپنی قدیم فوج اور سامان کے علاوہ تین ہزار سوار اور پانچ ہزار پیدل بھرتی کئے۔ سواروں کی تنخواہ ۴۵ روپئے ماہوار اور پیدل کی چار روپئے ماہوار مقرر ہوئے۔ اس طرح ایک لاکھ ۵۴ ہزار روپئے ماہوار خرچ کا اندازہ ہوا۔ شاہی احکام کی رو سے صوبہ کے دیوان [illegible] اور شریف خاں نے گیارہ لاکھ روپئے فیروز جنگ کے حوالہ کئے۔ یہ رقم مقامی فوج کے لئے آٹھ ماہ اور ۲۴ [illegible] کے لئے کافی تھی۔ دیوان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ فیروز جنگ کے لئے شاہی توپ خانہ پچاس [illegible] دار توپیں ۱۵۰ اونٹوں پر لادنے والی بندوقیں، تین ہزار ہوائیاں، ایک ہزار من سیسہ، ایک ہزار من بارود اور ایک ہزار من [illegible] مہیا کرے، اس کے علاوہ دو ہزار کھودنے والے، ایک ہزار کلہاڑے والے آدمی اور دس ہزار سقے فوج کے ساتھ روانہ کرے۔ (مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۰۶)۔

راجپوتانہ کی مہم پر روانہ ہونے سے قبل فیروز جنگ کی طبیعت خراب ہو گئی لیکن چند دنوں کے بعد وہ بالکل اچھا ہو گیا۔ اس نے اپنی صحت کی خوشی میں مقامی امراء، علما اور سیدوں سے بڑی فیاضی کا سلوک کیا۔ تین راتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دریائے سابرمتی کے کنارہ روشنی کی گئی اور آتش بازی چھوڑی گئی (مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۰۶)۔

میر ابو قاسم میں۔ شیخ نجم الدین کی جگہ محمد حاتم بیگ داروغہ چہرہ باف خانہ۔ خواجہ عوض خاں داروغہ خزانہ شہر شیخ نور اللہ داروغہ خزانہ صوبہ۔ اعتماد خاں متصدی کھمبایت امانت خاں کی جگہ، اور تھانیدار [illegible] سید علی خاں کی جگہ۔ (مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۰۴۔

فیروز جنگ احمد آباد سے میواڑ کی طرف روانہ ہوا۔ پہلا مقام جہاں اس نے قیام کیا دریائے سابرمتی کے کنارہ موضع اچھیر تھا۔ جاگیرداروں نے اس کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کئے۔ اس کے بعد وہ اویر ٹھیرا۔ یہاں شہنشاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے پچاس جاسوس اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ جاسوس شہنشاہ نے فیروز جنگ کی درخواست پر بھیجے تھے تاکہ راجہ اجیت سنگھ کی تمام حرکتوں کی خبر اُسے ہوجایا کرے۔ سپاہیوں کی طرح ان جاسوسوں نے بھی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ اس بات کی خبر ایک تیز رَو پیغام بر کے ذریعہ شہنشاہ کو کی گئی اور اس نے احمد آباد کے بخشی کو حکم دیا کہ ان کا مطالبہ پورا کردے۔

جب فیروز جنگ دنتا پہنچا تو جلندر کی بیماری پھر عود کر آئی، وہ بہت کمزور ہوگیا اور علاج کے لئے احمد آباد واپس ہوا۔ چند دنوں کی بیماری کے بعد اس کا انتقال ہوگیا ([illegible]) اس کے انتقال کی خبر سُن کر شہنشاہ نے دیوان کو فرمان بھیجا کہ مرحوم فیروز جنگ کی جائداد ضبط کرلی جائے۔ شہنشاہ کو اطلاع دی گئی کہ فیروز جنگ کے متصدی عوض خاں نے سپاہیوں میں بہت سا روپیہ تقسیم کرنا شروع کردیا ہے اور وہ جائداد کو نہیں چھوڑتا۔ اس نے اپنے لئے بھی اس بہانہ سے بہت سا روپیہ جمع کرلیا ہے کہ اسے فیروز جنگ کا قرض ادا کرنا ہے۔ کارخانہ کے دیوان جے کشن نے بھی روپئے کو اپنے تصرف میں لانے کے لئے بہت سی جعلی دستاویزیں بنالی تھیں (مرأۃ احمدی جلد اول ص ۳۹۱)۔

بہادر شاہ نے فیروز جنگ کے نائب محمد بیگ خاں پٹن کے فوجدار اور امانت خاں (جو بعد میں شہامت جنگ کے لقب سے مشہور ہوا) متصدی بندرگاہ سورت کو حکم دیا کہ وہ مرحوم صوبیدار کی جائداد کو اپنے قبضہ میں کرلیں۔ اس نے ہر ایک چیز کی تفصیل سے ایک فہرست بنائی تاکہ دارالخلافہ میں ان کی جانچ ہوسکے۔ جے کشن، الماس اور نیک روز (تینوں خواجہ سرا) گرفتار کر لئے گئے اور ذمہ دار آدمیوں نے اس جائداد کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کی جائداد مندرجہ ذیل اشیا پر مشتمل تھی۔ ۱½ لاکھ روپیہ جو ہنڈیوں کی شکل میں ساہوکاروں کے پاس تھا۔ ۱۳۳۰۰۰ سونے کی مہریں۔ ۲۵،۰۰۰ ہون (سونا) اور اتنی ہی تعداد میں نیم پاؤلی، (سونا)، ۱۷،۰۰۰ پاؤلی (سونا)

۴۰۰ ادصیلی، ۸۰۰۰ پاؤلی (چاندی) ۴۰ گھوڑے، ۴۰۰ اونٹ، ۴۰۰ بیل اور ۴۸ ہاتھی (Manucci Mogor جلد اول ص ۲۷۰)۔

فیروز جنگ کی جائداد کی ضبطی مغل حکومت کے رسم و رواج کے مطابق تھی۔ بالخصوص اس موقعہ پر تو اس کی سخت ضرورت تھی اس لئے کہ اپنے انتقال سے تھوڑی ہی مدت قبل فیروز جنگ نے بہت سارو پیہ شاہی خزانہ سے لیا تھا۔ چونکہ راجپوتانہ کی مہم کا خیال ترک کر دیا گیا تھا اس لئے گیارہ لاکھ کی رقم حکومت کو واپس کرنا ضروری تھی جو اس مقصد کے لئے دی گئی تھی کہ راجہ اجیت سنگھ کے خلاف لڑائی میں صرف کی جائے۔ اس قدم کو اٹھانے کی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ جو روپیہ شاہی خزانہ سے لیا گیا ہے اس کی ادائیگی کا یقین ہو جائے۔ بعض غیر ملکی مصنفین کو اس رواج سے غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ حکومت ان متوفی امیروں اور افسروں کی جائداد اور مال و متاع کو اپنے قبضہ میں نہیں کر سکتی تھی جیسا کہ ان کا خیال ہے[۵۱]۔ شہنشاہ اورنگ زیب کا فرمان مورخہ ۲۴ جولائی ۱۶۶۶ء جو صوبہ کے ہر دیوان کے پاس بھیجا گیا تھا اس میں صاف صاف یہ لکھا تھا کہ صرف ان امرا اور افسروں کی جائداد قبضہ میں کی جائے جو حکومت کے قرضدار ہیں[۵۲]۔

---

۵۱ Manucci's Storia do Mogor Vol. II, P 417 ;
(Bernier's Travels pp 163, 211 and 212.)

۵۲ فرمان کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔ اگر شہنشاہ کے کسی ملازم کا انتقال ہو جائے، اس کا کوئی وارث نہ ہو اور سلطنت کا اس کے ذمہ بھی کچھ نہ ہو تو اس کا مال و متاع بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ اگر متوفی کو حکومت کا کچھ دینا ہے تو وہ رقم لے کر باقی بیت المال میں جمع ہو جائے۔ اگر اس کا کوئی وارث ہے اور جائداد کا دعوے دار تو اس وقت تین دن انتظار کے بعد مال و متاع پر قبضہ کر لیا جائے۔ اگر کوئی جائداد اس رقم سے زیادہ ہو جو حکومت کی متوفی کے ذمہ ہے تو یہ رقم منہا کر کے باقی جائداد حقیقی وارث کے سپرد کر دی جائے جب وہ قانوناً اپنا حق ثابت کرے۔ اگر حکومت کا قرض متوفی کی جائداد سے بھی زیادہ ہو تو اس صورت میں ہر چیز پر قبضہ کر لیا جائے۔ اگر قانوناً

فیروز جنگ کا انتقال باسٹھ (قمری) برس کی عمر میں ہوا۔ اس کی لاش دہلی روانہ کی گئی اور اجمیری دروازہ کے قریب اس مقبرہ میں دفن کی گئی جو اس نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ یہ مقبرہ شاہ وجیہ الدین کی آرام گاہ سے زیادہ دور نہیں (مآثر الامرا، جلد دوم ص ٨٧٨)۔

فیروز جنگ تورانی مغلوں کا سردار تھا۔ وہ بہت قابل اور ہوشیار جنرل تھا۔ دکن میں اس نے بہت زبردست اثر پیدا کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں اس کی موجودگی کو بہادر شاہ خطرناک سمجھتا تھا اپنی تمام زندگی بھر وہ حکومت کا وفادار رہا۔ حاسدوں نے اس کے خلاف اورنگ زیب کے بہت کان بھرے لیکن آپ نے ہمیشہ فیروز جنگ پر اعتماد رکھا۔ وہ ہمیشہ فیروز جنگ کو پسند کرتا رہا جیسا کہ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جو اورنگ زیب نے اس کے نام لکھے تھے [١٥]۔ اس کی سیرت کے متعلق خافی خاں نے مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں: "وہ ایسا آدمی تھا جس کو ہمیشہ فتح ہوتی تھی۔ وہ اتنا منتظم تھا کہ اپنے دشمن پر چھا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ زبردست مطلق العنان تھا مگر طبیعت کا اتنا نرم اور اچھا کہ تورانیوں میں شاید ہی ایسا آدمی دیکھا یا سنا گیا ہو" (جلد دوم ص ٧٤١)۔

پہلی بیوی صفیہ خانم کے انتقال کے بعد جس سے قمر الدین خاں (نظام الملک آصف جاہ خلد آشیاں) نے تولد فرمایا تھا انھوں نے یکے بعد دیگرے سعد اللہ خاں کے بیٹے حفظ اللہ کی دو لڑکیوں سے شادی کی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ (مترجمہ سید نصیر احمد بی اے از انگریزی)۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) یہ ثابت ہو جائے کہ متوفی کے ذمہ حکومت کا قرض نہیں ہے تو ساری جائداد وارث کے حوالہ کر دی جائے (مراۃ احمدی جلد اول ص ٦٧، ٢٦٦)۔

[١٥] رقعات عالمگیری۔

ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں مسلمانوں کی اہمیت

(گذشتہ سے پیوستہ)

تمدن یا کلچر: تمدن یا کلچر کا لفظ بھی قوم یا نیشنلزم کی طرح کا ہے ہماری آیندہ منزل ہمارے قومی معیار ہمارے قومی نظریہ کے اعتبار سے ہندو تمدن اور مسلم تمدن اتنے ہی مغالطہ آمیز ہیں جتنا ہندو قوم یا مسلم قوم میں یہ کہہ چکا ہوں کہ ہندو تمدن اور مسلم تمدن کے بھی کچھ معنی ضرور ہیں لیکن اسی طرح جیسے بنگالی تمدن یا گجراتی تمدن برہمن تمدن یا راجپوت تمدن جین تمدن یا پارسی تمدن یا آریہ تمدن یا دراوڑ تمدن وغیرہ کے بھی اپنے اپنے معنی ہیں لیکن ہمارا معیار ان جدا جدا تمدنوں پر مبنی نہیں ہے انھیں الگ الگ تمدن کہنا بھی ایک درجہ تک غلط ہے ہمارا مقصد ان سب کو ملا کر ایک متحدہ ہندوستانی تمدن پیدا کرنا اور اسے ترقی دینا ہے جس میں یہ سب تمدن اس طرح ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہوں جس طرح ایک خوبصورت تھان کے اندر تانے بانے کے تار ہوتے ہیں۔

اس بارے میں دنیا کی مختلف تہذیبوں کی تاریخ ہمارے لئے نہایت سبق آموز ثابت ہوسکتی ہے پرانی یا نئی کسی بھی تہذیب کو ہم دیکھیں ہمیں معلوم ہوگا کہ ایک ملک کا قومی تمدن ہمیشہ ایک ملی جلی چیز کی صورت میں رہا ہے اور اسی میل جول پر ہر تہذیب اور ہر تمدن کی ترقی اور اس کا ارتقا منحصر ہوتا ہے۔
آج کل کی یورپین تہذیب کو لے لیجئے آج کل کے باشندگان یورپ اگر ارادہ کرلیں کہ انھیں اپنی تمدنی زندگی سے ایشیا کی تمام چیزوں کو خارج کر دینا ہے۔ تو سب سے پہلے انھیں عیسائی مذہب کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اگر عیسائی مذہب سے بھی خالص عیسائیت کے سوادہ سب چیزوں کو خارج کرنا چاہیں تو صلیب کا نشان قدیم مصریوں کے 'نشان حیات' کی نقل ہے اتوار کی چھٹی بڑے دن اور ایسٹر کے تیوہار سب زرتشت کے مصری مذہب کے اس فرقہ کی یادگار ہیں جو عیسائی مذہب سے پہلے تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا عیسائی مذہب کے تمام بنیادی اصولوں پر بودھ مذہب کی لافانی اثر ہے اور یہ ایک تاریخی

واقعہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائیش کے وقت تمام علاقہ شام بدھ مذہب کے معبدوں سے بھرا ہوا تھا ان سب باتوں سے حضرت عیسیٰ یا عیسائی مذہب کی عزت ہمارے دلوں میں کم نہیں ہوتی سب مذہبوں کے بنیادی اصول اس لئے ایک ہیں کہ سب کا مخرج ایک خدا ہے اور رسم و رواج اور شریعت سب کے آس پاس کے ماحول سے لی جاتی ہے۔ اور اکثر ملکی حالت کے مطابق فرق ہوجاتا ہے۔

مذہب سے ہٹ کر اگر یوروپ کے مختلف سائنسوں سے یونانی الفاظ اور یورپین قوانین سے رومن اصطلاحات نکال دی جائیں تو کم از کم ایک بار یوروپ کے عالموں کا ایک دوسرے کی بات سمجھ سکنا کچھ زمانہ کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ الفاظ کی کمی کچھ زمانہ میں شائد پوری بھی کی جاسکے لیکن اگر یونان کے دئیے ہوئے خیالات اور اصول مصر کی دی ہوئی سیاہی اور کاغذ چین سے لئے ہوئے جہازوں کے آلہ سمت نما چھاپ بارود اور ہیئت عربوں سے لئے ہوئے ہندسے یوروپ والوں سے لے لئے جائیں تو ساری یوروپین تہذیب اس بری طرح لڑکھڑا کر گر پڑے جس طرح نیو نکال لینے پر دیوار۔ یوروپ کے بادشاہوں اور پادریوں کی ساری پوشاکیں ایشیائی پوشاکیں ہیں شطرنج بیڈمنٹن اور پولو تینوں مسلمہ طور پر ہندوستان کے کھیل ہیں میں اس مضمون کو طویل کرنا نہیں چاہتا۔

اس طرح پر اگر قدیم یونانی تہذیب سے مصر کا علم ریاضی نجوم اور جغرافیہ یا فیثاغورث اور پارمنڈیز کے اصولوں میں سے ہندوستانی فلسفہ اور معرفت کو نکال دیا جائے تو تمام یونانی تہذیب ایک مردہ لاش نظر آئے گی اگر سکندر کے سر پر سے وہ شاہی تاج اتار لیا جائے جس کا پہننا اس نے ایران میں سیکھا تو سکندر کی ساری عظمت ختم ہوجائے سکندر چنگیز خاں کا ایک کمزور اور ناقص نقال نظر آئے گا اور اس کے ساتھ ساتھ تمام یوروپ کی بعد کی زندگی اور ان کے سیاسی تصورات اور تلازمے کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔

ٹھیک یہی حالت دنیا کی ہر ایک زبان اور ہر ایک تمدن کی ہے۔

تقریباً دو ہزار سال ہوئے چین کے ایک شہر میں تین سیاح جمع ہوئے جن میں سے ایک چینی ایک جاپانی اور ایک ہندوستانی تھا ان دونوں نے چینی سے پوچھا ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟ چینی نے جواب دیا کہ غرور کی گرمی سے ستائی ہوئی نسل انسانی کو ہوا کرنے کے لئے ہم ایک پنکھا تیار کر رہے ہیں چین اس

پہیے کا دستہ ہے جاپان چاروں طرف کو دوڑنے والی تیلیوں کی مثال ہے اور ہندوستان ان تیلیوں
کے اوپر کا غذ ہے بے شبہ اس زمانہ کا ایشیائی تمدن کا یہ خاصا خوبصورت خاکہ ہے۔

اگر ایک ہزار سال اور ادھر ہٹ کر ہم چین سے بغداد آجائیں تو اس سے بھی خوبصورت منظر دیکھنے
کو ملے گا۔ عباسی خلفاء کے دربار میں سنسکرت اور پالی چینی اور یونانی زبانوں کی کتابیں تلاش کر کر کے منگائی
جاتی تھیں فاضل برہمنوں بودھ بھکشوؤں اور یونانی فلسفیوں کا جمگھٹ رہتا تھا اور ان کتابوں کے ترجمے
عربی میں ہو کر بغداد سے ہسپانیہ تک کے مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے اگر اب اس زمانہ یا اس کے
بعد کے مسلمان صوفیوں کی کتابوں کو پڑھیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ آپ بھگوت گیتا کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں
یا ویدانت ہمہ اوست کے سنسکرت فلسفہ کی تفسیر افسوس اس بات کا ہے کہ ہم میں سے بیشتر تعلیم یافتوں
کو مسلم تاریخ اور مسلم لٹریچر کا علم اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا صرف مس میو کی کتاب مدر انڈیا پڑھ کر کسی انگریز
عورت کو ہندوستان کے تمدن سے واقفیت ہو جائے۔

کسی بھی ملک کی تہذیب (یا تمدن) تخمی چیز نہیں ہوتی بلکہ قلمی ہوتی ہے قومی تمدن صرف
بزرگوں کے دیئے ہوئے بیجوں سے پیدا نہیں ہوتا وہ سودیشی پودے کے تنے کو چھیل کر باہر کے
نئے نئے درختوں کی ڈالیوں کی قلم لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔ تخمی آم میں نہ وہ ذائقہ ہوتا ہے اور نہ وہ صفات
جو قلمی آم میں ہوتی ہے۔

جس تالاب میں باہر سے پانی آنا بند ہو جائے وہ یا تو تھوڑے ہی دنوں میں سوکھ جائے گا یا
اس کا پانی سڑنے لگے گا دریا کے پانی کی تازگی اس میں ہے کہ روانی جاری رہے۔ مختلف
معاون ندیاں چاروں طرف سے آکر اپنے اپنے پانی کی بھینٹ چڑھاتی رہیں
اسی پانی کو ہمیشہ سمندر اپنی طرف کھینچتا رہے۔ باہر سے آکر حملہ کرنے والے دو چار مسلمان فاتحوں نے نہیں بلکہ
مذہب اسلام نے اور عرب اور ایرانی تمدن نے جو اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آیا سب سے بڑا فیض
اس ملک کو یہ پہنچایا کہ باہر کی دنیا کے ساتھ اس کے ٹوٹے ہوئے تعلق کو پھر سے جوڑ دیا تقریباً ایک ہزار سال
پہلے یہی خدمت ہندوستان کی بودھ مذہب نے کی تھی اور اس عمل کے ذریعہ ہندوستان کی مردہ ہڈیوں

میں پھر سے جان ڈال دی تھی۔ ہندوستان کے بودھ مذہب کے زوال کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے تمدن کی وہ نالیاں ٹوٹ کر ختم ہوگئی تھیں۔ اسلام نے تمام نسل انسانی کے دل کے ساتھ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ ہمارا تعلق پیدا کرکے پھر سے ہماری نسلوں میں سے تازہ خون جاری کیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ زندگی ہمیشہ روانی میں ہے۔ زندگی مسلسل لین دین کا نام ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آنکھ بند کرکے اپنی پرانی چیزوں کو پھینکنا اور باہر کی اچھی یا بری ہر قسم کی چیزوں کو لینا شروع کردیں لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ ہم بے تعصب ہوکر نسل انسانی کی محبت سے متاثر ہوکر اپنے گھر کے باغ کی دیکھ بھال کرتے رہیں جو درخت سوکھتے جاتے ہیں انھیں کاٹ کر الگ کرتے رہیں ان کی جگہ نئی نئی قلمیں اور خوبصورت پھول باہر سے لا لاکر اپنے باغ کو آراستہ کرتے رہیں اپنے یہاں کے پودے بیج اور قلمیں دوسروں کی نذر کرتے رہیں اور نئی کھاد اور پانی سے باغ کی خبرداری رکھیں تاکہ باغ کی خوبصورتی بڑھتی رہے بلکہ تمام زمین پر جہاں تک فطری اختلافات کے ہوتے ہوئے ممکن ہے ایک ہی طرح کا باغ ایک ہمہ گیر انسانی تمدن ترقی کرتا ہوا دکھائی دے جس کا سینچنا انسانی محبت کے پانی سے ہمیشہ جاری رہے دنیا کی عظیم الشان ہستیوں رشیوں پیغمبروں اور اہل نظر کا یہی نظریہ رہا ہے۔

مشترکہ ہندوستانی تمدن پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدیوں کے اندر ہندوستان میں ایک اسی طرح کے خوبصورت قومی تمدن کی بنیاد پڑ رہی تھی مذہبی اور روحانی میدان میں کبیر چشتی اور سیاسی میدان میں اکبر اس کے سب سے بڑے بانی تھے یہ تمدن نہ ہندو تمدن تھا اور نہ مسلم تمدن بلکہ یہ خالص ہندوستانی تمدن تھا۔ پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدیوں میں اور ان کے بعد بھی نیپال سے افغانستان تک اور کشمیر سے لنکا تک سینکڑوں ہندو اور مسلمان سنت مہاتما (فقرا اور اولیا) اعلیٰ روحانی تلقین کے ذریعہ اس کی نیو کو مضبوط کرتے پھر رہے تھے قوم کی معاشرت خورد و نوش صنعت و حرفت زبان ادب علوم و فنون سب پر اس کا گہرا اثر پڑا قوم میں ایک نئی بیداری چاروں طرف دکھائی دینے لگی۔

اس مشترکہ تمدن کی صرف ایک درخشاں مثال آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ مثال فن

تعمیر کی ہے۔ اس فن میں اگر آپ کو قدیم ہندو معیار دیکھنا ہو تو دکھن کے بہت سے پرانے مندر میں عظیم شاندار
کرسی کے اوپر کرسی اور کنگرے کے اوپر کنگرہ ہندوستان کے گھنے جنگلوں کی طرح ایک ایک انچ دیواریں پر
(بتوں) اور تصویروں سے بھری ہوئی اس کی عظمت جامعیت اور خوبصورتی سے حیرت زدہ ہو کر دیکھنے
والے کی آنکھیں اسی طرح راستہ بھول جاتی ہیں جس طرح ہندوستان کے جنگلوں میں۔ دوسری طرف اگر
آپ کو باہر سے آئے ہوئے مسلم تہذیب کی مثال دیکھنی ہو تو دلی اور اجمیر کی خوبصورت مسجدیں ہیں عرب کے ریگستان
کی طرح اونچی ننگی دیواریں نیلے آسمان سے بات کرنے والے مینار بڑے بڑے گنبد اور اس کی عظمت
کے اندر عابدوں کے دھیان کو بٹنے والی سوائے اللہ کے کوئی دوسری چیز نہیں لیکن اگر آپ کو فن کی نظر سے ان دونوں
الگ الگ معیاروں کی محبت آمیز ہم آغوشی کو دیکھنا ہو تو آگرہ کا وہ تاج محل ہے جو نہ صرف اس وقت
تک ہندوستان کے فن تعمیر کا سب سے خوبصورت پھول ہے بلکہ ہندوستان بھر کے اندر سب سے
زیادہ بیش بہا نعمتوں میں سے ہے۔

جس تاج نے دس برس تک لگاتار بیس ہزار مزدوروں اور کاریگروں کی پرورش کی جس نے
بے پور کی پتھر کی کاریگری کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ایسے چار چاند لگا دیئے جو شاعر اعظم رابندر ناتھ
ٹیگور کے لئے بہترین شاعری اور دنیا کے ماہرین فن کے لئے پیام حیرت ہے یہ ہماری اس مصیبت
زدہ حالت میں بھی ہندوستان کے بیمار جسم اور جھکے ہوئے سر پر جھومر کی طرح چمک رہا ہے۔

کئی وجوہ سے ہماری غلطیوں اور باہر کی دستبرد سے ہماری وہ رفتار رک گئی لیکن پھر بھی اس
مجموعی رفتار کا دخل ہمارے روزمرہ کی زندگی میں اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ اس سے انکار کرنا یا اس سے پھرنے
کی کوشش کرنا خودکشی کرنا ہوگا اور بغیر اپنی کھال اور اپنا گوشت نوچ کر پھینکے ہوئے ہندو اور مسلمان دونوں
کے لئے اس طرح کی کوشش غیر ممکن ہے۔ یہ صرف ہماری تنگ نظری اور جہالت کا اظہار ہے کون سمجھ دار
ہندو اپنے باغ سے گلاب اس لئے نکال کر پھینک دے گا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایران سے آیا تھا ہماری
مٹھائیوں میں سے تین چوتھائی شاہجہاں کے وقت کی ایجاد ہیں جیسے کہ اس کے فارسی اور عربی ناموں سے
ابھی تک پتہ چلتا ہے ہماری پوشاک میں آدھی سے زیادہ چیزیں جنھیں پہن کر ہم مندروں میں اپنے دیوتاؤں کا

سنگار کرتے ہیں مسلمانی زمانے کی ہیں ہمارے بہت سے خوبصورت اور لذیذ میوے اسی دور کے ہیں کم سے کم شمالی ہندوستان میں ہر ہندو شادی کے زمانہ میں ' نوشاہ ' بنتا ہے ہندو کی شادی بغیر سہرے اور جامہ کے نہیں ہوتی ۔ اور کروڑوں مسلمانوں کی شادی بغیر کنگن کے نہیں ہوتی۔ سہرا اور جامہ مسلمانی ہے اور کنگنا ہندو ۔ مجھے نہیں معلوم ہندوستان بھر میں کتنے مسلمان گھر ملیں گے جن میں لڑکیوں اور لڑکوں کے کان اور ناک چھدنے کی رسم نہ ہوتی ہو دونوں رواج ہندوانہ ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے ان مثالوں کے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے اگر اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہم ایمانداری سے دیکھیں تو متعدد باتوں میں ایک پشاور کے ہندو اور ایک مدراس کے ہندو میں کہیں زیادہ فرق ہے بہ نسبت پشاور کے ایک ہندو اور پشاور ہی کے ایک مسلمان میں ۔

اگر ہم مذہب یا مذہبی اصولوں کی نظر سے دیکھیں تو بے تعصبانہ مطالعہ کرنے پر ہمیں ہندو مذہب اور اسلام دونوں میں ایک حیرت انگیز یکسانیت اور دونوں میں ایک سی لہر چلتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ ہندو مذہب کے کسی کسی فرقہ کے درمیان کہیں زیادہ فرق ہے بہ نسبت ہندو مذہب اور اسلام کے۔ اس بارے میں بابو بھگوانداس کی خوبصورت کتاب THE UNITY OF ALL RELIGIONS تمام مذہبوں کی یکسانیت ہر ہندوستانی کے پڑھنے کے قابل ہے ۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ہر مہذب ملک میں لوگوں کو پوری مذہبی آزادی ہونی چاہئے لیکن اگر ہم فرقہ وارانہ اختلافات سے اوپر اٹھ کر حقیقی ہمہ گیر انسانی مذہب کی جانب جانا چاہیں اگر ہم اپنے ملک کی ہزاروں سال پہلے کی اس قدیم تعلیم کو زندگی میں جگہ دینا چاہیں جو اپنشدوں کے اندر بند ہے تو ہمیں محسوس کرنا ہوگا کہ کسی قسم کی بھی تنگ دلی کسی دوسری چیز کے لئے اتنی مہلک نہیں ہے جتنی سچی مذہبی زندگی کے لئے۔ عالمگیر صلح جوئی کی اگر کہیں بھی سب سے زیادہ ضرورت ہے تو مذہب میں۔

اپنشدوں کا یہ قول ہے کہ گائیں تو مختلف رنگوں کی ہوتی ہیں مگر دودھ ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے عارف گایوں کے رنگ کے اختلاف کو نہیں دیکھتا دودھ کے رنگ کو دیکھتا ہے۔

اور مسلمان صوفی کا یہ قول ہے ۔

جام صد رنگ زاں خم صفا ؛ سادہ یک رنگ گشتہ چوں ضیا

مطلب دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔

ہمہ گیر انسانی مذہب کا سہارا کسی خاص علامت پر نہیں ہے انسانی مذہب ایک دل کی چیز ہے وہ ہمہ گیر محبت کا مذہب ہے دنیا کی تمام مذہبی کتابوں میں انسانوں کو حقیقتاً اس سمت لے جانے کی کوشش کی گئی ہے رسم و رواج اور شریعت صرف طریق کار ہے۔ اس انسانی مذہب کی ضمنی جامع واضح اور خوبصورت تشریح کبیر نانک دادو وغیرہ پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدی کے بیشمار ہندوستانی سنتوں اور ان کے ہمعصر یا ان سے پہلے کے مسلمان صوفیوں کی تعلیموں میں ملے گی اس سے بڑھ کر اور کہیں ملنا دشوار ہے۔

کبیر کا کلام

پورب دشا ہری کو باسا پچھم اللہ مقاما [1]
دل میں کھوج، دل ہی ماں کھوجو اِہی کریما راما
جتنے عورت مرد اُپانی [2] سو سب روپ تمہارا
کبیر پونگرا [3] اللہ رام کا سو گرو پیر ہمارا
ہندو کہیں رام موکہی [4] پیارا ترک کہیں رحمانا
آپس میں دو لڑ لڑ موے مرم [5] نہ کا ہو جانا

[1] طرف
[2] پیدا کئے
[3] غلام
[4] مجھکو
[5] بھید

دادو کا کچھ کلام ہے

آپا [1] میٹے ہری بھجے تن من [2] تجے وکار [3]
نربیری [4] سب جیو سوں [5] دادو یہ مت [6] سار
سب ہم دیکھیا سودھ [7] کر دوجا [8] ناہیں آن [9]
سب گھٹ ایکے آتما کیا ہندو مسلمان
نار [10] پرش [11] کا نام دھر اِہی سنشے [12] بھرم [13] بھلان

[1] خودی [2] چھوڑے [3] برائیاں
[4] عدم عداوت [5] سے [6] خلاصہ مذہب
[7] غور کرکے [8] دوسرا [9] کوئی
[10] عورت [11] مرد [12] مغالطہ [13] بھول

سب گھٹ ایکو اُتہ کیا ہندو مسلمان
دونوں بھائی اتھ ایک دونوں بھائی کان — ہیر
دونوں بھائی نین ہیں ہندو مسلمان — آنکھ
کس سوں بیری ہو رہا دو جا کوئی نا نہہ — نہیں
جس کے انگ تصیر اہنہ بچیا سوئی سب بانہہ — پیدا ہوا — میں

سچے انسانی مذہب کی تشریح کرتے ہوئے دادو نے کہا ہے۔

ہندو ترک نہ ہو نبا صاحب تی کام
شٹ درشن کے سنگ نہ جا نبا نرپکش کہبا رام — شاستر — بے تعصب

نا ہم ہندو ہوئیں گے نا ہم مسلمان
شٹ درشن میں ہم نہیں ہم راتے رحمان — یہ لفظ بہت جامع ہے مختصراً اسکے معنی رنگے ہوئے یا بسے
گرنی ہندو ترک کی اپنی اپنی ٹھور — اعمال — طرف
دو کہیہ بیچ مارگ سادہ کا۔ سنتوں کی رہ اور — دونوں — مارگ — درویش
دادو ہندو ترک کا دوے پکہ پنتہ نوار — دور رہ — مسلک — ختم کر
سنگت سانچے سادہ کی سائیں کو سنبھار — ساتھی — سچے — سنبھال
ہندو لاگے دے ہورے مسلمان مسیت — جھکے — مندر — مسجد

ہم لاگے ایک الکھ سوں سدا نرنتر پریت
نہ تہاں ہندو دے ہورا نہ تہاں ترک مسیت
دادو اپے آپ ہے نہیں تہاں رہ ریت — وہاں — راہ رسم
یہ مسیت یہو دہو راست گرو دیا دکھائے — مرشد برحق
بھیتر سیوا بندگی باہر کاہے جائے — اندر — خدمت
دو نیوں ہاتھی دے ہیے ل رس پیا نہ جائے — دونوں

دادو آپا میٹ کر دو نیو رہے سمائے
دلو دونوں[۱۸] پکھ دور کر بیچ[۱۹] پکھ نرل[۲۰] ناؤں[۲۱] — ۱۸ دو شہ راہ ۱۹ بے راہ ۲۰ پاک ۲۱ نام
آپا میٹے ہر بھجے تا کے میں بل جاوں — ۲۲ قربان

کبیر پیدائش سے مسلمان تھے اور دادو ہندو لیکن دونوں ہندو مسلمان کے اختلاف سے کوسوں اوپر تھے
اس کے بعد نمونے کے طور پر دو چار اقتباسات اورنگ زیب کے معاصر دہلی کے ایک مسلم سنت (درویش) یاری صاحب کے سنئے۔

[illegible]

کہیاری بھگتی کو ہر کی۔ دن دن پریت اَدھک[۲۳] مونہہ ہر کی — ۲۳ زیادہ
کام[۲۴] کرودھ[۲۵] جنجال بھسم کیو[۲۶]۔ برہ اگن لگ دھدھکی[۲۷] — ۲۴ خواہشات نفسانی ۲۵ غصہ ۲۶ جل گیا ۲۷ [illegible]

ہمارے ایک الله پیا پیارا ہے۔
بے نمون بیچون اکیلا ہند، ترک سے نیارا ہے

اونکار کے پار بیچ تیج ابھمان[۲۸] کلیش — ۲۸ غرور
تینوں اَچھر[۲۹] پریم کے یہی بڑا اپدیش[۳۰] — ۲۹ حرف ۳۰ وعظ
گھٹ[۳۱] گھٹ بولے رستا[۳۲] رام۔ نادبرن نارائن نام — ۳۱ دل ۳۲ بسا ہوا
من بیچ میں رہے سمائے۔ تا کا[۳۳] آوا[۳۴] گون نسائے[۳۵] — ۳۳ جس دم ۳۴ آنا جانا ۳۵ ختم
وے اپدیش ملاویں رام۔ ہوں بلہاری[۳۶] گرو کے نام — ۳۶ قربان
کاف کمارگ[۳۷] کوپ[۳۸] تو الا۔ ترشنا[۳۹] موہ بھرم جنجالا — ۳۷ برا راستہ ۳۸ کنواں ۳۹ لالچ
یہ آپو میں سوں تج رہے پرانی بہت گرو میں امرت[۴۰] بانی[۴۱] — ۴۰ آب حیات ۴۱ کلام
لابھ لوبھ لالچ چترائی[۴۲]۔ ان کے چھوڑے ہونے بھلائی — ۴۲ ہوشیاری
بچن[۴۳] ابر لنگوٹ راکھی۔ سب سادھوں مل بولیں ساکھی[۴۴] — ۴۳ زبان ۴۴ تصدیق
یم مہادیو اور سنکدیو۔ تینوں لوک کے جانیں بھیو[۴۵] — ۴۵ بھید
جو ان کے مارگ منہہ چلے۔ رتن ہوں سوجھے اور رب ملے[۴۶] — ۴۶ مراد۔ خدا سے

گُرتن ہیر دہر کی کایا ۔ ناتو جنم اکارتھ جایا
راہنہ سمرو تجو بکارا ۔ بیج بھگونت اتر بھو پارا
داد و بچا ہے اور نہ دوجا ۔ آپ ہی ٹھاکر آپ ہی پوجا
آپ ہی آپ اور نہیں آنی ۔ ایسا سادھو ہے برہم گیانی

بے شبہ ہندو اور مسلمان پارسی اور عیسائی اختلافات سے اوپر رسم ورواج شریعت اور کورانہ تقلید سے اوپر عوام کے لئے معمولی کاروبار اور سیاسی تعلقات میں معرفت کا رستہ بتانے والی جو مذہبی صلح جوئی اس وقت ہندوستان میں ظہور میں آرہی تھی اس سے بالاتر صلح جوئی کا قیاس ہی نہیں کیا جاسکتا آیندہ ہندوستان میں جبکہ سب مذہبوں کو پوری آزادی ہوگی ان لوگوں کو جو اس ملک یا قوم میں قومیت قایم کرنا چاہتے ہیں یہی اونچا معیار ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا ہوگا مجھے معلوم ہے کہ ہمعصر دکھنی فقرا کا کلام بھی انھی خیالات سے پر تھا۔

ہندوؤں میں ذات پات | بے شبہ اس قومی صلح جوئی میں ذات پات یا چھوت اچھوت کے امتیاز کا کوئی گذر نہیں اس بارے میں مجھے آپ کا وقت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میں یہ کہدینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی باتوں میں کھری اور قضایات کہنا ہی افضل ہو سکتا ہے۔ اچھے سے اچھا پھل بھی اگر بہت دیر تک رکھا جائے تو سڑنے لگتا ہے اور آخر میں بجائے آب حیات کے زہر ہلاہل کا کام کرنے لگتا ہے۔ روح لافانی ہے مگر جسم فانی ہے اسی طرح اصول دین باقی اور حقیقی ہے لیکن جن انسانی جماعتوں میں اسے مقید کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ نہ رہنے والی فانی اور تغیر پذیر ہیں ہندوؤں میں ذات پات کا امتیاز کسی وقت میں کسی ابتدائی شکل میں سوسائٹی کے نظام کا کتنا ہی مناسب عمل اور خوبصورت کیوں نہ رہا ہو اب صدیوں سے ایک خطرناک مرض کی طرح اس ملک کو کمل فنا کی طرف لئے جارہا ہے۔

اس زمانہ کی اس زہریلی رسم کو ایک بار جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا ہوگا میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس بارے میں کسی کے ساتھ کسی طرح کی زبردستی کریں میں صرف اس معیار کو آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو ہر ایسے ہندوستانی کے سامنے رہنا چاہئے جو اس ملک میں قومیت یا قوم پرستی قایم کرنے میں حصہ لینا

چاہتا ہے۔ سبرامینہ بھارتی انجہانی کے تامل زبان کے بھجن اس بارے میں سونے کے حروف میں لکھ لینے کے قابل ہیں۔ میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ بھی قوم پرستی قایم کرنے میں حصہ لینا چاہتے ہیں ان کا دل ان کا مزاج ان کا قول ان کا سلوک ہر قسم کی فرقہ پرستی صوبہ پرستی اور ذات پات تینوں سے اوپر ہونا چاہئے جسے اس ہندوستانیت اس طرح کے قومی اتحاد یا اس قسم کی مکمل صلح جوئی میں اعتقاد نہیں جس کا خیال اور جس کا سلوک اس قسم کی تنگدلی سے اوپر نہیں اٹھا وہ قومیت کے قیام میں ارج ہو سکتا ہے معاون نہیں ہو سکتا اور قومی زبان کا قیام قومیت کے قیام کا صرف ایک پہلو ہے۔

ہندی اُردو اور ہندوستانی آخر میں تھوڑے سے الفاظ ہندی بھاشا اور ہندی اُردو کے جھگڑے کے بارے میں اور کہنا چاہوں گا میری خوش قسمتی ہے مجھ سے پہلے کے چاروں سقرروں نے اور خاص کر پنڈت رام نرلیش جی ترپاٹھی نے بڑی خوبی کے ساتھ اس مضمون کو آپ کے سامنے رکھا ہے جس زبان کو آج کل ہندی بھاشا کہتے ہیں اس کی پیدائش اس ملک میں مسلمانوں کے زمانہ میں ہوئی مسلمانوں نے ہی اس کا نام ہندی رکھا امیر خسرو اور ملک محمد جائسی اس کے شروع کے شاعر مسلمان ہی تھے مسلمانوں ہی کی حکومت کے زمانہ میں اور خاص کر دکھن میں بہمنی اور آخر میں مغل سلطنت میں ہی اس نے سب سے زیادہ ترقی کی اُردو نام ہندو اور مسلمان دونوں نے بہت بعد میں استعمال کرنا شروع کیا اگر ہم رام اور رحمن دونوں ناموں کے پیچھے ایک ہی مالک کل کو دیکھ سکتے ہیں تو کوئی جرم نہیں کہ ہندی ہندوستانی اور اُردو اس تثلیث میں بھی بس ایک ہی زبان کیوں نہ دکھائی پڑے حقیقت میں ہندی اور اُردو دو زبانیں نہیں ہیں زیادہ سے زیادہ دو شکلیں ہیں خسرو اور جائسی، غالب ذوق میر اور درد اسی طرح ہماری قومی زبان کی تعمیر کرنے والوں میں سے اور ہماری قومی جائداد ہیں جیسے تلسی اور سورداس، جیون اور پنتھو، گردھر اور کیشو۔ اگر عثمانیہ یونیورسٹی والوں کی اُردو کو ترقی دینے کی کوشش میں آپ کی اپنی ہی کوشش کا عکس اپنے لئے ایک مبارک مدد دکھائی نہیں دیتی اگر انھیں اسی طرح آپ کی کوشش سے محبت اور ہمدردی نہیں ہوتی اس میں اپنا پن محسوس نہیں ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی قومی زبان کی فکر سے ابھی آپ دونوں کے منہ پھرے ہوئے ہیں۔

جو زبان آپ کے سامنے بول رہا ہوں وہ ابھی قومی زبان نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اس کی طرف ایک

ادھوری اور ناکام کوشش سے ہماری قومی زبان ابھی دھیرے دھیرے قائم ہو رہی ہے نہ سنسکرت بھری ہندی ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے اور نہ وہ فارسی عربی بھری اُردو جو بڑے بڑے شہروں سے آگے نہیں دھنس سکتی ہماری آیندہ قومی زبان میں سنسکرت فارسی اور عربی کے مروجہ لفظوں اور محاوروں کے ساتھ ساتھ تامل تیلیگو، گجراتی بنگالی وغیرہ صوبجاتی زبانوں کے بہت سے لفظ اور محاورات اور انگریزی کے بھی بہت سے الفاظ اور محاورے گنگا جمنا سنگتی کی طرح ملے ہوئے ہوں گے۔

شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ جب کہ ایک طرف ہندی میں بہت زیادہ سنسکرت اور اُردو میں عربی فارسی الفاظ بھرنے کی غلط کوشش ہو رہی ہے دوسری طرف ایک آسان عام فہم مشترکہ زبان کی طرف چلنے کی کوشش بھی دونوں طرف جاری ہے اُردو کے رسالوں میں اکثر اس مضمون پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں مثال کے طور پر اسی سال جولائی کے زمانہ میں جودھ پور سے مرزا عظیم بیگ نے اُردو ہندی کا تصفیہ کے عنوان سے ایک عالمانہ مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے اُردو کے اندر نئے عربی الفاظ ٹھونسے جانے کی روش کی ملامت کی ہے اور ہندو مسلمانوں کی ایک آسان عام فہم مشترک زبان بنائے جانے پر زور دیا ہے۔

مرزا عظیم بیگ لکھتے ہیں ،۔

میری دانست میں اُردو ہندی کا سوال پیدا کرنے والے وہی لوگ ہیں جو اپنے کو اُردو ہندی کا ادیب کہتے ہیں۔ خطا اُردو اور ہندی ادیبوں (دونوں) کی ہے مگر زیادہ سرزنش کے قابل اُردو کے حامی خصوصاً ہمارے مولوی صاحبان ہیں گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں اُردو کے حامیوں بالخصوص مسلمانوں نے اُردو میں اتنے نئے عربی الفاظ ٹھونس دئے ہیں کہ ہندوؤں کو اُردو پڑھنے میں بڑی دقت ہوگئی ہے اُن لفظوں کو جو عرصہ دراز سے اُردو میں داخل ہو گئے تھے نکال کر پھینک دیا اور ان کے بدلے عربی الفاظ ٹھونس دئے مثلاً خزانچی کے بجائے خازن لکھنے لگے مہر کی جمع مہریں کے بجائے مواہیر ہوگئی ہے ایرشپ کے بجائے ہوائی جہاز ناپسند طیارہ زیادہ پسند ہے اب یہ بتائیے کہ عام فہم اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کے مروجہ لفظوں کو نکال کر عربی لفظ ٹھونس کر آپ نے ہندوؤں کو ملک کی واحد مشترکہ زبان سمجھنے سے کیوں محروم کر دیا میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اصل روگ ذہنیت کا اور واقعی ماتم ضد اور تعصب کا ہے

آج کل ہر اُردو کا ادیب ٹھیٹھ عربی ترکیبوں پر فدا اور فنا ہے ذہنیت بگڑی ہوئی ہے ہندو در کنار خود مسلمان
کے لئے اُردو وبالِ جان بنائی جا رہی ہے۔

لازمی نتیجہ اس زبان کی پیدائش ہے جس کو ہندوستانی کہتے ہیں در اصل یہ زبان پیدا ہو چکی ہے مجھے تو یہی
زبان مستقبل میں ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار پاتی نظر آتی ہے اس میں نہ عربی کے ثقیل لفظ ہیں اور نہ
سنسکرت کے موجودہ اردو اور موجودہ ہندی ادیب دونوں اسے غلط کہیں گے مگر دونوں اسے سمجھ
سکیں گے اس میں اُردو داں اور ہندی داں دونوں کے لئے یکساں سہولت ہوگی یہ در خیبر سے راس
کماری تک بولی اور سمجھی جائے گی دکن میں دکھنی کا مقامی اثر قبول کرے گی پنجاب میں پنجابی کا اور بنگال
میں بنگالی کا۔

اس آسان عام فہم زبان میں لکھنے کی کوشش بھی اُردو کے کچھ صاحب دل مسلمان مصنفوں کی
طرف سے ہو رہی ہے، ستمبر کے نیرنگ خیال میں فرید جعفری کے قلم سے 'پریم کا بندھن' عنوان سے ایک
نفیس کہانی چھپی ہے جس کی شروع کی چار سطریں میں زبان کے نمونے کے طور پر نیچے نقل کرتا ہوں۔

کنول اور پریم پڑوسی تھے دونوں گھرانوں میں بھائی چارہ تھا ایک تو ہندوؤں میں پردے کی
رسم یوں بھی نہیں ہے پھر کنول اور پریم تو بچپن کے ساتھی تھے بچپن ساتھ گذرا لڑکپن ساتھ گیا جوانی کے
جھولے میں بھی دونوں ساتھ ہی بیٹھے میونسپلٹی کے مکتب سے لے کر مڈل تک دونوں ہم جماعت رہے پھر
پریم الٰہ آباد چلا گیا اور وہاں جا کر انگریزی اسکول میں داخل ہو گیا کنول گھر میں بٹھا دی گئی یہ دوری بھی
کہنے ہی کو تھی ادھر سنیچر آیا ادھر شام کی لاری سے پریم بابو پھول پور موجود کنول بھی راہ دیکھا کرتی پریم
کو دیکھتے ہی وہ کھل کھلا پڑی۔ وغیرہ

شروع سے آخر تک تمام کہانی اسی زبان میں بلکہ اس سے بھی آسان خوبصورت اور بھلی
زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ ہندی ہے یا اُردو۔

اکتوبر کے نیرنگ خیال میں 'متوالے تیرے نین' کے عنوان سے ایک اُردو نظم ایک مسلمان شاعر
باسط بسوانی کی لکھی ہوئی چھپی ہے شاعری غزل کے انداز کی ہے۔ لیکن صرف زبان کا نمونہ دکھلانے

کے لئے میں اسے نیچے نقل کرتا ہوں۔

متوالے تیرے نین سکھی متوالے تیرے نین

سندر چھب دکھلانے والی۔ دل پر آفت ڈھانے والی۔ آنکھ چرا کر جانے والی۔ تیر چلا کر برمانے والی

نینوں کی یہ سین سکھی متوالے تیرے نین

صورت تیری بھولی بھالی۔ زلفیں تیری کالی کالی۔ ناگن چنچل او متوالی۔ دیکھ رسیلی چتون والی

ہر دے ناہیں چین سکھی متوالے تیرے نین

باسط چاہے درشن تیرے۔ کون جتن سے تجھکو ہیرے۔ تیری گلی کے ایسے پھیرے کرتا ہے وہ سانجھ سویرے

تڑپت ہے دن رین سکھی متوالے تیرے نین

یہ اردو ہے یا ہندی۔

اسی شاعر کی ایک اور نظم۔ کوئی نہیں ہے غیر' کے عنوان سے نومبر کے نیرنگ خیال میں شایع ہوئی ہے۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو ہندوستان بھر کے سب اخباروں اور رسالوں میں یہ نظم نقل ہونی چاہئے نظم یہ ہے:۔

کوئی نہیں ہے غیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

ہندو مسلم سکھ عیسائی ؛ دیکھ سبھی ہیں بھائی بھائی

بھارت ماتا سب کی ماتا ؛ گنگا دیوی سب کی مائی

مت رکھ من میں بیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

بھارت کے سب رہنے والے ؛ کیسے گورے کیسے کالے

چھوت اچھوت کے جھگڑے پالے ؛ پڑ گئے جس سے جان کے لالے

کاہے کا یہ بیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

رام سمجھ رحمٰن سمجھ لے ؛ دھرم سمجھ ایمان سمجھ لے

مسجد کیسی مندر کیسا ؛ ایشور کا استھان سمجھ لے

کر دونوں کی سیر   بابا کوئی نہیں ہے غیر

سوچ کا کس پن میں بابا ٭ کیوں بیٹھا ہے بن میں بابا

خاک ملی کیوں تن میں بابا ٭ ڈھونڈھ لے اسکو من میں بابا

مانگ سبھوں کی خیر   بابا کوئی نہیں ہے غیر

دھن دولت میں من اٹکایا ٭ کاہے باسط جی للچایا

سب سے نرالی تیری مایا ٭ کرتا ہے کیوں اپنا پرایا

ناحق کا یہ بیر   بابا کوئی نہیں ہے غیر

ذرا غور کیجئے کہ یہ نظم لاہور سے نکلنے والے اردو کے ایک مسلمان اخبار میں شائع ہوئی ہے اور آج کل کے ایک مسلمان اردو شاعر کے قلم سے نکلی ہے۔

ہماری امید | بہت دنوں سے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے کو ہم آغوش کرنے کے لئے امنڈ رہے ہیں صرف آپس کی غلط فہمیاں تعصب اور تنگدلی کی ہوائیں حقیر دنیاوی خودغرضیوں کے جھونکے انہیں ملنے نہیں دیتے لیکن کب تک ہندوستان کا دکھا ہوا دل خون کے آنسو بہا کر دریافت کر رہا ہے۔ کب تک بھائی بھائی کے خون کا پیاسا رہے گا یہ قوم فروشی کا بازار کب تک گرم رہے گا ہندوستان کے ہندو اور مسلمانو! کب تک تاریخ کی پھیکی روشنی میں ادراک اور اعتماد دونوں اندر سے جواب دے رہے ہیں۔ کسی کی حالت ہمیشہ ایک سی نہیں رہی ہے یہ دلسوز تماشا بھی چند روز کا ہے آخر دل سے دل کو راہ ہے بہت دنوں سے رکے ہوئے دریا پھر زوروں کے ساتھ ملیں گے پھر ایک بار متفقہ ہندوستانیت کے سنگم سے زوروں کے ساتھ محبت کی دھارا بہے گی اور اس بدقسمت ملک کے بھی دن پھریں گے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ایک قومی زبان کی ضرورت کو کسی سے کم محسوس نہیں کرتا آپ کی کوشش اس بارے میں نہایت مبارک ہے اسی طرح، اور اتنی ہی مبارک کوشش میری رائے میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد جیسی انجمنوں کی ہے خدا کرے آپ دونوں کو دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل ہو اور دونوں پوری طرح اس بات کو دیکھیں کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں مخالف نہیں۔ بھائی کنھیا لال جی منشی پریم چند

جی کی جد وجہد سے اس بارے میں بہت کچھ امید ہو سکتی ہے۔

ساتھ ہی ہمیں کبھی بھی ذریعہ یا وسیلہ کو آخری مقصد نہ مان بیٹھنا چاہئے اگر ہم اوپری صلح جویانہ قومی اور محبت آمیز تاثرات سے لبریز ہو کر اس بارے میں آگے نہیں بڑھ سکتے تو ہمارے قدم رک جائیں تو بہتر ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں مرکزی حکومت کے احکام قریب قریب ۱۹ زبانوں میں شایع ہوتے ہیں اور اُن میں سے کچھ کے رسم الخط بھی الگ الگ ہیں سوئزرلینڈ جیسے چھوٹے سے اور معیاری آزادی حاصل کئے ہوئے ملک میں چار زبانیں سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں، روس میں تو اب الگ الگ زبانوں کے سہارے پر ہی ایک مشترکہ سوویٹ حکومت کا سسٹم چلایا جا رہا ہے انگریزی دفتروں اور دیسی راج درباروں میں اُردو کو نکال کر ہندی کرنے اور ہندی کو نکال کر اُردو کرنے کی کوششیں صرف ہماری تنگدلی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں اور قومیت سوز ہیں اس طرح کی کوشش خاصکر صوبجات میں کن کے اشاروں سے شروع ہوئیں کون پردہ کے پیچھے ہندو اور مسلم دونوں کٹھ پتلیوں کے تار کھینچنے والے تھے ان کوششوں کی وجہ سے کس کو حقیقی فائدہ اور کس کے گھروں میں گھی کے چراغ جلے۔ اس المناک کہانی میں میں پڑنا نہیں چاہتا غیروں کو الزام دینا بے معنی ہے ہمیں اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے پچھلے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اگر ہم سچ مچ ہندوستانی قومیت کے پجاری ہیں اور ہمارے دلوں میں اس کا ایمان ہے تو اسی کے مطابق ہمیں آیندہ کے لئے اپنا راستہ طے کرنا چاہئے۔

رسم الخط کا سوال زبان سے ایک الگ سوال ہے ٹھیک ٹھیک لکھنے اور ٹھیک ٹھیک پڑھنے کے لئے دیوناگری رسم الخط زیادہ موزوں ہے متعدد صوبوں کے لوگ اسے آسانی سے صوبجاتی رسم الخط کی جگہ بھی دے سکتے ہیں فارسی یعنی اُردو رسم الخط ہمارے لئے ایک بڑے خوبصورت شارٹ ہینڈ کا کام دے سکتی ہے ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ایشیا کی سیاسی حالت پر نظر رکھتے ہوئے کم از کم آیندہ چند صدیوں کے لئے ہمارے ملک کی قسمت چین جاپان اور کوریا کی قسمت کے ساتھ اس طرح وابستہ نہیں ہے جس طرح افغانستان ایران اور ترکی کی قسمتوں کے ساتھ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت کے مذہبی پہلو کو چھوڑ کر اس کا ایک زبردست سیاسی پہلو تھا جسے ہم نے پوری طرح نہیں سمجھا۔ امان اللہ خاں رضا شاہ پہلوی اور

کمال پاشا کو صرف ہماری اپنی خود غرضی کی نظر سے بھی ہندوستانیوں کے دلوں میں جو جگہ ملنی چاہئے وہ ابھی تک نہیں ملی یہ سوال ذرا گہرا اور سنجیدہ ہے۔ بمبئی سے جاتے وقت ہر ایک ہندوستانی کے محبوب امان اللہ خاں نے مہاتما گاندھی کا گرمجوشی اور محبت آمیز لفظوں کا استعمال کیا تھا وہ صرف رسمی اُدب نہ تھے بلکہ ان لفظوں کے پس پشت ایک گہری سیاسی حقیقت اور اپنی جان پر کھیلنے والا ایک بہادر دل تھا۔ فارسی رسم الخط ابھی بہت دنوں تک ہمیں مغربی ایشیا کے تحریکوں کو سمجھنے اُن سے اپنا ناطہ جوڑے رکھنے اور اسے زیادہ مضبوط کرنے میں مدد دے گی اور اگر آخر میں ایک قومی زبان کے لئے ایک رسم الخط کا ہونا ضروری ہے تو یہ سوال بھی اگر کبھی حل ہو سکتا ہے تو باہمی اعتماد اور ایک دوسرے کی محبت پر سے مضبوط ہو جانے پر ہو سکتا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے کسی زمانہ میں یہ صلاح دی تھی کہ ہر ہندو اور ہر مسلمان کو ناگری رسم الخط اور اُردو رسم الخط دونوں سیکھنے چاہئیں کسی بھی معمولی سے معمولی دماغ والے انسان کے لئے یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں ہے خاص طور پر آپ لوگوں سے میری یہ سفارش ہے کہ اگر آپ لوگ اپنے ملک کی اور باہر کی اسلامی تاریخ جاننا چاہتے ہیں اگر آپ مسلم صوفیوں اور اُردو شاعروں کے خیالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ نئی زمانہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خیالات اور جذبات سے واقف رہیں اور دونوں میں محبت قایم ہو تو آپ میں سے جتنے بھی ہو سکیں اور خاص کر وہ سب بھائی بہن جن کا مقصد قومی زبان کے قایم کرنے میں حصہ لینا ہے جتنی جلدی ہو سکے اُردو رسم الخط کا علم بھی حاصل کر لیں اور اُردو ادب سے بھی واقفیت حاصل کریں۔

میں نے آپ کا بہت وقت لیا جس محبت اور سکون کے ساتھ آپ نے میری اس زیادتی کو برداشت کیا اس کے لئے میں آپ کا نہایت ممنون ہوں۔

دکن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کام اس کے اصولوں اس کے طریقوں اور اس کے لائق کارکنوں سے میں خوب اچھی طرح واقف ہوں میرے دل میں آپ کی اور آپ کے کام کی گہری عزت ہے میں قومیت کے قیام کے معدودے چند سچے تعمیری کاموں میں عظیم سے عظیم اور پاک سے پاک کاموں میں آپ کے کام

[illegible]

تصویریں ہیں۔ پھر میں منشی صاحب سے کہتا، "منشی صاحب! آپ کا یہ لڑکا ایک جوہرِ قابل ہے۔ اس کی ہر بات اور ہر انداز سے ایک درخشاں مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ اگر اس کو مناسب تربیت اور صحیح تعلیم نصیب ہوئی تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا بن جائے گا۔" منشی صاحب کہتے، "بھئی اگر یہ بات ہے تو میں اس کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ جس طرح چاہو پڑھاؤ لکھاؤ، ورنہ مجھے تو اس شہدے میں کھیل کود، شرارت اور گستاخی کی قابلیت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔" اس کے جواب میں میں بچوں کی نفسیات پر ایک طویل اور مدلل تقریر کرتا اور منشی صاحب کو سمجھاتا کہ جس کو ہم لوگ کھیل کود، شرارت اور گستاخی کی قابلیت کہتے ہیں وہ بڑی قابلِ قدر چیز ہے بشرطیکہ اس سے فایدہ اٹھایا جائے۔

جب اقبال آٹھ برس کا ہو گیا تو اسے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس بات کو اب تقریباً تین مہینے ہو گئے ہیں اور وہ برابر اسکول آتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اسکول میں داخل ہو کر اس نے (غیر شعوری طور پر) محسوس کیا ہوگا کہ یہ دنیا اس دنیا سے بہت مختلف ہے جس میں میں نے اب تک اپنی زندگی گزاری ہے۔ یہاں متواتر پانچ گھنٹے پاؤں توڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی اور حرکت کا نہیں، جمود کا سبق دیا جاتا ہے۔ فکر کی آزادی پر تعصب اور تنگ نظری کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ جو طالب علم کہے وہ غلط، جو استاد کہے وہ صحیح۔ بے تکلفی کے ساتھ بولنے کی اجازت نہیں۔ اگر تم کہنا چاہتے ہو تو منہ بند رکھو اور صرف ہاتھ اٹھالو۔ اجازت مل جائے تو بولو، ورنہ دل کی بات دل ہی میں رہنے دو۔ تمہاری مرضی کو کسی کام میں دخل نہیں۔ جو استاد کہے وہ کرو۔ اور جس طرح کہے اس طرح کرو۔ اس نے سوچا ہوگا کہ مزے مزے کی باتیں، پرلطف کہانیاں، دل بہلانے والے مشاغل، یعنی وہ تمام چیزیں جو باہر کی دنیا میں مجھے ہر وقت میسر تھیں یہاں نصیب نہیں۔ یہاں تو کتابوں سے سر پھوڑنا پڑتا ہے، ان کتابوں سے جن میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور کوئی مزے کی بات نہیں ہوتی۔ مہمل الفاظ کو رٹنا پڑتا ہے۔ صوبوں، کمشنریوں اور ضلعوں کے بے معنی ناموں کو حفظ کرنا پڑتا ہے۔ اور جب حفظ نہیں ہو سکتے تو استاد کے بید پڑتے ہیں۔ بید کی ضرب سے بے حد تکلیف ہوتی ہے، جان سی نکلنے لگتی ہے، کئی کئی

دن تک یہ مار یاد رہتی ہے۔ یہاں، اس اسکول کے اندر، یہی سب ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نفرت انگیز کتابیں، بے لطف اسباق، تنگ و تاریک کمرے، غراتے ہوئے استاد، اور ان کے خوفناک بید، ان مصیبتوں کے سوا یہاں کوئی راحت نہیں۔ اور اس چار دیواری کے باہر؟ اس کے باہر کھلی ہوئی فضا ہے، کشادہ میدان ہیں، لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں، طرح طرح کے کھیل ہیں، ہنسی ہنسی کی باتیں ہیں، دوستوں کی محبت ہے، ماں باپ کا پیار ہے۔

ہاں میرا خیال ہے کہ اقبال نے اسکول میں داخل ہونے کے بعد یہ اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں محسوس کی ہوں گی اور دیکھی ہوں گی۔ اور ان سب باتوں سے اس کا ذہن متاثر ہوا ہوگا خوفناک طریقے پر متاثر ہوا ہوگا۔

چنانچہ اب ——— اب جب کبھی میری اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، اسکول میں یا اسکول سے باہر، تو وہ شرما کر، جھینپ کر، خوفزدہ انداز میں، دور سے سلام کرتا ہے۔ قریب آتے ہوئے جھجکتا ہے، بات کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ شوخی، شرارت، چلبلا پن، بے باکی، اور وہ تمام اوصاف جو تین ماہ پہلے تک اس میں شدت کے ساتھ پائے جاتے تھے اس کے اندر سے غائب ہو چکے ہیں۔

اور میں یہ سوچتا ہوں کہ اسکول نے اس لڑکے کو بنا دیا یا بگاڑ دیا، اس کی زندگی سنوار دی یا برباد کر دی، اس کو تہذیب و علم کی دولت بخشی یا اس کی شخصیت کو کچل ڈالا اور فنا کر دیا۔

ہندوستانی ڈراما

(دہلی) آل انڈیا براڈکاسٹنگ اسٹیشن کے کارکنوں کی اجازت سے پروفیسر مجیب کا وہ مضمون درج کرتے ہیں جو جناب موصوف نے براڈکاسٹ کیا تھا

آدمی دنیا میں آیا تو تماشے کا چسکا اپنے ساتھ لایا۔ پہلے جب اسے بولنا بھی اچھی طرح نہیں آیا تھا وہ اپنے من کی موجوں کو ایک بھانڈ اور نقل میں ظاہر کرتا تھا۔ جیسے جیسے اس کی قابلیت بڑھتی گئی اس کے حوصلے بھی بڑھتے گئے۔ اس کی ایک بھانڈ ترقی کرکے ناچ بن گئی۔ اور نقل کرنے کی خواہش نے آخر میں ناٹک کی صورت پائی۔ آدمی کا مذاق بھی ساتھ ہی بدلتا رہا۔ اور جب دنیا میں ناٹک کا رواج ہوا۔ آدمی کا حوصلہ خالی کرتب دکھانا نہیں تھا بلکہ آپ بیتی سنانا۔ اور اس طرح ناٹک کو اپنے دل کا آئینہ بنانا۔ آدمی کو آدمی کے مرتبے پر پہنچانے میں سب سے زیادہ ہاتھ مذہب یا دھرم کا رہا ہے۔ اور ناچ اور ناٹک شروع میں پوجا پرستش کے طریقے تھے۔ پھر وہ دھرم سے الگ ہوتے گئے۔ اور آخر میں ایسا وقت آیا جب لوگ انھیں مہا پاپ سمجھنے لگے۔ خیر اس سے ہمیں مطلب نہیں مطلب ہمیں اس سے ہے۔ کہ ناٹک یا ڈراما اس وقت ہمیں دنیا کی جیتی جاگتی تصویریں دکھا کر اپنی زندگی کو سمجھنا اس کی قدر کرنا اور اسے سدھارنا سکھاتا ہے۔ لیکن آدمی کے لئے سب سے دلچسپ تماشا اس کا اپنا دل اور اس دل کی کیفیتیں ہوتی ہیں۔ انھیں کو وہ ہر طرف اور ہر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے زندگی کی جیسی بھی تصویر دکھائی جائے ہمیں سب سے زیادہ خیال اس کا رکھنا چاہئے کہ ہم آدمی کو اس کی اپنی صورت دکھا رہے ہیں۔ ہندوستانی ناٹک کی سب سے پرانی اور سدا بہار شکل رام لیلا جیسے مذہبی تہوار ہیں۔ اور اس قسم کے ڈرامے ہمارے یہاں اب تک موجود ہیں۔ لیکن ناٹک کی دوسری شکل جسے کالی داس اور بھوبھوتی نے کمال کو پہنچایا اب دیکھنے میں نہیں آتی۔ اس لئے کہ قلم نے اس کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس طرح ناٹک کی تیسری شکل بھی اب مٹتی جا رہی ہے۔ ہمارے دیس کے باہر تو وہ اب بھی بہت مشہور ہے۔ جرمنی اور فرانس میں لوگ اب بھی ہندوستانیوں سے اس کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم خود اس کی

قدر نہیں کرتے ۔ شاید اس سبب سے کہ ہم بدیسی زبان بولتے اور بدیسی کپڑے پہنتے پہنتے مذاق اور پسند میں بھی بدیسی ہوگئے ہیں ۔ اور ناٹک کا یہ تیسرا روپ ٹھیٹھ دیسی ہے بھلا بتائیے آپ کو بندر کا تماشہ دیکھے کتنے برس ہوگئے ؟ آپ کہیں گے کہ اب بندر والے دیکھنے ہی میں نہیں آتے میں بھی یہی کہتا ہوں اب یہ بیچارے آئیں تو کس اُمید پر ؟ آپ خود ہی سوچئے کہاں صاحب بہادر اور کہاں ڈگڈگی ، کہاں آج کل کے قیمتی فراک اور ساریاں ، کہاں وہ سیدھی سادی دیہات کی گھگریا ۔ کہاں آج کل کے شاندار سینما اور کہاں وہ پیڑ اور سڑک کا کنارہ ، کہاں آج کل کے بکنگ آفس اور ٹکٹ اور کہاں بندر والے کی میلی ٹوپی کہ دو پیسے ڈال دیجئے تو حضور سرکار بھگوان کہلائیے ۔ اور کچھ نہ دیجئے تو بھی کہا سنا معاف ۔ اور پھر بیچاری بندریا کی ہستی کیا ۔ یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے کہ آدمیوں کی سی صورت ہے ۔ جو اسے سدھاتا اور ناٹک کے گُر سکھاتا ہے ۔ وہ بھی ایک گنوار ہی ہوتا ہے ۔ نہیں تو یہ کہنے کو ہو جاتا کہ خیر ، صورت شکل کچھ نہیں ، تعلیم تو اچھی ہے ۔ لیکن یاد رکھئے کہ بندر بندریا کے ناچ تماشے میں سینکڑوں پتے کی باتیں ہوتی ہیں ۔ جو اب تک ہمارے ڈراما اور فلم میں نہیں ملتی ہیں ۔ یورپ کے جن پنڈتوں نے اس میں سوچ بچار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مرد عورت کا سب سے پرانا اور اچھا رشتہ وہی ہے جو اس تماشے میں دکھایا جاتا ہے ۔ اور اگر ناٹک کا مقصد ہمیں زندگی کے بھید بتانا ہے تو اسے اپنی نظر مرد عورت کے رشتے کے اسی پہلو پر جمانا چاہئے جو اس ٹھیٹھ دیسی تماشے میں نہایت مزیدار طریقہ پر پیش کیا جاتا ہے ۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے ۔ کہ بندریا کوئی خوبصورت پری ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی ۔ اور بندر کوئی سمور راجہ یا کروڑپتی نہیں ٹھہرایا جاتا ۔ یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہوتی ہے ۔ کہ دونوں معمولی بندر ہیں اور معمولی آدمیوں کا پارٹ کر رہے ہیں ۔ پھر بھی بندر والا ہمیں جو کچھ دکھاتا ہے ۔ وہ بہت دلچسپ اور زندگی کا ایک سچا نقشہ ہوتا ہے ۔ اس تماشے میں ایک اور بھی بڑا بھید ہوتا ہے اس میں کوئی مسخرہ کوئی پاگل ۔ کوئی افیمچی نہیں ہوتا ۔ لیکن اسے دیکھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے ۔ اور ایسی ہنسی بڑی مفید ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ ہم اپنے اوپر ہنستے ہیں ۔ اور زندگی میں مزا اسی کو آتا ہے جو کبھی اپنے اوپر بھی ہنس لیا کرے ۔

اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ڈراما لکھنے والوں اور ہماری فلم کی کمپنیوں کو اس پرانے اُستاد یعنی بندر والے سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ آج کل ہندوستان کی کایا پلٹ رہی ہے۔ ہر طرف آزادی اور انقلاب کا شور سنائی دیتا ہے۔ اور ہمارے نوجوان پرانی زندگی کا تختہ پلٹ دینے پر تلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری ناؤ لنگر توڑ کر دریا کے کنارے سے منجدھار میں پہنچ گئی ہے۔ اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں جا کر پار لگے گی۔ ڈرامہ لکھنے والے کے لئے ہماری بدلتی زندگی رنگ برنگی تصویروں کا ایک خزانہ ہے جو کسی طرح خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ خزانہ اسی وقت کھلے گا جب ہم اپنے اسٹیج پر سے کوڑا کرکٹ ہٹا دیں۔ اگر ہم کو ہنسی مذاق پسند ہے تو ہمیں چاہئے کہ پیشہ ور مسخروں کو جو اپنے سارے کرتب دکھا چکے ہیں۔ رخصت کریں۔ پاگلوں کو پاگل خانے اور اچیوں کو چنڈو خانے کا رستہ بتا دیں۔ اور اپنی نئی زندگی میں دلچسپی کا نیا سامان تلاش کریں ہم میں سے جو عاشق مزاج ہیں انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ دل کھونا اور دل لینا شام کی سیر کی طرح روز کی تفریح نہیں ہے اور سچا عشق اُسی وقت ظاہر ہوگا جب ہم یہ دکھانا چھوڑ دیں کہ حسین عورتیں عیاشوں کے پنجے میں کیسے گرفتار ہوتی ہیں اور جوان مرد شریف ڈاکو بن کر اور لکڑی کی تلواریں چلا کر انھیں کس طرح چھڑاتے ہیں فوجداری کی وارداتوں کے ساتھ ہمیں ان قصّوں کو بھی کم کر دینا چاہئے جن میں نئے فیشن کے مطابق ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنے والا عشق دکھایا جاتا ہے۔ اور جن میں کبھی کبھی تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ کسی بے چارے غریب کو پکڑ کر زبردستی عاشق بنایا گیا ہے۔ میں نے دو تین مہینے ہوئے ایک فلم دیکھا تھا۔ جس میں ایک صاحب عاشق تو ہو گئے تھے مگر شروع سے آخیر تک یہی سوچتے اور پوچھتے رہے کہ بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں جان اور مال سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہوں مگر بتاؤ میں کیا کروں؟ ایسی بے بسی سے تو بہتر ہے کہ ہم اس کوچے میں ذرا ہوشیاری سے قدم رکھیں اور اپنے دل سے یہ خیال بھی نکال دیں کہ شادی کے بعد زندگی کی تمام دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ بندر بندریا کے تماشے میں جو کچھ ہوتا تھا شادی کے بعد ہوتا تھا۔ اور ان میاں بیوی کا باری باری سے روٹھنا نخرے کرنا۔ اور پھر مل جانا ایسا مضمون تھا جو ہر مرتبہ نیا اور انوکھا معلوم ہوتا تھا۔

لیکن اس وقت یہ کافی نہیں ہوگا کہ ہم اگلے زمانے کے ہندوستانی یا اپنے زمانے کے یورپ کے بازاری مذاق کی نقل کرنا چھوڑ دیں۔ ڈراما کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہم کو ہماری زندگی سمجھائے۔ اس لئے اس میں کوئی ایسی باتیں نہ ہونا چاہئیں جو ناممکن اور عقل کے خلاف ہوں۔ دکھانے کو تو ہم دکھا سکتے ہیں کہ ایک پیر یا جوگی کی دعا سے چاندنی چوک کے مالدار تاجروں کے بکس کھل گئے۔ ان کے اندر کے روپے پیسے پھرا مار کر اڑے اور فقیروں کی جھولیوں میں پہنچ گئے۔ مگر یہ سوشلسٹ انقلاب نہیں ہوگا نہ انصاف کرنے کا ایک طریقہ۔ یہ اپنی آنکھوں میں ایک دھول جھونکنا ہے۔ اسی طرح ہمیں مبالغہ یا بات کو بہت زیادہ بڑھانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔ اور اگر ہمیں اس کی عادت ہوگئی تو پھر ہم کھری اور سچی بات کی قدر کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ڈراما کے قصے کو ایسا ہونا چاہئے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں کھپ جائے، پیوند نہ معلوم ہو۔ اور کسی نہ کسی طرح سے ہم سب کی آپ بیتی کہا جاسکے۔ سچے ڈراما اور ان واقعات میں جو ہم روز سنتے یا دیکھتے ہیں بس یہ فرق ہونا چاہئے کہ ایک جگہ بے پرواہی یا خود غرضی کے سبب سے ہماری سمجھ کام نہیں دیتی۔ اور دوسری جگہ ہماری آنکھیں اس طرح کھول دی جاتی ہیں کہ معمولی سے معمولی بات بھی ایک بھید یا ایک اچنبھا یا علم کے ایک خزانے کی کنجی بن جاتی ہے۔

اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ڈراما کو ہم جو شکل دیں وہ ہماری جانی بوجھی ہو۔ ہندوستانی ڈراما میں صرف ہندوستانی زندگی پیش کی جاسکتی ہے اگر ہم یورپ یا کسی خیالی دنیا کا نقشہ اتارنا چاہیں گے تو وہ بہت ٹیڑھا بڑھا ہوگا اور شاید اسے ٹھیک دیکھنے کے لئے ہمیں سر کے بل کھڑا ہونا پڑے۔ اپنی زندگی کی تصویر دکھاتے وقت بھی ہمیں ہر طرح سے مناسبت کا خیال رکھنا چاہئے۔ مکان، رہن سہن، لباس ہر چیز کو ایسا ہونا چاہئے کہ ذرا غور سے دیکھنے والے کا مطلب۔ قصہ کا رنگ اور قصبہ کے اشخاص یا کیریکٹر کی کیفیت اس سے جھلکتی ہو۔ پرستان۔ محل۔ بھڑکیلے کپڑے۔ بناؤ سنگار۔ زیور یہ سب موقع سے دکھائے جاسکتے ہیں۔ ڈراما میں اثر پیدا کرنے کے لئے ان کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اور ان کی بے جا نمائش میں اس کا ڈر رہتا ہے کہ ڈراما کا اصل مطلب نظر سے چھپ جائے گا۔ ڈراما کا سب سے نمائشی اور

لطیف حصہ۔ ڈرامہ کا رس۔ اس کی جان۔ ڈراما کے اشخاص یا کیرکٹر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے
کہ ہیروئن جتنی خوب صورت اور ہیرو جتنا منچلا ہوگا اتنا ہی ڈراما اچھا اور دلچسپ ہوگا۔ آج کل ہم نے چند
ٹائپ' آدمیوں کی چند قسمیں بنائی ہیں۔ اور ڈرامہ میں دکھایا جانا انھی کا حق سمجھتے ہیں۔ ایک دو قسموں کی
طرف میں اشارہ کر چکا ہوں' یعنی وہ خوب صورت لڑکی جسے کوئی بدمعاش پکڑے لے جاتا ہے۔ وہ شریف
ڈاکو جو اسے چھڑاتا ہے۔ وہ لڑکی جو باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتی ہے۔ اور وہ بے چارہ
جو اس کارروائی میں اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی چند قسمیں ہیں۔ مسخرہ۔ ایچی۔
سر پھری سودائی۔ ظالم باپ۔ جوتا اور جھاڑو چلانے والی بیوی اور اس کے حسب حال جوتا کھانے والا شوہر۔
اب ان میں ایک نئی قسم۔ دیش سیوک کی شامل کر دی گئی ہے۔ جو تقریریں کرتا ہے۔ اور اس کے انعام
میں اسے ایک بڑی نیک اور خوب صورت بیوی ملتی ہے۔ کبھی کپڑے اور نام بدل کر یہی تقریریں ایک
دیش سیوک کی زبانی سنا دی جاتی ہیں۔ اب ہم کو سوچنا یہ ہے کہ ہمارے دیس میں کیا جتنے لوگ بستے ہیں
وہ ان قسموں میں سے ایک کا نمونہ ہیں یا یہ تقسیم غلط ہے۔ اور ہندوستانی طبیعت۔ مزاج اور وضع کو
دکھانے کے لئے ہمیں کوئی اور تدبیر کرنا چاہیئے۔ دوسروں کی نسبت میں کہہ نہیں سکتا، لیکن کیرکٹروں
کی جتنی قسمیں میں نے بیان کی ہیں ان میں میں خود کہیں بھی نہیں کھپ سکتا۔ اور اس لئے میں تو یہی کہوں گا
کہ اس تقسیم کو چھوڑ کر ہمیں بیچ بیچ کے ہندوستانیوں اور گھڑے ہوئے کیرکٹروں کی جگہ جیتے جاگتے آدمیوں
کی تصویر اتارنا چاہیئے۔ ڈراما نویس کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ کیرکٹر کو خاص مطلب کے لئے بنائے۔
کیونکہ وہ خدا کی طرح نئے آدمی نہیں پیدا کر سکتا اور ایسے کیرکٹر لکڑی کے کھلونے یا گرامو فون کے ریکارڈ معلوم
ہوں گے۔ اور ڈراما کھلونوں کی دکان یا اسکول کا کلاس روم بن کر رہ جائے گا۔ اصل زندگی کی اس میں
بو باس نہ ہوگی۔ جس طرح ڈراما نویس کا فرض ہے کہ زندہ آدمیوں کو اپنے ڈراما کے کیرکٹر بنائے' ویسے ہی
ایکٹر یا ایکٹریس کا کام ہے۔ کہ ڈراما نویس کی کوشش کو اسٹیج پر کامیاب کر دکھائے اور جو خیال ڈرامہ
نویس کے ذہن میں ہو اس اس کی زندہ تصویر بن جائے۔ یہ کام ڈراما لکھنے سے کچھ کم مشکل نہیں ہے۔
اس لئے کہ ذرا سی غلطی۔ ذرا سا مبالغہ اچھے خاصے کیرکٹر کا خون کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے

ایکٹر عام طور سے اثر پیدا کرنے کی فکر میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اور ان کی ہر بات پر بناوٹ کا شبہ ہوتا ہے۔ وہ چلّاتے بہت ہیں۔ اگر چلّاتے نہیں تو رونے لگتے ہیں۔ اور جہاں نہ چلّانے کا موقع ہوتا ہے۔ نہ رونے کا۔ وہاں وہ ہمارے ریڈیو اسٹیشن کے اناؤنسر صاحب کے لہجے میں بولتے ہیں۔ کہ جو کوئی بھی سنے وہ سمجھ سکے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے میرا مطلب کسی پر اعتراض کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تھوڑے سے وقت میں یہ سمجھانا کہ ہندوستانی ڈراما کو ترقی کرنے کے لئے کون سا رستہ لینا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی صاحب میرے خیالات کو صحیح سمجھتے ہوں تو میں انھیں اجازت دیتا ہوں کہ جہاں ضرورت ہو مناسب اعتراض کریں۔ ہم کو اصل میں ہمیشہ غور کرتے اور اعتراض کرتے رہنا چاہئے۔ مگر انصاف تو یہ ہے کہ ہمارے فلم اور ڈراما نے پچھلے دس بیس سال میں بہت ترقی کی ہے۔ اور بنگال اور گجرات میں دوسرے صوبوں کی رہنمائی کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ناٹک کا رواج پھیل رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ دن بھی بہت جلد آجائے گا جب ہر شہر میں دس سینما ہونے تو ایک تھیٹر بھی ہوگا۔ اور ہونہار ایکٹر اور ایکٹریس وہیں سے شہرت کی سیڑھی پر چڑھنا شروع کریں گی۔ یہاں تک کہ وہ آسمان کے تارے بن جائیں۔

موزہ

(ذیل میں ہم ایک روسی ادیب کے مختصر افسانہ کا ترجمہ لندن کے رسالہ نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن سے لیکر درج کرتے ہیں۔ جس میں عہد روسی دفتریت کا ایک طنزیہ خاکہ پیش کیا گیا ہے۔)

جی ہاں۔ ٹرام کے اندر موزہ کھونے میں لگتا ہی کیا ہے۔ ایک طرف سے لوگوں نے دبایا۔ پیچھے کسی ہٹے کٹے مسٹنڈے نے آپ کے ربر کے موزے کی ایڑی پر اپنا پیر دھر دیا۔ آپ آگے بڑھے اور موزہ غائب! موزہ کھونا یا ٹھوکر کھاکر گرنا ایک ہی سی بات ہے۔ اور صاحب میرا موزہ تو ایسا کچھ چٹ پٹ پیر سے کھنچ گیا کہ مشکل سے ایک مرغ بھی دو چٹکیاں بجا پاتی، نہ کچھ کہہ سکا نہ سن سکا۔

جب ٹرام میں بیٹھا تھا تو دونوں ربر کے موزے موجود تھے، ٹھیک درست۔ مجھے ایسا یاد ہے جیسے ابھی کی بات ہو۔ میں تو جانوں سوار ہوتے وقت میں نے ہاتھ سے چھو کر دیکھ بھی لیا تھا، تھے صاحب موجود تھے۔

مگر ٹرام سے اترا ہوں تو ایک موزہ وہ جو مجھے زیادہ پسند تھا۔ موجود ہے، مگر دوسرا غائب۔ کتاب بھی وہ موجود ہے، پاتا بہ تھا ہے، پتلون، حاضر جناب۔ مگر موزہ، غائب۔ پر کیا کیجئے۔ آپ کچھ ٹرام کے پیچھے دوڑ تو سکتے نہیں۔ ناچار دوسرا موزہ بھی اتارا، اور اسے اخبار میں لپیٹ آگے بڑھا۔ جی میں سوچا" کام ختم کرلوں، تو موزہ کی تلاش کی فکر کروں گا۔ چیز تھی اہم کی چیز، کام کی چیز کو کوئی یوں تو ہاتھ سے دے نہیں دیتا۔ جیسے تیسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔"

کام کر چکا تو تلاش شروع کی۔ پہلے ہی اپنی جان پہچان کے ٹرام چلانے والے سے شروع کیا۔

انتظام ہے! اوہ واہ، کیا لوگ ہیں۔ کیا کیا زحمت انھوں نے اٹھائی، اور سب میرے ایک موزے
کے لئے۔ میں نے ان سے کہا "جیتے جی آپ کا شکر گذار رہوں گا۔ لائیے، تو میں ابھی اسے پہن لوں"
جواب ملا "نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تمھارے نام موزہ نہیں جاری کر سکتے۔ ہمیں کیسے معلوم
ہو کہ تمھارا ہی موزہ کھویا تھا"

میں نے کہا "میں کہتا ہوں! میں نے ہی کھویا تھا۔ میرا ہی ہے"

انھوں نے کہا "بہت ممکن ہے۔ لیکن ہم اسے جاری نہیں کر سکتے۔ ایک صداقت نامہ
بدیں مفاد کہ تم نے ہی یہ موزہ کھویا تھا۔ محلہ کی کمیٹی کا صداقت نامہ لے آؤ تو تمھیں زیادہ دوڑائیں گے
نہیں، مزید ضابطہ کی کارروائی بغیر موزہ تمھارے نام جاری کر دیں گے"

"ارے لوگو" میں نے کہا "معزز ساتھیو، غریب محلہ کی کمیٹی کو اس کی کیا خبر وہ تو واقعہ سے
بالکل ناواقف ہے۔ وہ تو غالباً صداقت نامہ نہ دیں"

انھوں نے کہا "نہیں نہیں دیں گے کیوں نہیں۔ صداقت نامے دینا ان کا کام ہے"

میں نے حسرت سے ایک نظر اپنے موزہ پر ڈالی اور باہر نکل آیا۔ دوسرے دن میں محلہ کی کمیٹی
کے صدر کے پاس گیا۔ عرض کی "صداقت نامہ دیدیجئے۔ وہ میرا موزہ ختم ہوا جاتا ہے"

انھوں نے فرمایا "مگر یہ بات سچ بھی ہے کہ تمھارا موزہ کھویا تھا۔ کسی اور کا موزہ تو پہن کر آزمانا
نہیں چاہئے؟" میں نے کہا "بخدا۔ میں نے ہی کھویا تھا۔

انھوں نے فرمایا۔ "اچھا تو بیان حلفی داخل کر دو" میں نے بیان کا فارم پُر کیا۔ دوسرے دن
پھر حاضر ہوا تو صداقت نامہ مل گیا۔

یہ صداقت نامہ لے کر گم شدہ چیزوں کے دفتر پہنچا۔ اور ان لوگوں نے واقعی مزید ضابطہ کی
کارروائی کے بغیر میرا موزہ مجھے دیدیا۔ اور اب کہ موزہ پھر میرے پیر میں تھا کیا کہوں کہ مجھ پر کیا کیفیت
طاری تھی۔ جی میں کہہ رہا تھا "دیکھ تو۔ ریاست کا بھی کیا انتظام ہے۔ کسی پس ماندہ غیر ترقی یافتہ
ملک میں کیا کوئی میرے موزہ کے لئے اتنا وقت صرف کرتا اور اتنی زحمت اٹھاتا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

بس اسے ٹرام سے اٹھا کر پھینک دیتے، اور معاملہ ختم ہوتا۔ لیکن یہاں، ابھی عرضی دئیے مشکل سے ایک ہفتہ ہوا ہے اور میرا موزہ مجھے واپس مل گیا۔ کیا انتظام ہے، واہ کیا انتظام ہے!"

لیکن ایک کسر ہو گئی۔ اس ہفتہ کے انتشار میں وہ ایک موزہ جو مجھے زیادہ پسند تھا، وہ کھو گیا میں اسے کاغذ میں لپیٹ کر بغل میں دبائے دبائے پھر تا تھا۔ اور اب گردن کاٹو تو یاد نہیں آتا کہ کہاں بھول آیا۔ مگر اصل مصیبت یہ ہے کہ ٹرام میں نہیں بھولا۔ افسوس ٹرام میں نہیں بھولا۔ اب اسے کہاں ڈھونڈنے جاؤں۔

لیکن پھر بھی کیا مضائقہ ہے۔ وہ دوسرا موزہ تو ہے۔ اور میں نے اسے اپنے کمرہ میں آتش دان کے اوپر رکھ دیا ہے۔ جب زندگی سے ذرا تھک جاتا ہوں تو اس پر ایک نظر ڈال لیتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فکریں مٹ گئیں اور جی ہلکا ہو گیا۔ دل میں کہہ لیتا ہوں" واہ رے نظم۔ واہ رے انتظام!"

جواہرلال نہرو

پنڈت جواہرلال نہرو اس وقت قومی تمناؤں اور آمیدوں کا مرکز ہیں۔ قوم کی نگاہیں بے انتہا امید کے ساتھ ان کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کو قومی زندگی میں اتنا جذب کر دیا ہے کہ اب دونوں کو جدا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ جواہرلال قومی تحریک ہیں اور قومی تحریک جواہرلال ہے۔ گذشتہ سولہ سال تک مہاتما جی قوم کے جس اعتماد کے مالک رہے ہیں اب اس کا حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو وہ جواہرلال ہیں۔ مہاتما جی کا تاج —— کانٹوں کا اور عزت کا تاج —— صرف جواہرلال پہن سکتے ہیں۔ بوڑھے رہنماؤں نے اپنے وقت میں اعلیٰ کام انجام دئے لیکن اب وہ کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔ ان کی ہمتیں کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں۔ ضرورت نئی امنگوں، نئے جوش، نئے عزم اور نئی قوت کی ہے۔ ضرورت ایسے گرم خون کی ہے جسے تجربہ اور آزمائش نے پختہ کر دیا ہو۔ ضرورت ایسے مرد میدان کی ہے جس کا قلب وسیع، نگاہ بلند اور ارادہ اٹل ہو۔ یہ جوان پختہ کار، یہ رہنمائے کامل جواہرلال ہے۔

جواہرلال نہرو اس وقت ہندوستان کے سب سے زیادہ عزیز رہنما ہیں۔ ملک کے مختلف فرقوں، مختلف صوبوں، مختلف طبقوں، عورتوں مردوں، جوان بوڑھوں کے دلوں میں آج جو محبت جواہرلال کے ساتھ ہے وہ کسی دوسرے رہنما کو نصیب نہیں ہے۔ ان سے لوگوں کو جو وابستگی ہے اس میں ذاتی تعلق کی جھلک نظر آتی ہے۔ بوڑھے ان کی کامیابی سے اس طرح خوش اور ان کی تکلیف سے ایسے رنجیدہ ہوتے ہیں جیسے اپنا ہونہار بیٹے کی کامیابی اور ناکامی سے۔ جوان انھیں اپنا رفیق اور ہم سفر سمجھتے ہیں، ان سے پرخلوص ہمدردی رکھتے ہیں اور ان پر جان نثار کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ بچے انھیں اپنا مشفق اور مہربان بڑا بھائی جان کر ان کی

دکھ سے بے چین اور ان کے سکھ سے مگن ہو جاتے ہیں۔ جواہر لال چونکہ جوان ہیں اس لئے قوم کی گذشتہ کامیابیاں یا ناکامیاں ان کی ذات کے ساتھ اتنی منسوب نہیں کی جاتیں جتنی مستقبل کی تمنائیں اور آرزوئیں ان کے ساتھ وابستہ کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے عمر رسیدہ رہنما بھی مثلاً مہاتما گاندھی، پنڈت مدن موہن مالویہ، رابندر ناتھ ٹیگور، ڈاکٹر انصاری انھیں اپنا ہونہار جانشین سمجھ کر ان کی مناسب قدر و عزت کرتے ہیں۔ جواہر لال صرف سروپ رانی اور پنڈت موتی لال آنجہانی کے چہیتے بیٹے نہیں ہیں بلکہ وہ بھارت ماتا کے دل کی ٹھنڈک، آنکھ کا اجالا اور جان کی راحت ہیں۔

جواہر لال ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے اور امارت کے ان تمام لوازمات کے ساتھ ان کی پرورش ہوئی جو ایک شہزادہ کو ہی نصیب ہو سکتے ہیں۔ وہ پنڈت موتی لال کے اکلوتے بیٹے تھے۔ پنڈت موتی لال جی کو پبلک زندگی میں جو عزت و شہرت حاصل تھی اس کا یہ نتیجہ تو لازمی طور پر ہونا چاہئے تھا کہ جواہر لال پبلک سے روشناس ہو جاتے۔ لیکن جواہر لال نے جو امتیاز سروری و سرداری قومی زندگی میں حاصل کی وہ ان کی اپنی ذاتی صلاحیتوں اور کارگذاریوں کی بنا پر ہے۔ اپنے والد کے تعلقات، اثر اور دولت سے اس میں شک نہیں انھیں امداد بہت ملی لیکن ان کی ذاتی خوبیوں کو بھی ان کی کامیابی میں بہت بڑا دخل ہے۔ ملک میں اور بھی رہنما ہیں۔ ان کے بیٹے بھی ہیں لیکن کسی کو وہ شرف و بزرگی نصیب نہیں ہوئی جو جواہر لال کو ملی ہے۔ بلکہ بہت سوں کے لئے تو یہ تعلق خرابی اور گمراہی کا باعث ہو گیا ہے۔ اس لئے جواہر لال جی کی زندگی کے حالات تمام نوجوانوں کے سامنے ایک کامیاب اور عمل زندگی کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جواہر لال ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء میں الٰہ آباد کے محلہ میر گنج میں پیدا ہوئے۔ پنڈت موتی لال جی اس وقت اسی محلہ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ آنند بھون انھوں نے ۱۹۰۰ء میں خریدا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت شروع سے ہی انگریزی ڈھنگ پر ہوئی۔ پنڈت موتی لال جی نے

مغربی طریقہ بود و باش اختیار کر لیا تھا اور پانچ برس کی عمر سے ان کے لئے انگریز استانیاں مقرر کر دی گئی تھیں اور گیارہ برس کی عمر تک آپ انھیں سے تعلیم پاتے رہے۔ اس زمانہ میں موتی لال جی تعلیم کے مقابلہ میں ان کی صحت کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے۔ اور اسی لیے سنہ ۱۹۰۰ء میں کل خاندان کے ساتھ انھیں کشمیر لے گئے تھے سنہ ۱۹۰۲ء میں مشہور تھیا سوفسٹ مسٹر بروکس آلہ آباد آئے اور پنڈت موتی لال جی نے اپنے تھیا سوفسٹ دوستوں کے مشورہ سے انھیں جواہر لال جی کا اتالیق مقرر کر دیا۔ مسٹر بروکس آنند بھون میں ہی رہتے تھے وہ سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات کے اصول پر عامل تھے اور مذہبی رواداری، انسانیت دوستی اور عمل صالح پر اعتقاد رکھتے تھے۔ مسٹر بروکس نے جواہر لال کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا کیوں کہ جواہر لال جی میں آج تک یہ تینوں خصوصیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں پنڈت موتی لال جی نے مسٹر بروکس کے مذہبی خیالات کی طرف سے غیر مطمئن ہو کر اور جواہر لال جی پر ان کا بڑھتا ہوا اثر دیکھ کر انھیں اتالیقی سے برطرف کر دیا۔ اس کے بعد اور دوسرے استاد آپ کو پڑھاتے رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے ہندی اور سنسکرت کو بھی معمولی طور پر سیکھ لیا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں یعنی پندرہ سال کی عمر میں جواہر لال جی اپنے والد اور والدہ کے ساتھ انگلستان گئے اور ہیرو کے مشہور پبلک اسکول میں ان کا داخلہ کرا دیا گیا۔ ہیرو اور ایٹن انگلستان کے بہترین اسکول مانے جاتے ہیں اور ان میں صرف راجاؤں اور امیروں کے لڑکے ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ہیرو میں بڑودہ اور کپور تھلہ کے راج کمار آپ کے ہم سبق تھے۔ اسکول کی زندگی میں ہی جواہر لال جی لالہ ہردیال سے جو ان دنوں آکسفورڈ میں پڑھتے تھے ملا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں ہیرو سے انٹرنس کا امتحان پاس کر کے جواہر لال جی نے ٹرنٹی کالج کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ یہاں انڈین مجلس نامی ہندوستانی طالب علموں کی انجمن کے آپ ایک مشہور رکن تھے۔ کیمبرج میں آپ کے ہم عصر سیف الدین کچلو، تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر سید محمود، مسٹر عبدالمجید خواجہ اور سر شاہ محمد سلیمان تھے۔ نیچرل سائنس، کیمسٹری، جیالوجی اور باٹنی میں آپ نے سنہ ۱۹۱۲ء میں دوئم درجہ کی

بی۔اے (امتیازی) ڈگری حاصل کی۔ اور ان کی اعلیٰ قابلیت کو دیکھتے ہوئے کارکنان یونیورسٹی نے آپ کو بلاکسی مزید امتحانی آزمائش کے ایم۔اے (امتیازی) کی ڈگری عطا کر دی۔ اسی سال آپ نے انرٹمپل سے بیرسٹری کا بھی امتحان پاس کر لیا۔ اور یورپ کا پہلا سفر کرتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔

اپنے انگلستان کے زمانہ قیام میں جواہر لال ہندوستان کے معاملات سے بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے رہے ۱۹۰۷ء میں جب لاجپت رائے جلاوطن کئے گئے تو اس بات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور اس زمانہ میں "بال، پال اور لال" یعنی بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کا جو چرچا تھا اس سے انھیں بہت دلچسپی رہی۔ یہ تین بڑے رہنما اور مسز بسنٹ اس زمانہ کی ہندوستانی سیاسی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اس لئے ان کے خیالات کا جواہر لال پر خاصا اثر پڑا تقسیم بنگال کی شورش کا بھی ان پر شاید اثر ہوا ہوگا مگر نوجوانی کے اس دور میں جواہر لال کے خیالات میں کوئی پختگی اور قیام پیدا نہ ہو سکا۔

جواہر لال جی کی طبیعت بہت اثر پذیر تھی جس طرح دس سال پہلے مسٹر بروکس سے متاثر ہو کر وہ سادگی کی مجسمہ بن گئے تھے اسی طرح ہیرو، کیمبرج اور لندن نے انھیں شوقین اور فیشن ایبل بنا دیا۔ ان کے طور طریق اور عادتیں سب انگریزوں کے ڈھانچے میں ڈھل گئی تھیں۔ جب آپ ہندوستان آئے تو ایڑی سے چوٹی تک مغربی رنگ میں رنگ چکے تھے۔ ہندوستان پردیس سا معلوم ہوتا تھا اور وہ آئے دن خاندان والوں سے انگلینڈ لوٹ جانے کا خیال ظاہر کیا کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے آپ نے خود کہا تھا "دس سال سے کم ہوئے جب کہ انگلینڈ میں بہت دن رہنے کے بعد میں ہندوستان واپس آیا میں نے وہاں پبلک اسکول اور کالج میں جو تعلیم و تربیت رائج تھی وہی حاصل کی تھی اس لئے ہیرو اور کیمبرج کے تعصبات میرے اندر خوب راسخ ہو گئے تھے اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں شاید ہندوستانی کے مقابلہ میں انگریز زیادہ تھا۔ میں دنیا کو تقریباً ایک انگریز کی نگاہ سے ہی دیکھتا تھا اور اسی لئے

ہوم رول لیگ کے سکریٹری مقرر کئے گئے۔ چندہ اکٹھا کرنے اور جلسہ کرنے کا بوجھ آپ ہی کے کاندھوں پر تھا اور اسے آپ خوبی سے پورا کرتے تھے۔ لوکمانیہ گنگا دھر تلک کی ہوم رول لیگ میں بھی آپ نے نمایاں کام کیا۔ اسی وقت سے آپ کا رجحان انتہا پسند جماعت کی طرف ہوا۔ الہ آباد کی انتہا پسند جماعت کے رہنما سندر لال جی اور مسٹر منظر علی سوختہ سے آپ کی صحبت رہنے لگی۔ پنڈت موتی لال جی کو آپ کا یہ رجحان اور صحبت پسند نہ تھی۔ لیکن ان کی بہت کوشش سے بھی ان دونوں باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آئے دن آنند بھون میں اسی سوال پر بحث رہا کرتی تھی۔

جواہر لال جی کی شادی فروری ۱۹۱۶ء میں دہلی کے ایک کشمیری خاندان شری یت جواہر مل کول کی سلیقہ شعار لڑکی کملا کول سے ہوئی کملا کول ایک نہایت ذہین اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں انھیں جواہر لال جی کے خیالات سے پوری ہمدردی تھی اور یہ آخری دم تک جواہر لال جی کا ان کی تمام آزمائشوں اور تکلیفوں میں پورا پورا ساتھ دیتی رہیں۔ شادی کے موقع پر الہ آباد کے تمام شہر کو دعوت دی گئی تھی اور آنند بھون کو دولہن بنا دیا گیا تھا۔ ہندوؤں، انگریزوں، پارسیوں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ انتظامات کئے گئے تھے۔ جواہر لال جی کے کملا جی سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ایک لڑکی اندرا پریہ درشنی پیدا ہوئی جو آج کل سوئٹزرلینڈ میں تعلیم پا رہی ہیں۔ جواہر لال جی کی تاریخ عالم کے متعلق ضخیم کتابیں دراصل ان خطوط کا مجموعہ ہیں جو انھوں نے اسی چہیتی بیٹی کو جیل کی ویران تنہائیوں میں لکھے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں جواہر لال جی کے ایک لڑکا بھی ہوا تھا۔ مگر وہ تین دن سے زیادہ نہ جی سکا۔ کملا جی نہرو ایک طویل عرصہ تک بیمار رہیں ۱۹۲۶ء میں جواہر لال جی انھیں علاج کے لئے یورپ لے گئے۔ وہاں سے تندرست ہو کر واپس آئیں اور شوہر کے ساتھ آزادی کی تحریک کے لئے دوش بدوش کام کرتی رہیں۔ دو تین مرتبہ گرفتار ہوئیں اور ۱۹۳۱ء میں کئی ہفتہ جیل میں رہیں۔ جیل میں ان کی تندرستی دوبارہ خراب ہو گئی۔ اس کے بعد سے علالت کا سلسلہ برابر جاری رہا تا آنکہ فروری ۱۹۳۶ء میں انھوں نے یورپ میں انتقال فرمایا۔

پنڈت جی کی چونکہ انگریزی طرز پر تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس وجہ سے آپ کو گھوڑے کی

سواری، تیرنے، پہاڑ پر چڑھنے اور برف میں کھیلنے کا شوق ہے ٹینس بھی آپ کا خاص کھیل ہے۔

لیکن فی الحال ملک کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ ایک مرتبہ ناروے میں جہاں آپ سیر و سیاحت کے لئے گئے تھے سمندر کے کنارے تیر رہے تھے کہ ایک برف کے ٹکڑے میں آپ پھنس گئے۔ ایک انگریز نے ان کو وقت پر ایک زبردست خطرے سے بچایا۔ اسی طرح سے ١٩١٦ء میں آپ لداخ گئے اور ایک برف کے ٹکڑے میں پھنس گئے اگر رسیوں سے کھینچ کر آپ کو نہ نکالا جاتا تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ ایک طرف اٹھارہ ہزار فٹ بلند پہاڑی تھی اور دوسری طرف گیارہ ہزار فٹ نیچا ایک کھڈ تھا۔

١٩١٩ء میں موتی لال جی نے ایک انگریزی روزانہ اخبار انڈیپنڈنٹ نکالا۔ جواہر لال اس کمپنی کے ایک ڈائرکٹر مقرر کئے گئے اور یہی اس کے ایک بڑے مضمون نگار بھی تھے۔ یہ پرچہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ لیکن اس کی ختم ہونے کی ذمہ داری جواہر لال پر کسی طرح عاید نہیں کی جا سکتی۔ ١٩١٩ء میں ہی مہاتما جی نے تحریک ستیاگرہ شروع کی اور جواہر لال جی نے اپنے والد کی مخالفت کے باوجود ستیاگرہ کا عہد نامہ بھر دیا۔ ستیاگرہ شروع ہونے کے بعد پنجاب کے مظالم کے خلاف تحریک شروع ہو گئی اور پنڈت موتی لال جی کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی اور جواہر لال جی بھی اپنے والد کے ساتھ ایک سب کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے مظالم کی تحقیقات کرنے کے لئے پنجاب گئے۔ سرکاری افسروں کے ظلم کی داستان نے آپ کے دل پر بہت انقلاب انگیز اثر ڈالا۔ انہی دنوں مہاتما جی کے قربت اور صحبت کا بھی آپ کو موقع ملا۔ اور اسی وقت سے آپ گاندھی جی کے چیلے بن گئے۔ ان زبردست قوتوں نے آپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور آپ وطن کی محبت اور آزادی کے پجاری بن گئے۔

(باقی)

مسلمانانِ ہند کے لئے آئندہ راہِ عمل

مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اس وقت جو انتشار اور جمود نظر آرہا ہے اس کا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی سے ہمارے رہنماؤں کے سامنے نظری مسائل زیادہ اور عملی مسائل کم رہے ہیں۔ اس عرصہ میں ہم نے آس پاس کی ٹھوس چیزوں کی طرف سے نگاہ ہٹا کر دور کی غیر حقیقی چیزوں کی طرف نگاہ جمائے رکھی ہے۔ زمین کے کاموں کو چھوڑ کر آسمانی کاموں کے انجام دینے میں سرگرداں رہے ہیں۔ ہر چند اس زمانہ میں بھی ہم نے شورشوں اور ہنگاموں میں دوسرے لوگوں سے کم حصہ نہیں لیا۔ لیکن ہمارے معاصدان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ غیر دنیوی اور ہماری کوششیں نتیجہ کے لحاظ سے زیادہ بے اثر رہی ہیں۔ مثلاً ہم نے کانپور کی مسجد، بلقان اور طرابلس کی جنگ، خلافت، مسجد کے سامنے باجا بند کرانا، علی الاعلان گاؤکشی کے حق کو قائم کرنا، علم اور تعزیوں کے لئے پیپل کی ٹہنی کاٹنا، رسول اللہ کی شان میں بےادبی دگستاخی کرنے والوں کے خلاف شورش، ان کو قتل اور جہنم واصل کرنے والے غازیوں کے مقدموں کی پیروی، ان کی شہادت کے بعد ان کے جلوس وغیرہ نکالنے، قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے قضیوں اور انہدام مسجد شہید گنج کے جھگڑوں میں اپنی بیشتر قوت کو صرف کیا ہے۔ لیکن ایسے تعمیری کاموں کی طرف جن سے مسلمانوں کی نئی نسل کی زندگی بن سکتی یا اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی عظمت ان کے پیروؤں کی اعلیٰ زندگی کو دیکھ کر کفار کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو سکتی اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو کر مشرف با سلام ہو سکتے۔ کم توجہ کی ہے۔ ہم نے عاقبت کی زندگی اور دنیوی زندگی، روحانی زندگی اور مادی زندگی، عبادت اور معاملات میں تفریق اور بیگانگی کو قائم رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جس قدر ہم نے عاقبت روحانی زندگی اور عبادت کو درست کرنے کی کوشش کی ہے اتنی ہی ہماری دنیوی اور مادی زندگی کے معاملات

پھر ملک میں نئی تحریکیں، نئے خیالات اور نئے نصب العین پیدا ہو رہے ہیں۔ سب سے اول لائق ذکر کانگریس کی طرف سے ملکی آزادی کی تحریک ہے اور اس کے تعمیری اور سیاسی کام ہیں۔ ان میں مسلمانوں کو بڑی تعداد میں شریک ہونا چاہئے یا ان سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ پھر ہندو مہاسبھا کی طرف سے ہندو قومیت کو ترقی دینے کی کوششیں ہیں جن میں یا تو مسلمانوں کی کھلی ہوئی مخالفت کی جاتی ہے یا انھیں بالکل نظر انداز کر کے ان کے وجود سے ہی عملاً انکار کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں کمیونل اوارڈ کا مسئلہ اور ہندی پرچار کی تحریکیں بھی آجاتی ہیں۔ ان کے علاوہ، عورتوں کی تعلیم بے پردگی اور ان کی ترقی و آزادی کی تحریکیں اور مذہبی آزاد خیالی اور الحاد کی تحریکیں ہیں اور ان سب سے زیادہ اہم اور اپنی جاذبیت سے نگاہ کو سب سے زیادہ خیرہ کرنے والی سوشلزم کی تحریک ہے جو نظام معاشرت اور معیشت کو بالکل ایک نئی بنیاد پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ ان سب کے ساتھ مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے۔ یہ بات فیصلہ کرنے کی ہے۔ اس سے تجاہل اور اغماض کرنا ناممکن ہو گیا ہے ہر قدم پر مسلمانوں کو ان سوالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اور وہ موثر رہنمائی کے منتظر ہیں۔ چاروں طرف سے ان نئی قوتوں کا نرغہ ہے اور مسلمان ان میں سے کسی نہ کسی میں جذب ہو جانے کے لئے مجبور ہو رہے ہیں۔ پھر ان سب سے گہرا اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ فوری مسئلہ روزگار کی تنگی اور ماحول کی سختی کا ہے، روز بروز دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ مقابلہ کی قوتیں نیچے سے بھی ابھر رہی ہیں اور اوپر سے بھی نیچے کی طرف دھکیل رہی ہیں اور مسلمان دب دب کر پسے جا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل سوچنا بھی نہایت ضروری ہے۔

یہ امور ہیں جن کی طرف مسلمانوں کی تمام جمعیتوں، لیگوں، کانفرنسوں اور بورڈوں کو سب سے پہلے توجہ کرنا چاہئے۔ ان مسائل کی اہمیت اس میں شک نہیں اتنی نمایاں اور توجہ طلب تھی کہ حال میں جو اس قسم کے جلسے ہوئے ان میں بھی کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس نے کسی نہ کسی شکل میں ان مسائل کی طرف توجہ نہ کی ہو اور ان میں سے بعض کے بارے میں لمبے چوڑے رزولیوشن پاس نہ کئے گئے ہوں۔ خود غرض لوگوں کے جلسوں سے تو بحث نہیں کہ انھوں نے تو اپنے انتخاب کو سہل اور یقینی کرنے کے لئے

یہ تمام ڈھونگ کھڑا کیا تھا۔ اور ان سے کسی معقول رہنمائی کی توقع کرنا ہی فضول تھی۔ لیکن ایسے جلسوں میں بھی جن میں مخلص اور دردمند رہنما شریک ہوئے تھے اور جنھوں نے صحیح رہنمائی دینے کی کوشش بھی فرمائی وہ جامع اور مکمل پروگرام اور ایسی عملی تحریکیں پیدا نہ ہو سکیں جن کی مسلمانوں کو اس وقت شدید ضرورت تھی۔

جامعہ کی آئندہ اشاعت میں ہمارا ارادہ ہے کہ ان مسائل کی حقیقتوں کو نظری الجھنوں سے علیحدہ کرکے چند اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ ملک کے معتمد رہنما ان کی طرف توجہ فرمائیں گے اور ایک ایسا عملی پروگرام بنائیں گے جو وقت کے مطالبے کو قرار واقعی پورا کر سکے گا۔ (باقی)

صدائے کربلا!

آدمی کو امر حق پر سر جھکانا چاہیے
سر جھکانا ہی نہیں گردن کٹانا چاہیے

حادثات دہر سے گھبرا نہ جانا چاہیے
جو کڑی سر پر پڑے اس کو اٹھانا چاہیے

حفظ ناموس وفا میں جان سے کیسی دریغ؟
بے خبر! اس راہ میں تو جان جانا چاہیے

جان جاتی ہے اگر راہ صداقت میں تو جائے
موت آتی ہے تو آئے، اس کو آنا چاہیے

جان جانے کے لئے ہے اس کا ایسا غم نہیں
آن رہنے کے لئے ہے، وہ نہ جانا چاہیے

سر پہ مشکل آ پڑے کیسی ہی لیکن ہاتھ سے
ضبط و استقلال کا رشتہ نہ جانا چاہیے

ہو نہ پیدا کھوٹ اس سونے میں غافل اس لئے
غم کی دھیمی آگ پر دل کو تپانا چاہیے

گرچہ ہونا ہے وہی لکھا ہے جو تقدیر میں
وقت پر اپنی سی کوشش کر دکھانا چاہیے

اضطراب و انقلاب و کشمکش ہے زندگی
اہل ہمت ہی کو اس میداں میں آنا چاہیے

دامن مردانگی پر داغ ہے اک بزدلی
بزدلوں کو قبر کا کونا بسانا چاہیے

دہر کی نیرنگیوں پر گر نہ کچھ قابو چلے
دہر کی نیرنگیوں پر مسکرانا چاہیے

اور آئے وقت جب دنیا سے جانے کا جلیل
مسکراتے کھیلتے دنیا سے جانا چاہیے

مطبوعات جامعہ اور ایجنسی کی کتابیں

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش خالدہ ادیب خانم کے اُن خطبات کا مجموعہ جو انھوں نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لا کر جامعہ میں پڑھے۔ قیمت۔ انگریزی [illegible] اردو (۶ر)

تاریخ فلسفہ اسلام ایک جرمن تصنیف کا ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ اسلامی فلسفہ کی نشو و نما۔ یونانی عربی علوم فلسفہ فطرت اور مشرق میں فلسفہ کے انحطاط پر کار آمد بحث۔ قیمت (۶ر)

نفسیات شباب نوجوانوں کی نفسی سیرت اُن کی تخیلی زندگی۔ عشق۔ تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر بحث۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ [illegible]

آزادی مشہور سیاست داں جان اسٹورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ۔ از جناب سعید انصاری صاحب ایم اے (کولمبیا) قیمت (عہ)۔

انقلاب فرانس فرانس کی تحریک آزادی اور وہاں کے انقلاب کی تاریخ از جناب عبد الغفار صاحب بی اے (جامعہ) قیمت (۱۲ر)

مبادی معاشیات پروفیسر اڈون کینن کی معاشیات پر مشہور کتاب مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ قیمت (۱۲ر)۔

مالیات عامہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر مالیات عامہ کے اثرات اور ہمارے افلاس کے اسباب۔ قیمت (۱۲ر)۔

کسان زراعت پیشہ لوگوں کی موجودہ زبوں حالی کی داستان اور ان کی ترقی کی تدابیر (۲۷۵ صفحات)۔ قیمت مجلد۔ (عہ)۔

جاپان جاپان کے زبردست انقلاب اور حیرت انگیز ترقی کی کہانی۔ کتاب نہایت اچھے کاغذ پر چھپی ہے اور بہت سی تصویریں ہیں قسم اول ۶ر، دوم عہ۔

تاریخ مغربی یورپ ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ۔ یورپ کی معاشرت، علوم، فنون اور سیاسی اداروں کی تدریجی ترقی کا ذکر۔ قیمت (عہ)

تاریخ ہند قدیم کے ایم پانیکر کی کتاب جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر۔

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر تاریخ از مولانا نیاز فتحپوری۔ قیمت (عہ)۔

سیرت نبوی اور مستشرقین مستشرقین یورپ اسلام پر اکثر شیریں الفاظ میں جو زہر اگلا کرتے ہیں اس کتاب میں ان سب کا مدلل جواب دیا گیا ہے از ڈاکٹر عبد العلیم صاحب ایم اے پی ایچ ڈی عہ

تاریخ الامت ابتداء سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ سات جلدوں میں از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ (للعہ)

سیرت الرسول (عہ) خلافت راشدہ۔ ۶ا ، خلافت بنی امیہ (عہ) عباسیہ بغداد ۶ا ، خلافت عباسیہ ۶ا ، عباسیہ مصر ۶ا ، خلافت عثمانیہ (عہ)

قواعد عربی مولانا محمد بن یوسف السورتی کی مشہور و معروف اور مستند کتاب عربی صرف پر ۶ا ،

سیرت محمد علی مولانا محمد علیؒ کی سوانح حیات ۷۰۰ صفحات متعدد تصاویر۔ (سے)

کلام جوہر مولانا محمد علیؒ کے جدید و قدیم کلام کا مجموعہ مع مقدمہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی۔ قیمت (۸ر)

تلاش حق گاندھی جی کی آپ بیتی (۷۰۰) صفحے متعدد تصاویر۔ قیمت قسم اول ۶ا ، قسم دوم عہ

قوم کی آواز مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریریں اور سفر کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ قیمت (عہ)

ضبط نفس گاندھی جی کی مقتدر تصنیف کا اردو ترجمہ۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ حضرات کے لئے بہترین مشیر۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ۱۲ر

دو خدائی خدمتگار خان عبد الغفار خان صاحب اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب ایم۔ ایل۔ اے کے حالات زندگی مع خوشنما تصاویر۔ ۱۲ر

جمال الدین افغانی اخوت اسلامی کے پرجوش داعی سید جمال الدین افغانی کے حالات۔ طلباء کے لئے آسان زبان میں قیمت (۸ر)۔

مسلمان بیبیاں چند ایسی مسلمان خواتین کے حالات جو نیکی کا مجسمہ تھیں مسلمان بچیوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت ہے۔ (۶ر)

خادمات خلق یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات قیمت (۱۰ر)

تاج آفرینش مغربی اہل قلم خاتون ملک خانم کے چند نسوانی اصلاحی مقالات (۱۰ر)

کیمیا گر پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے۔ (آکسن) کے مختصر افسانوں کا نہایت دلکش مجموعہ۔ قیمت (عہ)

دلچسپ افسانے حضرت کوثر چاندپوری جیسے ادیب اور کامیاب فسانہ نگار کے (۲۵) دلگداز افسانے۔ قیمت ۶ا ،

مشاہدات سائنس سائنس پر بارہ مختلف مضامین از محمد عمر صاحب حسنی بی۔ اے۔ قیمت (عہ)۔

سیر المصنفین ادب اردو کی دلپسند تاریخ مرتبہ مولوی محمد یحییٰ صاحب۔ تنہا جلد اول (۶ر) جلد دوم (سے)۔

گلستان شیخ سعدی شیرازی کی مشہور آفاق کتاب جدید قالب میں۔ چھاپخانہ شرکت محدودہ آفتاب برلن کی نفیس طباعت اور کاغذ خوشنما ٹائپ۔ قیمت ۱۲ر

دیوانِ غالب اُردو جرمنی
جس میں مرزا غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد [illegible] خوبصورت ٹائپ جلد [illegible] نقش و نگار طلائی اوراق [illegible] صاحب کی [illegible] عکسی تصویر [illegible] قسم اول [illegible] قسم [illegible] قسم سوئم [illegible]

دیوانِ شیدا
مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور کے فارسی اور اُردو کلام کا مجموعہ مطبوعہ جرمنی۔ قیمت [illegible]

شعلۂ طور
حضرت جگر مراد آبادی کی کلیات کا مجموعہ۔ اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ۔ خوشنما کتابت، کاغذ، طباعت، قیمت مجلد [illegible]

پرشین لٹریچر
ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی قابل دید کتاب بزبان انگریزی۔ طلباء کے علاوہ عام مطالعہ کے لئے بھی کار آمد ہے۔ خوشنما طباعت۔ مجلد [illegible]

آسان خوشخطی
ہندوستان کے مشہور خطاط منشی علی محمد خاں صاحب کی لکھی ہوئی خوشخطی کی کاپیاں جن پر لکھنے سے بغیر استاد کی مدد کے بچے اپنا خط اچھا کر سکتے ہیں۔ چار حصے۔ فی حصہ [illegible] مکمل سٹ [illegible]

نوٹ:- خرچ کی کفایت کے خیال سے ان حصوں کی سادی جلدیں بھی تیار کرائی گئی ہیں۔
برائے حصہ اول و دوم - [illegible]
برائے حصہ سوم و چہارم - [illegible]

اُردو اکادمی کے مقالے

نفسیاتِ مذہب — جمال الدین افغانی
روحِ تہذیب — عقیدہ اعجاز القرآن
مسلمانوں کی آئندہ تعلیم

تصانیف مولانا اسلم صاحب جیراجپوری

تعلیماتِ قرآن — تاریخ نجد
تاریخ القرآن — سیرۃ عمرو بن العاص
حیاتِ حافظ — محجوب الارث
الوراثۃ فی الاسلام — جواہر پارے (نظمیں)

تصانیف خواجہ عبد الحی صاحب فاروقی

تفسیر آلِ عمران — تفسیر انفال و توبہ
" حجرات — " سورۂ یوسف
" سورۂ نور — " پارہ [illegible]
" پارہ [illegible] — بصائر

مشہور کتابوں کے سستے ایڈیشن

دیوانِ غالب — دیوانِ حالی
مسدس حالی — مقدمہ شعر و شاعری
اورنگ زیب عالمگیر

ڈرامے

پردۂ غفلت — انجام
کھیتی — نفرت کا نتیجہ
نیم شب — نقشِ آخر
صید زبوں — گناہ کی دیوار
ہمزاد

بچوں کا انصاف — اسکول کی زندگی
قوم پرست طالب علم — محنت

[illegible]

دفتر "نامۂ تعلیم" ۔ پونہ

محترمی

تسلیم!

یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہمارے ملک کی تمام مصیبتوں کا واحد علاج ہمارے بچوں کی کامیاب ابتدائی تعلیم ہے۔

خوش قسمتی سے ہمارا سرکاری کالج صوبہ بمبئی میں یہ خدمت اس طرح انجام دے رہا ہے کہ اس میں سے ہر سال اساتذہ کی ایک کافی تعداد فن تعلیم کی مخصوص مہارت کے بعد ابتدائی تعلیم کے اُردو اسکولوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک اس صوبہ میں کوئی ایسا تعلیمی پرچہ نہ تھا کہ جو اس اہم مضمون سے متعلق مسائل پر موجودہ تحقیقات کی روشنی میں ہمارے مخصوص ماحول کی مناسبت سے اظہار خیال کرتا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُردو زبان کی ترویج بھی کرتا۔ ہم نے محکمۂ تعلیم صوبہ بمبئی کی زیر نگرانی اس خدمت کو بجا لانے کا ارادہ کیا ہے۔ فی الحال ہماری گوناگوں مصروفیتیں ہم کو اجازت نہیں دیتیں کہ ہم ایک ماہنامہ کا اجراء کریں اس لئے سال میں صرف دو کوششوں ہی پر اکتفا کی گئی ہے۔ تاکہ ہم اپنی بہترین توجہ کے ساتھ ایک اعلیٰ معیار کا تعلیمی لٹریچر پیش کر سکیں کہ جو نہ صرف ہمارے ہی صوبہ کے لئے مخصوص ہو بلکہ ہمارے تمام ملک کے لئے کارآمد ہو سکے۔ اور جو اساتذہ ہی کے دائرہ میں محدود نہ ہو بلکہ عام طور سے والدین کی بھی صحیح رہنمائی کر سکے۔

ہم تذکرۂ بالا نصب العین کو پیش کرتے ہوئے آپ کے دماغ اور دل دونوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اپنے گرانقدر افکار و خیالات اور اپنی بہترین ہمدردیوں کے ساتھ ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔ چونکہ اس کے تحت کوئی تجارتی غرض نہیں ہے اور ہماری خدمات بھی اس سلسلہ میں اعزازی ہیں۔ اس لئے ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہماری آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی۔ اسی سلسلہ میں معاصرین سے استدعا ہے کہ وہ اس اعلان کو اپنے اخبارات و رسائل میں شائع کر کے ممنون فرمائیں گے۔

مہربانی فرما کر ذیل کی یادداشتیں نوٹ کر لیجئے:۔

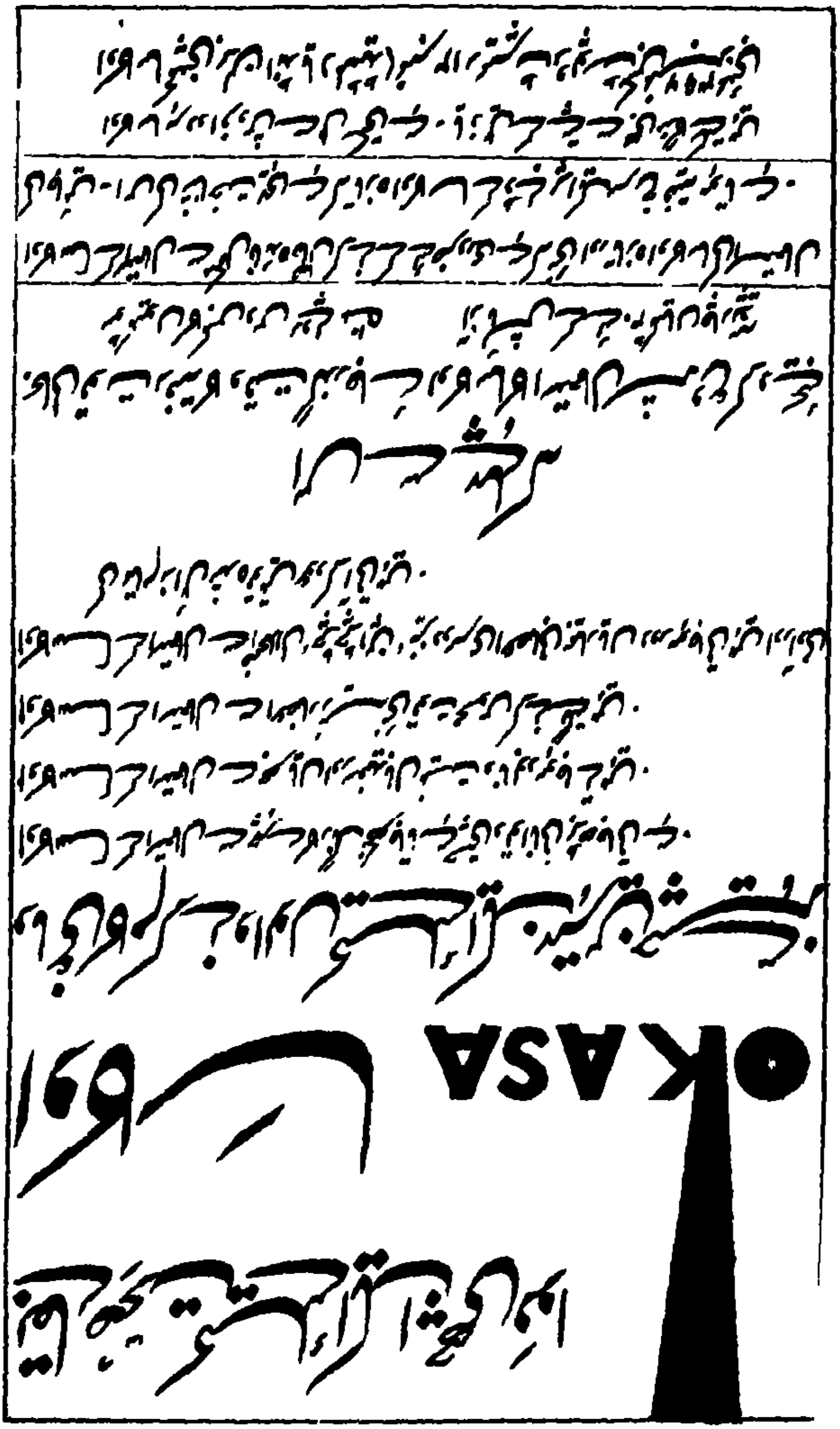
مضمون روانہ کرنے کی تاریخ - - - ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء

تاریخ اجراء رسالہ - - - - - ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء

قیمت فی پرچہ - - - - - ایک روپیہ (عہ)

گورنمنٹ ٹریننگ کالج ۔ پونہ

مدیران { سید عبدالرؤف ۔ ایم۔ اے؛ بی۔ ٹی
ابوطاہر رنک ۔ بی۔ ایس سی؛ بی۔ ٹی


OKASA

مطبوعات جامعہ اور ایجنسی کی کتابیں

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ خطبات کا مجموعہ جو انھوں نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لاکر جامعہ میں پڑھے۔ قیمت۔ انگریزی (سے ر) اُردو (عا)

تاریخ فلسفہ اسلام ایک جرمن تصنیف کا ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ اسلامی فلسفہ کی نشو و نما۔ یونانی عربی علوم فلسفہ فطرت اور مشرق میں فلسفہ کے انحطاط پر کار آمد بحث۔ قیمت (عا)

نفسیات شباب نوجوانوں کی نفسی سیرت، ان کی تخیل، زندگی، عشق، تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر بحث۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ (سے ر)

آزادی مشہور سیاست داں جان اسٹورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ۔ از جناب سعید انصاری صاحب ایم اے (کولمبیا) قیمت (عہ)۔

انقلاب فرانس فرانس کی تحریک آزادی اور وہاں کے انقلاب کی تاریخ از جناب عبد الغفار صاحب بی اے (جامعہ) قیمت (۱۲ر)

مبادی معاشیات پروفیسر ایڈون کینن کی معاشیات پر مشہور کتاب مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ قیمت (۱۲ر)۔

مالیات عامہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر مالیات عامہ کے اثرات اور ہمارے افلاس کے اسباب۔ قیمت (۱۲ر)۔

کسان زراعت پیشہ لوگوں کی موجودہ زبوں حالی کی داستان اور ان کی ترقی کی تدابیر (۲۷۰) صفحات۔ قیمت مجلد (عہ)۔

جاپان جاپان کے زبردست انقلاب اور حیرت انگیز ترقی کی کہانی۔ کتاب نہایت اچھے کاغذ پر چھپی ہے اور بہت سی تصویریں ہیں قسم اول عام، دوم عہ

تاریخ مغربی یورپ ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ۔ یورپ کی معاشرت، علوم، فن اور سیاسی اداروں کی تدریجی ترقی کا ذکر۔ قیمت (عہ)

تاریخ ہند قدیم کے ایم پانیکر کی کتاب جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر تاریخ از مولانا نیاز فتحپوری۔ قیمت (عہ)۔

سیرت نبوی اور مستشرقین مستشرقین یورپ اسلام پر اکثر شیریں الفاظ میں جو زہر اگلا کرتے ہیں اس کتاب میں ان سب کا مدلل جواب دیا گیا ہے از ڈاکٹر عبد العلیم صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

تاریخ الامت ابتداء سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ سات جلدوں میں از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ (مجلد ۱۲)

سیرۃ الرسول (عہ) خلافت راشدہ۔ ۱۲؍
خلافت بنی امیہ (عہ) عباسیہ بغداد ۱۲؍
خلافت عباسیہ ۱۲؍ عباسیہ مصر ۱۲؍
خلافت عثمانیہ (عہ)

قواعد عربی مولانا محمد بن یوسف السورتی کی مشہور و معروف اور مستند کتاب عربی صرف پر ۱۲؍

سیرت محمد علی مولانا محمد علیؒ کی سوانح حیات ۷۰۰ صفحات متعدد تصاویر۔ (سے)

کلام جوہر مولانا محمد علیؒ کے جدید و قدیم کلام کا مجموعہ مع مقدمہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی۔ قیمت (۸؍)

تلاش حق گاندھی جی کی آپ بیتی (۷۰۰) صفحے۔ متعدد تصاویر۔ قیمت قسم اول ۶؍ قسم دوم عہ۔

قوم کی آواز مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریریں اور سفر کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ قیمت (عہ)

ضبط نفس گاندھی جی کی مقدس تصنیف کا اردو ترجمہ۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ حضرات کے لئے بہترین مشیر۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ۱۲؍

دو خدائی خدمتگار خان عبد الغفار خانصاحب اور ان کے بھائی ڈاکٹر خانصاحب ایم۔ ایل۔ اے کے حالات زندگی مع خوشنما تصاویر۔ ۱۲؍

جمال الدین افغانی اخوت اسلامی کے پرجوش داعی سید جمال الدین افغانی کے حالات۔ طلباء کے لئے آسان زبان میں قیمت (۸؍)۔

مسلمان بیبیاں چند ایسی مسلمان خواتین کے حالات جو نیکی کا مجسمہ تھیں مسلمان بچیوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت ہے۔ (۷؍)

خادمات خلق یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات قیمت (۱۰؍)

تاج آفرینش معرکی اہل قلم خاتون ملک خانم کے چند نسوانی اصلاحی مقالات (۱۰؍)

کیمیا گر پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے۔ (آکسن) کے مختصر افسانوں کا نہایت دلکش مجموعہ۔ قیمت (عہ)

دلچسپ افسانے حضرت کوثر چاندپوری جیسے ادیب اور کامیاب فسانہ نگار کے (۲۵) دلگداز افسانے۔ قیمت ۱۲؍

مشاہدات سائنس سائنس پر بارہ مختلف مضامین از محمد عمر صاحب حسنی بی۔ اے۔ قیمت (عہ)۔

سیر المصنفین ادب اردو کی دلپسند تاریخ مرتبہ مولوی محمد یحییٰ صاحب۔ تنہا جلد اول (۱۲؍) جلد دوم (ہے)۔

گلستاں شیخ سعدی شیرازی کی شہرۂ آفاق کتاب جدید قالب میں۔ چنانچہ شرکت محدودہ آفتاب برلن کی نفیس طباعت اور کاغذ خوشنما ٹائپ۔ قیمت ۱۲؍

دیوان غالب جرمنی جس میں مرزا غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز خوبصورت ٹائپ جلد اس پر دلفریب نقش و نگار طلائی اوراق۔ اور سب سے زیادہ مرزا صاحب کی سہ رنگی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible] قسم سوئم [illegible]

دیوان شیدا مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ مطبوعہ جرمنی۔ قیمت [illegible]

شعلۂ طور حضرت جگر مراد آبادی کی کلیات کا مجموعہ۔ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ، خوشنما کتابت، کاغذ، طباعت، قیمت مجلد [illegible]

پرشین لٹریچر ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی قابل دید کتاب بزبان انگریزی۔ طلبا کے علاوہ عام مطالعہ کے لئے بھی کارآمد ہے، خوشنما طباعت۔ مجلد [illegible]

آسان خوشخطی ہندوستان کے مشہور خطاط منشی علی محمد خاں صاحب کی لکھی ہوئی خوشخطی کی کاپیاں جن پر لکھنے سے بغیر استاد کی مدد کے بچے اپنا خط اچھا کر سکتے ہیں۔ چار حصے۔ فی حصہ [illegible] مکمل سٹ ۵ر

نوٹ۔ خرچ کی کفایت کے خیال سے ان حصوں کی سادی جلدیں بھی تیار کرائی گئی ہیں۔

برائے حصہ اوّل و دوم [illegible]

برائے حصہ سوم و چہارم [illegible]

اُردو اکادمی کے مقالے

نفسیات مذہب	[illegible]	جمال الدین افغانی	[illegible]
روح تہذیب	[illegible]	عقیدہ اعجاز القرآن	[illegible]

مسلمانوں کی آئندہ تعلیم [illegible]

تصانیف مولانا اسلم صاحب جیراجپوری

تعلیمات قرآن	[illegible]	تاریخ نجد	[illegible]
تاریخ القرآن	[illegible]	سیرۃ عمرو بن العاص	[illegible]
حیات حافظ	[illegible]	محجوب الارث	[illegible]
وراثت فی الاسلام	[illegible]	جواہر ملیہ (قلمی)	[illegible]

تصانیف خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی

تفسیر آل عمران	[illegible]	تفسیر انفال و توبہ	[illegible]
" حجرات	[illegible]	" سورۂ یوسف	[illegible]
" سورۂ نور	[illegible]	" پارہ ۲۹	[illegible]
" پارہ ۳۰	[illegible]	بصائر	[illegible]

مشہور کتابوں کے سستے ایڈیشن

دیوان غالب	[illegible]	دیوان حالی	[illegible]
مسدس حالی	[illegible]	مقدمہ شعر و شاعری	[illegible]

اورنگ زیب عالمگیر [illegible]

ڈرامے

پردۂ غفلت	[illegible]	انجام	[illegible]
کھیتی	[illegible]	نفرت کا بیج	[illegible]
نیم شب	[illegible]	نقش آخر	[illegible]
صید زبوں	[illegible]	گناہ کی دیوار	[illegible]

ہمزاد [illegible]

بچوں کا انصاف	[illegible]	اسکول کی زندگی	[illegible]
قوم پرست طالب علم	[illegible]	محنت	[illegible]

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
[illegible]	۴ر	دیانت	۲ر

انتخابات

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
انتخاب میر	۱۲ر	انتخاب سودا	۱۲ر
انتخاب حسرت	۱۲ر		
میر کے سو شعر	۴ر	غالب کے سو شعر	۴ر
حسرت کے سو شعر	۴ر	جگر کے سو شعر	۴ر
جوش کے سو شعر	۴ر	اصغر کے سو شعر	۴ر

بچوں کے لئے اچھی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تعلیمی کھیل	۴ر	ترکوں کی کہانیاں	۴ر
عجائب خانہ سمندر	۱۲ر	بچوں کا تحفہ (نظمیں)	۱۲ر
بچوں کے کھیل	۶ر	حضرت مسیح	۵ر
بچوں کی رباعیاں	۱ر	حضرت زرتشت	۴ر
مرغی اجیر چلی	۳ر	نیت کا پھل	۲ر
ششیدلا	۳ر	پھول باغ	۱۲ر
پھلواری	۵ر	شہزادی گلنار	۴ر
اسکاوٹوں کی کہانیاں	۸ر	بچوں کی نظمیں	۵ر
تاریخ ہند کی کہانیاں	۴ر	اسلامی کہانیاں	۱۲ر
دنیا کے بسنے والے	۶ر	جہاز، ہوائی جہاز	۸ر
حاجی بابا اصفہانی	۱۲ر	سمندر کے عجائبات	۱۰ر

بچوں کی درسی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
آخری نبی	۲ر	سیرۃ الرسول (خورد)	۳ر
ہمارے نبی	۴ر	خلافت راشدہ	۳ر
ہمارے رسول	۵ر	عباسیہ بغداد	۱۲ر
نبیوں کے قصے	۵ر	اسلامی عقائد	۱ر
سرکار کا دربار	۸ر	ارکان اسلام	۲ر
سرکار دو عالم	۸ر	بچوں کا قاعدہ	۴ر

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
چاریار (طبع سوم)	۶ر	رہنمائے قاعدہ	۲ر
خلفائے اربعہ	۸ر	بچوں کی کتاب	۴ر
اچھی باتیں	۴ر	مشق خوشنویسی	۲ر
درس جنتی	۵ر	چالیس حدیثیں	۲ر
الورد الریحان	۲ر	ہمارا دین	۲ر

متفرق کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
کلام شیر	۳ر	نالۂ شیر	۳ر
نامہ شیر	۸ر	صلاح کار	۸ر
ازار العرب	۸ر	ضیاء الدین برنی	۴ر
ٹوالسٹائے	۳ر	جہاں آرا	۸ر
میلاد النبی پروجکٹ	۶ر	باغبانی پروجکٹ	۸ر
فردوس خیال (نظمیں)	۸ر	نجمہ (ناول)	۴ر
تخمیس (قرآن مریری)	۸ر	مالابدمنہ	۸ر
اعجاز القرآن عربی	۸ر	نیرنگ (مضامین)	۱۲ر
اسلامی تہذیب	۴ر	قومی تعلیم	۲ر
سالنامہ جوہر	۸ر	مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ	۴ر
لیلۃ القدر	۱ر	خطبہ شیخ الہند	۲ر
خطبہ مسیح الملک	۴ر	آزادی ہند	۳ر
نہرو رپورٹ	۱۲ر	خیالستان	[illegible]
رباعیات امجد	۸ر	کتاب الشعر	[illegible]
شعرستان	۳ر	کتاب الطلاق	[illegible]
گلیانگ	۸ر	الفوز الکبیر	۱۲ر
فانوس خیال	۳ر	المدینۃ والاسلام	[illegible]
ذکری (ابوالکلام)	۸ر	تاریخ امریکہ	[illegible]
خیالات لورنگ	۸ر	معاشقۂ نپولین	۱۲ر
معیاری افسانے	۱۲ر	مصری افسانے	۸ر

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی — پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۶	اپریل سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

[illegible]

(ހ) [illegible] | (ށ) [illegible] | (ނ) [illegible]

[illegible] | [illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ([illegible])
[illegible] ([illegible])
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

ڈاکٹر انصاری صاحب امیر جامعہ کا انتقال

(ڈاکٹر انصاری صاحب کی اچانک وفات ایسا جانکاہ سانحہ ہے جس سے ہر شخص متاثر ہے ذیل میں ہم شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کی اس تقریر کو درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۱۰ مئی ۳۶ء کو براڈکاسٹ فرمائی تھی)

کل رات کو کوئی ایک ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری دنیا سے اچانک رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے سوری تشریف لے گئے تھے، وہاں سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں قلب کی حرکت بند ہو گئی اور یہ اپنے بیشمار کاموں اور ان گنت قدردانوں کو اس دیس کو جس کی خاطر انھوں نے ہر طرح کی کڑیاں جھیلیں، ان مسلمانوں کو جن کی خدمت میں ساری عمر گذار کر ان کا بڑا ہی سہارا ان ہندو مسلمانوں کو جنمیں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کیلئے خون پسینا ایک کیا، ان ضعیفوں کو جن کی آنکھیں ایسی کا سہارا ان کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ دیکھ کر ان کا خون چلووں بڑھتا تھا، اور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ ان کی زندگیوں میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں، ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو دوستوں کو سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا، اس وقت دیس کے ہر بچہ بچہ کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور چشمہ اپنے پرائے سب کیلئے بہتا تھا۔ ان کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے کام آتا تھا۔ ان کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں ہر دکھی دل کو پناہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دم سے دنیا کے میدان عمل میں قدم رکھا۔ ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا۔ اس لئے کہ وہ نیک تھے، سچے تھے، مخلص تھے، فیاض تھے، ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم جانتے تھے۔ اس سے بہت پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انہیں مشہور

کریں، ہزاروں آدمی انھیں اپنا سمجھنے لگے تھے، ان کی سوجھ بوجھ، تدبیر، خلوص اور ایثار نے بہتیرں کو ان کا گرویدہ بنایا، لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں اُن کی پریم بھری آنکھیں، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا۔ پھر سوچئے کہ اس سانحہ سے ان لوگوں کے دلوں پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح خاص ان کے سایہ میں رہتے تھے۔ موت کی گھڑی سب کے لئے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی ۷۲ سال کے تھے۔ ان کے لئے تو وہ زمانہ آ رہا تھا کہ اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے۔ اور پھر جب وہ نہ ٹلنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ نصیحت کچھ وصیت کرکے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے، پر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا، اور ہوتا وہی ہے جو اسے منظور ہو۔ وہ چلے گئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھئے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد ہیں جن کے گھر میں مکے سے مدینے ہجرت کرنے والے قافلے کے سردار نے جاکر قیام فرمایا تھا، اس وقت جب مخالف اس کی حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے۔ پر جس کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت پائی۔ اسی وقت سے سچائی کی مدد، مہمان نوازی، فیاضی اس کے خاندان کا حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جب ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا لیکن بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۹۰۷ء سے جب انھوں نے اپنے وطن کا مڈل اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس آئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے اکثر چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا

کارنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر ان کو یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لئے نئے
آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے آدمیوں کی جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، انھیں برتیں، انھیں
ترقی دیں، تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں، خود مضبوط ہوں اور دوسروں
کی مضبوطی سے ڈریں نہیں۔ مانگیں ہی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی ہمت بھی رکھتے
ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے
باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ
ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جا کر دفنایا ہے۔ خدا انھیں توفیق دے
کہ وہ اس آرزو کو بھی پورا کر سکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اس
مدرسہ کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا، اس کے کام کرنے والوں سے کوئی
آ آ کر شرما شرما کر یہ نہ کہیگا کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکا تم سے آنکھ ملانے کی مجھ میں ہمت
نہیں۔ وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آکر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں
پاس دکھی دل کا دکھ نہیں یاد رہے گا۔ اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کچھ کرائے گا بھی۔ ہمارا کام
بڑھے گا، پھیلے گا، ہمیں ہزار دولتیں ملیں گی۔ پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہ ملے گا۔

ہندوستانی تحریک قومیت

(ذیل میں ہم جامعہ کے عزیز اور محترم اولڈ بائے ڈاکٹر عبدالحمید صاحب ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی کا ایک مضمون درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے لندن سے اشاعت کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ قارئین کو غالباً یاد ہوگا کہ دسمبر ۱۹۳۶ء کے رسالہ جامعہ میں ایک مضمون "ہندو اور مسلم قومی تحریکیں اور ہندوستانی قومیت کی تحریک" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں ملک کے اہل الرائے حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ بھی اس موضوع پر اپنے بیش قیمت خیالات کا اظہار فرمائیں تاکہ ایک واضح نصب العین کے تعین میں سہولت ہو۔ ڈاکٹر حمید صاحب کا یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس مضمون کے ساتھ صاحب موصوف نے ہمیں جو خط لکھا ہے اسے بھی اس مضمون کی تمہید کی حیثیت سے ہم بجنسہ نقل کر رہے ہیں۔

"جامعہ کے دسمبر نمبر میں آپ کا مضمون بہ عنوان "ہندوستانی قومیت کی تحریک" نظر سے گذرا۔ اگر تاریخی واقعات کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں نہ مسلم قومیت کا مکمل تسلط ہو سکتا ہے اور نہ ہندو قومیت کا۔ ہندوستانی زندگی میں مذہبی روح کا اثر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ بالشوزم جیسی مادی تحریک یہاں بغیر اپنے خد و خال تبدیل کئے ہوئے مقبول نہیں ہو سکتی۔ مغربی وضع کی سرمایہ دارانہ قومیت کا اثر ہندوستانی زندگی پر اب تک بہت رہا ہے اور اب تک ہے لیکن ہندوستانی جمہور کی غربت اور مغرب میں خود نظام سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کے باعث یہ تحریک اب ہندوستان میں زوال پذیر ہے۔ غالباً مستقبل ہندوستان میں صرف ایک تحریک ہمہ گیر ہو سکے گی جو ہندو اور مسلمانوں کے بہترین تمدنی سرمایہ سے مالا مال ہو اور جس پر جدید اجتماعیت کا اثر غالب ہو۔

مشترکہ ہندوستانی قومیت کی تعمیر ہندوستان میں کئی صدیوں سے ہو رہی ہے

(1)

[illegible]

[illegible]

(٨)

[illegible]

دور میں دونوں ملتوں نے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایک ہندوستانی تمدن کی تشکیل کی ہے
بادشاہ مسلمان ہوتے تھے لیکن امور سلطنت میں ہندو برابر کے شریک تھے۔ اکبر جیسے بادشاہ کو
تو چھوڑئیے جس کے متعلق کوئی متنازعہ فیہ امر نہیں ہے لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بھی جسے
متعصب مشہور کیا جاتا ہے سینکڑوں ہندو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے رعایا کے ملکی اور وطنی
حقوق میں حد درجہ انصاف اور رواداری سے کام لیا جاتا تھا۔ اس مشترکہ حکومت کے باعث ہندو
اور مسلمانوں نے ایک مشترکہ معاشی اور سیاسی نظام قائم کر لیا تھا جو موجودہ زمانہ کے نظامات کے معیار پر
نہیں جانچا جا سکتا چونکہ یہ رفتار زمانہ کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ ان نظامات کے تحت ہندوستانی کمال راحت
اور اطمینان سے زندگی گذارتے تھے اور وہ نظامات اس زمانہ کے اکثر نظامات سے زیادہ بہتر تھے بدقسمتی
سے ہندوستان کی تاریخ اب تک بہت غلط طریقہ پر لکھی گئی ہے خصوصاً اسلام کے اثرات ہندوستان
پر جو مرتب ہوئے ہیں اس کا اب تک مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ اسلام ہندوستان کی قومی زندگی کے
لئے تجدید کا باعث ہوا ہے۔ جس طرح اس نے ایران۔ مصر اور ایشیائے کوچک میں فرسودہ تہذیبوں
کی بجائے نئی اور زندہ تہذیبوں کی بنیاد رکھی اسی طرح اس کا نفس گرم ہندوستان میں بھی حیات تازہ کا
باعث ہوا ہے۔ اسلام جس وقت ہندوستان میں داخل ہوا اس وقت ہندو تہذیب کی نہایت
ابتر حالت تھی۔ ہندوں کا عہد ترقی تنزل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ تمام دنیا سے الگ تھلگ ایک
مضمحل اور فرسودہ زندگی گذار رہے تھے۔ یہاں نہ اب وہ اعلیٰ فلسفیانہ سرگرمیاں تھیں اور نہ علمی چرچے
آریاؤں کی ابتدائی سادہ زندگی کی بجائے چھوت چھات نے جگہ لے لی تھی اور مخلوق خدا ہزاروں قیود
میں جکڑ دی گئی تھی۔ تمام ملک میں کوئی مرکزی نظام حکومت نہ تھا اور آئے دن مختلف راجوں کے
درمیان خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلام سے تصادم کے باعث ہندو قوم میں ایک ذہنی بیداری
شروع ہوگئی اور اس عظیم الشان قوم نے پھر مسائل کائنات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ عقیدہ توحید کے
زیر اثر ہندوؤں میں متعدد تحریکیں پیدا ہوئیں جس میں زمانہ متوسط میں گرونانک کبیر اور بھگتی کی تحریک
اور عہد جدید میں سوامی دیانند راجہ رام موہن رائے۔ اور سوامی رام کرشن کے نام خاص طور پر قابل

ذکر ہے۔ ان لوگوں نے ہندو قوم کو توحید کی طرف دعوت دی اور ان کی اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلام مرکزی ایشیا کی نیم متمدن اقوام کے ذریعہ داخل ہوا جو نئی نئی مسلمان ہوئی تھیں اور اسلامی روح ان میں اچھی طرح داخل نہیں ہوئی تھی اُن کے فاتحانہ اقدام میں ملک گیری اور ہوس کو بہت زیادہ دخل تھا۔ ہندوؤں کے دل میں اسی لئے اسلام اور ملک گیری کا مفہوم باہم مربوط ہوگیا۔ اگر اسلام اس کے صحیح علمبرداروں کے ذریعہ ہندوستان میں داخل ہوتا تو اس کے اثرات یہاں بھی اسی قدر ہمہ گیر مرتب ہوتے جس قدر کہ ایران اور مصر وغیرہ میں مرتب ہوئے ہیں۔ سندھ میں اسلام عربوں کے ذریعہ پہنچا اس لئے وہاں اسلامی اثرات سب سے زیادہ پائدار مرتب ہوئے۔ ہندوستان میں جو کچھ بھی اسلام پھیلا وہ بادشاہوں کے باعث نہیں بلکہ اُن بزرگانِ کرام کی کوششوں اور اخلاق فاضلہ کے اثر سے جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچے اور اپنے روحانی فیض سے لوگوں کو منور کیا۔

باوجود ان تمام کوششوں کے تمام ہندوستان کا مذہبی تصور ایک نہ ہوسکا۔ اس کا بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہندو ایک بہت قدامت پرست قوم ہے اور خود بھی ایک اعلیٰ مذہبی فلسفیانہ نظام کی حامل ہے لیکن مذہب کو چھوڑ کے تمدن کے دوسرے شعبوں میں مثلاً سیاست اور معیشت میں جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں دونوں نے مل کر کام کرنا شروع کیا۔

زبان کی اہمیت ہر قوم کے تمدن میں بہت زیادہ ہے چونکہ یہ اس تمدن کی نفسی جدوجہد کی جس میں جذبات۔ خیالات۔ تاثرات وغیرہ سب ہی کچھ ہوتے ہیں مظہر ہوتی ہے مسلمانوں کی زبان عربی اور فارسی اور ہندوؤں کی زبان بھاشا اور سنسکرت تھی۔ ان زبانوں کے اتصال سے ایک مخلوط زبان اردو عالم وجود میں آئی جسے ہندوستانی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ دونوں اقوام کے ذہنی ورثہ کی حامل ہے اور ہماری متحدہ قومیت کی زندہ ترین مظہر ہے۔

تمدن کے جمالی پہلو یعنی فنون لطیفہ میں بھی ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ ہاتھ کام کرتا رہا۔ تاج محل ہندوستانی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں اسلامی عناصر غالب ہیں چونکہ فن تعمیر میں مسلمان ماہر

ہوئے ہیں لیکن اس کی طرز تعمیر نہ ایرانی ہے اور نہ عربی۔ یہ ہندی مسلمان کے دماغ کا شاہکار ہے جو ہندوؤں کے فن تعمیر سے کافی متاثر ہوا ہے۔ اس کے بلند و حسین مناروں۔ اس کے فلک بوس گنبدوں اور اس کی وسیع اور کشادہ محرابوں میں جہاں اسلامی روح کار فرما ہے وہاں اس کے نقش و نگار اس کے مثلثوں اور مربعوں اس کی تزئین و آرائش میں ہندو ذہن کی بلندیک بینیاں جلوہ گر ہیں۔

موسیقی میں ہندو بہت ماہر تھے۔ مسلمانوں نے اس کی ان سے تحصیل کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ آج موسیقی تو کم از کم ہندو اور مسلمانوں کی مشترک ہے اور دونوں ہندوستانی موسیقی کے دلدادہ ہیں ہندو موسیقی سوز و الم اور جذبات کی گہرائی کی مظہر تھی۔ وہ نغمے جو انسانی دل کی عمیق ترین تہ سے نکلتے ہیں اس کا بہترین مظہر صرف راگ و راگنی کے ذریعہ کیا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں نے ہندوستانی موسیقی میں جوش و شدت۔ بیساختہ پن اور صفائی پیدا کی۔ اس کا اظہار قوالی میں ہوتا ہے جس کو حضرت امام خسرو نے ہندوستان میں رائج کیا۔ ہندوستان میں سیکڑوں آلات موسیقی قدیم زمانہ میں رائج تھے مگر چنگ و رباب اہل ایران کے ساتھ یہاں داخل ہوئے۔ پھر ہندو اور مسلمانوں کی امتزاجی موسیقی کے باعث ایسے آلات موسیقی ایجاد ہوئے جو اس موسیقی کے لئے موزوں تھے۔ مثلاً ستار اور طبلہ۔ ستار کے بانی بھی امام خسرو ہیں۔ طبلہ عربی طبل سے ہے مگر یہ ہندوستانی ڈھولک کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ سارنگی جو ایک نہایت ہی ترقی یافتہ آلہ موسیقی ہے اور جس سے زیادہ انسانی آواز کا کوئی ساتھ نہیں دے سکتا بہت بعد کی ایجاد ہے اور ہندوستان کی مشترکہ موسیقی کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہے اس کے علاوہ تمدن کے ہر چھوٹے سے چھوٹے شعبہ مثلاً برتن سازی۔ پارچہ بافی۔ نجاری۔ کپڑوں کی رنگائی۔ لکڑی کی نقاشی وغیرہ میں دونوں ملتوں کے مشترک تمدن کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳)

عہد جدید میں ہندوستانی تحریک قومیت

زمانہ متوسط میں تمدنی عناصر کی اس یک رنگی کے باعث ہندو اور مسلمانوں کی ایک قومی زندگی

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مرعوب کن مناظر نے نفسِ انسانی پر بہت گہرا نقش کیا اور فطرت کے سامنے مجبور انسان نے حقیقت کا ابتدائی تصور ایک خوفناک ہستی کا کیا اور اس کے مظاہر آگ - پانی - بجلی - سانپ وغیرہ کی پوجا شروع کر دی - آریاؤں سے پہلے ہندوستان کے اصل باشندے دڑاوڑ بھی فطرت کے خوفناک مظاہر کی پرستش کیا کرتے تھے اور اس کی آفات سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے - بعد میں اس قوم نے بھی فلسفیانہ فکر کا اعلیٰ ثبوت دیا مثلاً ہندو تثلیث (وشنو - شیو اور برہما) کا تخیل دڑاوڑی قوم کا پیدا کردہ ہے ہندو فلسفیانہ فکر کی انتہا اپنیشد اور گیتا ہے جہاں عقیدہ وحدۃ الوجود کی تعلیم دی گئی اور ہندو اس عقیدہ میں تمام دنیا کے معلم اول ہیں فطرت کی فیاضیوں نے ہندوؤں کو زندگی کی معاشی جدوجہد سے بے نیاز کر دیا تھا اس لئے وہ اپنے تفکرات زیادہ ذہنی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کی طرف رجوع کر سکتے تھے -

ہندو مذہب ہی کے دامن سے بدھ اور جین مت کی تحریکیں پیدا ہوئیں جو مابعد الطبیعات سے زیادہ اخلاقی بنیادوں پر قائم تھیں - یہ تحریکات امرائیت کے خلاف جمہوری تھیں لیکن ان کا اثر ہندومت کے سامنے تقریباً مفقود ہو گیا اور جو کچھ باقی بھی رہا وہ ہندومت کا جزو ہو کر - غرضکہ ہندومت جس کا بنیادی تخیل وحدۃ الوجود ہے ہندو تمدن کے لئے بنیاد کا کام دیتا رہا - وحدۃ الوجود کا سب سے بڑا معلم شنکر اچاریہ ہے جس کا دنیا کے عظیم الشان مفکرین میں شمار کیا جا سکتا ہے - اس کا فلسفہ ہندو مذہب کی جان ہے اس لئے جس وقت ہندوستان میں جدید قومیت کی تحریک پیدا ہوئی اور اس نے ماضی پرانی بنیادوں کو قائم کرنا چاہا تو پھر ہندی ذہن نے گیتا اور شنکر اچاریہ کے فلسفہ کی طرف توجہ شروع کی -

ہندو فلسفہ یونان یا عام مغربی فلسفہ کی طرح صرف عقلی غور و فکر پر نہیں بلکہ وجدان پر مبنی ہے اور یہ فلسفہ "ویدانت" کا فلسفہ کہلاتا ہے ویدانت کے معنی مقصود یا نتیجہ کے ہیں یعنی ویدانت کا فلسفہ وہ تعلیم دیتا ہے جو وید کا مقصود آخر ہے یا وہ آخری تعلیمات دیتا ہے جو وید کے معلمین کا منشا تھا -

ہندومت کی چار متفق علیہ باتیں ہیں یعنی :-

(١) روح انسانی باقی رہنے والی ہے۔

(٢) ہر شخص کے اعمال بھی زندہ رہتے ہیں اور یہ اپنے مخفی اثرات رکھتے ہیں۔ اس کو "کرم" کہتے ہیں۔ اعمال اور ان کے نتائج کی بے رحمانہ تکرار کو "سنسار" کہتے ہیں۔

(٣) تناسخ۔ یعنی روح مختلف جنم اس دنیا میں لیتی رہتی ہے۔

(٤) دنیا رنج و عذاب ہے جس سے نجات پانا ضروری ہے اور اس کا ذریعہ ویدانت ہے۔

شنکراچاریہ کے نزدیک شاہد و مشہود یعنی انسان کے نفس اور مادہ کی حقیقت ایک ہے یہ ایک ہی تجربہ انسانی کے دو پہلو ہیں۔ وہ حقیقت جو دونوں پر حاوی ہے "برہما" کہلاتی ہے برہما کی حقیقت سے ہم واقف نہیں ہیں برہما "موجود" ہے۔ اس کا ذکر صرف نفی میں کیا جا سکتا ہے دنیا "مایا" ہے یعنی یہ ایک نقاب ہے جو شاہد و مشہود کے درمیان حائل ہے۔ "مایا" سے نجات "موکش" ہے۔ ہندو فلسفہ کی ان اعلیٰ تعلیمات سے ان کی عظمت اور ان کی خامیوں کا پتہ چلتا ہے۔ عظمت تو یہ ہے کہ انھوں نے حقیقت کی اس قدر صحیح توضیح کی ہے جس سے بہتر توضیح آج تک انسانی دماغ نہ کر سکا۔ روح و مادہ۔ شاہد و مشہود کی باہمی آویزش سے دنیا کو بچایا اور دونوں کو حقیقت اعلیٰ "برہما" کے دو پہلو قرار دئے۔ اپنی ذہنی کاوش میں وہ سب سے برتر تھے مگر عملی زندگی کے لئے جو تعلیمات دی گئیں وہ یاس و حزن سے مملو تھیں۔ دنیا ان کے نزدیک رنج و عذاب ہے۔ کرم کا ہاتھ اس قدر سخت ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں دکھائی دیتی دنیا کے اثباتی پہلو سے زیادہ انھوں نے اس کے منفی پہلو پر زور دیا ترک تمدن زندگی کا مقصد اعلیٰ قرار پایا جس نے عملی روح کو فرسودہ کر دیا اور لوگ جنگلوں میں جا کر نجات کے لئے مصروف زہد و ریاضت ہو گئے۔ ذہنی زندگی کی انفرادیت کا اثر جماعت پر بھی پڑا منو کے قوانین کے مطابق ہندو جماعت چھوت چھات کی سخت بندشوں میں جکڑ دی گئی اور اس کے کروڑہا اراکین بدترین غلامی میں مبتلا ہو گئے۔

ہندو فلسفہ دنیا کی بالذات کوئی حیثیت تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کو مایا سمجھتا ہے جو عموماً قومی جمود کا باعث ہوتا ہے اور لوگوں کے دل میں ترقی کی امنگ نہیں رہتی اور جو عمل کیا جاتا ہے وہ بھی اس لئے کہ اس سنسار سے نجات حاصل کریں۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد میں ہندو ذہن میں دوبارہ بیداری شروع ہو گئی اور ہندو مذہب کی تجدید و اصلاح کی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ عہد جدید میں مغربی علمائے ہندو فلسفہ کی طرف توجہ شروع کی اور اس کے مغربی زبانوں میں ترجمے کئے۔ پھر مغربی علوم و فنون سے واقفیت اور اپنی سیاسی پستی کے باعث ہندو قوم میں زندگی پیدا ہونا شروع ہوئی خالص مغربی وضع کی قومیت کے قیام کرنے والی تحریکیں سطحی تھیں اس لئے دیرپا نہ ہو سکیں۔ ماضی کی روح سے متاثر ہو کر جو تحریکیں پیدا ہوئیں وہ پائدار ثابت ہوئیں۔ دکن میں تلک کے ذریعہ سیواجی کی روح پھر اپنا اثر دکھانے لگی۔ بنگال کے انقلابی نوجوان کالی کو بھینٹ چڑھایا کرتے تھے اور اس کے سامنے بھارت ماتا کے اوپر قربان ہو جانے کا عہد کرتے تھے دکن میں غیر برہمنوں کی تحریک جو برہمنوں کے اقتدار کے خلاف بغاوت تھی بہت زور پکڑ گئی۔ اس تحریک میں دکن کے مخصوص دیوتا لنگا کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی اس دور کے بعد ایک اور عمیق دور آیا۔ اس دور میں شنکر اچاریہ اور گیتا کی تعلیمات کا اثر حاوی ہو گیا راجہ رام موہن رائے۔ لوکمانیہ تلک۔ داس۔ ٹیگور۔ گاندھی وغیرہ میں یہی روح کام کر رہی ہے گو کہ اس کی نوعیت ہر جگہ مختلف ہے مہاتما گاندھی کی تعلیمات میں ہندو دھرم کی تعلیمات سے زیادہ بدھ اور جین مت کی تعلیمات کا اثر ہے۔ ان کے یہاں "اہنسا" کا خیال پیش پیش ہے جو جین مت کی تعلیمات کی جان ہے ہندو قومیت کا اصل نمائندہ حقیقتاً گاندھی سے زیادہ ٹیگور ہے جو شاہد و مشہود کے تفرقوں کو مٹا کر وحدۃ الوجود کے فلسفہ میں گم ہو جاتا ہے۔

(۵)
ہندو تحریک قومیت کے بعض مظاہر

ہندو تحریک قومیت کے نفسی عوامل کا ذکر کرنے کے بعد ہم اب اس کے بعض مظاہر پر ایک

مختصر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں میں اس تحریک کی مظہر جو اپنی بنیاد صرف ماضی کی روایات پر رکھنا چاہتی ہے آریہ سماج کی تحریک ہے۔ اس کے بانی سوامی دیانند ہیں جو ایک پاکباز اور اعلیٰ اخلاق کے انسان تھے۔ ان کی طبیعت ہندو دھرم کی تباہ حالی اور خرابی کو دیکھ کر کڑھتی تھی۔ انھوں نے اس کی تجدید کا بیڑا اٹھایا اور اس کو ہر قسم کی برائیوں سے پاک کرنے کا عہد کیا۔ وہ ویدک دھرم کو اپنی اصل حالت میں زندہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں اور انگریزوں کی آمد ہندو قوم کے زوال کا باعث ہوئی چنانچہ اس تحریک کے پیروؤں کو ہر خارجی عنصر سے نفرت پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں کو بھی وہ صحیح یا غلط ایک خارجی عنصر سمجھتے ہیں اس لئے ان میں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا ہونا لازمی امر تھا۔

سوامی دیانند اپنے مذہبی خیالات میں بہت زیادہ اسلام سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے مذہب کی ایک منظم شکل کا خیال اسلام سے اخذ کیا۔ ہندومت حقیقت میں کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی نظام ہے جس میں ہر قسم کے خیالات کے لوگوں کے لئے گنجائش ہے چنانچہ ہندو مذہب میں ایک خدا کے ماننے والے۔ لاکھوں بتوں کی پرستش کرنے والے۔ روح کے قائل۔ مادیین اور تشکیکین وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ آریہ سماج نے اعتقادات میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک واحد ہستی پر ایمان رکھنا ضروری قرار دیا ہے اس کا مابعد الطبیعاتی تصور اسلام سے کسی قدر بھی مختلف کیوں نہ ہو۔ انھوں نے قرآن کی طرح ویدوں کو بھی آخری سرچشمہ ہدایت قرار دیا اور اس کی ہر تعلیم کو ازلی اور ابدی بتایا۔ جماعتی نظام میں ان لوگوں نے چھوت چھات کی مخالفت کی اور ہندومت کا دروازہ شدھی کے لئے کھول دیا۔ جدید تہذیب و تمدن کے یہ لوگ مخالف ہیں اور شہری زندگی سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ آریہ ورت کے پرانے نظام تعلیم کو انھوں نے دوبارہ زندہ کیا اور فطرت کے حسین گوشوں میں اپنی درسگاہیں (گروکل) کھول دیں۔

آریہ سماج کے باعث ہندوؤں کی ایک جماعت کو ایک مستقل عقیدہ اور ایک ازلی کتاب کا تخیل ہاتھ آگیا۔ انھوں نے جماعتی نظام کی خرابیوں کو بھی دور کیا جس کے باعث وہ ہندوؤں کی

ایک جماعت میں زبردست ہیجانی زندگی پیدا کر سکے۔ اس جماعت میں خارجی تسلط کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی اور اس کے پیرو جذبۂ آزادی سے سرشار ہوگئے۔

اس تحریک کی بنیادیں چونکہ ہندو تہذیب پر قائم تھیں جسے مشترکہ ہندوستانی تمدن سے کوئی واسطہ نہ تھا اس لئے اس نے ہندو اور مسلمانوں کے خلیج کو اور وسیع کر دیا۔ پھر یہ زمانہ کی جدید ضروریات اور قوتوں سے ناواقف تھی اس لئے بحیثیت مجموعی ہندو قوم کی رہبری نہ کر سکی۔ یہ لوگ زندگی میں حرارت تو پیدا کر سکے لیکن اس کی صحیح رہبری نہ کر سکے اسی باعث اس کے شعلوں نے بسا اوقات وطن ہی کے بعض حصوں کو خاکستر کر دیا۔

ہندو تحریک قومیت کا دوسرا مظہر برھمو سماج کی تحریک ہے۔ اس کے بانی راجہ رام موہن رائے ہیں۔ یہ بہت زیادہ مغرب سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے عیسائیت۔ اسلام اور مغربی علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ تعصب سے پاک اور ایک نہایت ہی برگزیدہ اور وسیع الخیال انسان تھے ان کے مذہبی خیالات پر سوامی دیانند کی طرح جذبات کا نہیں بلکہ عقل کا اثر تھا۔ وہ ایک عالمگیر انسانیت کا قیام کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں ایک ایسی قومیت جو انسانیت کی خدمت کرے۔ وہ جہاں اسلام کے صاف و سادہ جمہوری نظام سے متاثر تھے وہاں عیسائیت کی عالمگیر برادری کی تعلیمات کے بھی دلدادہ تھے۔ ان کے خیالات پر یورپ کے دورِ عقلیت کے فلسفہ کا بھی کافی اثر تھا۔ اسی بنا پر وہ تمام مذاہب میں صداقت دیکھتے تھے۔ ان کے وسیع مذہبی تخیل میں ان سب لوگوں کے لئے گنجائش تھی جو انسانیت کی خدمت کریں۔ آریہ سماج کی تحریک جس طرح شمالی ہند کے پرجوش انسانوں کی طبیعت کی مظہر ہے اسی طرح برھمو سماج بنگال کے پرامن اور فلسفیانہ طبیعت کا آئینہ۔ اس نے ہندو اور مسلمانوں کو جدا نہیں کیا بلکہ باہم مربوط کرنے کی کوشش کی۔

برھمو سماج کا اثر ہندوستان کی قومیت کے ارتقا پر بہت گہرا پڑا ہے اور بنگال کی تو تمام جدید تمدنی زندگی اسی تحریک کی ممنونِ احسان ہے۔ بنگال کا دماغ جب مذہبی توہم پرستی سے آزاد ہوا اور اس کی بجائے اس نے ایک وسیع مذہبی مسلک اختیار کیا تو اس کا نتیجہ علوم و فنون اور شعر و ادب

میں ظاہر ہوا۔ ذہنی بیداری سیاسی حرکت کا باعث ہوئی اور بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہوا۔ باوجود تمام خوبیوں کے برہمو سماج کی تحریک ہندو جمہور سے تعلق پیدا نہ کر سکی وہ صرف بنگال کے ذہنی طبقہ تک محدود رہی چونکہ اس کی بنیادیں عقل پر مبنی تھیں اور جذبات کا اس میں بہت کم دخل تھا۔

جس تحریک نے ہندو قوم کو صحیح معنوں میں بیدار کر دیا اور اس کی عمیق قومی روح میں حرارت پھونک دی وہ وہ تحریک ہے جو ہندوستان کے احیاء ماضی پر مبنی ہے لیکن ساتھ ہی جس کا نصب العین ایک عالمگیر انسانیت کی خدمت بھی ہے۔

یہ ہندو تحریک قومیت ایک ہندوستانی قومیت کا قیام چاہتی ہے جس میں ہندو اور مسلمانوں کے بہترین تمدنی سرمایہ کے لئے گنجائش ہو۔ اس کے علمبردار ذہنی دنیا میں ہندوستان کا سرمایہ ناز شاعر ٹیگور اور عملی دنیا میں ہندوستان کا قائد اعظم گاندھی ہے۔ ان دونوں شخصیتوں کا تعلق ہم سے بلاواسطہ ہے وہ اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ ان کے لئے مستقل بحث کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم اپنی داستان سرائی یہیں ختم کرتے ہیں۔

نوٹ۔ "مسلمانانِ ہند میں تحریکِ قومیت" کے لئے ملاحظہ ہو "سالنامہ اجمل سنہ ۱۹۴۲ء" پرنس بلڈنگ بمبئی نمبر ۳۔

بَرطانوی مزدوروں کا طرزِ عمل
جنگِ عظیم سے قبل

جنگ عظیم سے لے کر گذشتہ پانچ سال کا زمانہ برطانوی مزدوروں کے لئے خاموش نشو و نما کا دور تھا خاموشی کے اسباب کچھ تو مزدور پارٹی کے سیاسی طرزِ عمل، کچھ وادی طاف کے فیصلے کی عائد کردہ پابندیوں اور کچھ مسلک کی مجموعی سرد بازاری میں پائے جاتے ہیں - اس دور سے قبل ہی جو زمانہ گذر چکا تھا اس میں لبرل اور مزدور پارٹی کی متحدہ کارگذاریوں نے اپنے اراکین کو خوش حالی کے زینے پر پہونچا دیا تھا اس کا اندازہ نیچے دئے ہوئے نقشے سے کیا جا سکتا ہے -

سال	نرخ غلہ	اجرت بشکل زر[1]	اُجرت حقیقی[2]	بے روزگاری کا اوسط
١٩٠٣	١٠٠	١٠٠	١٠٠	۵ فی صدی
١٩٠٤	١٠٢	٩٦	٩٤	٦ "
١٩٠۵	١٠٣	٩٦	٩٣	۵ "
١٩٠٦	١٠٢	٩٨	٩٦	٤ "
١٩٠٧	١٠۵	١٠٢	٩٧	٤ "
١٩٠٨	١٠٧	١٠١	٩٤	٨ "
١٩٠٩	١٠٨	٩٩	٩٢	٨ "
١٩١٠	١٠٩	١٠٠	٩٢	۵ "

[1] Money wages.

[2] Real wages

یہ نقشہ صنعتی مزدوروں کی نقدی اور اصلی اجرت کی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ غلہ کی گرانی کے سبب سے اجرت حقیقی میں تھوڑی بہت کمی ہونا شروع ہوگئی تھی۔ لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اجرت نقدی میں بقدر ضرورت اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اور بے روزگاری کے اوسط کو نظر انداز کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مزدوروں کی مجموعی حالت ناقابل اطمینان نہ تھی۔

مگر پھر بھی مزدوروں کا ہر طبقہ اپنی جگہ بے چین اور پریشان تھا۔ اس پریشانی کی ابتدا تو درحقیقت واری طاف کے مقدمہ ہی سے ہو چکی تھی مگر آسبورن[1] کے نئے مقدمہ نے ہیجان میں اور بھی اضافہ کردیا۔ یہ مقدمہ برطانیہ عظمیٰ کی ہاؤس آف لارڈز[2] کے اس فیصلے کا نتیجہ تھا جس نے ۱۹۰۹ء میں مزدور پارٹی کے ان تمام اخراجات کو جن کی ذمہ داری ٹریڈ یونین پر تھی خلاف قانون ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس فیصلے کے معنی یہ تھے کہ مزدور پارٹی کے مالی ذرائع کو بند کرکے انھیں ایک عضو معطل بنادیا جائے۔ موقع سے فائدہ اٹھاکر آسبورن نے مزدور پارٹی کے خلاف عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مزدور پارٹی کو ٹریڈ یونین کی آمدنی اپنے صرف میں لانے کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ مقدمہ ایک عرصہ تک چلنے کے بعد آسبورن کے خلاف فیصل ہوا۔ مگر آگے چل کر ہاؤس آف لارڈز نے اس کا ساتھ دیا اور ریلوے ملازمین کی ٹریڈ یونین کے خلاف تعینات عمل میں لائے گئے۔ اس مقدمہ کے فیصلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ٹریڈ یونین، کو مزدور پارٹی کی مالی امداد سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر مزدور پارٹی اپنے اخراجات کے لئے بہر حال انہی مجالس کی مدد درکار تھی اور اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اس حق کو حاصل کرنے کی جد و جہد مجلس قانون سازی میں کی جاوے۔ ظاہر ہے کہ مزدور پارٹی کی کوئی تجویز اس وقت تک کامیاب

ف۱ W. V. Osborne ریلوے ملازمین کی مشترکہ انجمن کے سکرٹری تھے۔

ف۲ House of Lords.

نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ لبرل پارٹی بھی ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہو۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ لبرل پارٹی مزدوروں کا ساتھ ہر موقع پر دے رہی تھی مگر اس معاملہ میں مدد دینے کے لئے تیار نہ تھی اس طرح دونو پارٹیوں میں اختلافات کی بنیاد پڑنے لگی۔ مگر جلد ہی مصالحت کی کوششوں نے صورت حال میں تغیر پیدا کر دیا اور ۱۹۱۳ء میں ٹریڈ یونین کے اخراجات کے متعلق ایک نیا قانون نافذ ہوا۔ اس کی رو سے ان مجلس کو سیاسی معاملات پر اخراجات عمل میں لانے کا حق عطا ہوا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ جو پابندیاں عائد کی گئیں وہ مختصر طور پر یہ تھیں :-

(۱) سیاسی اخراجات کے لئے ایک جداگانہ مد قائم کی جائے اور اخراجات کی حد کو اس مد کی جمع شدہ رقم سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

(۲) سیاسی اخراجات کے لئے اراکین مجلس کی اجازت بذریعہ ووٹ حاصل کی جائے۔

(۳) ٹریڈ یونین کے جو اراکین سیاسی اخراجات میں حصہ دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ ان کو مجلس سے بلا مستعفی ہوئے ایسا کرنے کی اجازت دی جائے۔

(۴) ٹریڈ یونین کے رجسٹرار کو وقتاً فوقتاً مجوزہ قانون میں اصولی ترمیم کرنے کا حق حاصل ہو۔

گو مصالحت کے یہ نکات آخری طور پر تسلیم کرلئے گئے مگر یہ ٹریڈ یونین اور مزدور پارٹی دونو کے لئے ناقابل اطمینان تھے۔ اس قانون نے مجلس کی آزادی پر پابندیاں عائد کرکے مزدور پارٹی کو مالی دشواریوں میں مبتلا کیا۔ اور جذبۂ بغاوت کی آگ نئے سرے سے بھڑکا کر مزدوروں کے طرز عمل میں ہنگامی تغیر پیدا کر دیا۔ لہٰذا اس زمانہ میں جس کی ابتدا ۱۹۱۱ء سے ہوئی تھی بے شمار ہڑتالوں اور کاروباری بغاوتوں کا پھر سے آغاز ہوا۔ اس دور کو ہم "جنگ عظیم سے قبل کا زمانہ" کہیں گے۔

۱۹۱۱ء میں نئی پارلیمنٹ کی ابتدا ہوئی۔ اور ساتھ ہی ہڑتالوں کا ایک مستقل سلسلہ ظہور میں آیا جس میں سب سے پہلا نام ملاحوں کا آتا ہے۔ اس پیشے کی ٹریڈ یونین نے اپنے مطالبات

کو حاصل کرنے کے لئے ایک باضابطہ قومی ہڑتال کا اعلان کیا۔ اور حسب ذیل مطالبات پیش کئے ۔

(۱) ایک قومی مصالحتی بورڈ[۵۱] قائم کیا جائے جو ملاحوں اور جہازوں میں کوئلہ جھونکنے والے مزدوروں کی شکایتوں کو دلچسپی کے ساتھ سننے اور ان کا خاطر خواہ فیصلہ کرنے کا اہل ہو ۔

(۲) اجرت کی آخری حد مقرر کردی جائے تاکہ مالکان جہاز کی طرف سے قلت معاوضہ کا خطرہ باقی نہ رہے ۔

(۳) ملاحوں کی تقرری کے طریقوں کو درست کیا جائے ۔

مگر مالکان جہاز نہ ان مطالبات کی طرف غور کرنے کے لئے تیار تھے اور نہ تجارتی اتحاد کو مزدوروں کا جائز حق تسلیم کرتے تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی ہڑتال کو ہر جگہ کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی گئی اور ان کے حامیوں کو اپنے ارادوں میں ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ جہازی[۵۲] وفاق کو مجبوراً ہار ماننا پڑی ۔ اور مزدوروں کے اکثر مطالبات پورے کرنے پڑے ۔ لیکن اس طبقے میں ابھی تک بے اطمینانی کا دور جاری تھا ۔ اور بجائے مجموعی عمل کے الگ الگ ہڑتالوں کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا ۔ اس سلسلہ کی فہرست طویل ہے مگر چند وہ بندرگاہ جہاں ہڑتال کا اثر زیادہ ہوا (۱) لیورپول (۲) کیڈف (۳) مانچسٹر اور (۴) لندن تھے ۔ ہڑتالوں کا سلسلہ ترقی ہی کرتا گیا اور بدمزگی یہاں تک پہنچی کہ حکومت کی مدد درکار ہوئی اور مصالحت کے شرائط سرکاری طور پر منظور کرائے جانے لگے اسی سال ریلوے کے ملازمین نے بھی قومی ہڑتال کا اعلان کیا اور دھمکی دی کہ ان کے مطالبات نامنظور کئے جانے کی صورت میں وہ تمام ملک میں ہمدردانہ[۵۳] ہڑتال کرا دیں گے ۔ موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے حکومت نے پھر مداخلت کی اور ریلوے کارپوریشن کو ملازمین کے جائز

---

[۵۱] National conciliation Board

[۵۲] Shipping Federation

[۵۳] Sympathetic Strike

مطالبات منظور کرنے کے لئے مجبور کیا۔

مگر جنوری ۱۹۱۱ء سے ہڑتالوں کا دوسرا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس کی ابتدا گلاسگو کے بندرگاہ
میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد فروری میں مانچسٹر اور جولائی میں لیورپول میں ہڑتالوں کا زور رہا۔ اسی
سال مئی میں لندن کے بندرگاہ میں ایک اہم ہڑتال کی ابتدا ہوئی۔ اس ہڑتال کا اعلان کرنے
والے نئے ٹریڈ یونین کے اراکین تھے اور اس کے خلاف دوسری جانب لارڈ ڈیون پورٹ[۱]
بندرگاہ لندن کے صدر تھے۔ وہ اس ہڑتال سے ناراض تھے اور اس میں شریک ہونے والے تمام
مزدوروں کو سخت سے سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے۔ جب ٹریڈ یونین نے لارڈ ڈیون پورٹ
کے ارادوں کے استحکام کا احساس کیا تو انہی کامیابی کے لئے تمام بندرگاہوں میں ہمدردانہ ہڑتال
کا اعلان کرنے کے لئے مجبور ہوئے۔ اور بعد از خرابی بسیار لارڈ ڈیون پورٹ کو شکست ماننا پڑی
یہ سلسلہ اگست تک جاری رہنے کے بعد ختم ہوا۔ مگر اس کے بعد بھی متعدد غیر معروف ہڑتال ہوتے
ہی رہے اور اس وقت تک ہوا کئے جب تک کہ جنگ عظیم کی ابتدا نہ ہو گئی۔

بندرگاہوں سے گزر کر ریلوے اور کانوں کے حلقوں میں داخل ہو جئے تو پھر ہڑتالوں کا
وہی زور ملے گا جس کا نقشہ ہم ابھی پیش کر چکے ہیں۔ ریلوے ملازمین کی بے چینی کی ابتدا ۱۹۰۷ء
میں شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت انھوں نے مصالحتی مجلس قائم کرنے کے لئے زور دیا تھا جس
کے لئے لیورپول اور مانچسٹر میں بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں لیکن بالآخر یہ مسئلہ ایک شاہی کمیٹی کے
سپرد کر دیا گیا۔ لیکن اس کمیٹی کی سفارشات مالکان ریل کے خلاف ثابت ہوئیں جو بڑی جد و جہد کے بعد
ترمیم شدہ صورت میں منظور کی گئیں۔ اس طرز عمل کے خلاف ملازمین ریل میں جذبات برانگیختہ ہونا
شروع ہوئے اور نتیجہ ۱۹۱۱ء کا وہ قومی ہڑتال ہوا جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس ہڑتال کے
بعد ریلوے ملازمین میں اتحاد اور یکجہتی بڑھتی گئی۔ اور مالکان ریل کے خلاف مزدوروں کی لڑائے عامہ

[۱] Lord Devonport.

طاقت پکڑنے لگی۔ لہٰذا ۱۹۱۲ء سے کاروباری[٥١] تنازعات کی ابتدا ہوئی اور مطالبات کی بنا پر مالک و مزدور میں جھگڑے ہونے لگے۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے جھگڑے تو ۱۹۰۸ء ہی سے شروع ہو گئے تھے مگر ۱۹۱۱ء کی جنگ جو ایک زبردست ہڑتال کی صورت میں نمودار ہوئی بہت اہم تھی۔ اس تنازع کا سبب اجرت کی زیادتی کا مطالبہ تھا اس میں تقریباً دس ہزار آدمیوں نے حصہ لیا تھا۔ ہڑتال کا یہ سلسلہ ۴ ماہ تک جاری رہا۔ مگر مزدوروں کو اس میں کوئی خاص کامیابی نہ حاصل ہو سکی اور مجبوراً اپنے اپنے کام پر واپس جانا پڑا۔ اسی طرح کانوں میں کام کرنے والوں مزدوروں نے بھی ۱۹۱۰ء میں ایک زبردست قومی ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ کانوں کے ملازمین کی اجرت کے لئے قومی[٥٢] حد قائم کر دی جائے۔ اس معاملہ کو حکومت نے خود اپنے ہاتھ میں لیا اور وزیر اعظم اسکوئتھ[٥٣] کو اس کے فیصلے کے لئے مامور کیا۔ مگر باوجود ان کی پوری کوشش کے مصالحت نہ ہو سکی اور مجبوراً ۱۹۱۲ء میں پھر قومی ہڑتال کی ابتدا کرنا پڑی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد حکومت نے پھر دخل اندازی کی اور مزدوروں کے مطالبات کے متعلق مجلس قانون ساز میں ایک مسودہ پیش کیا۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں یہ مسودہ قانون کی شکل میں پاس ہوا۔ اس کی رو سے کان کے ملازمین کی آخری حد ۵ شلنگ قرار پائی۔ اس کے بعد مزدوروں کی حالت قابل اطمینان ترقی کر رہی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں اسکاٹ لینڈ کی کانوں سے ہفتے میں ۴ دن کام کرنے کا حق حاصل کرنے کے لئے شور برپا ہوا۔ مگر جنگ عظیم نے یکایک اس شورش کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اس دور کے دیگر کاروباری حلقوں میں بھی بے چینی کی فضا پھیل رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ڈنڈی کے جوٹ کی مشینوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے ایک زبردست ہڑتال کا اعلان کیا۔

---

[٥١] Industrial disputes

[٥٢] National Minimum

[٥٣] Asquith.

ان کا عذر بھی معاوضوں کی کمی تھا۔ اسی طرح مشرقی و مغربی لندن کے درزیوں نے بھی اپنے مطالبات کے سلسلہ میں ہڑتال کا اعلان کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد انجنیروں کے ایک طبقے نے اجرت کی کمی کی بنا پر ایک زبردست ہڑتال کی بنا ڈالی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یارک شائر کے رنگ سازوں نے اپنے حقوق حاصل کرنا چاہے اور اس سلسلہ میں بہت دنوں تک ہڑتال مناتے رہے۔

لیکن اس زمانہ کی سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ تحریک وہ تھی جس کی ابتدا جیمس لارکن[۵۱] نے کی۔ یہ تحریک آئرلینڈ سے شروع ہوئی اس کا ماحصل محکمہ آمد و رفت[۵۲] کی ٹریڈ یونین کو مستحکم کرنا اور ان کو فروغ دینا تھا۔ لارکن کی تحریک میں محکمہ آمد و رفت کے ملازمین کے علاوہ دیگر کاروبار کے مزدوروں نے بھی حصہ لیا۔ اس طرح ہم خیالوں کی ایک بڑی جماعت لارکن کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔ اس کا طریقہ اپنی طرز کا نرالا اور عجیب تھا۔ اور بظاہر یہ گمان ہوتا تھا شاید اس سے بہتر دوسری ترکیب نہ ہو۔ طرز عمل اس کا بھی وہی تھا جس کے عادی مالک و مزدور دونو ہو چکے تھے۔ یعنی ہڑتال۔ مگر طریقہ جداگانہ تھا۔ ان ہڑتالوں کا اعلان بلا پیشگی اطلاع کے کیا جاتا تھا۔ تاکہ مالکان کو سوچنے اور غور و خوض کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ ان کی کوششوں کی بہترین کامیابی یہی تھی کہ ہڑتال کا حربہ آفتِ ناگہانی کی شکل میں پیش کیا جائے۔ اور ہمدردانہ ہڑتال کے لئے ہر محکمہ کے مزدوروں کو ہمہ وقت تیار رکھا جائے اور اگر ہمدردانہ ہڑتال کامیاب نہ ہو تو اس کی کوشش کی جائے کہ ساتھ نہ دینے والے مزدوروں کی تیار کردہ سامان کا کوئی گاہک ہی نہ مل سکے۔ شروع شروع میں یہ ترکیب بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا اثر کم ہوتا گیا۔ کیوں کہ ساہوکار طبقہ بھی اپنی جگہ پر کافی ہوشیار تھا اور جلد ہی اس قسم کی ناگہانی مصیبتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اور ہمہ

---

۵۱ اسے موجد کے نام پر اس تحریک کا نام Larkinism رکھا گیا۔

۵۲ Transport

وقت اتفاقی اور ہمدردانہ ہڑتال کے لئے تیار رہنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد لارکن کی یہ حکمت عملی
عام طور پر ناپسندیدہ خیال کی جانے لگی اور اخبارات اس کے خلاف رائے عامہ کا اظہار کرنے لگے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۳ء میں لارکن کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور قید سخت کی سزا دی گئی۔
لیکن اس خبر نے پبلک اور مزدور دونوں طبقوں میں ہیجان بپا کر دیا۔ ہمدردیاں بہرحال لارکن کے
ساتھ تھیں۔ حکومت کے اس فیصلے نے لوگوں میں ایسی شورش پیدا کر دی کہ مجبوراً نقض امن کے
خوف سے اس کو رہا کرنا پڑا۔ مگر بالآخر لارکن کی جدوجہد کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکل سکا۔ اور اگرچہ
ہڑتالی مزدوروں کی حمایت کے لئے تمام برطانیہ تیار ہو چکا تھا مگر پھر بھی ماحصل یہی رہا کہ "لڑائی
برابر کی رہی"[1]

اس کیفیت نے تجارتی اتحاد کی پالیسی اور برطانیہ کی فضا پر ایک نیا اثر ڈالا۔ لوگوں کی
ہمدردیاں مزدور طبقے کی طرف شامل ہونے لگیں۔ اور ساہوکاروں کی طرف سے طبقوں میں
انحراف پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ یہ ایک ایسا نیا اور سنسنی خیز طرز عمل تھا جس نے ساہوکاروں اور حکومت
دونو کو معاملات پر نظر عمیق ڈالنے۔ اور موجودہ خرابیوں کو دور کرنے کی کوششیں کرنے کے لئے
مجبور کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ گذشتہ دنوں میں اکثر و بیشتر اختلافات کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے
لئے حکومت کی مدد درکار ہوا کی ہے۔ مگر اب یہ خیال ترقی پذیر ہو چلا تھا کہ اس طرح مداخلت
کرنا حکومت کے شایان شان نہ تھا اور خوف تھا کہ آئندہ چل کر اس میں خرابیاں نہ پیدا ہو جائیں۔
اس لئے ۱۹۱۱ء میں ایک صنعتی کونسل[2] قائم کی گئی جس کے اراکین میں مالک و مزدور دونوں کے
نمائندے شامل تھے اس کونسل کا مقصد آپس میں مصالحت قائم کرنا اور دوستانہ تعلقات کو
ترقی دینا تھا۔ مگر یہ مجلس مصالحت پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہی۔ ۱۹۱۲ء میں اس کونسل کی

---

[1] James Connolly سے نقل ہے۔

[2] Industrial Council.

طرف سے ایک تحقیقاتی کمیٹی صنعتی مصالحت کے طریقوں پر غور کرنے کے لئے بٹھلائی گئی۔ کمیٹی کے صدر سر جارج اسکوتھ تھے جو بعد میں لارڈ اسکوتھ ہوگئے۔ اس کی سفارشات کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک جبریہ مصالحتی بورڈ[1] قائم کیا جائے جو ہڑتال سے قبل تنازعات کے وجوہ پر غور کرے اور کوئی ہڑتال اس وقت تک جائز نہ قرار دی جائے جب تک کہ یہ بورڈ اپنی تحقیقات کا فیصلہ شائع نہ کرے۔ مگر صنعتی کونسل اس قسم کا بورڈ قائم کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اس لئے بالآخر یہ تجویز عملی صورت میں تبدیل نہ ہو سکی۔

لیکن مزدور طبقے کی حالت خراب ہوتی جاری تھی اور کان، ریلوے اور دیگر محکمات آمد و رفت میں کام کرنے والے اکثر ملازمین ۱۹۱۱ء کے ہڑتال کی بدولت بے روزگار ہو چکے تھے اس لئے اس وقت سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ ان[2] تینوں جماعتوں کو یکجا کرکے ایک متحدہ طاقت وجود میں لائی جائے جو مختلف اضلاع میں بیک وقت اپنے مطالبات کو پیش کرے۔ ان کے نہ حاصل ہونے کی صورت میں ایک متفقہ رائے پر عمل کرے اور جس وقت ممکن ہو عام ہڑتال کا اعلان کردے۔ اس قسم کا اتحاد ٹریڈ یونین کے لئے قابل فخر تھا مگر افسوس ہے کہ جنگ عظیم اس کی ترقی کے لئے بھی سد باب ہوئی۔

مختصر یہ کہ جنگ عظیم سے قبل کا زمانہ مزدوروں کی بے چینی کا وہ دور تھا جس میں ہڑتال اور صنعتی تنازعات کی بدولت مالک و مزدور دونوں مصیبت میں مبتلا رہے۔ اس بحث کو فی الحال ہم ہڑتالوں کے مندرجہ ذیل نقشہ کے ساتھ ختم کریں گے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ جنگ سے قبل کی شورش میں مزدوروں کی کس قدر کثیر تعداد نے ہڑتالوں میں حصہ لیا اور ان کا کتنا بیش بہا وقت مطالبات

---

[1] compulsory Conciliation

[2] کان۔ ریل۔ اور دیگر محکمات آمد و رفت کی مجلس کو ملا کر جو جماعت قائم ہوئی وہ Triple Alliance کے نام سے مشہور ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

راج کماری ۔ جو سرکاری نوکر ہو جس کے پاس بہت سا دھن ہو ـــــ روپیہ پیسہ ہو جائداد ہو۔

کرشن ۔ تو جب بھیّے کو نوکری مل جائے گی تو وہ بھی بڑا آدمی بن جائے گا ۔ ہے نا ماں ؟

راج کماری ۔ کوئی ایک دم سے تھوڑی برسیں گے ـــــ دھیرے دھیرے پرماتما کی دیا ہوئی تو پیسے والا ہو ہی جائے گا ۔

کرشن ۔ تو ماں یہ کیا بات ہے کہ کسی کے پاس زیادہ روپے ہوتے ہیں اور کسی کے پاس کم ۔

راج ۔ میں کیا جانوں ـــــ شاید یوں ہوتا ہے کہ جو بڑا کام کرتے ہیں انھیں زیادہ روپے ملتے ہیں اور جو چھوٹے کام کرتے ہیں انھیں کم ....

کرشن ۔ تو ہمارا بھیّا بڑا کام کیوں نہیں کرتا ۔

راج ۔ کہاں سے کرے ۔ کام ہو تو کرے ۔ کام ہی نہیں ملتا ۔

کرشن ۔ کیوں ؟ !

راج ۔ ایک جگہ خالی ہوتی ہے تو ہزار کام کرنے والے آموجود ہوتے ہیں ۔

کرشن ۔ کیا اچھا ہوتا اگر اتنے کام کرنے والے نہ ہوتے ـــــ

راج ۔ (خفیف مسکراہٹ سے) ہوں ۔ مگر یہ کیسے ـــــ

کرشن ۔ مگر ماں ۔ ہماری ٹیچر جی تو یہ کہا کرتی ہیں کہ بھگوان نے ہر آدمی کے لئے کوئی نہ کوئی کام پیدا کیا ہے ۔

راج ۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے ۔

کرشن ۔ تو پھر بھیّے کے لئے کام پیدا نہیں ہوا کیا ؟

راج ۔ ضرور ہوا ہوگا ۔ پر بٹیا آج کل کی تو دنیا ہی بدل گئی ہے ـــــ لے وہ آگیا جگدیش ۔

کرشن ـــــ بھیّے !!

(نوجوان جگدیش خستہ تن ، پژمردہ صورت ، پریشان حال سر جھکائے داخل ہوتا ہے ، ٹوپی تخت پر پھینک کر ایک کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے ۔ اُداس آنکھوں سے غصّہ اور نفرت کی چنگاریاں نکل رہی ہیں ۔

کرشن کماری، جلدی سے دوسرے کمرے میں جاتی ہے۔ راج کماری ترحم بھری نظروں سے
جگدیش کو دیکھتی ہے سینے پرونے کا کام بند کرکے، آہستہ آہستہ جگدیش کے قریب آتی ہے
لیمپ کی بتی کو اور اونچا کرتی ہے۔ جگدیش زمین میں نظریں جمائے ہوئے ہے۔ کچھ
دیر خاموشی رہتی ہے)۔

راج کماری۔ (نرمی سے) جگدیش !!!

جگدیش (بغیر سر اٹھائے) ہوں ؟

راج کماری — منہ ہاتھ دھو کے۔ کھانا کھالے نا۔ صبح سے بھوکا ہوگا —— !

جگدیش۔ (اسی طرح) ہوں !!

(کرشن کماری اندر والے کمرے میں سے کچھ برتن لئے ہوئے آئی۔ راج کماری
اس کے ہاتھ سے برتن لے کر تخت پر رکھتی ہے۔ کرشن کماری چپ چاپ میز
کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔)

راج کماری۔ آخر کیا گذری ؟ کچھ تو بتا !

جگدیش۔ گذری کیا —— پچاس کے قریب اُمیدوار تھے —— جو سب سے زیادہ 'نالائق'
سب سے زیادہ مکار، فریبی اور جھوٹا تھا اُس کو جگہ مل گئی اس لئے کہ اس نے ڈائرکٹر
صاحب کی جیب سونے اور روپے سے بھر دی تھی !!

راج کماری۔ بڑی ناانصافی ہے —— !!

جگدیش۔ ناانصافی !! ظلم ہے، اندھیر ہے، کھلّم کھلّا لوٹ ہے اور کیا ہے —— !!

راج کماری۔ خیر — تو چنتا نہ کر —— دیکھا جائے گا — بھگوان کبھی نہ کبھی تو ہمارے دن بھی پھیریں گے۔

جگدیش۔ بھگوان !!! —— یہ دن تو اب اپنے ہی پھیرنے سے پھریں گے —— !

راج کماری۔ (جگدیش کی ٹوپی کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے بولی، جا بیٹے کھانا تو لا —— (کرشن کماری
اندر والے کمرے میں جاتی ہے)۔

جگدیش ۔ میں روٹی نہیں کھاؤں گا ــــ

راج کماری ۔ کیوں ؟؟

جگدیش ۔ بھوک نہیں ہے ۔

راج کماری ۔ بھوک کیوں نہیں ہے ــــ کیا دن کو کچھ کھایا تھا ؟

جگدیش ۔ ہاں ہیرالال کے ساتھ چاء پی تھی ۔

راج کماری ۔ کون ہیرالال ؟ کیا لالہ شام لال کا بیٹا ؟؟

جگدیش ۔ ہاں، وہی ۔

راج کماری ۔ کیا کام کرتا ہے ۔ اُس کا باپ تو بڑا آدمی ہے ۔ کوئی اچھی نوکری دلوادی ہوگی ۔

جگدیش ۔ ہاں دلوادی تھی مگر اس نے چھوڑ دی ۔

راج کماری ۔ لگی لگائی نوکری چھوڑ دی یہ کیوں ؟

(کرشن کماری کھانا لے کر آتی ہے)

جگدیش ۔ وہ مغرور افسروں کی ٹھوکریں نہیں کھا سکا ــــ اور اب تو وہ دیش سیوا منڈلی کا سکرٹری ہے، پکڑا جائے گا کبھی نہ کبھی ! ــــ بیٹے کو دودھ لادے، روٹی نہیں کھائے گا ۔

کرشن کماری ۔ دودھ، اچھا !!

جگدیش ۔ کئی دفعہ پکڑا جا چکا ہے ۔ ابھی دو برس کی کاٹ کر آیا ہے ۔ اُس کی زبان میں ایسا جادو ہے کہ ہر کسی کا دل موہ لیتا ہے ۔ ملک میں بے چینی پھیلا دینے کے جرم میں پکڑا گیا تھا ۔

راج کماری ۔ تو اس نے کیوں بے چینی پھیلائی ؟ ۔

جگدیش ۔ ماں، بے چینی تو زمین میں آسمان میں ہوا میں پھیلی ہوئی ہے آج ہندوستان کا بچہ بچہ بے چین ہے ۔ بعض ایمانداری سے دل کی بات کہہ دیتے ہیں اور بعض دل ہی دل میں کڑھتے رہتے ہیں ۔ کچھ ایسے کمینے شخصوں نے اپنا ایمان جھوٹ کے ہاتھ بیچ رکھا ہے وہ ہی چین کا راگ گائیں مگر بے چینی کو کیسے مٹا سکتے ہیں ۔

کرشن کماری۔ بیٹے دودھ تو پی لو.........

جگدیش۔ (نئے جوش کے ساتھ).......... پر اب ہندوستان ایک نیا جنم لے گا۔ اس اُجڑے دیش کے ویرانے میں نئی دنیا بسے گی۔ یہاں کی تپتی ہوئی پیاسی ریت سے نئی ہری بھری کھیتیاں لہلہائیں گی —— پرجا کے دلوں کی راکھ سے، قبرستان اور شمشان کی مٹی سے ایک نئی پود جنم لے گی جو انسانیت کا جھنڈا بلند کئے ظلم کا سر کچل کر رکھ دے گی۔ دانہ دانہ کی محتاج رعایا کو اپنا خون، اپنی ہڈی اور چمڑا کھلا کر انھیں پروان چڑھائے گی —— انسانیت کی سیوا کرنا اس کا دھرم ہوگا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے ارادوں سے نہیں روک سکے گی —— جلد بہت جلد اس جنت نشان ہندوستان سے انیائے کا بیج مٹ جائے گا۔ اونچی اونچی عمارتیں، شاندار محل جن میں غریب کی روٹی کھا جانے والے امیر آنند کی سیج پر سوتے ہیں مسمار ہو جائیں گے غریب ان عمارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر میٹھی نیند سوئے گا —— نزدیک ہے وہ زمانہ جب سنسار پر انصاف، رحم اور نیکی حکومت کرے گی —— ظالم کا ہاتھ تھک گیا اور مظلوم کی پیٹھ نہ تھکی۔ آہ! مگر —— دیکھو ساری دنیا اب ہندوستان کی ہمت ہندوستان کی محبت اور سیوا کے گیت گانے والی ہے آزادی کا مندر سامنے ہے۔ پجاری! ہمت سے کام لے......

.... تیری منزل آگئی.........

راج کماری۔ جگدیش —— جگدیش! —— جگدیش!!! آہ!

(راج کماری نڈھال ہو کر تخت پر گر پڑتی ہے کرشن کماری دوڑ کر اس کے قریب آتی ہے جگدیش کا جوش بھی ٹھنڈا ہوتا ہے۔)

کرشن کماری —— ماں، ماں، کیا ہوا۔

راج کماری کی ہچکی بندھی ہوئی ہے۔

راج کماری۔ (بیٹھ کر) جگدیش! آہ! آج کس نے تجھے یہ سبق پڑھا دیا —— آہ! کیوں تباہی کے

پیچھے دوڑتا ہے ——

جگدیش۔ ماں، —— میں —— میں .... (تخت پر بیٹھ جاتا ہے)

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ کرشن کماری، راج کماری کو پانی کا گلاس دیتی ہے اور جگدیش کو دودھ —— دونوں پیتے ہیں —— خاموشی۔)

جگدیش۔ ماں —— میں۔ دیش سیوک کا ممبر ہو گیا ہوں۔

راج کماری۔ تو —— دیش سیوک منڈلی کا ممبر —— ہے بھگوان! یہ کیا ہو گیا۔

جگدیش۔ ماں۔ سنو تو سہی، دیش سیوک کوئی خطرناک سبھا نہیں ہے۔ بم بازی نہیں کرتی بلکہ صرف ہندوستان کے نوجوانوں میں عمل اور ہمت کا جوش پیدا کرتی ہے۔ آخر اس میں کیا برائی ہے۔

راج کماری۔ مگر آخر تجھے ایسی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔

جگدیش۔ ضرورت کچھ نہیں ماں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ ہندوستان کے ہر بچے کا فرض ہے۔

راج کماری۔ میں بیبے کار باتیں نہیں جانتی —— سُن۔ میں اپنے ماما سے کہہ کر تجھے کوئی نہ کوئی کاروبار کروا دوں گی تو ان باتوں کو چھوڑ۔ یہ سب بے کار اور ذلیل باتیں ہیں۔ آئے دن اس طرح کے فضول قصے سنتی رہتی ہوں —— یا پھر تو جانتا ہے کہ بھگوان کی دیا سے میرے پاس ابھی اتنا ہے کہ ہم تینوں مزے میں زندگی گذار سکتے ہیں۔ تو کچھ نہ کر —— میرے پاس رہ۔ میری سیوا کر۔ یہ دیش سیوک ویش سیوک سب بیکار کے جھمیلے ہیں۔

جگدیش۔ ماں، دیش سیوک بیکار کا جھمیلا نہیں ہے۔ اس نے تو ویسے کام کئے کہ کانگریس بھی نہیں کر سکی۔ اس وقت چھ سو سے زیادہ اس کے ممبر ہیں۔ دیوان امر سنگھ ہمارے سردار ہیں انھوں نے مجھے اپنا سکریٹری بنا لیا ہے۔ تنخواہ بہت معمولی ہے جو میرے گذارے کو بہت کافی ہے۔ تیس روپے میں سے آدھے تمہارے بھینٹ ہوں گے۔ آدھے میں میں گذر کروں گا۔

اُنھوں نے سر ہو کر مجھے ممبر بنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ تم ہندوستان کا بہت کام کر سکتے ہو۔

راج کماری۔ بیٹا! تو یہ تو سوچ کہ تیرے باپ دادا بہت عزت دار آدمی تھے اور سب سرکاری نوکر اب تو کیسے سرکار کی بغاوت کرتا ہے۔

جگدیش۔ ماں، ہمارا کام بغاوت کرنا نہیں۔ اپنے حقوق طلب کرنا ہے اور بس ـــــ تم گھبراؤ نہیں میں پرماتما کی دیا سے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے باپ دادا کے نام کو بٹہ لگے ـــــ میں مانتا ہوں کہ میرے باپ دادا نے سرکار کی خدمت میں اپنی جان تک گنوادی مگر اب وہ وقت نہیں کہ ہم اپنی قیمتی جانیں یوں ضایع کر دیں اس وقت ہندوستان کو ہماری خدمت کی ضرورت ہے۔ برسوں کے بعد آج ایسا موقع آیا ہے کہ جب جان پر بنی آبنی تو بھارت ماتا اپنے لاڈلے سپوتوں کی سیوا طلب کرتی ہے۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم اُس کی خدمت کو کھڑے ہو جائیں؟ ہم کوئی ناجائز بات نہیں کرتے، صرف اپنا حق مانگتے ہیں ـــــ

راج کماری۔ میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں ـــــ میری خاطر سے تجھے یہ خیال چھوڑ دینا پڑے گا۔

جگدیش۔ ماں، یہ ناممکن ہے ـــــ میں قسم کھا چکا ہوں۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی بے غیرتی یا بے عزتی کا کام نہیں کروں گا ـــــ کل ہم لوگ احمد آباد جائیں گے جلسے میں ـــــ

راج کماری۔ میں تجھے نہیں جانے دوں گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ

جگدیش۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، ماں، مجھے ضرور جانا چاہیئے مجھے تو تقریر کرنی ہے۔

راج کماری۔ اے رے ـــــ آہ! تجھے میری قسم جو جائے ـــــ

جگدیش۔ سوچو تو سہی یہ کیسے ـــــ

راج کماری۔ چاہے کچھ ہی ہو میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔

جگدیش۔ نہیں ماں، میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔

راج کماری ـــــ آہ ـــــ! (منہ ڈھانک کر روتی ہے)۔

کرتم آگیا نہ وہ — تمہیں اجازت دینی ہی پڑے گی ماں ؟

راج کماری — ایک شرط پر ——

جگدیش ۔ وہ کیا ؟

راج کماری (میز کی دراز میں سے ایک تصویر نکالتی ہے) دیکھ یہ تیرے پتا کی تصویر ہے اس کو سامنے رکھ کر قسم کھا کہ کوئی ایسا نیچ کام نہیں کروں گا جس سے تیرے باپ دادا کی عزت کو بٹہ لگے — ہمیشہ سچ بولے گا، ہمیشہ نیکی کی راہ چلے گا اور ہمیشہ بھگوان سے ڈرے گا ——

جگدیش ۔ (تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر) میں قسم کھاتا ہوں کہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے میرے باپ دادا کے نام کو بٹہ لگے، ہمیشہ سچ بولوں گا اور نیکی کی راہ چلوں گا —— بھگوان مجھے اس عہد کو پورا کرنے کی شکتی دے —— "

راج کماری جگدیش کو گلے سے لگا لیتی ہے ۔

دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں ۔

پردہ

دوسرا منظر

(پانچ سال بعد وہی کمرہ ۔ وہی سامان مگر ذرا شکستہ حالت میں ۔ دسمبر کا مہینہ رات کے دس بجے کا وقت، کنتی عمر بارہ سال لیمپ میز پر رکھ کر کھڑکی کھولتی ہے راج کماری نحیف و نزار اندر والے کمرے میں سے آتی ہے)۔

راج کماری ۔ کنتی ۔ یہ تو نے کھڑکی کیوں کھول دی ۔ بند کر جلدی ۔

(کنتی کھڑکی بند کرتی ہے)

تجھے یاد نہیں اس نے کہا تھا کہ میری آواز آنے کے بعد کھڑکی کھولنا ——

کرشن کماری ۔ مگر ہاں ـــ آج تو بیٹے شاید ہی آسکیں ۔ باہر تو موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور بڑی تیز ہوا چل رہی ہے۔

راج کماری ۔ مگر اس نے آج ہی کے دن آنے کو کہا تھا ـــ (تخت پہ بیٹھتے ہوئے) آج بدھوار ہے نا؟ وہ ضرور آئے گا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وعدہ کے مطابق نہ آیا ہو۔ چاہے کتنی ہی سردی ....

کنتی ۔ یہ کیسی آواز ـــ (خاموشی)

راج کماری ۔ یہ تو ہوا کی آواز ہے۔

کنتی ۔ باہر اتنی تیز ہوا چل رہی ہے کہ چاہے کوئی کتنا ہی چلائے آواز آنی مشکل ہے ۔ بارش ـــ

راج کماری ۔ سن تو سہی ـــ پھر آواز آئی (خاموشی)

(کرشن کماری دائیں طرف کا دروازہ کھولتی ہے ہوا کا تیز جھونکا اندر آتا ہے)

راج کماری ۔ دروازہ بند کر جلدی ـــ دو میل پرے سے بھی آدمی نظر آجائے گا۔ جب کبھی دروازہ کھولے روشنی کم کرکے کھولیو ۔ (کنتی تخت پر بیٹھ کر جلدی جلدی بنتی ہے)۔

راج کماری ۔ یہ کیا بُن رہی ہے اس وقت؟

کنتی ۔ بیٹے کا سوئٹر ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آج آئیں گے نہیں تو میں اسکول میں پورا کرتی ـــ بس کالر لگانا باقی ہے ـــ آج ہی دے دوں گی کیونکہ پتہ نہیں وہ پھر کب آئیں۔

راج کماری ۔ ہاں، یہ تو بتا آج تو کہہ رہی تھی کہ شہر میں بہت سے لال کوٹ والے پکڑے گئے۔

کنتی ۔ ہاں، بارہ ٹونٹی کے قریب پولیس والے بہت سے لال کوٹ والوں کو پکڑے لئے جا رہے تھے ـــ ذرا سننا، بیٹے کی آواز تو نہیں ہے ـــ (خاموشی) ـــ

راج کماری ۔ نہیں ـــ یہ تو چوکیدار کی آواز ہے ـــ

کنتی ۔ ہاں، تو میں نے بڑے غور سے دیکھا کہ کہیں بیٹے تو ان میں نہیں ہے ....

راج کماری ۔ دیکھ تو ـــ تو نے کھانا کافی بنا لیا ہے نا؟

کنتی ۔ اں ہاں ـــــــ

راج کماری ۔ پچھلی دفعہ جب وہ آیا تھا جس کو آج سات دن ہو گئے تو کہہ گیا تھا کہ روٹی زیادہ پکا دینا میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی لے جاؤں گا ـــــ "

کنتی ۔ ہاں، آخر یہ حالت کب تک رہے گی۔ کب تک چوروں کی طرح رہا جا سکتا ہے ۔

راج کماری ۔ یہی تو میں بھی سوچتی ہوں ۔ ڈیڑھ سال سے پولیس ان لوگوں کی تلاش میں ہے ۔ پکڑے جائیں گے ایک نہ ایک دن ضرور ۔ جگدیش کہہ رہا تھا کہ ۔۔ ہم سے زیادہ ویش سیوک جیل میں بند کئے جا چکے ہیں اور بغیر کسی قسم کا مقدمہ چلائے ۔ صرف سر پھرے باقی ہیں جن کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ـــــ سات تو دلی ہی کے ہیں ۔

کنتی ۔ تو ہاں، بیٹے ہی کیا سردار ہو گئے ہیں (سویٹر مکمل کر کے میز پر رکھتی ہے) ۔

راج کماری ۔ ارے سردار !! اس نے تین سال کے اندر ہی اندر وہ نام پیدا کیا کہ ہر اخبار اور رسالے میں اس کی لمبی چوڑی تعریفیں چھپنے لگیں ۔ کالج اور اسکول کے لڑکے اس کے نام کے گیت گاتے ہیں ـــــ سن ۔ آواز !!

(ـــ خاموشی ـــ) ہاں، یہ اسی کی آواز ہے، جلدی کر کھڑکی کھول ـــــ !

(کنتی جلدی سے کھڑکی کھولتی ہے اور میز لیمپ کی بتی اتنی نیچی کرتی ہے کہ منظر تاریک ہو جاتا ہے دائیں طرف کے دروازے سے کوئی شخص داخل ہوتا ہے ۔)

راج کماری ۔ جگدیش !!

جگدیش ۔ (خوشی کے لہجے میں) ہاں ہاں، !!

کنتی ۔ بیٹے !! تم آ گئے ـــــ !!

(جگدیش کھڑکی بند کر کے لیمپ کی بتی اونچی کرتا ہے اس کے کشادہ چہرہ پر دائمی وحشت کے آثار کے ساتھ ساتھ خوشی کی چمک پیدا ہے) ۔

کنی ۔ ارے بیٹے !! تمھارے تو سارے کپڑے بھیگ گئے ۔

جگدیش ۔ ہاں ! بارش بھی تو زبردست ہو رہی ہے اور پھر میں تلب گڑھ سے پیدل چلا آرہا ہوں۔

راج کماری ۔ تلب گڑھ سے پیدل !!!

جگدیش ۔ ہاں، ہاں

راج کماری (اندر کمرے میں جاتے ہوئے) شاباش ہے بیٹا تیری ہمت کو۔

کنی ۔ کھانا کھاؤ بیٹے ۔ لاؤں ؟

جگدیش ۔ ضرور ــ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے کل سے کچھ نہیں کھایا۔

کنی جلدی سے جاتی ہے ۔ راج کماری اندر سے جگدیش کے لئے نئے کپڑے لاتی ہے ۔

راج کماری ۔ لے، جلدی بدل لے، میں انگیٹھی جلاتی ہوں، سینک لیو، کہیں بخار نہ چڑھ جائے۔

(جگدیش گیلا کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر پھیلاتا ہے، راج کماری
انگیٹھی میں آگ روشن کرتی ہے ۔ جگدیش اندر کمرے میں کپڑے
بدلنے جاتا ہے ۔ کنی جلدی جلدی اندر سے کھانا لا کر میز پر رکھتی ہے)

راج کماری ۔ کنی، تو ذرا انگیٹھی سلگا، میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں ۔

(راج کماری جاتی ہے ۔ جگدیش آتا ہے)

جگدیش ۔ کھانا تیار ہے کنی ؟ جلدی کر ــ مجھے ابھی واپس جانا ہے۔

کنی ۔ ابھی ؟؟

جگدیش ۔ ہاں، پرشوتم اور ہیرالال دونوں بچارے ایک باغ میں بھوکے پڑے ہوں گے۔

کنی ۔ باغ میں؟ کون سے باغ میں ؟

جگدیش ۔ چپٹی زمیں کا باغ !!

(تخت پر بیٹھ کر کھانا شروع کرتا ہے ۔ ذرا دیر بعد زور زور سے
دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے ۔ جگدیش دوڑ کر برابر والے کمرے میں چلا جاتا ہے)۔

آواز ۔ دروازہ کھولو، جلدی

کنتی ۔ کون ہے ؟

راج کماری ۔ (اندر سے گھبرائی ہوئی آتی ہے ۔ دودھ کا گلاس ہاتھ میں ہے) کون ہے ؟

کنتی ۔ کون ہے ؟؟؟

آواز ۔ ہم ہیں ۔ کھولو

کنتی ۔ (چاروناچار دروازہ کھولتی ہے ۔ ایک سب انسپکٹر مع چند سپاہیوں کے داخل ہوتا ہے)

ایک سپاہی ۔ داروغہ جی شکار تو بھاگ گیا ۔

داروغہ جی ۔ مگر کھوج چھوڑ گیا ہے ـــــ یہ دیکھو یہ کوٹ !! !!!! !!!

دوسرا سپاہی ۔ اور یہ کھانا اسی کے لئے پروسا گیا ہے ۔ ہوں !!

تیسرا سپاہی ۔ (دودھ کا گلاس چڑھاتے ہوئے) اُفوہ ! آج کتنا پریشان ہونا پڑا ۔

راج کماری ۔ داروغہ جی، مجھ دکھیا کو آپ بار بار کیوں ستاتے ہیں ۔ میں کہتی ہوں کہ جگدیش کا مجھے کوئی پتہ نہیں ۔ وہ میرے ہاں سے عرصہ سے غائب ہے ۔

داروغہ ۔ خیر، ماتاجی، آپ پریشان نہ ہوں ۔ ہم آپ کے لاڈلے کو ابھی آپ سے ملائے دیتے ہیں ـــــ جاؤ !! (آنکھ سے اندر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ دو تین سپاہی اندر گھس جاتے ہیں) اے لڑکی !! یہ کون ہے ؟

راج کماری ۔ (خوف زدہ لہجے میں) میری بیٹی کرشن کماری !!

داروغہ ۔ ہا!! ۔ خوب، خوب !! (للچائی ہوئی نظروں سے کنتی کی طرف دیکھتا ہے) ہا ـــ !!

(سپاہی جگدیش کو رسیوں سے جکڑے ہوئے نمودار ہوتے ہیں)

داروغہ ۔ کیوں مسٹر جگدیش منوہر لال ۔ اے دیش سیوک کی منڈلی کے سردار اعظم اپنی ماتاجی سے ملے ۔ انہیں آپ سے ملے عرصہ ہو گیا ۔ ہا!! ۔ ماتاجی یہ حاضر ہیں آپ کے سپوت ۔

ـــــ ۱۱۱ ـــــ ۱۱۱ ـــــ

(سب سپاہی قہقہہ لگاتے ہیں، داروغہ جی کرسی پر براجمان ہوتے ہیں)

راج کماری۔ بیٹا ــــ !!! آہ ــــ !!!

جگدیش۔ ماں، تم گھبراؤ نہیں۔ سب دیکھا جائے گا۔ انجام ٹھیک ہی ہوگا۔

داروغہ۔ ہاں۔ بہت ٹھیک !! صرف کالا پانی۔ !!! ــــ گھبرانے کی کیا بات ہے ابھی یہ تو تمہارے نیک کرموں کا پھل ہے تمہیں بھوگنا ہی پڑے گا۔ کیوں !!! !!!

(جگدیش خاموش رہتا ہے)

داروغہ جی۔ اچھا مسٹر ایک بات بتا دو ہمیں۔ صرف ایک بات! تمہارے دوست پرشوتم اور ہیرا لال کہاں ہیں۔ بولئے۔

(جگدیش خاموش رہتا ہے)

داروغہ جی۔ دیکھئے جگدیش صاحب! اگر آپ نے اس سوال کا ٹھیک جواب دیدیا تو آپ کے حق میں اچھا ہوگا۔

جگدیش۔ خاموش رہتا ہے۔

داروغہ جی۔ آپ نہیں جانتے ــــ کیوں

جگدیش خاموش رہتا ہے

داروغہ جی۔ دیکھئے یہ کھانا آپ انہی کے لئے لینے آئے تھے نا؟ تو پھر وہ آپ سے کہاں ملیں گے۔ بتائیے؟؟

جگدیش خاموش رہتا ہے۔

داروغہ۔ اوہو ہو ہو ــــ صاحبزادے! تم ہمیں چکّر دیتے ہو۔ تم جیسے لاکھوں چٹکی میں مسل کر پھینک دیئے۔ میاں حکومت سے جنگ کرنے کے لئے ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہئے۔ ڈانٹ کر بولو، جواب دو !!

جگدیش خاموش رہتا ہے۔

داروغہ جی —— ہا ہا —— ہو مضبوط!! کیوں نہو۔ اچھا آج آپ کو کسی باغ میں جانا تھا نا۔
مثلاً چھٹی نویس کے باغ میں —— کیوں جناب —— نہ کہو گے؟ ہا ہا ہا —— مُرادی۔
انھیں لاؤ ——

مرادی سپاہی باہر کھڑے ہوئے آدمیوں کو بلاتا ہے چند سپاہی پرشوتم اور
ہیرالال کو پا بہ زنجیر لاتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی جگدیش سٹ پٹا جاتا ہے)

پرشوتم اور ہیرالال (جگدیش کی ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر) ماتا جی!
راج کماری (ضبط کرتے ہوئے) جے ہو۔ بچو!!
داروغہ جی۔ مسٹر جگدیش، اپنے دوستوں سے ملئے جنھیں آپ چھٹی نویس کے باغ میں بھوک سے
بیقرار چھوڑ کر یہاں اپنے حلوے مانڈے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ناحق ان غریبوں
کو دھوکا دے کر آپ نے اس مصیبت میں پھنسایا —— خیر۔ اب چلئے ذرا بڑے گھر کی
بھی سیر کیجئے (کمرا ہو جاتا ہے سپاہی قیدیوں کو حلقہ کئے ہوئے ہیں) اچھا ماتا جی اب
اجازت ہے! پھر کبھی حاضر ہوں گا ——
جگدیش۔ ماتا جی، چنتا نہ کرنا۔ میں جلدی چھوٹ کر آؤں گا —— دعا کرتی رہئے گا ——
بہن کنی —— رخصت۔ ہمیں بھولنا نہیں ——
راج کماری پتھر کے مجسمہ کی طرح ساکت ہے —— کنی کی آنکھ سے آنسو کا سمندر رواں
ہے —— چلاتی ہے۔ "ٹھہرو!" سب ٹھہر جاتے ہیں وہ اپنا بنا ہوا سوئٹر جگدیش کو
دیتی ہے۔
کنی . بھیئے۔ یہ تمھارے لئے بنا تھا۔ اسے میرے سامنے ضرور پہن لو ——
(داروغہ جی کی اجازت سے جگدیش سوئٹر پہن لیتا ہے)
جگدیش۔ کنی انھیں سلام کرو۔ یہ بھی تمھارے بھائی ہیں۔
(کنی ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کرتی ہے)۔

پرشوتم ۔ شکنتلا بہن — بھگوان تمہیں خوش رکھے۔

جگدیش پرشوتم اور ہیرا لال — رام رام ماتا جی

راج کماری بہت ہی کھڑی ہے۔ دروازے کے قریب پہنچکر جگدیش گانا شروع کرتا ہے۔ پھر تینوں یک آواز زور زور سے گاتے ہوئے رات کی تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں ۔

آ پہونچے بھئی آ پہونچے ؛ دیش کے سیوک آ پہونچے
ہاتھ میں لے کر سرخ نشان ؛ ننگے بھوکے پیر و جوان
آ پہونچے بھئی آ پہونچے
دیش کے سیوک آ پہونچے

کنتی دروازے سے لگی غور سے دیکھتی رہتی ہے اس کی بیتاب نظریں تاریکی کو چیر کر پار ہونا چاہتی ہیں۔ گانے کی آواز بتدریج کم ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ کنتی بیہوش ہو کر تخت پر گر پڑتی ہے۔

راج کماری۔ (کنتی کے قریب آتے ہوئے) کنتی بیٹیا! تو کیوں روتی ہے۔ اری مورکھ یہ تو ہنسنے اور خوشی سے پھول جانے کا مقام ہے۔ دیکھ، کیا تیرے بیٹے کی آواز اب تیرے کانوں میں نہیں آ رہی۔ مگر میں سن رہی ہوں۔ اس کی آواز۔ وہ جوشیلا نعرۂ جنگ پہاڑیوں وادیوں، صحراؤں اور جنگلوں میں گونجتا ہوا آج سنسار پر چھا رہا ہے تو ابھی بچہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی اس لئے روتی ہے مگر یہ واقعہ میری آنکھوں میں جگدیش منوہر کی ماں کی آنکھوں کو رنج یا افسوس کے ناپاک آنسوؤں سے تر نہیں کر سکتا۔ کل تک میں صرف ایک نادان اکھڑ سے لڑکے کی ماں تھی جو چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر روٹھ جایا کرتا تھا مگر آج — آج میں اس جواں مرد اس مغرور سردار کی ماں ہوں جس نے موہ اور لالچ کو لات مار کر اپنی جان اپنا سکھ اپنا چین بھارت ماتا کے چرنوں میں تج دیا۔

-([illegible])-

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

افسانہ کا پلاٹ

فرض کرو ایک باغ ہے اس میں گلاب کے بے شمار درخت ہیں۔ لالہ، نرگس، سنبل، نسترن، جوہی، بیلا وغیرہ وغیرہ پھولوں کی بیلیں اور پودے بے تحاشا اُگ رہے ہیں، سبزہ ہے، اشجار ہیں۔ مگر ان میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہے، کوئی آراستگی نہیں دکھائی دیتی۔ اس باغ کو کوئی دیکھے تو یہی کہے گا کہ چمن شاداب تو ہے مگر غیر آراستہ ہے، پودے اور پھول دار درخت سب دل لبھانے والے ہیں مگر ان کا مجموعی اثر کچھ اس قسم کا ہے کہ ذوقِ نظر کی تسکین نہیں ہوتی۔ مذاقِ سلیم یہ چاہتا ہے کہ ان میں کچھ کاٹ چھانٹ کرکے آراستگی پیدا کی جائے۔

یہی حال افسانہ کا ہے۔ ایک کہانی ہو سکتا ہے کہ بہت دلچسپ ہو مگر جب تک اس میں واقعات کو مناسب جوڑ نہ بیٹھے وہ صحیح معنوں میں افسانہ نہیں ہو سکتی۔ اپنی آسانی کے لئے اگر ہم "واقعات کے اس جوڑ" کو "پلاٹ" کہہ لیں تو یوں کہا جائے گا کہ افسانہ ایک ایسا پلاٹ چاہتا ہے جو مناسب قطع و برید کے بعد پیش کیا گیا ہو۔ واقعات اور افراد کے میل سے افسانہ بنا دینا کوئی کمال نہیں۔ افسانہ تو ہمیشہ ایک پختہ پلاٹ سے بنتا ہے۔ اس میں یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ گذشتہ واقعے سے منطقی لزوم کا یعنی فطری تعلق رکھتا ہو۔ اور حالات ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہوں کہ تناسب ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ نیز ہر جزو اپنے کل سے اس طرح وابستہ ہو کہ اس کی تکمیل کرتا نظر آئے۔

اکثر [illegible] واقعات مکمل پلاٹ نہیں ہوتے۔ سچ یہ ہے کہ تصورات کی رنگ آمیزی کے بغیر کوئی واقعہ [illegible] نہیں ہو سکتا۔ آپ کوئی افسانہ پڑھیں اگر وہ صرف اصلی واقعات پر مشتمل ہے تو کبھی بھی [illegible] جب تک متاثر کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ اس کے قابل ہی نہیں۔ ایک حقیقی [illegible] سکتا ہے مگر ایسی بہت ہی سکتے ہیں یہ نہیں کہ اصلی واقعے کو ان کا [illegible]

اس کی وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ حقیقی واقعات میں عمل اور پاداشِ عمل یعنی وجہ اور نتیجہ کا اثر پوری طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ وجوہات اور نتائج حقیقی واقعات میں بھی کار فرما ہوتے ہیں لیکن وہ غیر ضروری چیزوں کے ڈھیر میں چھپ جاتے ہیں۔ تصوری دنیا میں ان کا چھپ جانا ممکن نہیں۔ یہاں واقعات کا صحیح تعلق بے نقاب ہو کر ہی رہتا ہے۔ مثلاً ایک حقیقی واقعہ کی رو سے ایک ایماندار آدمی دفعتاً جواری بن سکتا ہے۔ اب یہ تو را واقعہ۔ اگر عقل کو اس پر حرف گیری کرنے دی جائے تو اس کا اعتراض یہ ہوگا کہ ایک ایماندار آدمی جواری نہیں بن سکتا یا تو وہ شروع ہی سے اندر ہی اندر جواری ہوگا یا اس کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہوگی۔ ان دونوں ہی مفروضوں میں سے ہر ایک پر ایک افسانہ تعمیر ہو سکتا ہے۔ یہ افسانہ اصلی واقعہ سے ہو بہو مطابق تو نہ ہوگا، مگر اس تصوری اعتبار سے سو فی صدی ٹھیک ہوگا۔ ہوا کیا؟ تصور نے اس خلا کو بھر دیا جو واقعہ خالی چھوڑ گیا تھا یعنی ایک پوشیدہ کڑی کو مہیا کر کے تصور نے فسانہ کو مکمل کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلی واقعہ ایک شخص کے ذہن کو چونکا کر اس میں یہ احساس چھوڑ دیتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ ادھورا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حقیقت افسانہ سے زیادہ عجیب ہوتی ہے۔ مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حقیقی واقعات اپنے اجزا کا نفسیاتی تعلق نہیں دکھا سکتے۔ رہا افسانہ وہ اگر نفسیاتی نہ ہو تو کچھ ہے ہی نہیں۔

اب اس اعتبار سے کہ افسانے کی بناوٹ نفسیاتی اصولوں پر ہوتی ہے افسانے کا پلاٹ زیادہ سے زیادہ سادہ اور لطیف ہونا چاہئے۔ اور یہ صحیح ہوتا ہے۔ چونکہ افسانہ زندگی کی کیفیات کا ترجمان ہے اس لئے پیچیدگی سے اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ مگر اب اس کا کیا جواب ہے کہ "پلاٹ" کا تصور ہی ہر خواندہ آدمی کے ذہن میں واقعات کا ایک الجھاؤ ہوتا ہے؟ کوئی معاملہ بڑی پیچیدگی سے وقوع پذیر ہو تو کہتے ہیں کہ پلاٹ کھیلا گیا۔ ڈراموں اور ناولوں کے پلاٹ کو دیکھئے کتنے متضاد جذبات کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر کے پلاٹ بنایا جاتا ہے۔ افسانے میں حالات کی پیچیدگی کا یہ عالم تو نہیں ہے مگر یہاں بھی کسی نہ کسی حد تک افراد، واقعات اور جذبات کو ایک الجھاؤ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں "وحدتِ تاثر" کا خیال اور سب ضرورتوں پر مقدم رکھا جاتا ہے

چھوٹے افسانے کا پلاٹ اس طرح بنتا ہے وہ ناول یا ڈرامے کے پلاٹ سے کم درجے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ
اس سے کہیں زیادہ تابناک ہی رہتا ہے۔ افسانے کی "سادگی" ہی اس کی "طاقت" بن جاتی ہے۔
ناول یا ڈراموں میں جہاں بہت سے سلسلے ایک دوسرے میں خلط ملط کردئے جاتے ہیں، پڑھنے والے
کا دماغ پریشان سا ہو جاتا ہے۔ اثرات ایک لمحے کے لئے چمکتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ قاری کا دماغ
ابھی ایک راستے پر جا رہا ہے ابھی مصنف نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے دوسرے راستے پر گھسیٹ لیا۔
افسانے میں یہ "گھسیٹم گھساٹی" نہیں ہوتی کیونکہ اس کھینچا تانی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

افسانہ تو صرف "وحدت تاثر" پیدا کرنے کا نام ہے اور بس، مگر ابھی ایک سوال باقی ہے پوچھا
جا سکتا ہے کہ سادہ پلاٹ اچھا سہی لیکن کیا وہ پیچیدہ پلاٹ کی بہ نسبت ذرا کم فطری نہیں؟ تفصیل اس
اجمال کی یوں ہے کہ یہ کہنے والے کے نزدیک افسانہ کا سادہ پلاٹ واقعات کو بکھری ہوئی حالت میں
دکھاتا ہے اور دنیا میں حالات کبھی اس طرح الگ الگ نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک دوسرے میں خلط ملط
رہتے ہیں۔ درست، مگر کیا حالات کے ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے کے باوجود بھی انسان سب
حالات سے ایک ہی وقت میں گذر جاتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ بلکہ ایک وقت میں اس پر ایک ہی حالت
طاری ہوتی ہے۔ بہت سے کام وہ "ایک مقصد" کے ماتحت کرتا ہے اور اس مقصد کا بیج عمل کی کیاری
میں بوتے وقت یہ بالکل نہیں سوچتا کہ اب سے چند یا بہت سال بعد یہ مقصد یا عمل اس کی اپنی یا
دوسروں کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔

ممکن ہے چند "بیدار مغز" ایسا بھی کرتے ہوں اور "پیش فکر" اعمال سے آئندہ کا اندازہ لگا کر
"دوش" یا "حال" کے "آئینے" میں "فردا" کو دیکھ لیتے ہوں مگر وہ بہرحال چند ہی تو ہوئے۔ عام
طور سے تو یہ نہیں ہوتا۔

لہذا اگر افسانے کی پوچھتے ہو تو وہ دکھائی اس یقین پر جاتا ہے کہ واقعات ایک دوسرے سے
پیوستہ ہونے کے باوجود بھی علیحدہ علیحدہ ہیں وہ کڑیوں کی طرح سے ہیں کہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی
بھی ہوتی ہیں اور جدا جدا بھی۔

گویا افسانہ نگار اور ناول نویس دونوں کی کوشش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر جس طرح زمین اپنی جگہ پر ٹھیک ہے اور آسمان اپنی جگہ پر درست ہے اسی طرح افسانہ نگار اپنی کوشش پر حق بجانب ہے اور ناول نویس اپنے انداز پر۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ افسانہ نگار کا طرز زندگی سے زیادہ ملتا جلتا ہے کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے نصف النہار کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔

یہی نصف النہار افسانے کے پلاٹ میں سب سے زیادہ معرکے کی چیز ہے۔ اور افراد اور عمل کی ٹکر سے پیدا ہوتا ہے۔ پلاٹ کا کمال یہ ہے کہ ان دونوں کو اس طرح ٹکرایا جائے کہ نصف النہار پیدا ہو جائے۔

کسی فرد کے راستے میں جب تک کوئی اٹکاؤ پیدا نہ ہو اس کا کیرکٹر جاذب توجہ نہیں ہوتا اور عمل جب تک کسی عورت یا کسی مرد یا بالفاظ دیگر کسی فرد سے متعلق نہ ہو دلچسپی سے محروم رہتا ہے۔ فرض کرو ایک بشر ہے وہ منطقۂ جنوبی میں رہتا ہے جہاں کوئی آدم رہتا ہے نہ آدم زاد، ہمیں اس سے کیا؟ جیتا ہے جئے، مرتا ہے مر جائے۔ ہاں اگر وہ کہیں دلی کی نواح میں آن نکلے اور لگے توسیوں کو چاٹ کھانے، تو یقیناً ہمیں اس سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی غرض ایک افسانہ میں فرد اور عمل کو ایک دوسرے سے ٹکرانا چاہئے۔ فرد کچھ کرے یا فرد کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو۔ افسانہ اور بالخصوص کامیاب افسانہ کسی فرد کی تصویر، یا حالات کی پیچیدگی، یا واقعات کا بیان یا کوئی سنسنی خیز حادثہ ہونے پر بس نہیں کرتا۔ کامیاب افسانہ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر ان سب پر مستزاد اس میں افراد اور اعمال کی ایک نتیجہ خیز ٹکر بھی ہوتی ہے۔

ڈرامے اور ناول میں تو یہ صورت ہوتی ہے کہ پلاٹ اپنے نصف النہار تک بنتا ہوا اور پھر اس کے بعد اپنے انجام کی طرف ڈھلتا ہے لیکن افسانہ میں یہ معاملہ نہیں ہوتا یہاں نصف النہار ہی انجام ہوتا ہے اگر نصف النہار کے بعد کچھ اور کہا جائے یا چند اور نتائج افسانے کی دم سے باندھے جائیں تو افسانہ کا اثر بالکل زائل ہو جائے۔ جو ایک سادہ سی پیچیدگی افسانے میں پیدا ہوتی چلی آئی ہے وہ نصف النہار پر پہنچ کر نتائج کا مجموعی اثر بے نقاب کر دیتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔

اگر یہ افسانہ کا نصف النہار ہے کیا ؟ اس کی مختلف صورتیں ہیں کبھی تو نصف النہار وہ واقعہ یا حادثہ ہوتا ہے جس کی سمت حالات دوڑتے چلے جاتے ہیں کبھی وہ "صورت حال" ہوتا ہے جس کی وجہ سے افسانہ لکھنے کی ضرورت پڑی تھی یا جس نے تصورات یا خیال کو برانگیختہ کیا تھا اور ذہن کو افسانہ تراشی کی طرف متوجہ کیا تھا مگر یہ یاد رہے کہ حادثہ ہو یا واقعہ، صورت حال ہو یا کچھ اور، جس شکل میں اور جس طرح بھی ہو نصف النہار "وحدت تاثر" سے رنگین ہوتا ہے۔

بس یہی افسانہ کا نصف النہار ہے ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ خواہ کسی رنگ میں ہو کہانی کی کیفیت سے ضرور مطابقت رکھتا ہے مثلاً ایک ایسے افسانہ کا نصف النہار جس میں کسی فرد کا کیرکٹر دکھایا گیا ہو یہی اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کیرکٹر کو کسی نازک مرحلے پر لا کر چھوڑ دیا جائے اب یہ نازک مرحلہ کیا ہو سکتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہ نازک مرحلہ حالات یا واقعات کی کسی معرکتہ الآرا تبدیلی کی صورت میں نمودار ہوگا۔

برخلاف اس کے اگر افسانے میں "عمل" غالب ہے تو نصف النہار کوئی حادثہ ہوتا ہے اور اگر کہانی کا ماحول "فضائی" ہے تو نصف النہار میں یہ فضا اپنے انتہائی عروج پر پہنچ جائے گی غرض کہانی کی انتہائی بلندی کو بھی وحدت تاثر کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ افسانہ کا "نصف النہار" کیا ہے مگر یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ نصف النہار تعمیر کس طرح کیا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر اس نصف النہار تک کہانی کیوں کر پہنچتی ہے ؟ صورت اس کی یہ ہے کہ افسانہ کے پلاٹ کے راستے میں دفعتاً کوئی روک حائل ہو جاتی ہے اور جب پلاٹ اس سے نکل آتا ہے تو نصف النہار نمودار ہو جاتا ہے۔ مگر کسی معمولی روک سے یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی اس کے لئے موثر سد راہ ہونی چاہئے۔ فرض کرو کہ ایک شخص موٹر پر دلی سے اوکھلے جا رہا ہے اور اسے پوری توقع ہے کہ بس چند منٹ بعد اوکھلے جا پہنچوں گا۔ اب راستے میں کھدی ہوئی ہے خندق۔ اتفاق ہے کہ راستہ بند ہے کیا ہوگا ؟ وہ گھر واپس آ جائے گا لیکن محض ان واقعات سے کہ ایک شخص اوکھلے کے ارادے سے شہر سے چلا اور راہ کو مسدود پا کر واپس چلا آیا، محض ان واقعات سے افسانہ نہیں بن سکتا۔

لیکن اگر یہ واقعات یوں ہو جائیں کہ وہ گھر واپس ہوتا تھا کہ کچھ خیال آیا اور راستے میں نالی کی طرف مڑ گیا اور وہاں ایک سڑک پر اسے اپنا ایک دوست نیم جان پڑا ملا ــــــ تو پڑھنے والے کا ذہن پھر سے فوراً متوجہ ہو جائے گا کہ یہی دیکھیں اب کیا ہوتا ہے اگر بات یہیں تک رہتی کہ وہ کھیلنے کی طرف گیا، راستہ بند تھا، واپس ہو گیا تو یہ بہت سادہ، بہت بے رنگ، بہت بے کیف اور بہت غیر دلچسپ رہتی۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز ہونی چاہئے جو معمول سے بڑھ کر ہو۔ راہ میں روڑا تو ضرور اٹکنا چاہئے۔ یہ تو ہے پلاٹ کا موازنہ، مگر راستہ بالکل مسدود نہیں ہو جانا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ سفر وہیں ختم ہو گیا۔ پلاٹ کا قدم کسی نتیجہ خیز انجام کی طرف بڑھتا رہنا چاہئے۔ اور یہی نتیجہ خیز انجام افسانہ کا نصف النہار ہے یوں تعبیر کیا جاتا ہے نصف النہار۔

اگر وہ روک جو افسانے کے راستے میں واقع ہوئی ہے حقیقی اور ناقابل جنبش ہے تو بڑا زبردست تصادم واقع ہوگا فرض کرو دو موٹر سائیکلیں مخالف سمتوں سے آ رہی ہیں اور وہ ایک موڑ پر ایک دوسرے کے مقابل آ جاتی ہیں۔ ایک زبردست ٹکر ہوگی یا نہیں؟ پھر جب ٹکر ہوگی تو یا تو دونوں میں سے ایک موٹر سائیکل چورا ہو جائے گی یا دونوں ہی کھیت رہیں گی۔ اس خاص مثال میں اس امر کا بھی امکان نکلا کہ موٹر سائیکلیں ڈھیر ہو جائیں۔ افسانے میں یہ صورت کبھی متصور نہ ہوتی۔ افسانے کا پڑھنے والا کبھی یہ توقع نہیں کرتا کہ یہ دونوں طاقتیں (یعنی ایک تو پلاٹ اور دوسری کوئی روک) جو آپس میں ٹکرا رہی ہیں ٹکرا کر بالکل ہی ختم ہو جائیں گی۔ وہ نہ تو یہی سمجھتا ہے کہ پلاٹ روک سے ٹکرایا اور بس ختم ہوا اور نہ یہ مانتا ہے کہ وہ چیز جو درمیان میں حائل ہے کچل دی جائے گی اور افسانہ فراٹے بھرتا ہوا آگے بڑھ جائے گا اور سچ بھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ درمیان میں حائل ہونے والی چیز تصادم سے کامیاب نکلتی ہے اور افسانہ اپنے انجام تک اسی چوٹ کو لئے ہوئے چلا جاتا ہے جو اسے متصادم ہونے سے لگی ہے یہی صورت ہے جیسے کسی چیز سے ٹکر کھانے کے بعد موٹر کا ڈھانچہ پچک جائے تو اسی حال میں موٹر منزل تک جاتا ہے۔ یہ فراموش نہ ہو کہ حائل ہونے والی چیز یا "روک" اور "عمل تصادم" دونوں الگ الگ چیزیں ہیں روک تصادم کی بنا ہے، اصل تصادم نہیں۔

پھر ایک چیز یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار از خود ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو افسانے کو نصف النہار تک سلجھا ہی نہ سکا ہو تو افسانہ ہے کیا سوائے پلاٹ کی "حرکت کے" افسانہ کی تعمیر کا ڈھنگ ایسا نہیں کہ جیسے کوئی چیلا کہیں بے سبب چلتے جاتا ہے کبھی یہاں کھڑا ہو گیا کبھی وہاں ٹھہر گیا، حرکت ارتقا ہی افسانے کے جسم کی جان ہوتی ہے افسانہ کا پلاٹ تعمیر کرنے والے حالات ایسے ہوتے ہیں جن سے پیدا ہونے والی پیچیدگی بالکل فطری اور نفسیاتی معلوم ہو اور نتائج بیگانہ محسوس نہ ہوں کیونکہ ایک سرسری نظر ڈالنے والا بھی ایک افسانہ میں یہی ڈھونڈتا ہے کہ اعمال اور ان کے مکافات کا نقشہ کہاں تک ٹھیک ٹھیک کھینچا گیا ہے افسانہ کی تعمیر کے وقت اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ واقعات اس قدر قوی ہیں یا نہیں کہ پلاٹ کی پیچیدگی کا جواز بن سکیں ؟

نصف النہار کا تعین کر لینے کے بعد افسانہ کے افراد یا کردار کا سوال سامنے آتا ہے جن میں سب سے زیادہ اہم مرکزی کردار ہوتا ہے۔ اس کا انتخاب کرتے وقت افسانہ کی فضا پر ایک نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس فضا کے لئے مرد زیادہ موزوں ہوگا یا عورت زیادہ مناسب رہے گی ؟ فرض کرو مرد انتخاب میں آیا تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی عادت و خصلت اور اس کے طور طریق کیسے ہونے چاہئیں۔ سوسائٹی کے کس طبقے سے وہ تعلق رکھتا ہو ؟ اس کی عمر کیا ہو ؟ اسے بے آب و رنگ دکھایا جائے یا اس کے کیریکٹر پر بعض خصوصیات کے رنگین چھینٹے دیئے جائیں ؟ ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لئے افسانہ نگار اپنے پلاٹ اور پلاٹ کے مقصد کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ کتنے وزنی کردار کو سنبھال سکتا ہے اگر افسانہ کوئی کرداری افسانہ ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ مرکزی کردار کی عادتیں، خصلتیں اور اس کے رجحانات کس حد تک زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ متعین ہو سکتے ہیں ؟ یہ بہت ضروری ہے کہ کردار کہانی کی حرکت کے ہمرکاب رہیں اور ان تمام کاموں کو ٹھیک ٹھیک طرح نبھا دیں جو ان پر ڈالے گئے ہیں۔ مثلاً یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی خادمہ نے کسی بہو کے سر کے کفگیر کھینچ مارا، مگر یہ بات خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ کسی تین دن کے بچے نے پستول چلا دیا۔

[illegible]

اپاہج دوست نے لکھا ہے کہ مجھے اس لڑکی سے عشق ہو گیا ہے اور میں تمہارے پاس آرہا ہوں تاکہ اس لڑکی کو جیت سکوں۔

افسانہ بالکل سادہ ہے بالکل ہلکا پھلکا ہے۔ پلاٹ بھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ مرکزی کردار نوجوان کا اپاہج دوست ہے۔ دوسرا کردار حقیقت میں کوئی لازمی کردار نہیں۔ وہ پلاٹ کی مشینری کا ایک معمولی پرزہ ہے۔ ہر چند افسانہ اس کے بغیر نہیں چل سکتا پھر بھی اس کا کردار نسبتاً بے رنگ ہے اور اس لئے اگر مندرجہ بالا پلاٹ کے خاکے کو ایک افسانہ میں ڈھالا جائے تو اس کے (یعنی نوجوان کے) کردار کو صرف اسی حد تک روشنی میں لایا جائے گا جس حد تک افسانہ کی تعمیر میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اچھا۔ مگر عورت کی کیا رہی؟ اس فرضی حسین عورت کا کیا بنے گا جس کا ذکر خط میں کر کے نوجوان نے اپنے اپاہج دوست کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ کوئی زندہ کردار تو ہے نہیں وہ تو پلاٹ کی تعمیر میں ایک سہارا تھی۔ نہ تو وہ خود کچھ کرتی ہے، اور نہ ہی اس کے راستے میں کوئی روک حائل ہوتی ہے۔ وہ تو بس دماغ کی ایک تخلیق ہے۔ ایک حسین گڑیا۔ اچھا اب یہ بتائیے کہ اس افسانہ میں نصف النہار کہاں ہے؟ آیا یہ وہاں پیدا ہو جب نوجوان کا اپاہج دوست اپنی مفروضہ محبوبہ کو جیتنے کے لئے نوجوان کے پاس آئے اور وہاں آکر معلوم کرے کہ حقیقت میں کسی ایسی عورت کا وجود ہی نہیں ہے؟ یہ افسانہ کا نصف النہار ہوگا۔ یا اس کا یہ ارادہ کہ محبوبہ تک پہنچ کر اسے جیتنا ہے؟ اگر اس معیار کو سامنے رکھا جائے جو ہم نے مندرجہ بالا سطور میں قائم کیا ہے۔ اور نصف النہار کی اس تعریف کو دیکھا جائے جو ہم نے اوپر کی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اپاہج کردار کا محبوبہ کو جیتنے کا عزم ہی افسانہ کا نصف النہار ہے اس موقع پر پڑھنے والے کا دل واقعی دھڑکنے لگتا ہے۔ کیونکہ شروع سے آخر تک دلچسپی اس سوال پر مرکوز ہوتی رہتی ہے کہ آیا محبت کا رشتہ قائم ہو سکے گا یا نہیں؟ اس سے پہلے کہ پڑھنے والا آگے بڑھے، اس سوال کا جواب ملنا چاہئے۔ جیتنے نہ جیتنے کا قصہ تو آئے گا بعد کو۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس افسانہ یہیں ختم ہو جائے گا۔ نصف النہار اور چیز ہے اور دلچسپی کا

خاتمہ اورشے ہے۔ "نصف النہار" پر ہی دلچسپی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک جب تک کہ پلاٹ مجموعی طور سے خاتمہ کے آخری نقطہ تک نہیں جا پہنچا۔ پڑھنے والے کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ متذکرہ بالا افسانے میں نصف النہار نے دلچسپی کو ختم نہیں کیا حقیقت میں تو دلچسپی ختم اسی وقت ہوگی جب "اپاہج" کو معلوم ہو جائے گا کہ اس عورت کا ایک سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔

بعض افسانوں میں ایک کردار کو دوسرے کردار سے ٹکرایا جاتا ہے۔ ایک قوت ارادی کو دوسرے کی قوت ارادی کے مقابل صف آرا کیا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں مرکزی کردار کی خصوصیات نمایاں کرنے کے لئے چند اور کردار لازماً تخلیق کئے جاتے ہیں مثلاً مغربی دنیا کے مصوری کے ایک شہرۂ آفاق شاہکار میں، جو مشہور عالم جادو نگار "پیرس بوردون" کے موئے قلم کا اثر ہے یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک نیم عریاں، اور تھر تھر کانپتا ہوا ماہی گیر قصر شاہی کی زینت و آرائش کے درمیان "دوژ" کو سینٹ مارک کی انگشتری پیش کر رہا ہے۔ یہ اصل تصویر کا علیہ ہے لیکن تصویر کے سیدھے رخ پر پیچھے کی طرف، ان سیڑھیوں کے اختتام کے قریب جو تخت شاہی تک پہنچتی ہیں، ماہی گیر کا لڑکا ننگے پاؤں، ننگے سر بیٹھا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت سے انگشتری کی چمک دمک کا تماشا کر رہا ہے۔ فن مصوری کے تمام مسلم الثبوت استاد اس پر متفق ہیں کہ تصویر نامکمل رہتی اگر یہ لڑکا منقوش نہ کیا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ لڑکا صرف اس لئے کھینچا گیا ہے کہ تصویر کے اس خلا وسیع حصے کو جو سیڑھیوں کے پہلو کے نظارے کو لئے ہوئے ہے بھر دیا جائے ورنہ ایک اچھی خاصی جگہ محسوس ہوگی۔ لیکن لڑکے کے نقش کے وجود کا ایک اور جواز بھی ہے وہ ایک طرح سے مصور کے تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ کتنے ہی افسانے پڑھ جاؤ تم دیکھو گے کہ ان افسانوں میں جو فنی اعتبار سے نک سک ہوں مرکزی کردار کو زیادہ روشنی میں لانے کے لئے چند امدادی افراد ضرور استعمال کئے گئے ہیں۔

غرض مدعا کہنے کا یہ ہے کہ افسانے کی تعمیر بڑی احتیاط سے ہوتی ہے۔ کردار اور پلاٹ کی ساخت سے لے کر حالات اور واقعات کی ترتیب تک ہر شے میں ایک نظام نفسیاتی ترتیب کارفرما دکھائی دیتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض افسانے مکمل ترین صورت میں خود بخود دماغ میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ تاہم اچھا ہوتا ہے اگر غیر ضروری عناصر کو نکال کر افسانے کو حسین تر بنا دیا جائے۔

تغذیہ

گذشتہ انٹرنیشنل لیبر کانفرنس میں جن ایسے مضامین کی جانب ڈائرکٹر کی رپورٹ میں اشارہ کیا گیا تھا کہ جو مستقبل قریب میں اہمیت حاصل کرنے والے ہیں اور اس لئے دقیق مطالعہ اور تحقیقات کے مستحق ہیں ایک مضمون یہ تھا کہ کافی غذا کے استعمال اور صحیح معیار زندگی کا باہمی تعلق کیا ہے یہ بات کہ جنیوا اس مضمون کے متعلق معتبر اطلاعات جمع کرنے کی ضرورت کو

پورے طور پر محسوس کرتا ہے اس دلچسپ رپورٹ سے ثابت ہو جاتی ہے جو حال میں ڈاکٹر اکروئیڈ اور مسٹر برنیٹ نے پیش کی ہے جو جمعیۃ الاقوام کے محکمۂ حفظان صحت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رپورٹ میں، مختلف قوموں کا معیار تغذیہ بتایا گیا ہے نیز یہ کہ یہ معیار کس حد تک ان قوموں کو حاصل ہو چکا ہے۔ ابھی ہمارے پاس اتنا کافی مواد موجود نہیں ہے کہ اس کی بناء پر ہم ہر قوموں کی کمترین ضروریات زندگی کی تشریح علمی اور فنی اعتبار سے کرسکیں۔ ماہرین علم افعال الحیات کا ابھی تک اس بات پر اتفاق آراء نہیں ہوا ہے کہ مختلف ممالک میں، اور مختلف قسم کے کام کرنے کی صورت میں انسانی جسم کو حرارت کی کتنی کیلوریز (حرارت کی اکائیاں) درکار ہوتی ہیں۔ اور نہ ابھی تک اسی کے متعلق اتفاق رائے کہیں نظر آتا ہے کہ تندرست اور قابل کار رہنے کے لئے انسان کو پروٹین (گوشت وغیرہ کے قسم کی غذا) کی اور معدنی نمکیات کی یا حیاتین (وٹامنز) کی کس مقدار میں ضرورت ہے۔ پھر بھی تغذیہ کے علم نے گذشتہ چند سال میں بڑی سرعت سے ترقی کی ہے اور حاصل شدہ علم کی بدولت صحت عامہ کی حکمت عملی نئی کروٹ بدل رہی ہے۔ اب اس بات کا احساس ایک وسیع پیمانے پر ہوتا جا رہا ہے کہ صحت عامہ کے افسروں کا فرض فقط یہی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو امراض سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کریں بلکہ یہ کہ لوگوں کی جسمانی صحت کو بلند سے بلند درجے پر پہونچانا کہ جس کے لئے تغذیہ یقیناً اہم ترین چیز ہے، ان کا اولین فرض ہونا چاہئے۔ آج دنیا میں غذا سے متعلق معاملات پر

حکومتوں کا اقتدار زیادہ باقاعدگی اختیار کرتا جارہا ہے اور وقتی ضروریات کے فہرست سے ان معاملات کو نکال دیا گیا ہے کیوں کہ جب کبھی عام آبادی کی ضرورتوں کی مناسبت سے تغذیہ کم ہوجاتا ہے تو لازمی طور پر قوم کی جسمانی صحت اور قوت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تغذیہ کا مسئلہ اہمیت کے لحاظ سے طبی امداد اور زچاؤں کی خبرگیری کے مسائل کا ہم پلہ ہے جس کے متعلق ان تمام ممالک میں کہ جہاں صحت عامہ کو برقرار رکھنے کا نظام مرتب کیا گیا ہے، بہت کچھ کام عمل میں آچکا ہے۔ صنعت و حرفت کی کارگردگی اور قومی معیار صحت دونوں کے لئے تندرستی شرط اوّل ہے، اور اس کی حفاظت قوم کے تحفظ و بقا کے نقطۂ نظر سے حکومت کا لازمی فرض ہونا چاہیئے۔ چونکہ اس حقیقت کا احساس ترقی یافتہ ممالک میں روز افزوں ہے اس لئے باوجود اس کے کہ حکومت کے بہت سے محکموں میں موجودہ اقتصادی نزاکت حالات کی وجہ سے فرسودگی رونما ہے پھر بھی معاشرتی بیمہ اور بیکاروں کی امداد کی تجاویز کفایت شعاری اور تخفیف کے طوفان سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہی ہوگئیں۔ اگر امراض کا علاج اور ان کے روکنے کی تدابیر ایک قومی ضرورت ہیں تو اچھے مکان اور اچھی خوراک کا مسئلہ جو تندرست زندگی کے لئے اولین شرائط میں ہے اس سے بھی زیادہ قومی توجہ کا مستحق ہے۔ لہٰذا انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن جس کا مقصد قیام ہی یہ ہے کہ مزدوروں اور کاریگروں کو مشکلات سے اور فاقہ کشی سے بچائے اور مزدوروں کو کافی مزدوریاں دلائے تاکہ وہ زندہ رہ سکیں، پورے طور پر اس بات میں حق بجانب ہے کہ تمام دنیا میں تغذیہ کا معیار علمی اور فنی اصولوں کی بنا پر رائج کرادے۔

مسئلہ خوراک کو قابل اطمینان طریق پر حل کرنے میں درحقیقت سب سے بڑی رکاوٹوں میں سے ایک افلاس ہے اگرچہ یہ ضرور ہے کہ افلاس کی وجہ سے تغذیہ کی کمی کے اثرات بہت طویل مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے افلاس کے ابتدائی اسباب کا ازالہ ضروری ہے اور اس بنا پر فوراً ایک طرف تو یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ لوگوں کو کافی اجرتیں ملیں، اور دوسری طرف یہ کہ مزدور اپنی اجرت کے روپے سے کیا کیا چیزیں خریدیں۔ اس معاملہ میں مزدوروں کی نام نہاد اجرتیں نہیں، بلکہ

وہ اُجرتیں کہ جو حقیقت انھیں ملتی ہیں ہمارے فیصلہ کا معیار ہونی چاہئیں، اور اگر مزدور کو جو اجرت
ملتی ہے وہ اس کے لئے کافی ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس سے اچھا مکان اور
اچھی غذا بقدر ضرورت حاصل کرسکے تو زندگی بسر کرنے کا ایک معقول معیار خود آقائم ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اجرتیں خواہ کافی ہوں یا ناکافی مگر اس زمانے میں لوگوں کی
بڑی بڑی جماعتوں کو یا تو پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی یا صحیح قسم کی غذا انھیں حاصل نہیں ہے۔ صنعتوں
کی ترقی نے غذا کے متعلق تمام دنیا کی عادتیں بدل ڈالی ہیں۔ صنعتی علاقوں میں مکانات کی لاگت
ایسی ہے کہ وہاں خوش ذائقہ غذائیں تیار کرنا بڑا مشکل کام ہے، اور شہروں میں کرائے کی
زیادتی نے لازمی طور پر خاندانوں کے بجٹ پر یہ اثر ڈالا ہے کہ وہ رقم جو وہ خوراک کی فراہمی پر صرف
کرتے بہت کم ہوگئی ہے۔ مشینوں کے رواج نے انسانی قوت کے خرچ کی ضرورت کم کردی ہے۔
اب صنعتی کاریگروں کا کام بڑی حد تک یہ رہ گیا ہے کہ مشینوں کو چلایا کریں۔ اس لئے اب ایسی غذا
کہ جو حجم میں زیادہ ہو اور کاربوہائیڈریٹ کی نوع سے (سبزی) ہونا موزوں ہے۔ اب ایسی غذا
مناسب ہے جو مقدار میں کم اور حیوانی پروٹین پر مشتمل ہو۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انیسویں
صدی کے اولین نصف میں امریکہ میں قومی خوراک کا جزو اعظم گوشت تھا، لیکن اب گوشت اور غلہ
کا استعمال کم ہوتا جارہا ہے اور دودھ، مکھن، بالائی، شکر، انڈوں، پھلوں اور سبزترکاریوں
کے استعمال کو ترقی ہے۔ امریکہ میں قومی تغذیہ کے مسئلے پر ایک اور چیز کا بھی اثر پڑ رہا ہے اور
وہ یہ کہ عوام الناس کو تغذیہ کے علمی اور فنی اصولوں کی تعلیم روز بروز زیادہ دی جارہی ہے۔

ہندوستان میں غذا کے متعلق اب یہ امر مسلمہ ہے کہ یہاں قلت غذا یا ناکافی اور خراب غذا
کی مصیبت عام ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں سر جان میگا نے دیہات کے ڈاکٹروں کے ذریعہ سے اعداد
وشمار فراہم کئے اور ظاہر ہے کہ ان ڈاکٹروں نے غذا کا معیار مقرر کرنے میں مبالغہ سے کام ہرگز
نہ لیا ہوگا۔ تمام ہندوستان کے مجموعی اعداد وشمار لے کر ان اسپتال کے ڈاکٹروں کا یہ خیال ہے
کہ ۳۹ فی صدی آدمی ایسے ہیں جنھیں حسب ضرورت پوری خوراک میسر آجاتی ہے، ۴۱ فی صدی ایسے ہیں

کو جو پیٹ بھر لیتے ہیں لیکن غذا ناکافی ملتی ہے، اور ۲۰ فی صدی وہ ہیں کہ جنھیں بہت ہی کم غذا نصیب ہوتی ہے۔ بنگال کے ڈاکٹروں نے تصویر کا سب سے زیادہ المناک رخ دکھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سو میں سے صرف بائیس آدمی ایسے ہیں جنھیں پوری غذا مل جاتی ہے، اور اکتیس فی صدی ایسے ہیں کہ جنھیں بہت ہی کم اور ناکافی غذا ملتی ہے۔ سر جان میگا کا بیان ہے کہ یہ اعداد و شمار اور بھی زیادہ خوفناک ہوتے اگر پوری اور ادھوری غذا کا معیار یورپین ڈاکٹروں نے مقرر کیا ہوتا جو کہ نسبتاً زیادہ صحت بخش اور زیادہ پرورش کرنے والے معیار خوراک کے عادی ہیں۔ جو اطلاعات اب فراہم کی گئی ہیں وہ اس تحقیقات کے نتائج سے مطابقت رکھتی ہیں جو کرنل میکے آئی، ایم، ایس نے بیس سال پیشتر بنگال میں کی تھی۔ میکے اور دیگر محققین نے معلوم کیا تھا کہ ہندوستان میں اسکول جانے کی عمر کا لڑکا یورپ کے اسی عمر کے لڑکے کی بہ نسبت اپنے وزن میں بہت ہی کم ترقی کرتا ہے اور ان کے نزدیک اس کا سبب ہندوستانی غذا کی ناموزونیت ہے، بالخصوص یہ چیز کہ اس میں جسم کو نشو و نما دینے والے گوشت اور انڈوں وغیرہ کی قسم کے اجزا جنھیں پروٹین کہا جاتا ہے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

جن گھروں کا حساب کتاب دیکھنے کو مل سکا، اسے دیکھ کر بھی اس عام اعتقاد کی تصدیق ہی ہوئی کہ ملک میں ناکافی تغذیہ بہت عام ہے۔ شولا پور کا ایک اوسط درجے کا مزدور پیشہ خاندان جس میں ۴٫۵۷ (تقریباً ساڑھے چار) آدمی ہوں اپنے کل اخراجات کا ۴۹٫۲۵ (سوا انچاس) فی صدی (یعنی ½ ۔ ¼ ۔ ۴۹) اپنی خوراک پر صرف کیا کرتا ہے، اور احمد آباد میں جہاں ایک اوسط درجے کے مزدور گھرانے میں ۳٫۸۷ (پونے چار سے کچھ زائد) آدمی ہوتے ہیں خرچ کا فی صدی اوسط ۵۷٫۹ (تقریباً اٹھاون) ہے (یعنی ½ ۔ ¼ ۔ ۱۲ ۔ ۴۲) یہ اعداد و شمار جن کے متعلق وکٹے کمشن کا خیال ہے کہ مزدور پیشہ جماعتوں کے ہیں جن کی مالی حالت دوسرے باشندوں سے مقابلتاً بہتر ہوتی ہے، بہت دلچسپ ہیں کیوں کہ ان سے اخراجات کی وہ عظیم شرح معلوم ہو جاتی ہے، جو زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے اہم ضرورت پر صرف میں آتی ہے یہ قرضہ کی مد کے

اخراجات کو چھوڑ کر جسے بدقسمتی سے ہر گھرانے کے حساب کتاب میں ایک بڑی اہمیت حاصل ہے، ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ خوراک، ایندھن، روشنی، پوشش، اور مکان کے کرایہ پر کل اخراجات کا ۶۰ فی صدی شولا پور میں اور ۵۰ فی صدی احمد آباد میں خرچ کیا جاتا ہے۔ وٹھلے رپورٹ رقمطراز ہے کہ "ان واقعات کو خود اپنی داستان کہنے کے لئے بغیر کسی تفصیل ہی کے چھوڑ دینا بہتر ہے، اور یہاں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ جس عام محتاجی اور افلاس کا وہ اظہار کرتے ہیں اس کی تشریح کی جائے۔" جنگ عظیم کے کچھ دنوں بعد بمبئی کے مزدوروں کی انجمن کے دفتر نے مختلف گھرانوں کے حساب کتاب جمع کئے تھے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ متمول طبقے میں آمدنی کا ۵۷٫۸ (تقریباً ستاون) فی صدی اور غریبوں کے طبقے میں آمدنی کا ۶۰ فی صدی خوراک پر صرف میں آتا تھا، اور جسمانی ضروریات پر خرچ کی یہ بڑھی ہوئی شرح آمدنی کی کمی پر دلالت کر رہی ہے کیوں کہ عمرانیات کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی گھرانے کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے تو اس آمدنی کا بہت تھوڑا فی صدی حصہ خوراک پر صرف میں آتا ہے۔ اور حفظ صحت، تفریح، تعلیم وغیرہ کے متعلق اخراجات برابر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

"ہندوستان کا دہقان اس بات پر مجبور ہے کہ ایک ایسی خوراک پر قناعت کر کے خود کو اس کا عادی بنالے جو بہ لحاظ صفات بھی ناکافی ہو اور بسا اوقات بہ لحاظ مقدار بھی۔ دودھ بہت کم میسر آتا ہے اور دہقان شاذ و نادر ہی اس حیوانی روغن کی کافی مقدار حاصل کر سکتا ہے جو دودھ اور گھی میں ہوتا ہے۔ غلہ جو اس کی خاص غذا ہے اس کی غذائیت میں سبز ترکاریوں کے ذریعہ سے افزونی ممکن ہے لیکن یہ بھی اسے شاذ و نادر ہی کافی مقدار میں ملتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ضعف اس پر غلبہ پا لیتا ہے اور مرض کی مدافعت کی قوت جسم میں بہت کم ہو جاتی ہے۔" وٹھلے کمیشن نے جو یہ نتائج اخذ کئے ہیں وہ سر جان میگا کی رائے سے مطابقت رکھتے ہیں جن کا مقولہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان میں خوراک کے ناکافی ہونے کے متعلق بہت سی اطلاعات موجود ہیں، لیکن غالباً خوراک کی مقدار کی بہ نسبت خوراک کی صفات میں زیادہ کمی ہے۔ حیوانی پروٹین بہت ہی کم مقدار میں

جواہر لال نہرو

(بسلسلۂ گزشتہ)

پنجاب سے واپس آکر پنڈت جی نئے جوش اور عزم کے ساتھ صوبہ کی کانگریس کی تنظیم اور اودھ کے کسانوں کی تحریک چلانے میں معروف ہو گئے۔ اس زمانہ میں انھیں کسانوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اور ان کی تباہ اور سقیم حالت کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا دل اس مظلوم اور فاقہ زدہ طبقہ کی محبت میں ڈوب گیا۔ محلوں میں رہ کر اور عیش و آرام کی گود میں پل کر انھوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ان کے ملک میں ان کے ایسے بے شمار بھائی بھی ہیں جنھیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا اور گرمی اور سردی میں بدن پر چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں، دن رات محنت و مشقت کرکے تمام انسانوں کے پیٹ بھرنے والے کسان کی تباہ حالت دیکھ کر وہ بے چین ہو گئے۔ سماج، سرمایہ داروں اور موجودہ سرکار سے انھیں نفرت ہو گئی۔ سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک کسان تحریک نے اودھ میں جو ترقی پائی تھی اس میں جواہر لال جی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ سارے اودھ میں اور خاص کر پرتاب گڑھ ضلع میں رات دن دورہ کرنا، تقریریں کرنا اور کسانوں کی تنظیم کرنا آپ کا پیشہ ہو گیا۔ جو ہمیشہ محلوں میں راجاؤں کی شان و شوکت سے رہنے کے عادی تھے وہی مصیبت زدہ کسانوں کی محبت میں پاگل ہو کر غریب کسانوں کی جھونپڑیوں میں کھرّے کمبلوں کے اوڑھنے بچھونے پر سوتے تھے۔ مغربی طریقہ بود و باش سے انھیں نفرت ہو گئی تھی اور دیہاتی ڈھنگ سے ہی آپ گاؤں میں جاتے تھے۔ اچھے اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھا کر خوشی نہیں ملی تھی۔ وہ کسانوں کی موٹی روٹیوں اور ساگ پات میں ملتی تھی۔ گھر سے باہر کبھی پیدل نہ نکلتے تھے وہی جواہر لال ادھر کے کھیتوں میں، پانی میں اور دیہات کی گلیوں میں دھوتی چڑھائے میلوں پیدل چلتے تھے۔ کتنا بڑا انقلاب تھا۔ لوگ اس انقلاب کو دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دباتے تھے۔

سرکار کی ناراضی نگاہ پنڈت جی پر پڑ چکی تھی اور وہ انھیں قانون کی زد میں لا کر سزا دینا چاہتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں آپ اپنی والدہ بہن اور بیوی کے ساتھ منصوری میں سوائے ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ انہیں دنوں افغان نمائندے بھی برٹش نمائندوں سے صلح کی شرائط پر بحث کرنے کے لئے وہاں مقیم تھے۔ مقامی افسر نہرو جی کی موجودگی سے ڈرے اور انھوں نے آپ سے اس بات کا وعدہ لینا چاہا کہ آپ افغانوں سے کسی قسم کی کوئی گفتگو نہ کریں گے۔ اگرچہ آپ نے اس وقت تک افغانوں کو دور سے بھی نہیں دیکھا تھا مگر ایسے حکم کو نہایت نامناسب سمجھ کر آپ نے اس قسم کا وعدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو ۲۴ گھنٹے کے اندر منصوری چھوڑ دینے کا حکم ملا اور آپ کو ماں بیوی اور بہن کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر مسوری سے روانہ ہونا پڑا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے سرکار کو اطلاع دی کہ اجازت ہو یا نہ ہو وہ منصوری جانے سے نہ رکیں گے۔ اس پر حکم واپس لے لیا گیا اور آپ منصوری جا سکے۔

اسی زمانہ میں مہاتما گاندھی نے پنجاب کے مظالم اور خلافت کے مسائل کو لے کر عدم تعاون کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا۔ جواہر لال جی ابتدا ہی سے پروگرام کے طرفدار ہو گئے اور کلکتہ اور ناگپور کے کانگریس کے اجلاسوں میں گاندھی جی کا ساتھ دیا۔ ناگپور کانگریس کے ختم ہوتے ہی آپ نے وکالت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنا سارا وقت اور قوت کانگریس کی خدمت میں لگا دی۔ پنڈت جواہر لال ان دنوں صوبہ کی کانگریس کے سکرٹری تھے اور صوبہ کی ساری تنظیم کا بوجھ آپ کے کندھوں پر ہی تھا۔ کانگریس کمیٹیوں کا قائم کرنا، صوبہ کے دفتر کا کام کرنا اور تمام صوبہ میں تحریک پھیلانا آپ کا روز کا کام تھا۔ صبح ۵ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک آپ روزانہ کام کرتے تھے آپ کی نہ تھکنے والی محنت، آپ کی غیر معمولی حب الوطنی آپ کا ولولہ عمل امنگ اور امید تمام دوسرے کام کرنے والوں کے اندر زندگی اور جوش پیدا کرتی تھی۔

نہرو جی ان دنوں میں کانگریس کے روزانہ کاموں کے علاوہ انڈیپنڈنٹ اخبار کے نکالنے میں بھی بہت مدد دیتے تھے۔ مسٹر جوزف اور رنگا آئر اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ سرکار نے آپ کو اور دونوں ایڈیٹروں کو نوٹس دیا کہ اخبار کے کچھ خلاف قانون مضامین کے لئے معافی مانگیں۔ مگر ان کے لئے

ممکن تھا مصلحت وقت دیکھ کر سرکار نے اس وقت جواہر لال جی سے تو کچھ نہ کہا صرف مسٹر رنگا ائر کو
ایک سال کی قید با مشقت کی سزا دے کر خاموش ہو گئی۔

اسی موقع پر پرنس آف ویلز ہندوستان میں آئے اور کانگریس نے ان کا بائی کاٹ کیا۔
اس بنا پر کانگریس والنٹیر کور غیر قانونی جماعت قرار دی گئی اور جواہر لال جی ۶ دسمبر کو گرفتار
کر لئے گئے۔ گرفتاری کے وقت پریشان ہونا تو بڑی بات ہے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آنے والی
تکلیفوں کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں ہے۔ اس وقت جو دو چار منٹ ملے اس میں آپ نے یہ
مناسب سمجھا کہ کارکنوں کو ان کے خطوں کا جواب لکھ دیں۔ آپ لکھنو جیل کے سول وارڈ میں رکھے
گئے جیل میں تین مہینے رہنے کے بعد آپ رہا کر دئے گئے۔ جیل سے چھوٹتے ہی نہرو جی نے مہاتما جی
سے ملنے کے لئے احمد آباد کا سفر کیا لیکن آپ کے پہنچنے کے پہلے ہی وہ گرفتار ہو گئے۔ گاندھی جی کے
مقدمے کے دوران میں پنڈت جی احمد آباد ہی میں رہے۔ پھر وہاں سے مہاتما جی کی مرضی معلوم کر کے
الہ آباد آئے اور بدیسی کپڑے کے بائی کاٹ کے کام میں مصروف ہو گئے۔ بائی کاٹ کی کامیابی سے
چڑھ کر سرکار نے آپ کو دھمکی دینے اور زبردستی روپیہ وصول کرنے والوں کو امداد کرنے کے الزام
میں دوسری بار گرفتار کر لیا اور ۱۰ مئی کو ڈیڑھ سال کی سزا دے دی۔ نہرو جی خوشی خوشی جیل
گئے انھیں ان کے اپنے الفاظ میں "جیل سے باہر تنہائی اور ویرانی سی معلوم ہوتی تھی اور دل پھر
وہیں جانے کی تمنا کرتا تھا"۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں صرف آٹھ مہینے کی قید کے بعد آپ بہت سے سیاسی
قیدیوں کے ساتھ چھوڑ دئے گئے۔ جیل سے آ کر پنڈت جی صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری بنائے
گئے اور سیاسی کاموں میں پوری طرح مصروف ہو گئے۔

جس وقت جواہر لال جی جیل سے چھوٹ کر آئے اس وقت کانگریس کی پالیسی میں تبدیلی
چاہنے والوں اور تبدیلی کے مخالف لوگوں میں خوب ان بن تھی۔ مسٹر راج گوپال اچاریہ کی رہنمائی میں
تبدیلی کے مخالف لوگوں نے گیا کانگریس میں فتح پائی تھی اور داس بابو اور پنڈت موتی لال جی اس
ناکامی سے مایوس نہ ہو کر سوراج پارٹی کو مضبوط بنا رہے تھے۔ جواہر لال جی اس آپس کے اختلاف کو

دیکھ کر بہت کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے یا توان میں سے ایک جماعت میں شریک ہو جاتے یا ان دونوں سے علیٰحدہ رہ کر دونوں جماعتوں میں اتفاق و محبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ پہلا راستہ اختیار کرنے میں دونوں طرف سے فایدہ تھا اگر آپ اپنے گروپ کی طرفداری کرکے باپ کی مخالفت کرتے تو یہ یقینی تھا کہ پبلک آپ کو سر پر اٹھا لیتی اور آپ تبدیلی کے مخالف لوگوں کے رہنما ہو جاتے اگر آپ باپ کی طرفداری کرتے تو اسمبلی کی ڈپٹی لیڈری یا کونسل کی لیڈری آپ کو مل جاتی۔ لیکن آپ نے ان لالچوں کو ٹھکرا کر اپنے اصول کے مطابق دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔

۲۰ر فروری کو الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں مولنا ابوالکلام آزاد اور آپ کی کوشش سے کچھ دنوں کے لئے آپس کی مخالفت بند ہو گئی لیکن پوری طرح میل جول نہ ہو سکا۔ اسی درمیان میں ایک ایسی درمیانی جماعت بھی بن رہی تھی جس میں دونوں جماعتیں باہمی اتفاق و محبت کے ساتھ شریک ہو سکیں۔ ۲۶ر مئی کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی والے اجلاس میں اسی درمیانی جماعت کے آدمیوں نے مندرجہ ذیل مضمون کی قرارداد پیش کی جو کثرت رائے سے پاس ہو گئی۔ "یہ پیش نظر رکھتے ہوئے کہ کانگریس کے بہت سے با اثر رہنماؤں کے خیالات کاؤنسل کے داخلہ کی حمایت میں ہیں یہ طے ہوا کہ کانگریس کے ریزولیوشن کے مطابق کونسلوں کے بائی کاٹ کے لئے کوئی عملی تحریک نہ چلائی جائے۔" اس رزولیوشن کے پاس ہو جانے پر کئی تبدیلی کے مخالف کارکنوں نے مثلاً مسٹر راجگوپال اچاری، سردار ولبھ بھائی پٹیل، بابو راجندر پرشاد، بابو برج کشور پرشاد، جے. جی. ونیش پانڈے اور سیٹھ جمنالال بجاج نے استعفے دے دیئے۔ جواہرلال جی کی تجویز پر استعفوں پر نظر ثانی کا موقع دینے کے بعد یہ استعفے اور صدر کا استعفےٰ قبول کر لیا گیا۔ اعتدال پسند جماعت کی کیبنٹ بنی جس کے ڈاکٹر انصاری صدر اور جواہرلال جی قائم مقام چیف سکریٹری بنے۔ کئی صوبوں نے مفاہمت کی اس قرارداد کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور ان صوبوں کی خواہش پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ناگپور میں بلایا گیا۔ یہاں بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۲۶ر مئی کو جو بمبئی میں قرارداد پاس ہوئی تھی اس کے ٹھیک اور مناسب ہونے کی قرارداد منظور کی۔ اس کے علاوہ ایک قرارداد اس مضمون کی بھی

بالخصوص بعض صوبائی کانگریس کمیٹیوں کی یہ کوشش کہ اس قرارداد کی خلاف ورزی کی جائے۔
[illegible] ہے۔ مگر اس سے مطمئن نہ ہو کر پنڈت جواہر لال جی نے یہ تجویز پیش کی کہ تامل ناڈ
کانگریس کمیٹی پر حکم نہ ماننے کے الزام میں ملامت کی جائے۔ اس پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک
حصہ نے اس بنیاد پر مخالفت کی کہ اس قسم کی ملامت کے لئے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کانگریس کمیٹی
نے موخرالذکر رائے کو تسلیم کیا۔ اس بات پر جواہر لال جی نے اور دوسرے لوگوں نے جو ان کے ہم
خیال تھے جن میں ڈاکٹر انصاری بھی شامل تھے استعفٰے دے دیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ان
استعفوں کو قبول کر لیا اور نئی ورکنگ کمیٹی کا اسی وقت انتخاب کیا گیا۔ ستمبر کے مہینہ میں نیشنل
کانگریس کا پہلا اجلاس دلی میں ہوا اور سوراجسٹوں کو کونسل کے داخلہ کی اجازت مل گئی۔

دلی کانگریس کے ختم ہونے پر پنڈت جی ریاست نابھا کے مصیبت زدہ اکالیوں کی حالت
دیکھنے کے لئے جیتو گاؤں گئے۔ اچاریہ کرپلانی اور مسٹر کے۔ سنتانم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ جیتو پہنچتے
ہی آپ کو ریاست سے چلے جانے کا حکم دیا گیا اور انکار کرنے پر آپ گرفتار کر لئے گئے۔ نابھا میں مقدمہ
ہوا اور آپ کو دو برس کی قید باشقت کی سزا دی گئی۔ لیکن جس دن سزا سنائی گئی اسی دن آپ
ملک کے حکم سے رہا کر دئے گئے۔ جب آپ نابھا ہی میں تھے اسی وقت آپ کو صوبائی کانگریس کے صدر
منتخب ہونے کی اطلاع ملی۔ لیکن جواہر لال جی کانگریس کے موقع پر بیمار ہو گئے اور آپ کا خطبۂ صدارت
آپ کی غیر حاضری میں پڑھ کر سنایا گیا۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس کوکناڈا میں ہوا۔ جواہر
لال جی نے اجلاس کے سامنے والنٹیروں کی تنظیم کا رزولیشن پیش کیا جسے کانگریس نے منظور
کر لیا۔ اسی موقع پر آپ کی صدارت میں آل انڈیا والنٹیر کانگریس ہوئی۔ نہرو جی ہندوستانی سیوا دل کے
آل انڈیا بورڈ کے پہلے صدر بھی بنائے گئے۔ کوکناڈا کانگریس میں تبدیلی کی مخالفت کرنے والی جماعت
نے اپنی ساری طاقت کو جمع کر کے ایک بار پھر تمام ملک کو پرانے طریقوں پر قائم رکھنے کی کوشش کی
لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی اور کانگریس تمام تر سوراجسٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ نہرو جی کوکناڈا میں

پہلی بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اور کئی سال تک درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر اس عہدہ پر فائز رہے۔ اور یہ بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں زندگی اور باقاعدگی پیدا کرنے کا سہرا بہت بڑی حد تک جواہر لال جی کے سر ہے۔ الٰہ آباد میں قیام کے دنوں میں ۱۱ بجے سے ۵ بجے شام تک پنڈت جی لگاتار دفتر کا کام کرتے تھے۔ سارے خطوں کا جواب خود ہاتھ سے لکھ کر دیتے تھے اور دفتر میں بیٹھے بیٹھے ساری کانگریس مشین کو چلاتے تھے۔ تمام ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لیتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آپ نے کانگریس آفس کو سنبھالا اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

یہ زمانہ جواہر لال جی کے لئے بہت مصروفیت کا تھا۔ جیل سے آنے کے کچھ دنوں بعد ہی آپ الٰہ آباد میونسپل بورڈ کے چیرمین منتخب ہو گئے تھے اور آپ نے جنرل سکریٹری کے عہدہ کے ساتھ ساتھ اس فرض کو بھی سلیقہ کے ساتھ انجام دیا۔ الٰہ آباد کے کلکٹر مسٹر الگزنڈر نے آپ کے بورڈ کے کام کی بابت لکھا تھا کہ " بورڈ قومیت کے تخیل کو پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کام کر رہا ہے۔

(۱) اسکولوں میں کتائی کی تعلیم
(۲) اسکولوں میں سیوا سمتی
(۳) انگریزی کی جگہ ہندی کا استعمال
(۴) چھٹیوں کی فہرست میں تلک اور گاندھی ڈے کا اضافہ
(۵) چھٹیوں کی فہرست سے امپائر ڈے کا نکال دینا۔
(۶) مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی کو ایڈریس دینا
(۷) مہاتما گاندھی کے جیل سے چھوٹنے پر جلسہ
(۸) وائسرائے کا استقبال کرنے سے انکار
(۹) اسکول کے بچوں کو سبھاؤں اور قومی جلسوں میں آزادی سے شریک ہونے کے لئے ترغیب دینا "

۱۹۲۶ء کی ابتدا میں کملا جی کی حالت بہت بگڑ گئی اور ڈاکٹروں نے انھیں علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ لے جانے کا مشورہ دیا۔ اس لئے پنڈت جی نے مارچ میں یورپ کے لئے سفر کیا۔ کملا جی کا علاج جنیوا اور مونٹانا میں رہا۔ اس زمانہ میں جواہر لال جی کو غور و فکر اور مطالعہ کا اچھا موقع ملا۔ آپ کے کئی مضامین یورپ اور ہندوستان کے رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے۔ کملا جی کی حالت سنبھلنے پر نہرو جی نے یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کیا۔ آپ اٹلی، فرانس، ہالینڈ، جرمنی، انگلینڈ، بلجیم اور روس گئے اور وہاں کے سیاسی لیڈروں سے ملے۔ یورپ کے ملکوں میں آپ ہندوستان سے جلاوطن کئے ہوئے کئی ہندوستانیوں سے بھی ملے۔

پنڈت جی شہنشاہیت کے خلاف برسلس کی بین الاقوامی کانفرنس میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس حیثیت سے یہاں آپ کی بہت عزت ہوئی اور آپ بین الاقوامی کانگریس کے پانچ صدروں میں سے ایک کی جگہ کے لئے منتخب کئے گئے۔ سوویٹ روس کی دسویں سالگرہ میں شامل ہونے کی دعوت پاکر آپ روس گئے۔ ماسکو پہنچ کر آپ نے روس کے انقلاب عظیم کو دیکھا آپ زیادہ دن روس میں نہ رہ سکے۔ کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے کے لئے آپ کو جلد ہی وہاں سے روانہ ہونا پڑا۔

یورپ اور روس کے اس سفر سے آپ کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا اور آپ لینن اور سوشلزم کے پجاری بن کر ہندوستان کو لوٹے۔ یورپ کے سیاسی لیڈروں کے خیالات معلوم کرنے کے بعد آپ بین الاقوامی تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت کو بہت اہم سمجھنے لگے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے نہرو جی نے مدراس کانگریس میں دو مہرکے کے رزولیوشن پیش کئے۔ ایک مستقبل کی جنگ میں انگلینڈ کا ساتھ نہ دینے اور دوسرا کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی قرار دینے سے متعلق تھا۔ ان دونوں رزولیوشنوں نے ملک کے کارکنوں کو آپ کی طرف متوجہ کیا اور آپ کل ہندوستان کے لیڈروں کی فہرست میں آ گئے۔ اسی موقع پر آپ نے ریپبلکن کانگریس اور ہندوستانی سیوادل کی صدارت کو بھی قبول کر لیا۔

مدراس کانگریس کے بعد آپ کانگریس کے احکامات کو عملی جامہ پہنانے اور اپنے نئے خیالات کو پھیلانے کے کام میں معروف ہو گئے آپ نے سوویٹ روس کے متعلق مضامین مختلف اخباروں میں لکھے جو سوویٹ روس نامی کتاب میں جمع کر کے شایع کر دئے گئے ہیں آپ نے آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو رپورٹ کی تیاری میں بڑی محنت سے کام کیا جس کی تعریف نہرو رپورٹ میں موجود ہے۔ سائمن کمیشن کے بائی کاٹ کرنے میں بھی آپ نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور سارے یو۔پی۔ کے صوبہ کا اس سلسلہ میں دورہ کیا۔ کمیشن کے بائی کاٹ کے موقع پر پنڈت جی کو لکھنؤ میں پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑے۔ جسے آپ نے بڑی ہمت اور بہادری سے برداشت کیا۔

اگست ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لئے لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس ہوئی اس موقع پر باپ بیٹے میں جو پوشیدہ اختلاف برسوں سے پایا جا رہا تھا وہ عام مجمع میں سب پر ظاہر ہو گیا۔ جواہر لال جی نے مکمل آزادی کے حامیوں کے لیڈر کی حیثیت سے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ اور سوشلزم کی تلقین کی۔ اس پر اودھ کے ایک تعلقہ دار نے کہا "پہلے آنند بھون کو گرادو پھر سوشلزم کی تلقین کرنا" یہ بات تیر کی طرح جواہر لال کے دل پر لگی۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد اس طعنہ کا عملی جواب دینے کی فکر میں لگے رہے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں ان کی صدارت کے زمانہ میں موتی لال جی نے آنند بھون کا وقف نامہ کانگریس کے نام لکھ دیا۔ بہر حال اس تقریب کے بعد مکمل آزادی کے حامیوں نے اس کانفرنس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ۳ اور ۴ نومبر کو دلی میں انڈیپنڈنس لیگ کی بنیاد پڑی اور جواہر لال جی اس کے سکریٹری بنائے گئے۔ کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ موتی لال جی اس کے صدر تھے۔ اس موقع پر بھی جواہر لال جی اپنے والد کے خلاف کھڑے ہوئے۔ مہاتما جی کی کوشش سے انڈیپنڈنس لیگ سمجھوتے کے رزولیوشن پر راضی ہو گئی اس رزولیوشن کے مطابق سرکار کو الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر ایک سال کے اندر اندر برٹش سرکار نے نہرو کمیٹی کے طرز کا سوراج نہ دیا تو کانگریس مکمل آزادی کا اعلان کر دے گی اور عدم ادائیگی لگان اور ستیاگرہ کی تحریک شروع کریگی اور اس وقت تک ملک کو سول نافرمانی کے لئے تیار کرے گی۔

پنڈت جواہر لال جی جب سے یورپ سے آئے تھے برابر ملک کو سول نافرمانی کے لئے

تیار کر رہے تھے آپ پنجاب، دلی، کرنال اور یو۔ پی کے صوبوں کی کانفرنسوں کے صدر بنائے گئے اور صدارت کی کرسی سے انقلاب کا پیغام گھر گھر پہنچا رہے تھے۔ نوجوانوں میں زندگی اور بیداری پیدا کرنے اور ان کے ذریعہ سرمایہ داری کو ختم کرنے کی طرف آپ خاص طور پر متوجہ ہوئے جواہر لال جی نے پرتندی کی بنیاد ڈالی اور ماسکو کے بڑے گرجے کے سامنے لکھے ہوئے اس مشہور کتبہ کو کہ "مذہب عوام کے لئے افیم ہے" اس کا اصل اصول بنایا۔ کئی سال کے سوئے ہوئے ملک کو نوجوانوں کی پیہم پکار نے جگا دیا اور عدم تعاون کے دنوں کی گرمی اور چہل پہل دوبارہ پیدا ہو گئی۔ سوشلسٹ یوتھ کانفرنس، انجمن طلبائے بنگال اور صوبہ بمبئی کے نوجوانوں کی لیگ کے اجلاسوں کے آپ صدر ہوئے۔ اور آپ کی صداقت اور خلوص کو دیکھ کر تمام ملک آپ سے محبت کرنے لگا۔ اسی سال کا آپ کا ایک بڑا کارنامہ وہ خطوط ہیں جو آپ نے اپنی بیٹی کے نام دنیا کی ابتدائی تاریخ کے موضوع پر لکھے تھے جب وہ گرمیوں میں مسوری میں قیام پذیر تھیں۔

اسی زمانہ میں ملک اور کانگریس کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس آزمائش کے وقت میں کانگریس کا صدر کسے بنایا جائے؟ ملک کے سب رہنماؤں نے مہاتما جی سے صدارت کی درخواست کی مگر مہاتما جی نے نہرو جی کو ہی اس عہدہ کے لئے مناسب سمجھا۔ آخرکار جواہر لال جی کا صدارت کے لئے انتخاب ہوا۔

چنانچہ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی صدارت بھی آپ نے فرمائی۔ جیاریا ٹریڈ یونین کانگریس کے تین ہفتہ بعد آپ لاہور کانگریس کے صدر بنے اور آپ ہی کی صدارت میں مہاتما گاندھی نے یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو رات کے بارہ بجے کے بعد مکمل آزادی کے نصب العین کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے جو خوشی آپ کو ہوئی وہ دیکھنے کے لائق تھی آپ کا خطبہ صدارت کسانوں اور مزدوروں کے لئے پیغام حیات اور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لئے آنے والے خطرہ کا پیغام تھا۔

لاہور کانگریس کے کچھ ہفتہ بعد مہاتما جی نے وائسرائے کو الٹی میٹم دیا اور ان کے پاس سے جواب آ جانے پر ورکنگ کمیٹی نے مہاتما گاندھی کو ڈکٹیٹر بنا کر جنگ کا اعلان کر دیا۔ مہاتما جی نے نمک قانون کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا اور اپنے اسی ساتھیوں کے ہمراہ ڈانڈی نمک اکٹھا کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔

یو۔پی کے صوبہ میں بھی اس فیصلہ پر عمل درآمد ہوا اور دس اپریل کو پہلی مرتبہ جواہرلال جی کی رہنمائی میں نمک قانون کی خلاف ورزی کی گئی۔ پنڈت جی اس دن گرفتار نہیں کئے گئے لیکن دو دن بعد یکایک راستے ہی میں روک کر جیل بھیج دئے گئے اور آپ کو ۶ مہینے کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد ملک میں تحریک نے خوب ترقی پائی۔ اسی تحریک کے دوران میں سپرو اور جیکر کی سرکردگی میں مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی اور جواہرلال جی یرودہ جیل لیجائے گئے۔ یرودہ سے لوٹ کر آپ نے مہاتما جی کو جو خط لکھا تھا اس سے آپ کی انتہا پسندی ظاہر ہوتی تھی۔

جواہرلال جی اپنی قید کی میعاد پوری کرکے ۱۱ اکتوبر کو چھوٹے۔ جب وقت رہا ہوئے اس وقت موتی لال جی کی حالت بگڑ چکی تھی۔ مگر آپ نے اس کا خیال نہ کرکے تحریک کو چلانے کا کام نہایت تیزی سے شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ بعد آپ پھر گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن ان سات دنوں میں بھی آپ زبردست کام کر گئے۔ عدم ادائیگی لگان کی تحریک کو آپ نے سارے ملک کی تحریک بنا دیا اور ستیاگرہ پروگرام کو اس سے بہت ترقی ہوئی۔

اس دفعہ جیل میں پہنچنے کے بعد آپ نے اپنی بیٹی کے نام وہ خطوط لکھے جن میں دنیا کی تاریخ کے کچھ نظارے دکھلائے گئے ہیں اور جسے آپ کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن ابھی اس سلسلہ کے اٹھارہ خطوط ہی لکھنے پائے تھے کہ گاندھی ارون التوائے جنگ کی بنا پر آپ تین مہینہ بعد بلا کسی فرق کے تمام دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ رہا کر دئے گئے۔ جب آپ جیل سے نکلے اس وقت پنڈت موتی لال جی کی حالت بہت بگڑی ہوئی تھی اور سارے کانگریس لیڈر جیل سے چھوٹ کر ان کی درشن کے لئے آ رہے تھے۔ اس حالت میں بھی جب کانگریس کمیٹی کا اجلاس سوراج بھون میں ہوا تو آپ نے اس میں پوری طرح حصہ لیا۔ پنڈت موتی لال جی کا انتقال ۶ فروری کو ہوا۔ اس وقت بھی آپ جذبات سے بے قابو نہیں ہوئے اور ماتم میں بہت زیادہ دن نہیں لگائے بلکہ مہاتما جی کے ساتھ سمجھوتہ کی بات چیت کے لئے دہلی چلے گئے۔

دہلی میں سمجھوتہ ہو جانے کے بعد مارچ ۱۹۳۱ء میں کراچی کانگریس ہوئی۔ اس اجلاس میں

بنیادی حقوق کا ریزولیشن منظور کیا گیا۔ لوگوں کو یہ خیال ہونے لگا تھا کہ کانگریس رفتہ رفتہ نوآبادیات کے
درجہ کی حکومت، برطانوی شہنشاہیت اور بورژوا رنگ کی دفتری حکومت کے نصب العین کی طرف
دھیرے دھیرے جا رہی ہے اور مزدوروں اور کسانوں کے مسائل اور اشتراکی خیالات سے دور ہٹتی جا رہی ہے۔
اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے جواہر لال جی کے اصرار پر یہ بنیادی حقوق کا ریزولیشن پاس کیا گیا۔

دہلی کے سمجھوتہ کے بعد جواہر لال جی نے اس کا مطلب سمجھانے کے لئے یو۔ پی۔ کا دورہ کیا اور
سمجھوتے کی خلاف ورزی کی طرف سختی کے ساتھ دھیان رکھا۔ جذبات کو بہت زیادہ ضبط کرنے اور مسلسل
محنت کی وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہو گئی اور آپ مئی کے مہینے میں تبدیلی آب و ہوا کے لئے سیلون گئے۔
سیلون میں آپ کی بڑی عزت ہوئی اور وہاں جو تقریریں آپ نے کیں ان کی اخباروں میں بڑی تعریف
ہوئی۔ وہاں سے لوٹ آنے کے بعد آپ سمجھوتے کی پابندی کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے اور یو۔پی۔
میں اس کی جو خلاف ورزی کی جا رہی تھی اس کو نمایاں کرنے لگے۔ ۲۹ اگست کو مہاتما گاندھی گول میز
کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن چلے گئے اور ہندوستان کے کام کا بوجھ ان کی عدم موجودگی میں
بڑی حد تک جواہر لال جی کو اٹھانا پڑا۔

اس زمانہ میں قیمتوں کے بہت زیادہ گر جانے کی وجہ سے یو۔ پی۔ کے کسانوں کی حالت بہت
خراب ہو گئی تھی۔ لیکن لگان کی وصولیابی میں کوئی کمی نہ کی گئی تھی جس سے کسان بڑی مصیبت میں مبتلا
تھے۔ جب کبھی کانگریس والے ان کی ہمدردی میں کچھ کہتے تھے تو زمیندار اور تعلقدار انھیں باغی، قانون
شکن اور دوسرے ایسے ناموں سے موسوم کر کے حکومت کی حمایت حاصل کر لیتے تھے۔ اور زمیندار
اور تعلقدار اور حکومت کے افسران پر خوب اپنا غصہ نکالتے تھے۔ اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۳۱ء میں اس
مسئلہ پر پنڈت گوبند ولبھ پنت اور جواہر لال نے کانگریس کی طرف سے یو۔ پی۔ گورنمنٹ سے بہت
خط و کتابت کی اور یہ دونوں کئی مرتبہ یو۔ پی۔ گورنمنٹ کے چیف سکریٹری سے بھی ملے اور دو مرتبہ انھوں
نے سر مالکم ہیلی سے بھی ملنا چاہا لیکن اس کا انتظام نہ ہو سکا۔ یو۔ پی۔ پراونشل کانگریس کمیٹی نے کئی ضلعوں
کے کسانوں کی حالت کی تحقیقات کے لئے کمیٹیاں بھی مقرر کیں جن کی رپورٹیں ستمبر ۱۹۳۱ء میں پنت کمیٹی رپورٹ کے

نام سے یکجائی طور پر شائع کر دی گئیں۔ مہاتما گاندھی نے حکومت ہند سے لندن روانہ ہونے کے آخری وقت
تک جن مسائل پر بحث کی ان میں ایک یو۔پی۔ کے کسانوں کا بھی مسئلہ تھا اور انھوں نے یہ صاف
طور پر کہہ دیا تھا کہ اگر شکایات کی تلافی نہ ہوئی تو مداخلت کے لئے ستیاگرہ اور سول نافرمانی ضروری ہو جائے
گی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کانگریس کے صدر نے بھی یو۔پی۔ کے کسانوں کے بارے میں یو۔پی۔ حکومت
کو لکھا۔ ان تمام کارروائیوں میں جواہر لال جی کی کوششیں بہت بڑی حد تک شامل رہیں جب یو۔پی
کے صوبہ کی کانگریس کی تمام درخواستوں پر حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی تو وہ مجبور ہوئے کہ کسانوں
کو عدم ادائیگی لگان کا مشورہ دیں۔ حکومت نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس نے کانگریس کے کارکنوں
کو تیزی سے گرفتار کرنا شروع کیا اور آخر میں مسٹر شروانی اور جواہر لال جی کو بھی مہاتما گاندھی کے ہندوستان
پہنچنے سے پانچ دن پہلے یعنی ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو گرفتار کر لیا گیا۔

قید کے زمانہ میں جواہر لال جی نے پھر اپنی بیٹی کے نام دنیا کی تاریخ کے متعلق خطوط کا سلسلہ
شروع کیا۔ جیل کی تنہائیوں اور تکلیفوں میں ان کے دل بہلانے کا ایک یہی مشغلہ تھا۔ لیکن جس سادگی
خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ انھوں نے اپنے اس مشکل کام کو انجام دیا وہ ہر اعتبار سے تعریف کے
قابل ہے۔

۳۰ اگست ۱۹۳۳ء کو جواہر لال جی رہا ہوئے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اتنے خط لکھ ڈالے
تھے جو دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوتے ہیں۔ رہائی کے بعد انھوں نے سیاسی صورت حال کے متعلق
مہاتما گاندھی سے خط و کتابت کی اور کئی زبردست تقریریں مختلف جلسوں میں کیں اور وہ معرکۃ الآرا مضامین
اخباروں میں لکھے جو "ہندوستان کدھر جا رہا ہے" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور
جن میں سوشلزم کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی زمانہ میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق بھی بنارس یونیورسٹی
میں آپ نے ایک زبردست تقریر کی جس سے فرقہ پرست حلقوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد آپ
نے بنگال میں حکومت کی طرف سے جو ظلم و زیادتی ہو رہی تھی اس کی تحقیقات کرنے اور بہار کے زلزلہ کے مصیبت
زدہ لوگوں کی امداد کرنے کے لئے بنگال اور بہار کا دورہ کیا۔ بنگال میں آپ کی ایک تقریر پر قانونی گرفت

لی گئی اور آپ [illegible] فروری [illegible] کو گرفتار کر لئے گئے اور کلکتہ کے چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے آپ کو دو سال کے لئے قید بامشقت کی سزا دی۔ قید کے اس زمانہ میں آپ نے اپنی آپ بیتی لکھی جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ قید کی مدت پوری ہونے میں جب دو تین مہینہ باقی تھے تو کملا جی نہرو کی نازک حالت دیکھ کر حکومت نے آپ کو رہا کر دیا اور آپ فوراً کملا جی نہرو سے ملنے یورپ چلے گئے۔ آپ کے یورپ کے قیام کے زمانہ میں آپ کا انتخاب کانگریس کی صدارت کے لئے کیا گیا فروری ۱۹۳۶ء میں کملا جی نہرو کا انتقال ہو گیا اور آپ یورپ سے ہندوستان واپس چلے آئے اور آج کل خطبہ صدارت کی تیاری اور کانگریس کے آئندہ طریقہ کار کے طے کرنے میں مصروف ہیں۔ یورپ کے اس زمانہ قیام میں آپ وہاں کے بڑے سیاسی لیڈروں سے ملے اور انگلستان میں بھی آپ نے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، تقریریں کیں اور اخباروں میں مضامین لکھے۔ آپ اس مرتبہ یورپ والوں اور خصوصاً برطانیہ پر بہت اچھا اثر ڈال کر واپس آئے ہیں۔

مسلمانانِ ہند کے لئے آیندہ راہِ عمل

(بسلسلۂ سابق)

(رسالہ جامعہ کی گذشتہ اشاعت میں، میں نے قارئین کو اُن مسائل کی طرف متوجہ کیا تھا جو اس وقت قوم کے سامنے ہیں اور جن کا حل ملک کے متعدد رہنماؤں کو سوچنا ہے۔ مثلاً نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، کانگریس کی آزادی وطن کی تحریک، مہا سبھا اور سوشلزم کی تحریکیں، عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے مسائل، بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور افلاس وغیرہ۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ گذشتہ ربع صدی میں مسلمانانِ ہند کی توجہ ان مسائل کی طرف جتنی رہنا چاہئے تھی اتنی نہیں رہی۔ ہم نے جن مسائل کو زیادہ اہمیت دی وہ کچھ دوسرے ہی قسم کے تھے جن کا تعلق ہماری معاشی، معاشرتی، سیاسی اور حقیقی مذہبی زندگی سے کم اور خیالی اور جذباتی زندگی اور توہم پرستی سے زیادہ تھا۔ میرے بیان میں یہ بات بھی مخفی طور پر موجود تھی کہ ہمارے تمام سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی مسائل کا مطالعہ دو طرح کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ ان کے محض سطحی اور ہنگامی مظاہر اور نتائج کو سامنے رکھا جائے اور ان کی اصلاح کی عارضی تدبیریں اختیار کی جائیں اور دوسرے اس طرح کہ ان کی گہری اور مستقل بنیادوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اور اپنی آیندہ پالیسی ان بنیادی حقائق کی روشنی میں متعین کی جائے ذیل کی سطروں میں میں کوشش کروں گا کہ اپنے پچھلے مضمون کے اجمال کی تفصیل زندگی کے انہی بنیادی محرکات اور واقعات کو سامنے رکھ کر کروں۔)

انسان کی زندگی احتیاجات کا ایک ایسا طویل سلسلہ ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ اور یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے اور جس پر اس کی تمام ترقی و

تہذیب کا علمبردار ہے احتیاجات کے نام مختلف رکھ لئے جاتے ہیں کبھی اسے بھوک، سردی، گرمی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کبھی جنسی خواہش کے نام سے۔ کبھی درد اور کسک کے نام سے اسے یاد کیا جاتا ہے کبھی خلش اور تپش، تمنا اور آرزو سے۔ کبھی اسے عشق مجازی کہا جاتا ہے اور کبھی عشق الٰہی۔ لیکن ان سب خواہشوں میں جو چیز مشترک ہے، وہ اشتہا، خلا، بے چینی، بے کیفی ہے جسے رفع کرنے کی تدبیریں اور جستجوئیں آدمی برابر کرتا رہتا ہے۔

مہذب لوگوں کے موجودہ معیار کے مطابق افراد کی مکمل زندگی کے لئے جن چیزوں کی عموماً ضرورت ہوتی ہے اور طلب کی شدت کے اعتبار سے جس ترتیب کے ساتھ ضرورت ہوتی ہے انھیں مندرجہ ذیل طریقہ پر درج کیا جا سکتا ہے:-

۱۔ تندرستی
۲۔ غذا
۳۔ کپڑا
۴۔ مکان
۵۔ گھر کی روشنی کا انتظام
۶۔ گھر کے لئے سامان
۷۔ سواری

۸۔ رشتۂ ازدواج
۹۔ عبادت گاہیں، سوشل کلب اور تعلیم گاہیں۔ ادب، فنون لطیفہ اور تفریح گاہیں۔

۱۰۔ حکومت کے کاروبار میں شرکت۔ انفرادی اقتدار، اعزاز اور وقار

۱۱۔ تحقیق و انکشاف۔ تخلیقی اور تعمیری کام سیر و سیاحت

ان مختلف احتیاجات کو اگر علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر احتیاج کی تکمیل کو آزادی کے نام سے موسوم کیا جائے تو چار عنوانوں کے ماتحت انھیں درج کیا جا سکتا ہے۔

نمبر ایک سے نمبر سات تک جتنی احتیاجات ہیں ان کی تکمیل کو ہم مادی، جسمانی یا معاشی آزادی کہہ سکتے
ہیں۔ نمبر آٹھ اور نو کو اخلاقی، ذہنی، مذہبی اور معاشرتی آزادی نمبر دس کو سیاسی آزادی اور نمبر
گیارہ کو تلاش اور جستجو کی آزادی۔

ہنگامی جوش یا کسی مقناطیسی قوت کے زیر اثر، غیر معمولی اور غیر فطری جذبات سے مغلوب
ہو کر جسم و ذہن کی بیماری یا طبیعت کی منافقت کی وجہ سے ممکن ہے اوپر جو ترتیب رکھی گئی ہے اس
کا ہمیشہ مشاہدہ کرنا ممکن نہ ہو بعض ایسی ضروریات کو جنھیں میں نے ثانوی اہمیت دی ہے ممکن ہے
کہیں کہیں ابتدائی اہمیت دی جاتی ہو اور جنھیں اس فہرست میں مقدم رکھا گیا ہے انھیں مؤخر رکھا جاتا
ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک سیدھے سادے اوسط درجہ کی ذہنی اور جسمانی تندرستی رکھنے والے
آدمی کا ذہن یا موجودہ زمانہ میں اس کی احتیاجات غالباً اسی ترتیب سے آئیں گی جس طرح میں نے
بیان کی ہیں۔ اور وہ اپنی مختلف خواہشات کی تکمیل غالباً اسی ترتیب کے ساتھ کرنا چاہے گا۔ کم از کم
عقل و خرد اور فطری جذبات کا تقاضا یہی ہوگا کہ وہ ان چیزوں کا مطالبہ اسی ترتیب سے کرے ورنہ
اگر وہ جسم کی بھوک رفع کرنے سے پہلے ادب اور فنون لطیفہ کی لذت اور روح کی تسکین حاصل کرنے میں
مصروف رہے گا اور ان ذہنی لذتوں کے حصول کے لئے دنیا کے ہنگاموں سے بے تعلق ہو کر ایک
گوشہ عافیت میں اپنی دنیا الگ تعمیر کرنا چاہے گا تو وہ اپنی اس حالت بیماری کو زیادہ عرصہ تک
نبھا نہ سکے گا اور جلد ہی مادی احتیاجات کی سرد اور تلخ منطق اس سے اس قسم کے متضاد اور ہیجانی
افعال سرزد کرائے گی جو بہت جلد لوگوں کی نگاہ میں اسے استہزاء کا سزاوار اور ناپسندیدہ بنا دیں گی
اس قسم کے فریب خوردہ اور دھوکہ باز لوگوں سے ہمیں روزانہ واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ہر شخص اپنے
ذاتی تجربہ سے ایسے گندم نما اور جو فروش لوگوں کی صدہا مثالیں پیش کر سکتا ہے۔

لیکن یہاں غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے میں ایک نکتہ کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے مندرجہ
بالا بیان میں کہیں یہ فرض نہیں کیا گیا ہے کہ انسان دنیا میں اپنی انفرادی زندگی کو دوسروں سے الگ
تھلگ رہ کر بسر کر سکتا ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ ہر انسان آدمیوں کے ایک

کنبے میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ رہ کر نشو و نما پاتا اور جوان ہوتا ہے اور زندگی کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو معاشرتی شکل میں ہی انجام دیتا ہے۔ اس کی جماعتی وفاداریاں اور وابستگیاں ہوتی ہیں اور جماعت کے ساتھ ہی وہ ابھرتا اور گرتا ہے۔ اس کی غذا، لباس اور مکان کی خواہش اور اس کی تمام دوسری احتیاجات جتنی انفرادی ہوتی ہیں کم و بیش اتنی ہی جماعتی بھی ہوتی ہیں گو یہ تناسب مختلف اوقات میں اور مختلف حالات کے زیر اثر بدلتا رہتا ہے۔ جماعتی زندگی میں تقسیم عمل پیدا ہو جانے سے یہ ممکن ہے کہ جماعت کی غذا، لباس اور مکان کی فراہمی کا کام ایک گروہ کرنے لگے اور دوسرا گروہ جماعت کی صرف علمی، جمالی اور روحانی احتیاجات کی تکمیل میں مصروف ہو جائے۔ اور یہ تعاون عمل اور باہمی انحصار کا معاشرتی نظام اس وقت تک ہم آہنگ رہتا ہے جب تک اس میں جسمانی ذہنی اور روحانی ضرورتوں کا توازن قائم رکھا جاتا ہے لہذا انفرادی زندگی کی مجرد سادگیوں سے جب ہم اجتماعی زندگی کے پیچ در پیچ تعلقات کی طرف بڑھیں تو اس وقت بھی ہمیں زندگی کی ان بنیادی حقیقتوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، کیوں کہ جماعت بہر حال افراد کا ہی ایک مجموعہ ہوتی ہے بنا بریں احتیاجات کی جو ترتیب میں نے افراد کے لئے مقرر کی ہے میرا خیال ہے کہ وہ جماعت پر بھی منطبق کی جا سکتی ہے اور ہر عقل مند اور تندرست معاشرت کے لئے اس کی پابندی ضروری ہے ورنہ افراد کی طرح جماعت بھی اپنے متضاد اور متبائن اقوال و افعال میں مضحک اور ناپسندیدہ سمجھتے اور مخاصمتیں کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔ جماعت کی ان بیماریوں کی بھی صدہا مثالیں تاریخ سے مل سکتی ہیں۔ لیکن فی الحال میں اپنے بحث کو پیچیدہ بنانا نہیں چاہتا اور پہلے کی طرح صرف افراد کی زندگی کو ہی اپنا موضوع فرض کئے لیتا ہوں۔

تو اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ افراد کی چند احتیاجات ہیں جن کے پورا کرنے سے ان کی زندگی مکمل ہوتی ہے پھر اس تکمیل کے بھی مختلف معیار ہیں جن میں ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے آج اگر ایک قسم کے کھانے کپڑے اور مکان سے تسکین ہو جاتی ہے تو کل بہتر معیار کے معلوم ہو جانے کے بعد اس کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور ہم اپنی احتیاجات کی تکمیل کے لئے اس نئے

معیار کے مطابق چیزوں کو حاصل کرنا چاہیں گے اور جب تک انسانی ذہن میں ایجاد و اختراع، تلاش و جستجو، تنوع پسندی اور جدت طرازی باقی ہے کوئی ایک عام معیار مستقل طور پر کبھی قائم نہ ہو سکے گا بلکہ معیاروں میں ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

انسانی احتیاجات کی ان بنیادی حقیقتوں کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی آبادی کا کیا حال ہے اور یہاں کتنے ایسے گروہ ہیں جن کی احتیاجات کی تکمیل مکمل طور پر ہو جاتی ہے اور کتنے ایسے ہیں جن کی احتیاجات محرومی، دقت، پریشانی اور کمی کے ساتھ پوری ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل فہرست میں چند عنوانوں کے ماتحت ہندوستانی آبادی کے مختلف گروہوں کو جمع کیا گیا ہے فہرست کے آغاز میں جو لوگ ہیں ان کی بیشتر احتیاجات اعلیٰ ترین معیاروں کے مطابق پوری ہو جاتی ہیں۔ جوں جوں ہم فہرست کے نیچے کے عنوانوں کی طرف اترتے ہیں اتنی ہی محرومی اور عدم تسکین ہمیں بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے:۔

۱۔ ویسرائے، گورنر، جماعت عاملہ کے ارکان، وزرا، راجہ مہاراجہ، نواب، کروڑ پتی، لکھ پتی۔

۲۔ (الف) حکومت کی اعلیٰ سول اور فوجی افسر

(ب) کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر

(ج) پولیس سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

(د) فوج کے دوسرے بڑے افسر

(ہ) جج، سب جج

(و) ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت، صنعت، امداد باہمی، نہر کمشنر، انکم ٹکیس وغیرہ

(ز) اعلیٰ انجینیر، ماہران سائنس، ماہران فن

(ح) اعلیٰ بیرسٹر اور وکیل

(ط) اعلیٰ ڈاکٹر اور طبیب

(ی) پروفیسر، اعلیٰ ایڈیٹر، جرنلسٹ، مصنف، شاعر، آرٹسٹ، صوفی، مولوی، پنڈت۔

(ک) مرکزی کونسل اور صوبجاتی کونسل کے ارکان ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے چیرمین وغیرہ۔

(ل) بڑے زمیندار، کارخانہ دار، ساہوکار، تاجر اور بنکر

۳۔ (الف) تحصیلدار نائب تحصیلدار

(ب) انسپکٹر تھانیدار

(ج) فوجی افسر — (د) منصف

(ہ) انسپکٹر زراعت، صنعت اور ماہی، نہر وغیرہ

(و) اوسط درجے کے انجنیئر، ماہران فن

(ز) اوسط درجے کے وکیل بیرسٹر

(ح) اوسط درجے کے ڈاکٹر طبیب وید

(ط) اوسط درجے کے پروفیسر ہیڈ ماسٹر ایڈیٹر مصنف مولوی پنڈت وغیرہ

(ی) آنریری مجسٹریٹ، خطاب یافتہ ممبر میونسپلٹی ڈسٹرکٹ بورڈ

(ک) اوسط درجے کے زمیندار، کارخانہ دار، ساہوکار، تاجر اور بنکر

(ل) سینیر کلرک

۴۔ (الف) جونیر کلرک

(ب) مدرس مولوی پنڈت جونیر ٹیچر

(ج) منشی پٹواری، عرائض نویس کمپونڈر جراح

(د) ادنیٰ درجے کے زمیندار، ساہوکار اور تاجر

(ہ) بڑے کاشتکار اور شہر کے ماہر مزدور، کاریگر

(و) پولیس کانسٹبل، فوجی سپاہی، چپراسی، ملّا، موذن، پروہت

۵۔ ادنیٰ کاشتکار، مزدور، قلی، کہار، پنہارا وغیرہ

۶۔ بھک منگے، گداگر، چور اٹھائی گیرے اپاہج فاترالعقل وغیرہ

[illegible] سوسائٹی کے یہ مختلف گروہ ہیں۔ ان میں جو لوگ شامل ہیں ان کی احتیاجات کی تکمیل ان کے درجے کی پستی اور بلندی کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ پہلے اور دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جنہیں حکومت کا اقتدار، حکومت کی سرپرستی یا حکومت سے وابستگی حاصل ہے یا زمین اور سرمایہ پر جن کے حقوقِ ملکیت کو حکومت تسلیم کرتی ہے یا جن کی مذہبی اور روایتی اجارہ داری میں حکومت مزاحم نہیں ہوتی بلکہ اسے مستحکم کرتی ہے یہ لوگ عیش و مسرت سے اپنی تمام احتیاجات نہایت فراغدلی کے ساتھ پوری کرتے ہیں۔ عالیشان محل، عالیشان ساز و سامان، زرق برق پوشاکیں، بیش قیمت سواریاں، انواع و اقسام کی غذائیں، تفریحیں، ذہنی اور روحانی آسودگیاں دنیا اور عاقبت دونوں جگہ کے اطمینان انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ تیسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو اس پہلے گروہ کے برابر خوش قسمت تو نہیں ہیں لیکن پھر بھی آرام و عافیت سے ہیں چوتھے گروہ کی زندگی نسبتاً سخت ہے لیکن پھر بھی جیسے تیسے زندگی گذری جاتی ہے۔ پانچواں گروہ اصل کام کرنے والوں کا ہے جو تمام دوسرے گروہوں کا کمر توڑنے والا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہے اور جسے خود زندگی کے سکھ چین کا بہت کم حصہ ملتا ہے اور پانچواں گروہ ان بدنصیب لوگوں کا ہے جو زندگی کی تقریباً تمام لذتوں سے محروم ہیں۔

ان بنیادی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اب آئیے ان مختلف گروہوں میں اپنے بھائی بند یعنی ہندستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو تلاش کریں۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

چین و جاپان کے تعلقات چین پر جاپان نے جو جو زیادتیاں کی ہیں ان کی وجہ سے ایک دنیا جاپان سے ناخوش ہے۔ مگر پھر بھی چینیوں جاپانیوں کے تعلقات کا مسئلہ اتنا صاف نہیں جتنا کہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چونکہ چین کی کمزوری سے دول یورپ بھی فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کرتی تھیں اس لئے جاپان نے جو کچھ کیا اس کو چینی قوم کا ایک حصہ اس قدر برا نہیں سمجھتا جتنا کہ یورپ والے بتاتے ہیں۔ ان دونوں قوموں میں معاشی اور سیاسی تعاون کے امکانات کم سہی مگر مفقود نہیں ہیں۔ غرض ان کے تعلقات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے معمولی قیاسات سے زیادہ گہری شہادتوں کی ضرورت ہے۔ ہم ذیل میں چین کے ایک مشہور فاضل ڈاکٹر شی کی ایک کھلی چٹھی کا ترجمہ شائع کرتے ہیں جس سے ان تعلقات پر مفید روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر شی چین کے نہایت ممتاز اور با اثر اہل علم میں سے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے خیالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اہل جاپان کے نام:- یہ کھلی چٹھی آپ کے ایک ممتاز عالم مسٹر نکا زوبو کی اس درخواست کی تعمیل میں ہے جو کوئی تین مہینے ہوئے انہوں نے کی تھی۔ اس کے لکھنے میں دیر کچھ تو پچھلے مہینوں میں کام کی زیادتی سے ہوئی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ مجھے شبہ تھا کہ ایسے خط سے کوئی فائدہ بھی ہوگا یا نہیں اس لئے کہ اگر میں آپ کو خوش کرنے کے لئے میٹھی میٹھی باتیں لکھ دوں تو یہ میرے ضمیر کے خلاف ہوگا اور اگر میں ٹھیک ٹھیک اپنی دل کی باتیں کہوں تو اندیشہ ہے کہ آپ انہیں سنیں گے ہی نہیں۔ پھر بھی یہ خط لکھتا ہوں اس لئے کہ حال میں چین و جاپان کے تعلقات اس قدر برے ہوگئے ہیں کہ اب مجھے اسے چھپانے کی تاب نہیں جو میرے دل میں ہے۔

پہلا پیام جو میں آپ کی خدمت میں دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ خدارا چینی جاپانی دوستی کا ذکر فرمانا چھوڑ دیجئے۔ پچھلے چار سال میں میں نے جب کبھی کسی جاپانی کی زبان سے یہ میٹھے لفظ سنے میں

تو مجھے ہمیشہ ایک دکھ سا محسوس ہوا ہے، ویسا ہی دکھ جیسا کہ جاپانی فوج پرستوں کے منہ سے "پدرانہ حکومت" کا لفظ سن کر ہوتا ہے .... ابھی گذشتہ جون میں جاپانی فوجیوں نے چینی حکومت کو مجبور کرکے وہ "اپنے ہمسایہ سے محبت کرو" والا اعلان نکلوایا تھا جس نے جاپان کے خلاف قول و فعل کو ممنوع قرار دیدیا۔ اور سچ ہے کہ اس اعلان نے ایسے قول و فعل کا سدباب بھی کیا۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ کسی حکومت کا اعلان چاہے کتنا ہی سخت ہو لوگوں کے ملی جذبات و خیالات کو نہیں دبا سکتا۔ اور اب کہ ان خیالات و جذبات کو، کہ شدید نفرت کے خیالات ہیں، مناسب طریق پر اظہار کا موقع نہیں، قدرتی بات ہے کہ یہ دلوں میں اور جڑ پکڑیں اور ان کا رنگ پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا جائے۔ یہی فطرت انسانی کا معمولی تقاضا ہے اور مجھ میں نہیں آتا کہ جاپانی فوجی اور شہری اس کو کیسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لہذا میری پہلی التجا یہی ہے کہ اس "چینی جاپانی دوستی" کا ذکر بند کیجئے، اس وقت تو کام یہ ہے کہ چینی جاپانی دشمنی کو ختم کرنے کی راہ ڈھونڈی جائے، دوستی کو بڑھانے کا معاملہ پیش ہی نہیں ہے۔ جب تک یہ باہمی نفرت ختم نہ ہوگی دوستی کا تذکرہ بس جاپانیوں کی طرف سے چینیوں کی اہانت ہے اور چینیوں کی طرف سے محض جھوٹی باتیں۔

میرا دوسرا پیام یہ ہے کہ آپ لوگ، ہم کروڑ انسانوں کی نفرت کو بے اعتنائی سے نہ دیکھیں ایک بھڑ کا ڈنک بھی تو زہریلا ہوتا ہے"۔ آپ کے لئے اس کا تصور مشکل نہ ہوگا کہ ہم کروڑ آدمیوں کی نفرت سے آپ کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اس میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ گذشتہ چار سال میں چینی حکومت اور چینی قوم آپ کے بیجا مطالبات کو پورا کرنے کے لئے برابر دبتے رہے ہیں۔ اور یہ انھوں نے اس لئے کیا ہے کہ وہ آپ کی فوج اور آپ کے بیڑے کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہیں اور انھوں نے اسلحہ کے تصادم کے ہر امکان کو ٹالنے کی کوشش کی تاکہ اس مجبوری کی اطاعت سے انھیں اپنی منتشر قوم کی شیرازہ بندی کا موقع ہاتھ آجائے۔ لیکن آپ کے فوجیوں کی حرکتوں کو صبر سے دیکھتے دیکھتے ہمیں بالآخر اس تکلیف دہ نتیجہ پر پہنچنا پڑا ہے کہ ان فوجیوں کی حرص

کی کوئی ضرورت ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہے، انھیں جو تیل ہی چاہئے۔ اس پر بھی بس نہیں، چہار
کے مشرقی حصے پر حملہ بول دیا۔ اور اب جو جاپان کا علاقہ بھی کافی نہیں جس سے فوجیں ہٹالی گئی
تھیں، شمالی چین کے پانچ صوبوں میں ایک ریاست درکار ہے جو ان کے اشاروں پر ناچے۔ اور
اس طرح رفتہ رفتہ یہ گھن سب جسم کو کھاتے کھاتے چین کے قلب تک پہنچ رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ
ان کی حرص کی حد نہیں مگر شاید افسوس نے اس کا خیال نہیں کیا کہ چینی اطاعت شعاری اور صبر کی بھی
کوئی حد ہوگی۔ اور وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ چینی قوم اس توہین اور نفرت سے دیوانی ہو کر ترکی بہ
ترکی جواب دینے پر مجبور ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔

مجھے امید ہے کہ آپ اسے مان لیں گے کہ جب دو ملک ایک دوسرے سے جنگ کی ٹھان
لیں تو مضبوط جیتتا ہے اور کمزور ہارتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہارے ہوئے کے دل میں ہمیشہ
نفرت رہے۔ روسی جاپانی جنگ کو پانچ سال نہ گزرنے تھے کہ روسی جاپانی دوستی کا معاہدہ ہوگیا۔
چینی جاپانی جنگ کو دس برس نہ گزرے تھے کہ چینیوں نے روسیوں سے جنگ میں جاپانیوں کے
ساتھ ہمدردی کی۔ پروشیا سے شکست کھا کر زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ آسٹریا نے اپنے سابق حریف
سے اتحاد کیا۔ جنگ میں شکست سے نفرت کا پیدا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں جب کسی پر بے خبری میں
وار کیا جائے یا ایسی حالت میں کہ وہ مقابلہ و مدافعت کی طاقت نہ رکھتا ہو اس پر ٹوٹ پڑا جائے تو سخت
تلخی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ پست چیز ہے جو جاپان جیسے ملک کو نہ کرنی چاہئے جہاں شجاعت کی
نہایت قدیم روایات موجود ہیں۔

میرا تیسرا پیغام یہ ہے کہ آپ اپنے کو اپنے ماضی کے شاندار تفصیلات سے محروم نہ کیجئے
نہ اس عظیم الشان مستقبل سے جو آپ کے سامنے ہے۔ پچھلے ساٹھ برس میں جاپان نے جو کچھ حاصل
کیا اس سے جاپانی قوم ہی کی ایک شاندار تصویر سامنے نہیں آتی بلکہ تاریخ انسانیت کا ایک
بڑا معجزہ بھی۔ جو کوئی ان ساٹھ سال کی جاپانی تاریخ پڑھے گا اس پر حیرت و ہیبت ضرور طاری
ہوگی۔ لیکن آپ کو ایک چینی ضرب المثل یاد دلاؤں جو کام اچھی طرح شروع ہو، لیکن اسی نیک نیتی سے

اسے چلایا نہ جائے تو انجام بخیر نہیں ہوتا" ایک عظیم الشان ملک کے بنانے میں قوم کو بے حساب محنت کرنی پڑتی ہیں پر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو ایک لمحہ کی جلد بازی یا غفلت کافی ہے۔ میں ماضی کی بڑی سلطنتوں کی مثالیں پیش نہیں کرتا۔ ابھی کوئی دو سو سال کی بات ہے کہ اسپین کوئی نصف کرۂ ارض پر قابض تھا اور دنیا کے ہر گوشہ میں اس کی نوآبادیاں تھیں۔ مگر آج وہ عظیم الشان سلطنت کہاں ہے؟ .... ان تاریخی مثالوں پر جتنا تدبر کیجئے اتنا ہی اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ "انجام بخیر" کرنے کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

دنیا میں کسی ملک کا مستقبل اتنا امید افزا نہیں جتنا جاپان کا۔ اس کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اس کی راہ میں کوئی روک ہے تو بس خود اس کی یہ خواہش کہ اپنے کو تباہ کرے!

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں ہوں جن کے نظر میں جاپان کی پچھلی ترقیوں کی بڑی قدر ہے، میرے ذہن میں اس عظیم الشان مستقبل کا تصور ہے جو جاپان کا حصہ ہو سکتا ہے، میری نظر میں جاپانی شہنشاہوں کا لمبا سلسلہ ہے، اس کے باشندوں کی محنت پسندی، کفایت شعاری اور وطن پرستی ہے، اس کی شجاعانہ روایات ہیں، اس کی حسن دوستی ہے، اس کی عالمانہ تفلسف ہے مجھے اس قوم میں جرمن اور انگریز قوموں کے بہترین صفات کا مجموعہ نظر آتا ہے، اور میری نظر میں جاپان کا مستقبل یہ ہے کہ وہ مشرق کی سب سے معزز و محترم قوم بنے۔ مگر جب جاپان کے نئے سیاسی حالات کو دیکھتا ہوں تو اس مستقبل کی طرف سے بڑے اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھتا ہوں کہ پچھلے ساٹھ برس میں اس کے سیاسی نظام میں جو جمہوری روح ظاہر ہوتی رہی ہے اس کی جگہ دیکھتے دیکھتے چند فوجی ڈکٹیٹروں نے لے لی۔ پھر جس ملک کی ہمیشہ سے یہ شہرت تھی کہ اس میں نظم و ترتیب سیاسی بہت غیر معمولی ہے، وہاں سیاسی انتشار کا ایسا دور دورہ ہے کہ ایک اجنبی حیرت سے سوچتا ہے کہ اس ملک میں سیاسی اقتدار کس کا ہے اور فوجی اقتدار کس کا۔ تیسرے جاپان ہمیشہ سے ایک ملک تھا جس کو لوگ پسند کرتے اور جس کی لوگ عزت کرتے تھے۔ اب اس کو امن عالم کے لئے خطرہ جانکر ڈرتے ہیں اور وہ ہر طرف دشمنوں سے گھرا ہوا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ جاپانی قوت

نے جو [illegible] صورت حال پیدا کر دی ہے اسے برقرار رکھنے کے لئے اور زیادہ قوت درکار ہے جس کے لئے لازم ہے کہ اسلحہ کو بے حساب بڑھایا جائے۔ جاپان اسلحہ بڑھائے گا تو دوسری دول بھی اس دوڑ میں حصہ لیں گی اور شاید اس دوڑ کا نتیجہ ایک عالمی جنگ ہو کر رہے۔

جاپان کے ہاتھ میں اس قدر وسیع غصب کیا ہوا رقبہ زمین ہے، چالیس کروڑ انسانوں کی شدید نفرت ہے، خشکی پر ایک طاقتور حریف کا سامنا ہے۔ سمندر میں دو حریفوں کا مقابلہ ہے۔ شاید پہلے کبھی جاپان کو ایسی دانشمندی، تدبر اور دور اندیشی کی ضرورت نہ تھی جتنی کہ آج ہے۔ صراط مستقیم سے ذرا انحراف ہوا اور نہایت سخت نتائج پیدا ہونے کا احتمال ہے جو ساری قوم کو خودکشی کے گڑھے میں دھکیل دیں گے...... مجھے امید ہے کہ آپ اپنے ماضی کی قدر کریں گے اور اپنے مستقبل کا بھی پاس رکھیں گے، اور میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ جاپان کی بربادی سے نہ چین کو کچھ خاص فائدہ ہوگا نہ دنیا کو۔

آپ کا مخلص ٹیگور

منگولیا | ایشیا کا یہ دور افتادہ علاقہ جو چنگیز خاں کی عظیم الشان سلطنت کے باقیات سے ہے اب تک مقابلتہ پر امن سی جگہ تھی۔ چودھویں صدی سے جب اس کے باسیوں کا تسلط چین پر ختم ہوا، یہ ایک خاموش سا علاقہ ہے جہاں کسی قسم کی ترقی یا حرکت کا پتہ نہیں۔ روسی سلطنت کی قوت اور چین میں منچو خاندان کے اقتدار نے ہجرت کر کے دور دور پہنچنے کے امکانات کم کئے تو ان منگولوں کی خانہ بدوش زندگی میں کچھ تغیر ضرور پیدا ہوا مگر وہ بھی خفیف سا اور یہ یورپ کی نئی ایجادات اور جدید صنعت کے اثرات سے کم و بیش محفوظ ہے۔ چین اور روس سے بہت کچھ الگ تھلگ یوں رہے کہ روس کا جو علاقہ سائبیریا ان سے ملا ہوا افتادہ آدمیوں سے خالی تھا، چین کے اور ان کے درمیان صحرائے گوبی حائل تھا۔ دنیا سے کچھ تعلق تھا تو ان تجارتی کاروانوں کے ذریعہ جن کے ہاتھوں پہلے مشرق اور مغرب کی تجارت کے فرائض سر انجام پاتے تھے۔ مگر جب سے دوسرے ملکوں کو ریل اور جہاز کی سہولتیں ملیں یہ تعلق بھی ختم ہو گیا۔

انیسویں صدی میں جب روس نے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا تو منگولیا سے تجارتی تعلقات بڑھے کیونکہ روس اور چین کی باہمی تجارت بہت کچھ منگولوں کی معرفت ہونے لگی۔ حتیٰ کہ روس اور منگولیا کی سرحد پر کیاختا نامی مقام اس تجارت کا مرکز رہا۔ روسی تجارتی کارواں کی حفاظت منگولوں کے سپرد رہی اور اس طرح خاصے خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ ان تعلقات کو قانونی حیثیت اس معاہدہ میں مل گئی جو ۱۸۶۰ء میں چین اور روس میں ہوا۔ اس لئے کہ منگولیا قانوناً چین ہی کا صوبہ تھا۔ مگر چین کا تسلط کچھ ایسا کمزور تھا کہ جب کبھی منگولیا کے سردار چین کے منچو حکمرانوں سے ناخوش ہوتے تو روس سے براہ راست معاملہ کرنے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اسی سے بیرونی منگولیا اور اندرونی منگولیا کا وہ فرق پیدا ہوا جس سے موخرالذکر پر تو چینی تسلط پورا پورا تھا، مگر اول الذکر پر بس برائے نام۔ چنانچہ جب چین نے اپنے اقتدار کو ذرا بڑھانے کی کوشش کی تو منگولوں نے ۱۹۱۱ء میں براہ راست روس سے مدد چاہی۔ اسی سال چین میں انقلاب ہو گیا تو انھوں نے چینی جوا اتار پھینکا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ نئی ریاست کو روس نے جھٹ تسلیم کر لیا اور ۱۹۱۲ء میں اس سے ایک مستقل عہد نامہ بھی کر لیا۔ منگولیا سے یہ عہد نامہ دراصل اس پرانے منصوبے کا ایک جزو تھا جسے روسی جاپانی جنگ نے ۱۹۰۵ء میں روک دیا تھا۔

اس جنگ کی کامیابی کے بعد سے جاپان کی نظریں بھی منگولیا کی طرف ہیں۔ شروع ہی میں روس سے تصادم کا ڈر تھا اس لئے دونوں ملکوں نے ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ کر کے اپنے اپنے 'حقوق' کا تعین کر لیا تھا۔ پھر ۱۹۱۰ء میں ایک اور معاہدہ ہوا تھا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے 'حقوق' کا احترام کریں گے۔ اس معاہدہ میں 'حقوق' منچوریا اور منگولیا (بیرونی) تک محدود تھے، جب ۱۹۱۲ء میں ایک اور معاہدہ ہوا تو اس میں اندرونی منگولیا بھی شامل کر لیا گیا اور قرار یہ پایا کہ پیکنگ کے طول البلد سے مشرق کو جو علاقہ ہے وہ جاپان کے حلقہ اثر میں ہے، مغرب والا حصہ روس کے۔

روس جب جنگ عظیم میں شریک ہوا تو چینیوں کو موقع ملا۔ انھوں نے چاہا کہ منگولیا کو پھر اپنا صوبہ بنا لیں اور اگر اس کی خودمختاری کو ختم نہ کر سکیں تو کم ضرور کر دیں۔ اندرونی منگولیا میں تو چینی

بڑی کوشش سے جاپان کی بھی گو بیرونی میں قدم نہ جم سکے۔ جب روس میں انقلاب ہوا تو چین نے ۱۹۱۹ء میں بیرونی منگولیا کو ایک فوجی مشن بھیجا جس کا مقصد اسے پھر سے چینی صوبہ بنا لینا تھا جاپان جو اس وقت انقلابی روس کو زک دینا چاہتا تھا اس میں چینیوں کو شہ دے رہا تھا۔ چنانچہ چینی جنرل شو تسنگ نے بلا کسی مزاحمت کے وہاں قدم جمالئے۔ ارگا میں بدھ مذہب کے سردار کو قید کر لیا اور وہ اندھیر شروع کیا کہ الامان۔ اس کا خاتمہ بیرن اسٹرنبرگ نے کیا جو روس کی انقلابی فوج سے بھاگ کر یہاں وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے چینی جنرل کو بھی ظلم و زیادتی میں مات کر دیا اور بالآخر ان کے جور و ستم سے منگولیا کو اس وقت نجات ملی جب روس کی انقلابی فوج نے ان کا خاتمہ کر ڈالا۔

روسیوں نے یہاں ایک انقلابی حکومت قایم کی مگر آغاز کار کی دشواریوں کو دانشمندی سے خوب سمجھا۔ بدھ مذہب کے بڑے پیشوا کو رہا کر کے اس حکومت کا صدر بنایا، غربا کو حکومت کے معاملات میں حق رائے دہی بخشا اور اپنی ساری فوجیں ہٹا لیں۔ جب مذہبی پیشوا صاحب نے دنیا سے کنارہ کیا تو پھر ان کی جگہ پُر نہیں کی گئی اور ۱۹۲۴ء میں ایک نئے دستور سیاسی کا اعلان ہوا جس کو منگول اپنی خود مختاری کا صداقت نامہ جانتے ہیں۔ لیکن اسی سال چین اور روس میں ایک معاہدہ ہوا جس میں درج ہے کہ روس بیرونی منگولیا کو جمہوریہ چین کا حصہ تسلیم کرتا ہے اور ہمیشہ اس پر چینی اقتدار کا احترام کرتا ہے گا۔ لیکن منگولیوں نے کبھی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کیا اور عملاً ان کا نہایت گہرا علاقہ صرف روسیوں سے رہا ہے۔

اس عرصہ میں جاپان بھی خاموش نہ تھا۔ یوں تو اس کی نظر ۱۹۰۳ء سے منگولیا پر تھی۔ مگر اب منچوریا میں جاپانی اقتدار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ منگولیا کا معاملہ ان کے لئے زیادہ اہم ہو گیا۔ یہاں چینیوں کی ایسی خونریزی کرائی گئی، پھر کام نکل گیا تو انھیں چھوڑ دیا۔ اندرونی منگولیا والوں کو اسلحہ پہنچا پہنچا کر چینیوں کے خلاف بغاوت کرائی اور جب چینی ان کے مطالبات کو ماننے لگے تو ساتھ چھوڑ کر ان منگولوں کو پٹوا دیا (۱۹۳۶ء میں برگا قبیلہ کی بغاوت!) ادھر منچوریا میں فوجی کارروائیاں شروع ہوئیں۔

ادھر منگولیا میں اپنی علیحدہ ریاست بنانے کی تحریک جاپانی مدد سے شروع ہوئی۔ پھر منچوریا پر تسلط
پاتے ہی اس کے اندر ایک خود مختار منگول ریاست بھی بنائی گئی تاکہ منگول جاپان کی طرف کھنچیں۔ رشوت
دے دے کر ان کے سرداروں اور امیروں کو اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو ملایا۔ انہیں اسلحہ پہنچائے۔
چین کے خلاف بھڑکانے کے لئے قومی آزادی کا [illegible] چلایا۔ جب موقع ملا تو اس علاقہ کے چینی جنرلوں کو
اکسا دیا۔ اور رفتہ رفتہ اندرونی منگولیا کے بڑے حصہ پر خود قابض ہو گئے۔ جو حصہ ان کے قبضہ میں نہیں
آیا ہے اس کا سودا بھی شاید جلد ہو جائے گا۔ اس لئے کہ شہزادہ "طے" جنہوں نے [illegible] میں
نانکنگ کی چینی حکومت سے اس علاقہ کے لئے ایک خود مختار سیاسی جمعیۃ کی منظوری حاصل کر لی تھی،
ہوشیار آدمی ہیں۔ حال ہی میں سنا ان کا آنا جانا منچوریا میں بھی رہا ہے اور یہ اپنے صدر مقام کو بدل کر
جاپانی اقتدار والے علاقہ کے قریب لے جانے کی فکر میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔

امیر امراء بچاری اگر جاپان کی طرف جھک رہے ہیں تو غریب اور نادار روس کی طرف ہیں۔ ان
غریبوں کو وطن فروشی کے سارے سودے میں کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔ اس لئے وہ روس کی مدد سے
جاپانی اقدام کی راہ میں حائل ہیں۔ رفتہ رفتہ معاملات یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ منگولیا کے مسئلہ پر
روس اور جاپان میں جنگ تک کا اندیشہ بعید از قیاس نہیں رہا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جاپان اور
روس کی سیاست میں جو بے شمار تضاد ہیں جن سے کسی وقت ان میں ٹکر ہو جانے کا امکان ہے ان
میں منگولیا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر منگولیا جاپان کے زیر اثر آ جائے تو روس کے لئے جاپان کے
مقابلہ میں لشکر کشی کی مشکلیں بہت بڑھ جائیں۔ ایک تو منگولیا میں مویشی اور اون ہوتا ہے جس کی ضرورت
جاپانی صنعت کو ہے۔ اس کے علاوہ معدنی ذخائر بھی بہت ہیں۔ پھر یہ جاپانی مال کی منڈی بھی بن
سکتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ بڑی بات اس کی فوجی اہمیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانی فوجوں کے
لئے منگولیا کی طرف سے روس پر حملہ کرنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔ اور بعض فوجی مبصر تو یہ پیشگوئی بھی
کر رہے ہیں کہ روس اور جاپان کی فوجوں کے فیصلہ کن معرکے جھیل بیکال کے علاقہ میں ہونگے۔ اس کے علاوہ چین کی
اشتراکی فوجوں کے مقابلہ کے لئے بھی منگولیا سے نہایت موثر کارروائی ممکن ہے۔ بہر حال گمان یہ ہے کہ منگولیا کی خبریں اس

بلکہ آج کل تو قوت یہ ہے کہ مال ابھی قیمت پر بک نہیں سکتا" اور جب جنگ شروع ہو جائے تو اس وقت محض نوآبادیوں کا ہاتھ میں ہونا یا معاہدوں کی رو سے کسی نوآبادی سے کوئی خام جنس حاصل کرنے کا حق ایک بے معنی سی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس ملک کے پاس ساری جہان کی نوآبادیاں ہوں پر ان تک پہنچنے کے وسائل نہ ہوں تو یہ سب بیکار ہونگی۔ آخر گذشتہ جنگ میں جرمنی کی نوآبادیوں کے معاشی وسائل اس کے کس کام آئے۔ اور اگر سمندر کے راستوں پر قبضہ ہو اور ہر غیر جانبدار ملک تک بے روک ٹوک پہنچنے کا موقع ہو تو پھر جنگ کے زمانہ میں بھی، کہ قیمتوں کا مسئلہ اتنا اہم نہیں رہتا، وہ ملک جو اجناس خام چاہتا ہے حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ جنگ کے زمانہ میں برطانیہ نے کیا۔ گویا معاشی وسائل کا مسئلہ بھی بالآخر بری، بحری، اور ہوائی قوت کا مسئلہ ہے۔

البتہ امن کے زمانہ میں یہ سمجھنا کہ کوئی نوآبادی اپنا مال بیچنے سے انکار نہ کرے گی، جیسا کہ سر سیول ہور نے بیان فرمایا تھا، انصاف نہیں ہے۔ بیشک امن کے زمانہ میں نوآبادیاں سب ہی کے ہاتھ اپنا مال بیچتی ہیں اور سب کے ہاتھ کم و بیش ایک ہی دام پر بیچتی ہیں۔ مگر آج بھی تو دنیا میں منجملہ اور چیزوں کے ربڑ، تانبے اور ٹین کی پیداوار پر مصنوعی پابندیاں عاید کر کے ان کی قیمت کو بڑھایا گیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ وہ تو سب کے لئے بڑھایا ہے۔ یہ تو نہیں کہ جرمنی کو ان چیزوں کے دام زیادہ دینے پڑتے ہوں اور برطانیہ کو کم۔ دام زیادہ ہیں تو سب کے لئے ہیں۔ مگر ذرا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ برطانیہ نے ان چیزوں کی فراہمی کے کاروبار میں بھی تو بے شمار سرمایہ لگا رکھا ہے۔ اسے اگر قیمت وہی دینی ہوتی ہے جو جرمنی کو تو قیمت کی زیادتی سے اس سرمایہ پر تو بہت زیادہ منافع ملتا ہے۔

یہی نہیں۔ برطانیہ کو ان ممالک میں جہاں ان صنعتوں میں اس کا سرمایہ لگا ہے اپنا مال بیچنے میں بھی تو سہولت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی کافی نہیں کہ یہ نوآبادیاں بلا امتیاز سب کے ہاتھ اپنا مال بیچنے کو تیار ہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو وہاں مال بیچنے کی بھی یکساں سہولتیں حاصل ہوں۔ ان کا مال خریدنے والے ان سے اس لئے مال خرید نہیں سکتے کہ ان کے ہاتھ بیچ نہیں سکتے ہیں۔

[illegible] سے خیال یہ ہے کہ اگر خام اجناس کے وسائل کی کوئی نئی تقسیم کی جائے گی تو اس کے معنا [illegible] کی ان دیواروں کو بھی توڑنا پڑے گا جو مختلف ملک نے اپنے گرد اٹھا رکھی ہیں انگلستان کے مشہور سیاسی رسالہ راؤنڈ ٹیبل نے اپنی مارچ کی اشاعت میں اس مسئلہ پر صحیح لکھا ہے کہ " ہم دیانت داری سے نوآبادیوں کے وسائل خام پر دسترس کا مسئلہ اس وقت تک نہیں اٹھا سکتے جب تک ہم اپنی سلطنت کی نوآبادیوں میں شاہی ترجیح کے مسئلہ کو چھیڑنے پر تیار نہ ہوں۔ .... وہ رجحان ذہنی جو نوآبادیوں کو " اپنی منڈی " سمجھتا ہے اسے آپ نوآبادیوں کے امین ہونے کی حیثیت سے نہیں ملا سکتے۔ نہ اس کا میل بین الاقوامی جھگڑوں کو جڑ سے مٹانے کی اس مخلصانہ کوشش سے ہو سکتا ہے جو غیر مطمئن دول کی جائز شکایات کو رفع کرنا چاہتی ہے ...... جہاں تک ماتحت علاقوں کا تعلق ہے سب کو خام وسائل پر دسترس دینے کا تقاضا تو یہ ہے کہ تجارت کا دروازہ نوآبادیوں میں سب پر یکساں کھلا ہو۔"

چند اعداد | اس سلسلہ میں مارچ ۱۹۳۶ء کے کرنٹ ہسٹری (نیویارک) کے ایک مضمون " جنگ اور آبادی " سے ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کہ ارض کا کل رقبہ ۱۹ کروڑ ۲۰ لاکھ مربع میل ہے۔ جس میں ۷۲ فی صدی سمندر ہے، اور ۲۸ فی صدی یعنی کوئی ۵½ کروڑ مربع میل خشکی۔ اس رقبہ میں بھی جھیل اور دریا اور ریگستان شامل ہیں یعنی آدمیوں کے بسنے کے لئے اس سے بھی کم رقبہ ہے۔ دنیا کی آبادی کا تخمینہ ہے کوئی ۲ ارب، کروڑ، ۲۰ لاکھ نفوس۔ یعنی ایک مربع میل پر کوئی ۴۰ آدمی۔ مختلف براعظموں کا حال اس حیثیت سے جدا جدا ہے۔ مثلاً یورپ سب سے گھنا آباد ہے اس میں ایک مربع میل پر حساب سے ۲۹ آدمی آتے ہیں، اس کے بعد ایشیا میں ایک مربع میل پر ۶۷ کا حساب پھیلتا۔ دوسرے براعظم ان سے پیچھے ہیں۔ شمالی امریکہ میں فی مربع میل ۱۶ - ۲۰ آدمی بستے ہیں، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ۱۲ آدمی فی مربع میل۔ اور آسٹریلیا اور اوشینیا میں ۳ شخص فی مربع میل۔

ملکوں کا حال ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوگا:۔

ملک	اشخاص فی میل مربع	ملک	اشخاص فی میل مربع
بلجیم	۷۰۰	ہنگری	۲۴۱
انگلستان و ویلز	۶۸۴	پولینڈ	۲۲۱
نیدرلینڈ	۶۵۹	ڈنمارک	۲۲۰
جاپان	۴۴۹	آسٹریا	۲۰۸
جرمنی	۳۶۳	فرانس	۱۹۶
اٹلی	۳۵۶	ہندوستان	۱۹۵
چین	۲۹۹	پرتگال	۱۹۲
چکوسلاویا	۲۷۱	بلغاریہ	۱۵۲
[illegible]	۲۵۵	یوگوسلاویہ	۱۴۵

ذیل کے نقشوں سے دنیا کی سلطنتوں کے رقبہ اور آبادی، اور حکمراں ملک کے رقبہ اور آبادی کے تناسب روشن ہو جائیں گے۔

نقشہ ۱

سلطنتوں کا رقبہ اور آبادی

سلطنت	دنیا کے رقبہ کا فیصد	دنیا کی آبادی کا فیصد کس قدر	آبادی فی مربع میل
۱. برطانوی	۲۵/۲	۲۴/۹	۴۸/۱
۲. روس	۱۵/۹	۸	۲۰/۱
۳. فرانس	۸/۹	۵	۲۲/۷

۳۔ امریکہ	۷٫۲	۶٫۶	۳۶٫۹
۵۔ اطالوی	۱٫۹	۲٫۱	۴۵٫۴
۶۔ بلجیم	۱٫۸	٫۸۵	۱۹٫۱
۷۔ پرتگیزی	۱٫۶	٫۷۶	۱۸٫۵
۸۔ ولندیزی	۱٫۵	۳٫۳۴	۸۶٫۵
۹۔ جاپانی	۱٫۴	۶٫۲۶	۱۷۹٫۴

نقشہ ۲

حکمران ملکوں کا رقبہ اور آبادی

کسی سلطنت پر حکمراں ملک	اس کا رقبہ دنیا کے رقبہ کا کس قدر ہے	اس کی آبادی دنیا کی آبادی کا کس قدر ہے	آبادی فی مربع میل
بلجیم	٫۰۲۳	٫۴	۷۷۰٫۵
نیوزلینڈ	٫۰۲۴	٫۴	۶۵۹٫۱
انگلستان، ویلز و اسکاٹستان	٫۱۷	۲٫۱۷	۵۰۵٫۸
جاپان	٫۲۹	۳٫۲۹	۴۶۲٫۱
اٹلی	٫۲۳	۲٫۰۵	۳۵۶
فرانس	٫۴۱	۲٫۰۲	۱۹۶٫۸
پرتگال	٫۰۶۹	٫۳۳	۱۹۳٫۳
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۵٫۸۵	۵٫۹۳	۴۰٫۶
یورپی روس	۲٫۷۹	۶٫۴۵	[illegible]۸٫۱

جنگ کے امکانات کو سمجھنا ہو تو ان نقشوں کا غور سے مطالعہ کیجئے۔ دنیا کی ۹ قومیں جن کی اپنی آبادی دنیا کی آبادی میں بقدر ۲۳ فیصد ہے اور جو ربع مسکون میں ۱۴ فیصدی زمین پر بستے ہیں یہ نو قومیں دنیا کی ساری زمین میں ۲۲ فیصد پر قابض اور دنیا کی آبادی میں ، ۵ فیصدی قسمتوں کی مالک ہیں۔ اور اس میں سے روس اور امریکہ کو چھوڑ دیجئے تو باقی ، قومیں جن کی آبادی دنیا کی آبادی میں صرف ۱۱ فیصد ہے اور جو دنیا کی زمین کے صرف ۱/۴ فیصد حصہ پر بستی ہیں وہ دنیا کی ۴۹ فیصد زمین اور اسی قدر انسانوں پر مسلط ہیں۔

پہلے نقشہ میں یہ بات اور دیکھنے کی ہے کہ یہی چار سلطنتوں کے پاس ابھی دنیا کی آبادی کے مقابلہ میں دنیا کا رقبہ زیادہ ہے۔ یعنی یہ چار سلطنتیں ربع مسکون کے ۵۰ فیصد پر قابض ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جاپان، جرمنی اور اٹلی اس لوٹ میں اپنا "حق" جتانے میں کبھی کبھی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

جرمن مالیات | جرمنی کی مالی دشواریوں کو قرضہ اور اعتبار کی چالاکیوں سے رفع کرنے کی جو حیرت انگیز تدبیریں ڈاکٹر شاخت نے کی ہیں ان کا خیال کر کے اگر انھیں مالیات کا بازیگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ذیل میں ہم ایک جرمن رسالہ سے ایک چھوٹا سا لطیفہ نقل کرتے ہیں جس سے اس بازیگری پر ان جرمنوں کی رائے ظاہر ہوتی ہے جو اس وقت جلاوطن ہیں۔ جرمن رسالہ Das neue Tage - Buch سے یہ اقتباس لیا گیا ہے:-

اعلیٰ ریاضیات

پانچ جرمن وزیر، گوئرنگ، گوئبلز، بلوم برگ، دارے، اور ہر ڈاکٹر شاخت کے دفتر میں آتے ہیں۔ ان سب کو پردیسی زر مبادلہ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شاخت بتلاتے ہیں کہ سرکاری بنک کے پاس سب لے دے کر کل ۳۰ مارک میں مبادلہ خارجہ کے لئے باقی ہیں۔ مگر یہ پانچوں وزیر کہتے ہیں کہ

ہیں تو ہر ایک کو [illegible] سمجھا دو کار ہیں۔ جیسے بھی ہو دلوایئے۔ ڈاکٹر شاخت کا غذ کا ایک پرزہ
لیتے ہیں اور اس پر لکھتے ہیں۔

15 + 15 + 15 + 15 + 15

کچھ دیر سوچتے ہیں اور یکایک بول اٹھتے ہیں " بہت اچھا ، بہت اچھا۔ صاحبان من
بہت اچھا ، ایک صورت نکل آئی۔ آپ کو ہر ایک کو 15 - 15 ملیں مل جائیں گے۔"
یہ بالکل ظاہر ہے کہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ 30 ملیں میں سب کا کام کیسے نکل جائیگا۔
تو ڈاکٹر شاخت انہیں سمجھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں " دیکھئے۔ پہلے سیدھے ہاتھ کا ہندسہ لیجئے
5 + 5 + 5 + 5 + 5 یہ ہوئے 25 - اب الٹے ہاتھ والا ہندسہ جوڑیئے 1 + 1 + 1 + 1 + 1
یہ ہوئے 5 - 25 اور 5 مل کر ہوئے 30 ۔

سب وزیر تعجب سے چلا اٹھے ۔ " مگر ڈاکٹر شاخت کہیں ایسے بھی ہندسے جوڑے
جاتے ہیں۔ یوں جمع نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر شاخت مسکرائے اور بولے " نہیں کر سکتا کی آپ نے ایک کہی۔ میں ڈھائی برس
سے اسی طرح جمع کرتا ہوں ۔ بار ہا کر دم ـــــ و شد ! "



ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شائع کی ہیں۔ جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہوں از راہ کرم مطلع فرمائیں۔ مطلوبہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مطبوعات جامعہ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) ناشرینِ اُردو۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) مصنفینِ اُردو۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مؤلفین اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۴) بچوں کی کتابیں۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی بہترین فہرست

(۵) عورتوں کی کتابیں۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں

(۶) مختصر فہرست کتب۔ اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست

(۷) ادبی کتابیں۔ تاریخ و تنقید ادب۔ مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

نوٹ

تاریخی کتابیں۔ مذہبی کتابیں اور اسی طرح کے دوسرے مضامین پر علیحدہ علیحدہ فہرستیں بھی زیر ترتیب ہیں عنقریب شائع ہوں گی

جامعہ

اُردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین - ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

مطبع جامعہ دہلی

اُردو اکادمی

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

مندرجہ ذیل کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اراکینِ اردو اکادمی اپنے حساب میں طلب فرما سکتے ہیں:۔

ترجمان القرآن (جلد دوم) از مولانا ابو الکلام صاحب آزاد

قیمت بلا جلد [illegible] ۔ مجلد [illegible]

مختصر تاریخ ہند ۔ از سید ابو ظفر صاحب ندوی۔ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ

قیمت [illegible]

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۔ از مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

قیمت [illegible]

مقالاتِ شبلی جلد پنجم ۔ (تاریخی) شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

قیمت [illegible]

انقلابِ روس ۔ از کشن پرشاد صاحب کول۔ شائع کردہ۔ ہندوستانی اکیڈمی ۔ الہ آباد

قیمت [illegible]

جوشِ فکر ۔ مجموعہ مضامین سید سلطان حیدر صاحب جوش

قیمت [illegible]

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی — پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۶	مئی ۱۹۳۶ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اردو مثلاً مرزا غالب، خواجہ حالی، علامہ شبلی، مولانا آزاد، مولانا شرر علامہ اقبال، منشی پریم چند اور اردو کے جملہ مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، حیدرآباد، اورنگ آباد، اعظم گڑھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت ہمارے یہاں موجود رہتی ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرما کر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں۔

رعایت۔ مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف ہو سکتا ہے بشرطیکہ

(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔

(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ پانچ روپیہ سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہوگا۔

مکتبہ جامعہ کے مندرجہ ذیل رسائل کے نمونے مفت طلب کیجئے

"رسالہ جامعہ" ماہوار	باتصویر "پیام تعلیم" ماہوار	"کتاب نما" ماہوار
سالانہ چندہ (صہ)	سالانہ چندہ (۱۲ر)	سالانہ چندہ (۸ر)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ڈاکٹر انصاری اور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

(ڈاکٹر انصاری مرحوم ہم سے جدا ہوگئے ہیں لیکن ان کے خیالات اور کارنامے زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے ۱۹۳۵ء میں دکن ہندی پرچارنی سبھا کا جو اجلاس میسور میں ہوا تھا اس کے ڈاکٹر انصاری مرحوم صدر منتخب کئے گئے تھے اپنے خطبہ صدارت میں آپ نے ہندستان کی مشترکہ قومی زبان کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا وہ آج بھی اتنے ہی سبق آموز ہیں جتنے اس وقت تھے۔ اس خطبہ کا اصل مسودہ انگریزی زبان میں ہمیں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی عنایت سے مل گیا جس کے ضروری حصوں کا اقتباس ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔)

ہندستان کی قومی زبان کے بارے میں دو سوال ہیں جن کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا ـــــ زبان کی شکل اور رسم خط کی صورت۔ پہلے زبان کی شکل کو لیجئے۔

ہمیں اس بات کو مان لینا چاہیئے کہ عام طور پر زبان دو ہی باتوں کا اظہار کر سکتی ہے۔ یا تو مادی ضرورتوں کی خبر دینے کے لئے خیالات کو ایک شخص سے دوسرے شخص تک پہنچاتی ہے یا نہایت گہرائیوں میں چھپے ہوئے جذبات کو غیر اختیاری طور پر ظاہر کرتی ہے۔ زبانوں کے اس افادی اور رومانی تخیل کو تسلیم کرنے کے بعد ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ ایک مشترکہ قومی زبان کو اپنے مقصد کی نوعیت کی بنا پر الگ تھلگ اور بیگانہ نہ رہنا چاہیئے بلکہ ان تمام لوگوں کے ذخیرہ الفاظ کو جن سے اسے واسطہ پڑتا ہے اپنانا چاہیئے لہذا انھیں اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ اس سے یہ بات بھی نتیجہ کے طور پر از خود ماننا پڑتی ہے کہ افادی ترقی کی قربان گاہ پر زبانوں کی انفرادی خصوصیات کو کبھی بھی بھینٹ نہ چڑھانا چاہیئے۔ زبان کو جہاں تک ہو سکے ہمہ گیر بنانا چاہیئے تاکہ اس کے اندر مختلف زبانوں کی انفرادی خصوصیات جذب ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں زبانوں کے میل جول سے ان کی تمام انفرادی خصوصیات باقی نہیں رہ سکتیں

لیکن یہ بات کہ قصداً اور ارادتاً کس حد تک ان کو فنا کیا جائے اس میں اختلاف رائے کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔

زبان کی شکل کا تعین بڑی حد تک معاشرتی میل جول کی ضرورت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ معاشی تعلقات جس قدر بڑھتے ہیں ذخیرہ الفاظ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ کئی گاؤں کے ایک چھوٹے سے تعلقہ کی زبان میل جول کے اضافہ سے صوبہ کی زبان بنتی ہے۔ پھر یہی ترقی کرتے کرتے قومی زبان بن جاتی ہے۔ پھر یہ تفریق محض جغرافیائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس تفریق کے ساتھ ساتھ معاشرتی فرق یا جذب وانجذاب کا بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ شہری اور دیہاتی آبادی کی زبان میں فرق ہوتا ہے۔ مختلف پیشوں کی زبان میں اظہار خیال کی مختلف خصوصیات ترقی پا جاتی ہیں۔ شاعروں کی ایک رسمی زبان الگ بن جاتی ہے۔ واعظ اور مقرر اپنی ایک علیحدہ زبان بنا لیتے ہیں لیکن پھر بھی باہمی جذب وانجذاب سے ایک مشترکہ زبان اور عام طور پر تسلیم کئے ہوئے اظہار خیال کے طریقے نشو و نما پا جاتے ہیں اور قبول کر لئے جاتے ہیں۔ یہ سب کام زیادہ تر غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اور ایسے فرد یا گروہ کا طریقہ اظہار جسے کوئی قیمتی بات کہنا ہوتی ہے یا جسے کسی بات کو اثر آفریں طریقہ پر کہنا معلوم ہوتا ہے غیر محسوس طریقہ پر قبول کر لیا جاتا ہے۔ اسکول، اخبار، کتاب، تھیٹر —— یہ مرکز کی طرف کھینچنے اور یکساں ٹکسالی زبان بنانے میں بہت امداد دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان عوامل میں سے کوئی عامل قصداً یا ارادتاً بعض عناصر پر دوسرے عناصر کے مقابلہ میں زیادہ زور دینے لگے یا ایک بول چال کی زبان کو دوسرے کے مقابلہ میں، ایک طبقہ کے محاورے کو دوسرے طبقہ کے محاورے پر ترجیح دینے لگے تو اس طرح سے ایک یکساں اور معیاری زبان پیدا کرنے کی کوشش نکلائے خود قومی زبان کی ترقی میں ارتقاء ہونے لگتی ہے۔ اس بنا پر میں تمام ایسی کوششوں کو جن میں ارادتاً سنسکرت لفظوں کو زبان کی شدھی کرنے اور عربی لفظوں کو زبان کو مسلمان بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے خوف اور خطرہ کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ جو لوگ اپنی قوم سے گفتگو کرنا نہیں چاہتے انہیں اختیار ہے جس طرح چاہیں عربی اور سنسکرت کا استعمال فرمائیں۔ ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ بہت زیادہ نہ ہوگا لیکن بہرحال ان کا ارمان نکل جائے گا۔ مگر انہیں ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی ترقی کی راہ میں

[illegible] ...کے ساتھ ہی ساتھ [illegible]

[illegible]

...ی ہرگاہ اس طرح کا ہموار ہونا ہے کہ [illegible]
[illegible] ...کے ساتھ ساتھ چلتا ہے کہ زبان کو ضرورت سے زیادہ حسین ضرورت [illegible]
مصنوعی بنانے کا بھی امکان ہے۔ چنانچہ اپنے تبحر علمی کی بےجا اور بےجا نمائش کرنے والے لوگ
زبان میں ضرورت سے زیادہ تصنع پیدا کرتے ہیں۔ ایسے بزعم خود علامہ مصنفوں کا شمار زبان کے دوستوں
میں نہیں ہونا چاہئے بلکہ انہیں زبان کا دشمن سمجھنا چاہئے۔ جب وہ رشتے جو حسین اور مفید کو ملاتے ہیں کمزور ہو
جاتے ہیں تو زبان کی تباہی شروع ہو جاتی ہے۔ سادہ بات چیت سمجھنے کی عملی ضرورتیں ایک سادہ راستہ
چلتی ہیں اور مصنوعی حسن پیدا کرنے کی کوششیں دوسرے راستہ پر۔ عوام پہلے کا ساتھ دیتے ہیں اور پڑھے
لکھے علماء دوسرے کا۔ لیکن اس سے زبان کے دونوں حصوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ کلاسیکل عہد کے بعد
لاطینی زبان کا یہی حال ہوا اور یہی حشر یونانی اور سنسکرت زبان کا بھی ہوا۔ مجھے کسی زبان کی ترقی یا زوال
کی بابت فیصلہ کرنے کے لئے، مفید اور حسین کے اس باہمی تعلق کے علاوہ اور کوئی دوسرا معیار نظر نہیں آتا۔
قومی تعمیر کے زمانہ میں جب اہم باتیں کہنا ہوتی ہیں، تعصبات کو رفع کرنا ہوتا ہے۔ اختلافات میں ہم
آہنگی پیدا کرنی ہوتی ہے حسن و شائستگی کو سادگی اور افادہ کے مقابلہ میں صرف ثانوی جگہ ہی دی جا سکتی ہے
البتہ جب قوم بن جاتی ہے اور خوشحالی کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور زندگی کا ایک ملا جلا انداز ترقی پانے
لگتا ہے اور مشترک تعلقات رونما ہو جاتے ہیں اس وقت حسن و آرائش کا مرتبہ بھی بلند ہونا شروع کرتا
ہے۔ ہم ابھی تک قومی تعمیر کی منزل سے ہی گزر رہے ہیں اس لئے ہمارے واسطے تزئین و آرائش
موزوں نہیں ہو سکتی۔

مگر اس تمام سادگی کے باوجود جس کے لئے میں آپ سے التجا کر رہا ہوں میں سمجھتا ہوں ہم اپنی زبان
کو خوبصورت بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب زبان افراد کے درمیان محض تبادلۂ خیال
کا ایک مفید ذریعہ نہ ہو بلکہ جب وہ ایک طاقتور اندرونی تمنا، ایک قومی جذبہ کے اظہار کے لئے ایک وسیلہ

[illegible] ات کی درجہ بدرجہ تقسیم کا عکس صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

ایک ایسے [illegible] بچوں کی ماں جو ایک دوسرے سے تقریباً بالکل مشابہ ہوتے ہیں ان دونوں [illegible] اس قدر دلچسپی رکھتی ہے کہ ان کے دو جداگانہ نام رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف ایسے شخص جو [illegible] دوسرے سے ممتاز اور متفرق ہوتے ہیں جب وہ کسی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں تو انھیں [illegible] سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وسط برازیل کی ایک قدیم قوم کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے طوطوں کی مختلف قسموں کو صرف ایک سادہ لفظ "طوطے" سے ظاہر نہیں کرتی بلکہ ہر ایک کے لئے انھوں نے ایک جداگانہ نام رکھا ہے۔ اسی طرح تاڑ کے درخت کی ہر قسم کی بھی ان [illegible] ایک ممتاز اہمیت ہے اور اس کا ایک خاص نام ہے۔ عربی زبان میں اونٹ، گھوڑے اور [illegible] لئے ناقابل یقین حد تک بے شمار نام ہیں۔ ہندوستان کے انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں نے [illegible] جو اپنے اور فطرت کے درمیان جو ہمارے ملک میں دوسرے تمام ملکوں کے مقابلہ میں بہت [illegible] رنگ برنگے لباسوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، ایک دیوار کھڑی کر لی ہے۔ وہ اپنی ہزاروں قسم کی [illegible] چڑیوں کو محض "چڑیا" اور خوشبودار پھولوں کو محض "پھول" کہنا کافی سمجھتے ہیں۔ تمام ان لوگوں کا جو مادر وطن کی خدمت ایک مشترک زبان کو ترقی دے کر کرنا چاہتے ہیں یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ قوم کی [illegible] کے حلقے کو بھی اس طرح وسیع کریں تاکہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعلیٰ مسکن اور اس کی زبردست روایات [illegible] اور اس کے مستقبل کو ماضی کی تمام عظمت و شوکت سے بھی زیادہ باعزت اور شاندار بنا سکیں۔

[illegible] سے ایک سنسکرت کے لفظ کو یہاں یا ایک عربی کے لفظ کو وہاں نہ بڑھاؤ بلکہ قوم کی [illegible] اخلاقی افق کو وسیع کرو تاکہ زبان از خود قومی اظہار نفس کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ آزادی کی

بن جائے۔ ہندوستانی زبان کے لئے یہ جذبہ مشترکہ قومیت کا جذبہ ہی ہوسکتا ہے جس کی ہندوستانی زبان صحیح معنوں میں ایک تمدنی مظہر ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس جذبہ سے زبان کا حسن کس قدر بڑھے گا تو اس کا انحصار ایک طرف تو خود اس جذبہ کی شدت پر ہوگا اور دوسری طرف اس جذبہ کی وجہ سے جن لوگوں کے مفاد کو فروغ ہوا ہے ان کی وسعت اور ان کے جذبات کی شدت پر ہوگا۔ کیونکہ ہر زبان کے حسن و تناسب میں اس کی جماعت کے طبقات کی درجہ بدرجہ تقسیم کا عکس صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

ایک ایسے جڑواں بچوں کی ماں جو ایک دوسرے سے تقریباً بالکل مشابہ ہوتے ہیں ان دونوں سے علیحدہ علیحدہ اس قدر دلچسپی رکھتی ہے کہ ان کے دو جداگانہ نام رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف ایسے شخص جو قطعاً ایک دوسرے سے ممتاز اور متفرق ہوتے ہیں جب وہ کسی فوج میں بھرتی ہوجاتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ وسط برازیل کی ایک قدیم قوم کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے طوطوں کی مختلف قسموں کو صرف ایک سادہ لفظ "طوطے" سے ظاہر نہیں کرتی بلکہ ہر ایک کے لئے انھوں نے ایک جداگانہ نام رکھا ہے۔ اسی طرح تاڑ کے درخت کی ہر قسم کی بھی ان کی نگاہ میں ایک ممتاز اہمیت ہے اور اس کا ایک خاص نام ہے۔ عربی زبان میں اونٹ، گھوڑے اور تلوار کے لئے ناقابل یقین حد تک بے شمار نام ہیں۔ ہندوستان کے انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں نے اپنی تعلیم کی وجہ سے اپنے اور فطرت کے درمیان جو ہمارے ملک میں دوسرے تمام ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ رنگ برنگے لباسوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، ایک دیوار کھڑی کرلی ہے۔ وہ اپنی ہزاروں قسم کی خوبصورت چڑیوں کو محض "چڑیا" اور خوشبودار پھولوں کو محض "پھول" کہنا کافی سمجھتے ہیں۔ تمام ان لوگوں کا جو اور وطن کی خدمت ایک مشترک زبان کو ترقی دے کر کرنا چاہتے ہیں یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ قوم کی دلچسپیوں کے حلقے کو بھی اس طرح وسیع کریں تاکہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعلیٰ مسکن اور اس کی زبردست روایات کا مستحق ثابت کرسکیں اور اس کے مستقبل کو ماضی کی تمام عظمت و شوکت سے بھی زیادہ باعزت اور شاندار بنا سکیں۔

تنگ فرقہ پرست نگاہ سے ایک سنسکرت کے لفظ کو یہاں یا ایک عربی کے لفظ کو وہاں نہ بڑھاؤ بلکہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی افق کو وسیع کرو تاکہ زبان از خود قومی اظہار نفس کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ آزادی کی

تمنا کو خدمت کے جذبہ کو، نیک اور بزرگ بننے کے عزم و ارادہ کو ظاہر کرنے والے جتنے لفظ بھی مل سکیں ان سب کو استعمال کرو۔ ہندوستان نے دنیا کے خیالات اور علم کی ترقی میں جو خاص حصہ لیا ہے اس کے ظاہر کرنے والے جتنے لفظ ملیں انھیں استعمال کرو۔ مجھے اس بات کی ذرا بھی پروانہ ہوگی کہ یہ سنسکرت کے لفظ ہیں یا عربی کے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو آزادی حاصل کرنے خدمت کا جذبہ پیدا کرنے اور فلسفہ اور سائنس سے شغف رکھنے میں باہم مقابلہ کرنا چاہیئے اور ان میں سے جو اس آزاد مقابلہ میں بازی لے جائیگا وہ اس بات کا مستحق ہوگا کہ وہ اپنے مفید شغلہ کے اظہار کے لئے اس شکل کو اختیار کرے جو اس کے خاص ماحول سے زیادہ قریب ہے۔ دوسرے بھائی کو اس بات سے کڑھنا نہ چاہیئے لیکن اہم معاملات میں اس تندرست مسابقت کے بغیر ایک مشترک زبان کو محض بے معنی فرقہ پرستی کی وجہ سے خراب کرنا فتنہ اور شر کھڑا کرنا ہے۔ ایک لفظ یا اظہار خیال کا طریقہ اسی وقت زندہ رہتا اور عام قبولیت حاصل کرتا ہے جب اس کی حمایت کے لئے بولنے والوں کا اخلاقی اور ذہنی مفاد موجود ہوتا ہے۔ اگر یہ نہیں ہوتے تو وہ مرجاتا ہے۔ آپ غیر ضروری الفاظ کو اس وقت تک رائج نہیں کر سکتے جب تک آپ ان چیزوں اور ان خیالات کے لئے جن کی الفاظ نمایندگی کرتے ہیں زندگی میں کوئی دلچسپی نہ پیدا کر دیں۔ اسی طرح آپ الفاظ کو زبان سے اس وقت تک خارج بھی نہیں کر سکتے جب تک لوگوں کے دلوں سے آپ اس دلچسپی کو زائل کر دیں جو انھیں اس شے سے ہے جس کی وہ الفاظ نمایندگی کرتے ہیں۔

گو بظاہر یہ بات غیر متعلق سی معلوم ہوگی لیکن میں آپ کے ہندی پرچارکوں سے اپیل کروں گا کہ وہ اس بات پر دھیان رکھیں کہ لوگوں کی دلچسپی ان تمام چیزوں کے لئے بیدار ہو جو اچھی اور اعلیٰ ہیں۔ نیز یہ کہ اس ملک میں جتنی قومیں آباد ہیں ان سب میں دلی اتحاد بہت جلد پیدا ہو جائے اور اس کا عکس ایک نہایت اعلیٰ اور ارفع مشترک زبان میں بھی نظر آنے لگے۔ کیونکہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہوگی ہم کچھ اور نئی اور تنگ زبانوں کا اضافہ اپنے ملک کی بے شمار زبانوں میں کر دیں گے اور ایک حقیقی مشترک زبان پیدا کرنے کا کام انجام دینا پھر بھی باقی رہے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو چاہیئے کہ وہ ایک مشترک زبان کو ترقی دیں اور اسے تنگ فرقہ وارانہ مقاصد کے لئے خراب نہ کریں۔ اس بات کو یاد رکھیے کہ ایک ملک کے ادب کو ناپاک کرکے آپ

اس قوم کی روح کو ناپاک کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد رسم خط کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ تو اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگرچہ ذخیرہ الفاظ کے معاملہ میں تو میری یہ خواہش ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اگر ضرورت ہو تو ایک دوسرے کی رعایت سے اپنے ثقیل اور ناقابل فہم الفاظ کو ترک کر دیں اور اپنی مشترک زبان کو اس کی مخصوص ساخت اور ترنم کا لحاظ کرتے ہوئے جس ذریعہ سے بھی ممکن ہو زرخیز کریں مگر رسم خط کے معاملہ میں بہ سختی سے یہ چاہتا ہوں کہ نہ ہندو اپنے رسم خط کو ترک کریں نہ مسلمان۔ مجلس استقبالیہ کے صدر کی تقریر کے ان حصوں کو میں نے دلچسپی سے سنا جس میں انھوں نے دیوناگری رسم خط کی تائید میں عربی رسم خط کو ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ میں ان کی خلوص و صداقت کا معترف ہوں لیکن میں ایمانداری کے ساتھ ان سے اختلاف رائے رکھتا ہوں۔ یہ میرا پختہ یقین ہے جس کا اظہار میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بھی کر چکا ہوں کہ سیاسی اور مذہبی اختلافات جو آج ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خراب کر رہے ہیں وہ دراصل اس گہری کشمکش کے بیرونی مظاہر ہیں جو ہندوستان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی یہ کشمکش دیکھی گئی ہے اور تاریخ بھی اس قسم کی مثالوں سے ناواقف نہیں ہے۔ یہ مسئلہ حقیقت میں دو ایسے مختلف تمدنوں کے میل ملاپ کا مسئلہ ہے جن میں سے ہر ایک زندگی کے بارے میں ایک جداگانہ تخیل رکھتا ہے۔ میری رائے میں اس مسئلہ کا بہترین حل جیسا کہ میں نے اس وقت بھی ظاہر کیا تھا یہ ہے کہ ہر تمدن کو زندہ رہنے کا حق دیا جائے لیکن اس کے ساتھ رواداری اور باہمی عزت کے جذبہ کی نشو و نما کی جائے اور تمدنی قربتوں کو ترقی پانے کا موقع ان نصب العینوں کے مطالعہ کرنے اور سمجھنے کے ذریعہ سے فراہم کیا جائے جن پر دونوں کی تہذیب قائم ہے۔ ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لئے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمدنی نشو و نما کے لئے بھی میں یہاں بھی یہی کہتا ہوں کہ ہر تمدن کے لئے جداگانہ طور پر زندہ رہنے کے حق کو ایک ناقابل انکار حق کی حیثیت سے تمام قوموں کے لئے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اسی طرح ان کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کے عظیم ترین ہم آہنگ تمدن کی تخلیق میں اپنا امتیازی حصہ شامل کر سکیں۔ اس طریقہ پر عمل کرنے سے کامیابی دیر میں حاصل ہوگی لیکن تمدن کا مرکب جس کے ساتھ یا ایک دن میں تو

تیار نہیں ہو سکتا ۔ ہم میں انتظار کرنے کی عقل ہونا چاہیئے ۔ مسلمانوں سے عربی رسم خط کے ترک کرنے کے لئے کہنا گویا انھیں اپنے شاندار تمدنی ترکہ سے بے تعلق کرنا ہے ۔ کیونکہ اس رسم خط کے ذریعہ سے ہی وہ آسانی کے ساتھ اپنے ماضی کے عظیم الشان ذخیرہ تک پہنچ سکتے ہیں ۔ اس ترک سے انھیں محروم کرنا نہ تو خود ان کے لئے مناسب ہے نہ دنیا کے لئے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ ترکوں نے عربی رسم خط کو ترک کر کے کوئی عقلمندی کا کام کیا ہے ۔ لیکن غالباً انھوں نے یہ اس لئے کیا کہ وہ ماضی کی روایات سے اپنے تمام تعلقات منقطع کرنا چاہتے تھے تاکہ یورپ کا طرز زندگی اختیار کرنے میں انھیں سہولت ہو ۔ اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے انھوں نے بہترین طریقہ اختیار کیا ۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر کمل تمدنی قلم بندیوں میں کچھ زیادہ اعتقاد نہیں ہے ۔ اس لئے میرے نزدیک یہ بات عقلمندی اور مصلحت دونوں کے خلاف ہے کہ دیوناگری رسم خط کے اختیار کرنے کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان بننے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیا جائے ۔ ہمیں اپنی تمام توجہ ایک واقعی ہندوستانی زبان پیدا کرنے کے لئے وقف کر دینا چاہیئے اور عربی اور دیوناگری دونوں رسوم خط کے استعمال کی آزادی دینا چاہیئے ۔ مجھے مسلمانوں کی ایسی قومی درسگاہوں کا علم ہے جہاں عربی رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم خط بھی سکھایا جاتا ہے ۔ میری یہ خواہش ہے کہ تمام قومی درسگاہیں اسی طریقہ پر عمل کریں ۔ ممکن ہے ایسا کرنے سے کچھ بے آرامی ہو لیکن اس کے فوائد اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں ۔ میری رائے میں دونوں رسوم خط کا علم اس قابل افسوس بیگانگی اور زبردست لاعلمی کے رفع کرنے کا ایک بہت موثر ذریعہ ثابت ہوگا جس کی وجہ سے آج کل ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے تمدنی نصب العینوں کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں ۔

ہندوستان کی مختلف زبانیں
اور
ایک مشترکہ قومی زبان

۱۹۳۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں کو کئی خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں تعداد کی کثرت کے لحاظ سے دو خاندان بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور آبادی کے بیشتر حصہ پر حاوی ہیں۔ اول ہندی یورپی خاندان کی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد ۲۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ہے اور دوسرے دراوڑی خاندان کی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد ۷ کروڑ ۱۶ لاکھ ہے۔ پھر ان خاندانوں کی مختلف شاخیں ہیں۔ پہلے ہم دراوڑی خاندان کی شاخوں کو لیتے ہیں۔ اس کی دو بڑی شاخیں دراوڑا شاخ اور اندھرا شاخ ہیں۔ دراوڑا شاخ کے بولنے والے ۴ کروڑ ساڑھے چودہ لاکھ ہیں اور اندھرا شاخ کے ۲ کروڑ ۶۴ لاکھ۔ اندھرا شاخ کی زبان تلگو ہے۔ جو زیادہ تر شمالی مدراس اور ریاست حیدرآباد میں اور کم تر میسور کے کچھ حصہ میں بولی جاتی ہے۔ دراوڑا شاخ کی کئی اور چھوٹی شاخیں ہو جاتی ہیں جن میں خاص طور پر لائق ذکر تامل، کناڑی اور ملیالم ہیں۔ تامل کے بولنے والے ۲ کروڑ ۴ لاکھ ہیں اور یہ زبان زیادہ تر جنوبی مدراس میں اور کم تر میسور کے کچھ حصہ میں بولی جاتی ہے۔ کناڑی کے بولنے والے ایک کروڑ بارہ لاکھ ہیں اور یہ زیادہ تر میسور اور کورگ میں اور کم تر بمبئی، حیدرآباد اور مدراس میں بولی جاتی ہے۔ ملیالم کے بولنے والے ۹۱ لاکھ ہیں۔ یہ زبان زیادہ تر کوچین اور ٹراونکور میں اور کم تر مدراس مالابار میں بولی جاتی ہے۔

ہندی یورپی خاندان کی خاص خاص بڑی شاخیں (۱) ایرانی شاخ (۲) داردی شاخ (۳) ہندی آریائی شاخ ہیں۔ ایرانی شاخ کے بولنے والے پونے ۲۳ لاکھ ہیں۔ اس میں پشتو، بلوچی اور

فارسی بولنے والے ہیں۔ داردی شاخ کے بولنے والے سوا پندرہ لاکھ ہیں اس میں چترالی، شینا، کاشمیری کوہستانی وغیرہ شامل ہیں۔ ہندی آریائی شاخ کے بولنے والے ۲۴ کروڑ ۷۴ لاکھ ہیں۔

پھر ہندی آریائی شاخ کی مزید تین شاخیں ہیں (۱) بیرونی شاخ (۲) درمیانی شاخ اور (۳) اندرونی شاخ۔ بیرونی شاخ کے بولنے والے ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ہیں۔ درمیانی شاخ کے بولنے والے ۸۰ ½ لاکھ ہیں اور اندرونی شاخ کے بولنے والے ۱۱ ½ کروڑ ہیں۔

پھر ان شاخوں کی بھی مزید شاخیں ہیں۔ بیرونی شاخ میں شمال مغربی شاخ، جنوبی شاخ اور مشرقی شاخ شامل ہیں۔ شمال مغربی شاخ کے بولنے والے ایک کروڑ ۲۵ ½ لاکھ ہیں۔ اس میں مغربی پنجابی (لہندا) اور سندھی شامل ہیں۔ جنوبی شاخ کے بولنے والے ۲ کروڑ ۱۲ ½ لاکھ ہیں اس میں زیادہ تر مرہٹی اور بہت کم کنکانی شامل ہے۔ مشرقی شاخ کے بولنے والے ۹ کروڑ ۲۴ لاکھ ہیں۔ اس کی مزید شاخیں اڑیا، بہاری، بنگالی اور آسامی ہیں۔ اڑیا بولنے والے ۱ کروڑ ۱۲ لاکھ ہیں۔ بہاری بولنے والے ۲ کروڑ ۷۹ لاکھ۔ بنگالی بولنے والے ۵ کروڑ ۲۵ لاکھ اور آسامی بولنے والے ۲ کروڑ ہیں۔

درمیانی شاخ کے بولنے والے جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے صرف ۸۰ ½ لاکھ ہیں اور اس میں مشرقی ہندی شامل ہے۔

اندرونی شاخ کی مزید شاخیں مرکزی شاخ اور پہاڑی شاخ ہیں۔ مرکزی شاخ کے بولنے والے ۱۱ کروڑ ۴۵ لاکھ ہیں اور پہاڑی شاخ کے ۷۲ لاکھ ۵۲ ہزار۔

پھر مرکزی شاخ کی بھی پانچ مزید شاخیں ہیں۔

(۱) مغربی ہندی جس کے بولنے والے ۷ کروڑ ۱۵ لاکھ ہیں۔

(۲) راجستھانی جس کے بولنے والے ۱ کروڑ ۴۹ لاکھ ہیں۔

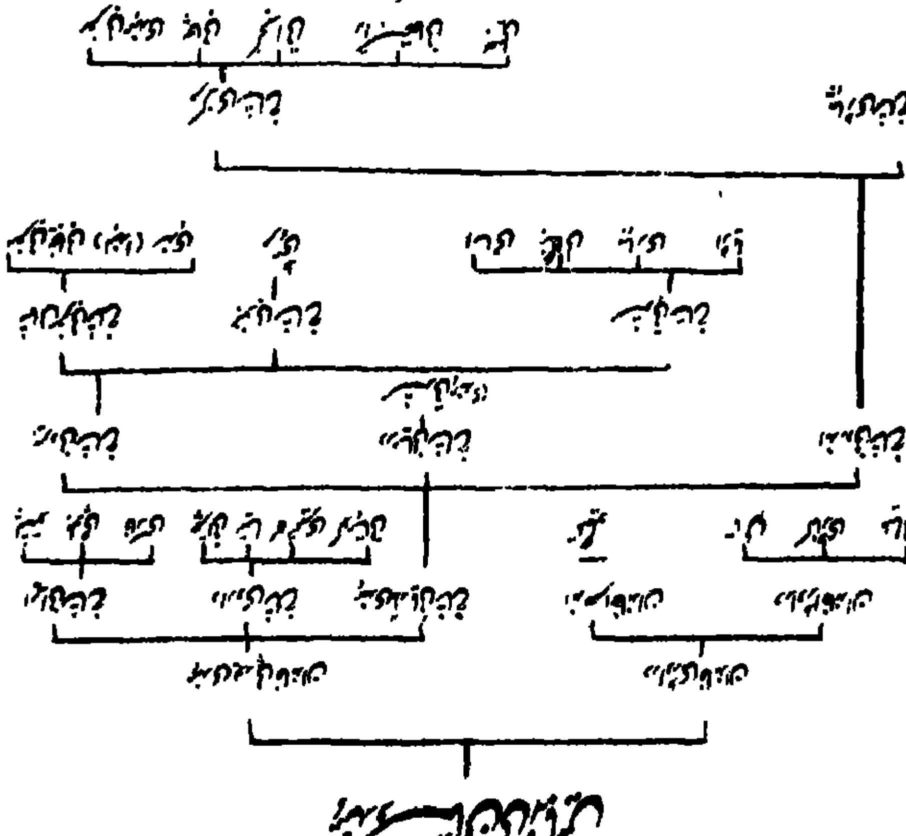
(۳) گجراتی جس کے بولنے والے ۱ کروڑ ۸۰ لاکھ ہیں۔

(۴) پنجابی جس کے بولنے والے ۱ کروڑ ۵۸ لاکھ ہیں اور

(۵) بھیلی جس کے بولنے والے صرف ۲۲ لاکھ ہیں۔

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]



[illegible]

اسے توڑتا مروڑتا ہے ۔ لیکن اس کی ان ادبی کاوشوں اور کارناموں کی کوئی تحریری یادداشت نہیں رکھی جاتی جس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھا سکیں اور آنے والی نسلوں کے لئے وہ ایک معیار بن سکے ۔

" ہندوستانی " زبان کی تحریری ' ادبی ' اور معیاری شکلیں دو ہیں ایک اُردو دوسرے ہندی ۔ اُردو اور ہندی میں فرق یہ ہے کہ اُردو اپنی " ہندوستانی " کو شائستہ بنانے کے لئے فارسی عربی کے الفاظ سے مدد لیتی ہے اور جب لکھنے کا موقع ہوتا ہے تو اسے عربی رسم خط میں لکھتی ہے ہندی یہی کام سنسکرت سے لیتی ہے اور سنسکرت رسم خط میں " ہندوستانی " کو پیش کرتی ہے ۔ اُردو کی یہ کوشش بالکل فطری تھی ۔ مسلمان چونکہ ہندوستان پر حکمراں تھے اور دفتری زبان فارسی تھی جس میں عربی کے بہت سے الفاظ ملے ہوئے تھے ۔ اس لئے اُردو کے لئے شائستگی کا معیار اس وقت کی راج بھاشا اور امیروں کی زبان یعنی فارسی ہی ہو سکتی تھی ۔ چنانچہ فارسی کی اصطلاحیں ' محاورے ' تشبیہیں ' استعارے ' تلمیحات ' مذہبی روایات ' عروض ' اسالیب بیان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسم خط اُردو میں آگئے ۔ دربار ' امیروں اور شہری زندگی سے جو لوگ وابستہ تھے ان کی زبان میں ان اثرات کا پیدا ہونا لازمی تھا ۔ لیکن جو لوگ دربار سے دور تھے ' ان کی زبان بڑی حد تک محدود اور غیر شائستہ رہی ۔ صرف جماعت کا وہ قلیل التعداد حصہ جس کے ذمہ دھرم کی حفاظت کا کام تھا یا جو قدیم زبان اور علوم سے محبت رکھتا تھا وہ اپنی قدیم مہذب زبان یعنی سنسکرت اور اس کے رسم خط کی حفاظت کے کام کو کرتا رہا ۔ جب مسلمانوں کی حکومت اور امارت کا خاتمہ ہوا اور سیاسی رہنمائی ان کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو ہندوستان کے بہت سے دوسرے پرانے حکمرانوں مثلاً راجپوتوں کی طرح مسلمان بھی محکوم ہو گئے ۔ سرکار کی نگاہ میں سب محکوم برابر تھے ۔ ان کی بولیاں یکساں طور پر ورناکیولر یعنی غلاموں کی زبانیں تھیں ۔ فارسی کو سرکار نے راج بھاشا کے عہدہ سے برطرف کیا ۔ اس کی جگہ انگریزی نے لی ۔ لیکن چونکہ انگریزی کو عام کرنا مشکل تھا اس لئے ورناکیولروں کو ترقی دینے کی پالیسی اختیار کی گئی ۔ سرکار مساوات کی حامی تھی ۔ اعلیٰ اور شریف نسل کے مسلمان اور وہ ہندو شرفا جو مسلمانوں کے دربار سے متعلق تھے اس کے نزدیک ایسے ہی غلام تھے جیسے وہ لوگ جن کی مسلمان بادشاہوں کے دربار تک رسائی

نہ تھی۔ ان کے نزدیک "ہندوستانی" کی وہ شکل بھی غلاموں کی زبان تھی جو فارسی کے اثر سے شائستہ ہوگئی تھی اور وہ بھی جو گاؤں میں دربار سے دور رہنے کی وجہ سے غیر شائستہ سمجھی جاتی تھی۔ سرکار انگریزی نے اپنی ضرورت کے لئے جب اُردو اور ہندی کو ترقی دینے کا ارادہ کیا تو اس وقت شاعری نے تو دونوں زبانوں میں خاصی ترقی کر لی تھی مگر ان دونوں کا کوئی تحریری نثر کا ادب نہ تھا۔ دونوں زبانیں ملی جلی بول چال میں استعمال کی جاتی تھیں۔ مسلمان دربار سے جو لوگ قریب تھے وہ اُردو بولتے تھے اور جو دور تھے وہ بھاشا بولتے تھے۔ انگریزی سرکار نے دونوں کو ترقی کا مساوی موقع دیا اور دونوں کا نثر کا ادب بننا شروع ہوا۔ اُردو میں فارسی عربی کے زیادہ الفاظ آنا شروع ہوئے اور اس کا رسم خط عربی ہوگیا اور ہندی کو شائستہ بنانے کے لئے سنسکرت سے مدد لی گئی اور تحریر کے لئے سنسکرت کا رسم خط اختیار کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بولی کی مشترک زبان کی جگہ دو تحریری زبانیں جدا جدا بن گئیں اور دونوں بول چال کی عام زبان سے بہت دور ہٹ گئیں اور صرف سنسکرت یا فارسی جاننے والے قلیل التعداد تعلیم یافتہ گروہ تک محدود ہوگئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو ہندوستان کی مشترک قومی زبان کہا جائے۔ یہاں محض "ہندوستانی" کے لفظ کو استعمال کرنے سے کام نہیں چلتا۔ شائستہ اور تربیت یافتہ اُردو اور ہندی لکھنے والوں کی تحریریں اور تقریریں اور نظم و نثر اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں کہ ایک زبان کا ادیب اور عالم دوسری زبان کے ادیب اور عالم کا مفہوم سمجھنے سے بالکل قاصر ہوتا ہے۔ جو لوگ دونوں زبانوں کے اخبار و رسائل پڑھتے ہیں، سیاسی اور مذہبی تقریریں سنتے ہیں اور مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں شریک ہوتے ہیں وہ اس دشواری کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔

جیسا اوپر بیان کیا گیا اُردو اور ہندی ابھی تک ایک تعلیم یافتہ گروہ تک محدود رہی ہیں لیکن تعلیم جس قدر وسیع اور عام ہوتی جائے گی اتنا ہی کم از کم اس علاقہ میں جہاں ہندوستانی بولی اور سمجھی جاتی ہے اُردو یا ہندی کا رواج بھی عام ہونا لازمی ہے۔ لیکن اگر ان دونوں زبانوں کا فرق قائم رہا تو جس جگہ کی زبان کو آج ہم نے "ہندوستانی" کہا ہے وہاں اس کی جگہ ہمیں دو مستقل زبانوں کا ذکر کرنا پڑے گا

کچھ عرصہ سے اردو اور ہندی کے مسئلہ نے ایک مذہبی رقابت کا رنگ اختیار کر لیا ہے لیکن پھر بھی ابھی تک اُردو کے بولنے، لکھنے اور چھاپنے والوں میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذہب والوں کی بھی ملتی ہے۔ اُردو کے بعض بہترین ادیب و شاعر، بہترین اخبار اور رسالے اور بہترین ناشر ہندو ہیں۔ بعض ہندو ریاستوں میں بھی اُردو ابھی تک درباری زبان رہ چکی ہے۔ اس لئے اردو کو ایک فرقہ کی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہندی کی حیثیت ایک فرقہ کی زبان کی ہے اور فرقہ پرستی کے جذبات کو ابھار کر ہی اس کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندی کے پرانے شاعروں میں چاہے کتنے ہی مسلمان کیوں نہ رہے ہوں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہندی تقریباً تمام تر ہندوؤں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندی کے پھیلانے کے لئے بہت سرگرمی سے کوششیں کی جا رہی ہیں اور بہت منظم اور مستقل ادارے اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں اور اس کام میں مذہبی تعصبات، تاریخی روایات اور قومی جذبات سب سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہندو مذہب، فلسفہ، علم و ادب اور قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ چونکہ سنسکرت ہے اس لئے سنسکرت کے الفاظ کو زیادہ رواج دینا گویا قدیم ہندو تہذیب کے تخیلات کو زندہ کرنا ہے۔ اسی بنا پر جو ہندو اپنی قدیم تاریخ سے محبت رکھتے ہیں وہ ہندی کے اختیار کرنے کی طرف مائل ہیں۔

پھر ایک دوسرا اثر بھی ہے جو "ہندوستانی" میں سنسکرت کے لفظوں کو زیادہ داخل کرنے کا سبب ہو رہا ہے۔ کچھ دنوں سے ہندی کی ترویج و اشاعت اور مربیانہ سرپرستی کا کام ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر جن کی مادری زبان فی الواقع ہندوستانی ہے ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ رہا ہے جن کی مادری زبان ہندوستانی نہیں ہے بلکہ جو مذہبی عقیدت یا تہذیب و تمدن کے اشتراک اور مشترکہ قومیت کی تعمیر کے سلسلہ میں ہندی کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے یہ توقع کرنا کہ یہ مقامی محاوروں اور زبان کی لطافتوں، نزاکتوں اور سلاستوں کو سمجھ سکیں گے فضول ہے یہ لوگ سنسکرت خوب جانتے ہیں۔ انگریزی اور مغربی زبانوں کے ادب سے بھی ان کی واقفیت اچھی ہے یہ لوگ مغربی ڈھنگ کی ٹھوس اور چست زبان کے عادی ہو گئے ہیں مگر اپنی مادری زبان پر یا تو انہیں پورا عبور نہیں ہے یا اسے اپنے اظہار مطلب کے لئے

بنالی بھتے ہیں، اس کے دائرہ کو تنگ اور محدود پاتے ہیں۔ بہر حال اپنی مقامی زبانوں کے کم و بیش کو ترقی دینے کے لئے یہ سنسکرت سے مدد لے رہے ہیں اور ہندی کو ترقی دینے میں بھی انہیں سہولت اسی میں نظر آتی ہے کہ "ہندوستانی" کے لفظوں اور محاوروں کی جگہ اس میں قدیم سنسکرت کے لفظ اور محاورے رائج ہو جائیں۔

مرہٹی، گجراتی اور بنگالی پر مسلمانوں کے زمانہ حکومت میں فارسی عربی کا بہت اثر پڑا تھا۔ اگر ان زبانوں کو خالص بنانے کی کوششیں بعد میں نہ کی جاتیں اور بول چال کی زبان پر ان کے علم و ادب کی تعمیر کو جاری رکھا جاتا تو ان میں جتنے اس وقت فارسی عربی کے لفظ گھلے ملے نظر آتے ہیں اس سے بہت زیادہ مل سکتے اور اُردو سے یہ آج بہت قریب ہوتیں۔ لیکن خالص بنانے والی تحریکوں نے ان میں سنسکرت کا عمل دخل بہت بڑھا دیا ہے۔

جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں نے فارسی عربی کے الفاظ کو نسبتاً کم قبول کیا ہے۔ مگر برہمنوں کے زیر اثر جن کی طاقت جنوبی ہند میں صدیوں سے بہت مضبوط چلی آرہی ہے ان زبانوں میں سنسکرت کے الفاظ بہت شامل ہو گئے ہیں۔ اس لئے جنوبی ہند کے ہندوؤں سے میل جول بڑھانے کے لئے بھی ہندی کے حامی ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کا زیادہ استعمال کرنا مفید سمجھتے ہیں۔

بہر حال ان تمام رجحانات کا نتیجہ ممکن ہے یہ نکلے کہ آیندہ اُردو بھی ہندی کی طرح ایک مذہبی فرقہ کی زبان بن جائے اور اُردو کے ہندو لکھنے والے جن میں اکثر ہندی کو بھی ثانوی زبان کی حیثیت سے اچھی طرح جانتے ہیں شاید اُردو کو چھوڑ کر ہندی کو اپنی زبان بنالیں۔ اور اُردو کے لکھنے والوں میں ہندوؤں کا اضافہ بند ہو جائے۔ لیکن فی الحال اُردو کا حلقہ ہندی کے مقابلہ میں زیادہ وسیع معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ بھی جو اپنی زبان ہندی بتلاتے ہیں بلا تکلف ان لفظوں اور اصطلاحوں کا زیادہ استعمال کرتے ہیں جو اُردو میں رائج ہیں۔ عدالت کی زبان میں اُردو کی اصطلاحیں تقریباً ہر صوبہ میں عام ہیں۔ اُردو کے اخبار رسالوں اور کتابوں کی تعداد بھی خاصی کثیر ہے۔ اُردو کے مشاعرے بھی ملک میں کثرت سے ہوتے ہیں۔ اُردو کے گانے فلم ڈرامے بھی بہت مقبول ہیں۔ اُردو کی ایک یونیورسٹی

بھی ہے۔ تنگ نظر، متعصب اور فرقہ پرست گروہ کو جو اُردو کے تمام لفظوں سے ہندی کو پاک کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا چکا ہے اور جو اس کوشش میں ہندی کو عوام کی زبان سے برابر دور ہٹاتا چلا جا رہا ہے اگر نظر انداز کر دیا جائے تو باقی تمام ہندی بولنے اور لکھنے والے ایسے فارسی اور عربی لفظوں کو جو عام طور پر لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں زبان سے خارج کرنا نہیں چاہتے۔ مسلمان ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ہیں وہ اُردو کو بولتے لکھتے اور سمجھتے ہیں اور اپنے آس پاس کے ہندوؤں کو بھی اُردو سے کم و بیش واقف کرا دیتے ہیں۔ اس لئے اگر اُردو کو اس وقت ہندوستان کی قومی زبان کہا جائے تو یہ دعوے ہندی کے اسی قسم کے دعوے کے مقابلہ میں کسی طرح غلط نہیں کہا جا سکتا۔

مگر ہمارے فیصلے کے لئے محض یہ بات کافی نہ ہونا چاہئے۔ ہماری تحریر کی تمام زبانیں ابھی تک ہماری کثیر آبادی کے صرف ایک بہت مختصر حصہ تک پہنچی ہیں۔ محض اس مختصر حصہ کے تناسب کو دیکھ کر ہمیں آئندہ نسل کی قومی زبان کے متعلق رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے تغیر پذیر زمانوں میں اور بڑھتی ہوئی تحریکوں کی موجودگی میں ہمیں موجودہ حالات سے زیادہ مستقبل کے امکانات اور رجحانات پر نظر کرنا چاہئے۔ اس وقت لوگوں میں جو شدید تمنائیں، حوصلے، سرگرم کوششیں، مستقل اور منظم ادارے، تعلیم گاہیں اور مخلص کارکنوں کی جماعتیں پائی جاتی ہیں ان کے مشاغل کی طرف ہمیں توجہ کرنا چاہئے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ نشوونما، ترقی، جذب و انجذاب، حملہ و مدافعت، مقابلہ و مسابقت کی اہلیت، زندگی اور طاقت، جذبۂ ایثار و وفاداری طاقتور سیاسی جماعتوں، امیروں اور لکھ پتیوں کی سرپرستی اور عوام کی حمایت اور ان میں مقبولیت موجودہ زبانوں میں سے کسے سب سے زیادہ حاصل ہے جس زبان کو یہ چیزیں زیادہ ملی ہوئی ہیں یا جو زبان انہیں دوسروں سے پہلے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے وہی آئندہ کی قومی زبان ہے۔ ہمیں ان باتوں پر جذبات اور تعصبات سے خالی ہو کر اور تعمیری نصب العین کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہئے اور جو نتیجہ نکلے اسی کے مطابق اپنی آئندہ طرزِ عمل کی تشکیل کرنا چاہئے۔

؎ اُردو کے جو حامی اُردو کو مسلم فرقہ کی زبان نہیں بلکہ کل ہندوستان کی قومی زبان بنانا چاہتے ہیں

انھیں چند بنیادی تبدیلیاں اپنی پالیسی میں کرنا ہوں گی۔ ان کے سامنے لائق توجہ مسائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جو ہندو اس وقت اُردو بولتے یا لکھتے ہیں وہ مذہبی تعصب کی وجہ سے اُردو کا بولنا یا لکھنا نہ چھوڑیں۔

(۲) جو "ہندوستانی" بولنے والے عوام خصوصاً دیہات کے رہنے والے تعلیم پائیں انھیں اُردو میں ایسی زبان لکھی ہوئی ملے جو ان کے بول چال کے تلفظ اور محاوروں سے قریب ہو اور جن میں ان کی مذہبی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا عکس بھی موجود ہو۔

(۳) طاقتور اور ترقی پسند سیاسی جماعتوں کی امداد اور سرپرستی اسے حاصل ہو۔

(۴) جو ہندو "ہندوستانی" نہیں بولتے انھیں اُردو کے الفاظ بالکل اجنبی اور نامانوس نہ معلوم ہوں۔

اس غرض کے لئے اگر اُردو کے ادیب مندرجہ ذیل پالیسی اختیار کریں گے تو اُردو کی توسیع میں بہت امداد ملے گی:۔

(۱) ہندو مذہب، فلسفہ، علم و ادب اور قدیم تہذیب و تمدن کے بارے میں اُردو میں کتابیں شائع کرنا۔

(۲) بول چال کی عام "ہندوستانی" زبان کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا اور اس میں اگر موجودہ معیار فصاحت کو قربان کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا۔

(۳) سنسکرت کے الفاظ کو اُردو میں زیادہ رواج دینا۔

(۴) ترقی پسند قومی تحریکوں خصوصاً سوشلزم کے رہنماؤں سے میل رکھنا اور ان کے مشورہ سے ان تحریکوں کے متعلق خوب لٹریچر شائع کرنا۔

(۵) عام فہم قومی نظموں، گیتوں، افسانوں، قصہ کہانیوں، ناولوں، ڈراموں کو لکھانا۔

(۶) جو فارسی عربی کے الفاظ گجراتی مرہٹی بنگالی اور جنوبی ہند کی دراوڑ زبانوں میں رایج ہوں ان کو اُردو میں بالکل انھیں معنوں میں رایج کرنا جو ان کے ان زبانوں میں ہوں۔

(۷) دیوناگری رسم خط میں اُردو زبان کے مقبول عام ناول، ڈرامے، کہانیاں، نظمیں شائع کرنا۔

(۸) گجراتی، مرہٹی، بنگالی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ایسی کتابیں شائع کی جائیں جن میں اُردو کے الفاظ زیادہ آئیں۔

(۹) ہندوستان کے ہر صوبے میں ترقی پسند تحریکوں کے ساتھ ایسے مقرر شاعر اور گانے والے بھیجنا جو اُردو زبان کے الفاظ کو مقبول کرا سکیں۔

(۱۰) زوال پذیر زمینداروں اور دیسی ریاستوں سے جہاں تک ہو سکے اپنا تعلق منقطع کرنا۔

مندرجہ بالا وہ تدبیریں ہیں جن سے اُردو زبان کی اشاعت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر کام کرنے والوں میں خلوص، ایثار، جذبۂ مسابقت، ولولہ، ہمت، امنگ، زندگی اور طاقت ہو تو اُردو ضرور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان بن سکتی ہے۔

ہندی ادبی سبھا

(ہندی ساہتیہ سمیلن)

(ذیل میں ہم ہندی ساہتیہ سمیلن (ہندی ادبی سبھا) کی تاریخ اور اس کے طریقہ کار کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے دیکھنے سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ ہندی والے کس خلوص اور سرگرمی سے اپنی زبان کے لئے کوشش کر رہے ہیں اور اردو والوں کو کس قدر اپنی رفتار کو تیز کرنا چاہیئے)۔

مختصر تاریخ | سمیلن کی بنیاد ۲۰ سال پہلے یعنی سنہ ۱۹۱۰ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ جی کی صدارت میں بنارس میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک سمیلن کے اجلاس ملک کے مختلف حصوں مثلاً کلکتہ، لاہور، اندور، گوالیار، پٹنہ، بھاگلپور، کانپور، بھرت پور اور دہلی وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔ سمیلن کا مقصد ہندی کی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہے۔ سمیلن نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے جن کاموں کو ہاتھ میں لے رکھا ہے ان میں خاص طور پر لائق ذکر نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

سمیلن کے امتحانات | مدرسوں میں ہندی کی جو تعلیم رائج تھی اس کے معیار کو بلند کرنے کے لئے سمیلن نے اپنے بھاگلپور کے اجلاس (سنہ ۱۹۱۳ء) کے بعد ہندی ادب کے ابتدائی، درمیانی اور اعلیٰ امتحانوں کا سلسلہ جاری کیا اور اس طرح عملی کام کا نمونہ سامنے رکھ کر موجودہ تعلیم گاہوں کو ہندی کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ سمیلن کے امتحانوں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک تقریباً ۲۵۰ جگہوں میں اس کے امتحانوں کے مرکز کھل چکے ہیں۔

قدیم ادب کی اشاعت | سمیلن نے دوسرا کام قدیم ادب کی اشاعت کا اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس وقت تک تلسی داس جی کی رامائن کو چھوڑ کر دوسرے قدیم شاعروں کی تصانیف پر ہندی میں بہت کم کتابیں ملتی تھیں۔ مہاراجہ بڑودہ کے عطیہ سے فائدہ اٹھا کر سمیلن نے اس کام کو شروع کیا اور "سولبھ گرنتھ مالا" نکالی جس کی زیادہ تر کتابیں طالب علموں کے امتحان کے کام کی تھیں۔ سمیلن نے جب ایک دفعہ اس کام کو

شروع کر دیا تو دوسرے ناشروں نے بھی اس طرف توجہ کی اور اب یہ کام خاصا آگے بڑھ گیا ہے۔

بلند پایہ تصانیف کے لئے انعام | اس کے بعد ساہتیہ سمیلن کا دھیان نوبل پرائز کی طرح کوئی انعام مقرر کرکے ہندی میں اعلیٰ کتابوں کی تصنیف اور ہندی ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی طرف گیا۔
شری گوکل چند نے ۴۰ ہزار روپیہ کا پرامیسری نوٹ سمیلن کو اس کام کے لئے دیا جس سے ہر سال بارہ سو روپیہ کا انعام باری باری سے ادب، تاریخ، سائنس اور فلسفہ کی بہترین کتابوں کے لئے دیا جاتا ہے۔ انعام کے فیصلہ کے لئے ملک کے مشہور عالم منتخب کئے جاتے ہیں۔

بہترین مصنفہ کو انعام | خواتین کو تصنیف و تالیف کی طرف مائل کرنے کا انتظام بھی سمیلن نے کیا ہے۔ اس کام کے لئے پانسو روپیہ پانچ برس تک دینے کا وعدہ شری سیتارام سیکسریا جی نے کیا تھا۔ اس سال اس کی مدت ختم ہونے والی تھی لیکن سیکسریا جی نے اس انعام کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ہندی پرچار | اس کے علاوہ سمیلن ہندی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرتی ہے اور اسے سمیلن نے سب سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اونچی چوٹی کا ادب تو جماعتوں کے ذریعہ تیار کرانا ممکن نہیں ہے۔ یہ کام تو غیر معمولی قابلیت کے افراد کا ہی ہوتا ہے۔ لیکن معمولی ادب اور زبان کی نشر و اشاعت کا کام البتہ کامیابی کے ساتھ جماعتی ادارے انجام دے سکتے ہیں۔ مہاتما گاندھی ہمیشہ سے ہندی پرچار پر زور دیتے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ پرشوتم داس جی ٹنڈن کو انھوں نے لکھا تھا کہ "میرے لئے ہندی کا سوال سوراج کا سوال ہے۔ قوم کی ترقی اور بہبود بہت کچھ زبان پر منحصر ہوتی ہے۔ ہم انگریزی زبان کے ذریعہ قومیت کا تخیل لوگوں میں پیدا نہیں کر سکتے"۔ ۱۹۱۸ء کے اندور کے اجلاس کے صدر مہاتما گاندھی چنے گئے تھے۔ اس کے بعد سے ہندی پرچار کا کام مہاتما گاندھی کی نگرانی میں دن بدن بڑھتا گیا۔ ہندی سمجھنے میں سب سے زیادہ مشکل مدراس والوں کو ہوتی ہے اس لئے سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں وہاں کام شروع کیا گیا۔ آج مدراس میں دکن ہندی پرچار نی سبھا کی کوشش سے لاکھوں آدمی ہندی سمجھنے لگے ہیں اور لاکھوں ہندی کتابوں کی کھپت وہاں ہونے لگی ہے آسام اور اڑیسہ میں بھی

ہندی پرچار کا کام مشرقی ہندی پرچار کمیٹی کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔

ہندی میوزیم کانپور والے اجلاس (۱۹۲۳ء) میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے سمیلن کے سامنے ہندی میوزیم کھولنے کی تجویز رکھی تھی۔ میوزیم کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی تھی کہ ہندی قدیم قلمی کتابیں دن بدن ضائع ہوتی جا رہی تھیں۔ اس مقصد کے لئے چار لاکھ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی گئی تھی لیکن یہ رقم پوری جمع نہ ہو سکی۔ فی الحال ۲۶ ہزار روپیہ کی ایک عمارت الہ آباد میں تعمیر ہو گئی ہے جس کا افتتاح ابھی حال میں مہاتما گاندھی نے کیا ہے۔

بھارتیہ ساہتیہ پریشد ۱۹۳۵ء میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں اندور میں پھر ایک اجلاس ہوا۔ جس میں دو اور نہایت اہم کاموں کو سمیلن نے اپنے ذمہ لیا ہے جن کا اثر نہ صرف ہندی زبان بلکہ ملک کے تمام تمدن و تہذیب پر پڑ سکتا ہے۔ ان میں سے ایک کام ہے دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کے لئے ہندوستان کی مختلف زبانوں کو اپیل کرنا اور اس مقصد کے لئے دیوناگری رسم الخط کی بعض موجود خامیوں کی اصلاح کرنا۔ دوسرا کام ہے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا اور ہندی زبان کے ذریعہ انھیں باہم ایک دوسرے کے ادب سے واقف کرانا۔ اس دوسرے مقصد کے لئے کنہیا لال منشی صاحب اور منشی پریم چند صاحب کی مشترکہ ادارت میں اکتوبر ۱۹۳۵ء سے ایک ماہوار رسالہ "ہنس" نکل رہا ہے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کا نو بیش کیا جاتا ہے اور ناگپور میں ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو پہلا اجلاس بھارتیہ ساہتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کا ہوا ہے جس میں ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔

طریقۂ کار سمیلن کا کام دو طرح انجام پاتا ہے۔ ایک تو خود سمیلن کی براہ راست نگرانی میں اور دوسرے ایسے آزاد اداروں کے ذریعہ جن کا سمیلن سے الحاق ہے۔ پہلے ہم سمیلن کے ان کاموں کو لیتے ہیں جنھیں سمیلن براہ راست انجام دیتی ہے۔ ان کے پورا کرنے کے لئے کاموں کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر شعبہ کے لئے شعبہ وار کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں جو اپنے ناظم کے کام میں مدد دیتی ہیں۔ امتحان کے کام کو تو مستقل طور پر اصل میں ہندی وشو ودیالہ پریشد چلاتی ہے۔ لیکن اس کی نگرانی کے لئے

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]			
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]			
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]		

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
	[illegible]			[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]			[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]			
[illegible]	[illegible]			
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]		

[illegible]

		[illegible]	[illegible]	
		[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	

۱۰- ادبی شعبہ	۱،۶۹۹	۷- کتب خانہ	۵	
۱۱- گیلاکسی پرنٹنگ پریس	۴۵	۸- بالورانگھو پریس	۱۷	
		۹- اصلاح رسم الخط	۳۰	
میزان کل	۱،۰۱،۳۱۴	میزان	۵،۷۶۵	
		بچت	۹۵،۵۴۷	
		میزان کل	۱،۰۱،۳۱۴	

اوپر کے آمد و خرچ کے حساب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ششماہی میں ۷ ہزار ۹۰۷ روپیہ کی آمدنی اور ۶ ہزار ۵۰۷ روپیہ کا خرچ ہوا۔ دوسری ششماہی میں ۱۴ ہزار ۲۹۰ روپیہ کی آمدنی ہوئی اور ۵ ہزار ۷۶۵ روپیہ کا خرچ ہوا۔ دونوں ششماہیوں کی مجموعی آمدنی ۲۲ ہزار ۱۹۷ روپیہ اور خرچ ۱۲ ہزار ۲۷۲ روپیہ ہوا جس میں سے ۹ ہزار ۹۲۵ روپیہ پس انداز کیا گیا۔ کل پس انداز کی ہوئی رقم جو سمیلن کے پاس سال کے آخیر میں تھی ۹۵ ہزار ۵۴۷ روپیہ تھی گویا تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ کی تقویت سمیلن کو اس وقت حاصل ہے۔ اور اس کا سالانہ خرچ ۱۲ ہزار روپیہ ہے جس کے لئے سالانہ آمدنی نہ صرف کافی ہوتی ہے بلکہ اتنی زاید ہوتی ہے کہ خرچ کی کچھ رقم بچائی بھی جا سکتی ہے۔

سمیلن کے امتحانات | سمیلن کے امتحانات کا شعبہ بہت اہم شعبہ ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق زیادہ تفصیلی معلومات فراہم کی جائیں۔ سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں سمیلن کے سب امتحانوں میں مجموعی طور پر ایک ہزار ۵۲۵ امیدوار شریک ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء میں ایک ہزار ۶۵۹ امیدواروں کی درخواستیں آئیں یعنی پہلے سال کے مقابلہ میں دوسرے سال ۹ فی صدی زیادہ امیدوار شریک ہوئے۔ کئی سالوں سے تقریباً اسی طرح طالب علموں کی تعداد بڑھ رہی ہے جس سے سمیلن کے امتحانوں کی عام مقبولیت اور مفید ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امتحانات کے ۱۷ شعبے ہیں:- (۱) ہندی ادب (۲) تاریخ (۳) جغرافیہ (۴) حساب

(۵) علم سیاست (۶) معاشیات (۷) سنسکرت (۸) فلسفہ (۹) انگریزی (۱۰) دھرم شاستر (۱۱) آیورویدک
(۱۲) تشریح اعضا (۱۳) سائنس (۱۴) زراعت (۱۴) منیمی اور منشی گیری (۱۵) عرائض نویسی (۱۶) صحافت۔
مندرجہ بالا امتحانوں میں وید وشارد اور کرشی (زراعت) وشارد کے امتحانات نئے نئے کھلے ہیں اس لئے ان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی تعداد کم رہتی ہے۔ مگر وید وشارد کے امتحان کو یو۔ پی۔ انڈین میڈیسن بورڈ نے رجسٹری کے لئے منظور کر لیا ہے۔ اس لئے اس امتحان میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کا ۵ سال کی پریکٹس کے بعد دوسرے درجہ کے ویدوں میں شمار ہو سکتا ہے۔

ان امتحانوں کی تنظیم اور نگرانی کا کام ۲۱ ممبروں کی ایک امتحان کمیٹی اور ۷۰ ممبروں کی ایک وشو ودیالہ پریشد انجام دیتی ہے۔ تعلیمی کمیٹی کے ممبروں میں مہاتما گاندھی کا نام سب سے اول ہے۔ ان کے علاوہ کئی پروفیسر، ڈاکٹر اور مشہور پنڈت ہیں۔ پریشد میں بھی مہاتما گاندھی کا نام سب سے اول ہے ان کے علاوہ ڈاکٹر بھگوان داس اور بہت سے دوسرے معزز لوگوں کے نام ہیں۔

ہر شعبہ کے ممتحنوں اور ماڈریٹرس کی الگ الگ کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ ممتحنوں کی کمیٹی کے پانچ ارکان ہوتے ہیں جن میں ایک کنوینر ہوتا ہے۔ ماڈریٹرس کی کمیٹی کے تین رکن ہوتے ہیں جن میں ایک کنوینر ہوتا ہے۔ ان ممتحنوں اور ماڈریٹرس میں ہر شعبہ کے ماہروں اور اہل علم حضرات کے نام نظر آتے ہیں ان میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر، اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور سینئر ٹیچر، پنڈت محکمۂ تعلیمات کے نگراں سب شامل ہیں۔ یہ سب لوگ اعزازی طور پر کام کرتے ہیں۔ لیکن جس محنت، جانفشانی اور احساس فرض کے ساتھ یہ اپنے کاموں کو انجام دیتے ہیں وہ نہایت لائق تعریف ہیں۔ امتحان کا کام خاصا پیچیدہ کام ہے اس میں ممتحنوں کے علاوہ نگراں امتحان، ٹیبولیٹرس وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سمیلن کے لئے یہ سب کام اعزازی طور پر کئے جاتے ہیں۔

سمیلن کی طرف سے اب تک ۲۰۵ مرکز کھولے جا چکے ہیں۔ اس سال سمیلن کے امتحانات ۱۸۲ مرکزوں میں ہوئے تھے ان میں سے ۱۰۸ مرکزوں کا معائنہ کرایا گیا تھا تقریباً سب ہی مرکزوں کی حالت ٹھیک تھی۔ صرف تین مرکزوں کی حالت اچھی نہیں تھی اس لئے امتحان کمیٹی کے فیصلہ سے وہ مرکز

توڑ دئے گئے۔

۱۹۴۳-۴۴ء کے مختلف امتحانوں کا نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

نام امتحان	کتنی درخواستیں آئیں	کتنے شریک ہوئے	کتنے کامیاب ہوئے	فی صدی
ابتدائی	۷۸۶	۶۶۶	۴۴۳	۶۶
درمیانی	۶۹۱	۵۷۸	۲۵۹	۴۳
اعلیٰ	۷۴	۶۱	۴۴	۸۶
منشی	۱۹	۱۸	۹	۵۰
عرائض نویسی	۴	۲	۲	۱۰۰
قومی زبان کی تبلیغ	۵۷	۴۳	۳۳	۷۶
ویدو شارد	۲۶	۲۲	۲	۹
کرشی (زراعت) وشارد	۲	۲	۲	۱۰۰
صحافت	۱	۱	۱	۱۰۰

سمیلن سے ملحقہ ادارے ابھی تک ہم نے ان کاموں کا مطالعہ کیا ہے جنھیں سمیلن براہ راست انجام دیتی ہے۔ اب ہم ان آزاد اداروں کے کام کی طرف بھی توجہ کرتے ہیں جن کا سمیلن سے الحاق ہے۔

نام مقام	نام ادارہ	خاص کام
اندور	وسط ہند ہندی ساہتیہ کمیٹی	دس بارہ ہزار سالانہ کی آمدنی اور ایک عالیشان مکان "سرسوتی نکیتن" ۵، ہزار کا پریس اور عمارت اور ۵۵ ہزار کا رہنے کا مکان۔ "وینا" نامی رسالہ نکلتا ہے

مقام	ادارہ	کیفیت
		سمیلن کے امتحانوں اور پڑھائی کا بھی انتظام ہے۔ ایک تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت بھی سمیلن نے دیدی ہے۔ بہت سی سلسلہ کی کتابیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔
مدراس	دکن بھارت ہندی پرچار سبھا	اس کے کام کا مفصل حال علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔
ابوہر (پنجاب)	ساہتیہ سدن	۴۰ ہزار روپیہ کی لاگت کا مکان۔ اس کی سرپرستی میں کئی کتب خانے اور دار المطالعے چل رہے ہیں۔ ایک دیہاتی اخبار "دیپک" نام کا نکلتا ہے۔ بیکانیر بھاولپور اور پٹیالہ میں ہندی پرچار کا کام اس کی نگرانی میں ہوتا ہے۔
اورچھا راج (بندیلکھنڈ)	شری بیرندر کیشو ساہتیہ پریشد	مہاراج کی مہربانی سے کوئی مالی دشواری نہیں ہے۔ سمیلن کے امتحان کا مرکز اور کتب خانہ ہے۔ ۲ ہزار روپیہ کا ایک انعام اچھی کتاب لکھنے والے کو دیا جاتا ہے۔ سرکاری اصطلاحوں کے لئے ایک لغت تیار ہو رہا ہے۔ "بیر بندیل" نام کا ایک اخبار نکلتا ہے۔
مین پوری	پشپ بھاون پاڑھم	مدرسہ، کتب خانہ اور مقامی امتحانوں کا مرکز۔ بہت سی اعزازی کام کرنے والے۔ آمدنی ۴۴۰ روپیہ خرچ ۴۲۸ روپیہ سالانہ
مین پوری	شری ماتھر کتب خانہ	۱۲۰ آمدنی اور اتنا ہی خرچ۔ کتابوں کی تعداد ۲ ہزار ۹۹۷ اور پڑھنے والوں کی تعداد دس ہزار ۲۶۵
کراچی	ہندی ساہتیہ بھون	دار المطالعہ، کتب خانہ

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

دکن بہارت ہندی پرچار سبھا اس ادارے کی ابتدا مہاتما گاندھی کی صدارت کے زمانے میں ۱۹۱۸ء میں ہوئی تھی اس نے جنوبی ہند میں ہندی پھیلانے کا بہت کام کیا ہے۔ اس کی طرف سے چار پانچ مدرسے قائم کئے جا چکے ہیں ایک اخبار نکلتا ہے۔ ایک اپنا پریس بھی ہے۔ پہلے اس سبھا کا کام سمیلن کی براہ راست نگرانی میں ہوتا تھا لیکن ۱۹۲۷ء میں جب سبھا مضبوط نظر آنے لگی تو سمیلن نے اسے آزادی سے کام کرنے کی اجازت دے دی۔ مہاتما گاندھی زندگی بھر کے لئے اس کے صدر بنا دئے گئے ہیں مدراس کے بہت سی تعلیمگاہوں نے اس سبھا کی کوشش سے ہندی کو اپنے امتحانوں میں داخل کر لیا ہے اس کی طرف سے ۵۰۰ مرکزوں میں ہندی پرچار کا کام کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوشش سے کئی اسکولوں میں ہندی کی کلاسیں کھل گئی ہیں۔ ہندی پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد ۴۰ ہزار ہے اس کے لئے ایک عمارت بنانے کی تجویز ہے جس کے لئے سیٹھ جمنا لال بجاج نے ایک لاکھ روپیہ کی اپیل کی ہے۔ روپیہ حسب ذیل طریقہ پر خرچ کیا جائے گا۔

زمین .... دس ہزار

بڑی عمارت .... پندرہ ہزار

مدرسہ اور بورڈنگ .... بیس ہزار

پریس .... دس ہزار

کتب خانہ .... دس ہزار

کارکنوں کے لئے مکان .... دس ہزار

عبادت گاہ .... پانچ ہزار

پاٹ شالا .... پانچ ہزار

ودیا یام شالا .... ڈھائی ہزار

دو کوئیں .... ڈھائی ہزار

میزان ایک لاکھ

سابق صدر کانگریس اور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

(ذیل میں ہم بابو راجندر پرشاد سابق صدر کانگریس کے اس خطبہ کے ضروری اقتباسات درج کرتے ہیں جو اُنھوں نے ہندی ادبی کانفرنس (ہندی ساہتیہ سمیلن) منعقدہ ناگپور کے اجلاس میں ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو کرسی صدارت سے پڑھ کر سنایا تھا۔ بابو راجندر پرشاد کے خطبہ سے یہ بات بالکل صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ موجودہ ہندی کسی صورت سے ہندوستان کی قومی زبان کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے۔ ہندی کو قومی زبان بننے کے لئے اپنی بہت کچھ اصلاح کرنا پڑے گی اور زیادہ وسعت قلب اور رواداری سے کام لینا ہوگا۔ جو باتیں بابو راجندر پرشاد نے ہندی کے ادیبوں سے کہی ہیں ان میں سے بہت سی باتوں کی طرف اُردو ادیبوں کو بھی متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر دونوں زبانوں کے ادیب خلوص، نیک نیتی اور رواداری کے ساتھ کام کریں گے تو ہمارا خیال ہے اُردو ہندی کا اختلاف ختم ہو جائے گا اور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں رہے گا جتنا کہ اس وقت ہے۔ اگر اُردو اور ہندی کی جگہ ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کا نام "ہندوستانی" رکھا جائے تو اس سے ذہنیت میں وہ ضروری تبدیلی پیدا ہو سکے گی جس سے لوگ ہر قسم کے نامانوس اور غیر ضروری سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ کے استعمال کرنے سے پرہیز کریں گے)۔

ہندی قومی زبان بننے کا دعوےٰ کرتی ہے آج بھی اس کو بولنے والوں اور سمجھنے والوں کی تعداد چودہ پندرہ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ جو ہندی بولنے والے نہیں ہیں ان میں بھی ناگپور، گجرات، برار، مہاراشٹر اور بنگال جیسے صوبوں میں ہندی سمجھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اگرچہ ان کی گنتی نہیں ہوئی ہے اور اس کا کرنا کٹھن بھی ہے۔ مسلمانوں میں زیادہ تر جو شمالی ہندوستان میں بستے ہیں وہ سب بھی ہندی سمجھتے اور بولتے

ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمان بھی سب ہندی سمجھ اور بول لیتے ہیں اور اگرچہ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ہے لیکن پھر بھی وہاں کے بیشتر عوام ہندی سمجھ اور بول سکتے ہیں۔ اس لئے اگر ہندی آج بھی قومی زبان ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ مناسب ہی ہے۔

میرے کہنے کا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ہندی کے لفظ کا وسیع مفہوم لے رہا ہوں۔ یوں تو عالموں میں اس بات پر بھی اختلاف ہے کہ ہندی اور اُردو دو الگ بھاشائیں ہیں یا ایک۔ سورگیہ پنڈت گوند نراین مصر جو ہندی اور پراکرت کے جیّد عالم تھے انھوں نے دوسری ہندی ادبی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس بات پر بہت زور دیا تھا اور بہت سے ثبوت پیش کئے تھے کہ ہندی اور اُردو ایک نہیں دو زبانیں ہیں۔ دوسری طرف سورگیہ بابو رادھا کرشن داس نے "ہندی کیا ہے" نام کے ایک مضمون میں لکھا ہے "ہندوستان میں رہنے والے عوام کی زبان کا نام ہندی ہے۔ ہندوستان کی اگر کوئی ایک بھاشا ہو سکتی ہے تو وہ ہندی ہے۔ اصل میں اُردو اور کچھ نہیں ہے وہ ہندی ہی ہے"۔

آج ہندی اُردو کا سوال چاہے کتنی ہی پیچیدہ شکل کیوں نہ اختیار کر رہا ہو اور مسلمان ہندی نام سے کتنے ہی کیوں نہ جھجک رہے ہوں لیکن تھوڑا پیچھے کی طرف دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہندی نام مسلمانوں ہی کا دیا ہوا ہے اور اس مفہوم کے ساتھ اس نام کا استعمال کسی معمولی شخص نے نہیں بلکہ امیر خسرو، میر تقی، انشا اور ملک محمد جائسی جیسے عالموں نے کیا ہے۔ امیر خسرو کے بارے میں اُردو کے مانے ہوئے شاعر غالب نے لکھا ہے کہ "ہندوستان کے سخنوروں میں امیر خسرو دہلوی کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا" اور "میں اہل زبان کا پیرو ہوں اور ہندیوں میں سوا امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں"۔ اتنا ہی نہیں غالب نے اور بھی کہا ہے:-

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

غالب ہی نہیں مولانا شبلی بھی امیر خسرو کے بارے میں لکھتے ہیں:- "ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف گوناگوں اوصاف کے جامع ایران

اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔" یہی خسرو لکھتے ہیں:۔

عربی بولے آئینہ فارسی بولے پائینہ
ہندی بولے آرسی آئے، منہ دیکھے جو اسے بتائے

جن کے بارے میں مشہور شاعر ذوق نے لکھا ہے:۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اور غالب نے کہا ہے:۔

اپنا بھی یہ عقیدہ ہے بقول مومن
آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں

یہی اردو کے مانے ہوئے استاد ہندوستان کی زبان کے لئے "ہندی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں:۔

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زباں کے بیچ

مشہور شاعر انشا نے اپنی "رانی کیتکی کی کہانی" میں اس کتاب کی زبان کے متعلق لکھا ہے:۔
"جس میں ہندی چھٹ کسی اور بھاشا کی پٹ نہیں ہو۔"

ان سے بھی پہلے، پدماوت کے مشہور شاعر ملک محمد جائسی نے لکھا ہے:۔

عربی ترکی ہندوی، بھاشا جیتی آہی
جا میں مارگ پریم کا۔ سبے سراہیں تاہی

پر میں اس جھگڑے میں نہ پڑ کر کہ قواعد زبان اور علم زبان کے اصولوں کے مطابق ہندی اور اردو ایک ہیں یا نہیں صرف کاروباری نقطۂ نگاہ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جتنے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس بھاشا میں باتیں کر سکتے ہیں جس کو ہم ہندی مانتے ہیں۔ چاہے وہ اصول قواعد کے

مطابق شدہ ہندی نہ بھی ہو اور چاہے اس میں کتنے ہی لفظ ایسے ہوں جو ہندی بھاشا میں نہ ملتے ہوں، وہ سب ہی ہمارے کام کے لئے ہندی زبان کے مانے جا سکتے ہیں۔ اور ان سب کو میں نے اپنی لو پردی ہوئی گنتی میں شامل کر لیا ہے۔ ہندی قومی زبان تب ہی ہو سکتی ہے جب ہم ان سب کو شامل کر لیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو جو ہندی آج کتابوں میں لکھی جاتی ہے وہ بہت تھوڑے ہی لوگوں کی مادری زبان ہے اور ہندی بولنے والوں کی تعداد کتنی ہی صوبہ کی زبانیں بولنے والوں کی تعداد سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ بہار کو ہی لیجئے۔ وہ ہندی بولنے والا صوبہ سمجھا جاتا ہے اور ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ پر اس صوبہ میں کئی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ شاہ آباد، سارن، چمپارن، اور مظفر پور کے کچھ حصوں میں بھوجپوری بولی جاتی ہے۔ دربھنگا، اُتر منگھیر، اُتر بھاگلپور، پورنیا اور مظفر پور کے شمالی حصوں میں میتھلی بولی جاتی ہے۔ پٹنہ، گیا، دکھن منگھیر اور چھوٹا ناگپور میں مگھی بولی جاتی ہے۔ اور بھاگلپور، سنتھال پرگنہ اور منگھیر کے کچھ حصوں میں چھیکا چھیکی بولی جاتی ہے۔ ان میں سے میتھلی کے سوا کسی کا الگ رسم خط نہیں ہے اور نہ کسی کا کوئی لکھا ہوا ادب۔ یہ سب ہی آج کی کتابوں کی ہندی سے بہت الگ ہیں اور ان بولیوں کے بولنے والوں میں جو تعلیم یافتہ نہیں ہیں وہ کتابوں کی ہندی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یو۔ پی میں بھی کئی بولیاں بولی جاتی ہیں اور آج کی سنسکرت ہندی شاید ہی کسی ضلع میں پوری پوری شدھتا کے ساتھ گھروں میں بولی جاتی ہے۔ ان وہ بہار کی بولیوں کی بہ نسبت شدہ ہندی کے بہت قریب ضرور ہے۔ اگرچہ مجھے وسطی ہند کی بولیوں کا زیادہ علم نہیں ہے پر وہاں بھی یہی کیفیت ہوگی۔ راجپوتانہ بھی ہندی زبان کا صوبہ کہا جاتا ہے لیکن اس میں بھی کئی الگ الگ بولیاں ہیں۔ دلی اور پنجاب کے کچھ حصوں کو بھی ہندی زبان کے صوبے کہتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی بولی دوسری ہے۔ اس لئے جب ہم ہندی کو قومی زبان کے روپ میں دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں تو ہم کو یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ جو کوئی بھی اس سے کام لے سکتا ہے وہ ہندی بولنے والا ہے۔

قومی زبان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ صوبوں کے باہمی کاروبار اور روزمرہ کے بیوپار میں سب ہی صوبوں کے رہنے والوں کے ذریعہ برتی جائے اور راس کماری سے بدری نراین تک اور اٹک سے کٹک تک سبھی جگہوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے اور خیالات منتقل کرنے کے کام میں لائی جائے۔

طرح طرح کے اختلافات ہوتے ہوئے بھی ہندی ان شرطوں کو پورا کرتی ہے۔ تلیگو، تامل، ملیالم اور کنڑی زبانیں ہی صرف ایسی ہیں جن کا ہندی کے ساتھ کوئی سیدھا ناتا نہیں ہے اور جن کے بولنے والے نہ ہندی سمجھ سکتے ہیں اور نہ جن کو ہندی بولنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ ان میں بھی سنسکرت لفظوں کی کثرت رہنے سے تھوڑی کوشش سے ہی کامیابی مل سکتی ہے۔ پھر بھی اُتر اور پچھمی ہندوستان میں جہاں آریا بھاشائیں بولی جاتی ہیں ہندی کا پرچار آسان ہے اور دکن کے علاقوں میں جہاں دراوڑ بھاشائیں رائج ہیں یہ کام بلاشبہ بہت کٹھن ہے۔ قومی زبان ہونے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت ہندی میں آنی اور لانی چاہیئے۔ اس کے پرچار کے راستے میں جو روکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنا چاہیئے۔ ہندی کی خامیوں کو دور کر کے اسے مکمل بنانا چاہیئے۔ اس لئے ہندی کی شکل پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

زبان کے دو حصہ ہیں۔ الفاظ اور صرف و نحو۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک عبارت کس زبان کی ہے اس پر اتنا منحصر نہیں ہے کہ اس جملہ کے لفظ کس زبان سے لئے گئے ہیں یعنی ان کا رواج کہاں سے اور کیسے ہوا ہے بلکہ اس کا فیصلہ جملہ کی ترتیب حرف عطف اور افعال پر ہی منحصر ہے۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹے جملہ کو لیجئے۔

"رام نے حکم دیا موٹر لاؤ"

اس چھوٹے جملہ میں رام نام ہے۔ حکم عربی لفظ ہے دیا فعل ہے۔ اس میں ہندی عربی اور انگریزی کے لفظ آئے ہیں پر انگریزی اور عربی کے لفظ رہتے ہوئے بھی یہ ہندی کا ہی جملہ ہے۔ اس لئے اگر ہندی میں ایسے لفظ آجائیں جو کسی دوسری زبان سے لئے گئے ہیں تو وہ ہندی ہی رہے گی۔ جتنی زندہ زبانیں ہیں وہ اپنے لغات کو برابر بڑھاتی جاتی ہیں اور ان کے شاعر اور مصنف دوسری زبان کے نئے نئے لفظوں کا استعمال اپنی تصنیفوں میں کرتے ہیں۔ باہر کی بات جانے دیجئے ہندوستان کی ہی بنگلہ، مرہٹی، گجراتی وغیرہ سب ہی زبانوں میں دوسری زبانوں کے لفظوں کا استعمال دھڑلے سے ہو رہا ہے۔ اُردو والے بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اُردو کے بڑے شاعر اگر ہندی لفظوں کو

بڑی آسانی سے لے لیا کرتے تھے۔ جیسے :۔

"سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں"

"آغوش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا"

اُنھوں نے کتنی آسانی سے "سنورنا" اور "سدھارنا" لفظوں کو اپنا بنا لیا ہے۔

مرحوم مولانا حالی نے لکھا ہے :۔

"جب تک شاعر کی فکر میں اتنی بھی آنچ نہ ہو۔ جتنی ایک بیے میں گھونسلہ بنانے کی اور مکڑی میں جالا پورنے کی ہوتی ہے۔ اس کو ہرگز مناسب نہیں کہ اس خیال خام میں اپنا وقت ضایع کرے۔ بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ اس کے دماغ میں خلل نہیں"۔

اس میں "آنچ" اور "پورنا" لفظ اُنھوں نے ہندی کی بول چال سے لئے ہیں۔

آج کل کے زمانہ میں جب دنیا سے علمی ترقیوں کی وجہ سے فاصلہ اور وقت کا فرق اُٹھتا جا رہا ہے، کوئی بھی زبان دوسری زبان کے اثر سے اپنے کو اچھوتا نہیں رکھ سکتی۔ اگر وہ ایسی کوشش کرے تو دنیا کی دوڑ میں وہ بہت پیچھے رہ جائے گی اور اس کے لئے ترقی کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ہندی زبان کی خوبیوں میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہندوؤں کی زبان ہوتے ہوئے بھی اس نے عربی فارسی ہی کے نہیں بلکہ ترکی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے لفظوں کو بھی اچھوت نہیں سمجھا۔ اگر ایسا نہیں کیا ہوتا تو کتنے ہی لفظ جو ہمارے گھروں میں پہنچ گئے ہیں آج نہ ہوتے اور ان کے ہم معنی لفظ ہمارے پاس شاید اتنے موزوں نہ ہوتے۔ اس طرح کے لفظ انسانی زندگی کے سب ہی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا۔ مثلاً :۔

سوغات، غالیچہ، بہادر، چھلکہ، قلی، قینچی، چاقو، لاش، داروغہ، توپ، چک وغیرہ ترکی سے۔

الماری، اچار، بوتل، کمرہ، آل پن، گملہ، گوبھی، گودام، چابی، مستری، میز، تمباکو، نیلام، تولیہ، پرات، بوتام، سنتری وغیرہ پرتگالی سے۔

سمن، جج، سگریٹ، ربر، رجسٹر، لالٹین، مشین، مجسٹریٹ، بنک، بم، رپورٹ، فیس، پنڈ، ڈرائیور، ٹین، ٹیبل، نمبر، ماسٹر، مل، ممبر، میم، موٹر، منٹ، بٹن، بگل، بلیک، پولیس، بٹن، منی بیگ، رجسٹری، منی آرڈر، اسٹیشن، پلیٹ فارم، ٹرین، ماسٹر، کانگریس، کالج، کمپنی، کلنڈر، کلکٹر، کمیٹی، کاپی، کارنس، کونین، کوٹ، کونسل، گلاس، گنی، گیس وغیرہ انگریزی سے۔

حد، بالغ، ہوائی، عبیر، اطلس، توشک تکیہ، حقہ، اسباب، بخار، بحث، حلوہ، علم، جیب، دلال وغیرہ عربی سے۔

پرسہ، فتیل، اخبار، نوکر، بیل، دگل، بستار، جلیبی، رندہ، داوات، دیہات، بے باق، پلک، چشمہ، وکیل، لالہ، بیمہ، بابا، باجی، داماد، لاب، بخیہ، طمانچہ وغیرہ فارسی سے۔

ہندی کے پرانے مشہور شاعروں کی شاعری میں بھی بہتیرے لفظ ایسے ملتے ہیں جو بدیشی زبانوں کے ہیں یا بدیشی زبانوں سے مشتق ہیں۔ مثلاً

جائسی:۔ شیر شاہ دلی سلطان

سورداس:۔ ہاں ہری سب پتی تن کو نایک۔
کوکری سکے برابری میری اتنے مان کو لائق

تلسی داس:۔ گئی بہوری غریب نواز سرل سبل صاحب رگھوراجو
بہنی بخشش جاچکن دینی
بنا بازار نہ جائے بکانا
جنوا سے گرنے مردت سکل بھوپ سرتاج
کم ہکرن کی فوج بڈاری
لوک پ جاکے بندی خانہ
جوکچھ جو ٹھ مسوی جانا

بیٹھے بجاج ، سراف ، بنیک ، ایک منہو کو بیرسے

غنی غریب گرام نر ناگر

کوئی کنگورن چڑھی گئے کوٹی کوٹی رندھیر

بودھا:- ہوئے مغرور تو پے دونی مغروری کیجے گھو چلے دیے جوتا سوں گھوتا لواتیے۔

پدماکر:- ایتے گج بخشے ہیپ رگھو ناتھ راؤ یاہی گج دھوکے کہوں کاہو دیے ڈارنا

بھوشن:- روم سوندی ڈارے خراساں کھوندی مارے خاک کمادروں جھارے ایسی ساہو کی

بہار بیجا راجا سوراج کے لنگارن کی داک سن کیتے بادشاہن کی چھاتی درکتی ہے۔

متی رام:- سو بنکو سوٹی دلی دل دیبے کو جو سوبھٹ سمر بن سواکی اہتی ہے

کہے متی رام تاہی رو کیبے کو سنگین کا ہو کے نہ ہمتی ہیے میں آہنی ہے

ستر و سال نند کے پرتاپ کی لپیٹ سب گربی غنیم برگین کو دہتی ہے

پتی بادشاہ کی اجتی امرادن کی راکھی ریپاراو بھاو سنھ کی رہتی ہے

بہاری:- کٹھن بیٹھی جاکی صحبتی گہی گہی گرب غروب

بھیے نہ کیتے جگت کے چتر چتیرے کور

بچے نہ بڑی سبیل ہوں چل گھونسوا انس

تلسی داس اور ہندی کے اور قدیم شاعروں کی تصنیفوں میں عربی فارسی کے لفظوں کا ہی نہیں

اُردو میں آج کل رائج محاوروں کا بھی استعمال ملتا ہے۔ جیسے:-

" بالم باسی اودھ کا بوجھیے نہ خاک "

مطلب:- اجودھیا کے رہنے والے خاک بھی نہیں سمجھتے

" کیو وار کہی ہے اجہوں نہ آئے باج "

مطلب:- اے سوامی میں نے کئی بار کہا تم ابھی تک باز نہیں آئے

اس میں خاک نہیں سمجھنا اور باز نہیں آنا جو محاورے اُردو میں آج کل رائج ہیں۔ وہ پہلے

[illegible] سنسکرت کی بول چال میں تھے۔

انگریزی آج دنیا کی ایک شائستہ زبان ہے۔ جس کا بہت پرچار ہے اور جو دنیا کے کونے کونے میں پڑھی اور برتی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ اتنا بڑا ہے اور اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری کا حجم جس کے تیار ہونے اور چھپنے میں کئی برس لگ گئے۔ کتنے ایسے لفظ نہیں ملتے جو اس کے ابتدائی حصوں کے چھپنے کے وقت انگریزی میں رائج نہیں ہوئے تھے۔ پر جو آخر حصہ کے چھپنے تک انگریزی زبان میں لے لئے گئے اور آج اخباروں اور کتابوں میں روزمرہ ملا کرتے ہیں۔ آج سے پچاس برس پہلے کے چھپے کسی بھی انگریزی لغت کو آج کے چھپے کسی اچھے لغت سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کا پتہ چلے گا کہ آج کتنے نئے لفظ اس زبان میں لئے گئے ہیں اور اس کا ذخیرہ کس تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ کسی کو کہنے کی ہمت نہیں ہوگی کہ انگریزی زبان ان لفظوں کے آجانے سے خراب اور ناشائستہ ہو گئی ہے اور وہ انگریزی بھاشا نہیں رہی۔ جو نئے لفظ آئے ہیں وہ سنسار کی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ پرانی انگریزی میں لاطینی، یونانی، فرنچ، جرمن وغیرہ کے ہی لفظ زیادہ تر لئے جاتے تھے۔ پر اب تو ہندی، سنسکرت، عربی فارسی وغیرہ کے علاوہ جنوبی ہندوستان، افریقہ، امریکہ اور چین جاپان کی زبانوں کے بھی ضروری اور مطلب کو پوری طرح ادا کرنے والے لفظ لے لئے جاتے ہیں اور یورپ کی زبانوں کے لفظ تو بہت زیادہ لئے ہی جا رہے ہیں۔

یہ معمولی زبان کی بات میں کہہ رہا ہوں۔ علمی اور اصطلاحی لفظوں کا تو الگ ہی لغت اور ذخیرہ ہے اور ان کی تعداد تو روز بروز بڑھتی جاتی ہے جو نئی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں اور جو نئی مشینیں اور ان کے نئے کارخانے ہوتے ہیں ان سب کے لئے نئے لفظ تو بنتے ہی جا رہے ہیں۔ یہی جیتی جاگتی زبان اور قوم کی خصوصیات ہیں۔

ہندی بھی اگر جیتی جاگتی زبان ہونا چاہتی ہے تو اسے اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو بڑھانا پڑے گا۔ بانی کاٹ کا اصول تو وہ کبھی اختیار نہیں کر سکتی اور نہ بدیسی لفظوں کو باہر رکھ کر وہ اپنی ترقی کر سکتی ہے۔ ہندی سنسکرت نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان، پارسی عیسائی بلکہ بستے ہیں لیکن پھر

بھی وہ ہندوستانی ہے اسی طرح ہندی میں سب ہی زبانوں سے اچھے لفظ ہم لیں گے لیکن پھر بھی وہ ہندی رہے گی۔ اس میں ایسے لفظوں کے ہضم کرنے کی طاقت ہونی چاہئے اور اس کے مصنفوں کو ایسے لفظوں کا علم ہونا چاہئے۔ اس لئے میں ہندی اردو کے جھگڑے میں فائدہ نہیں دیکھتا ہوں۔ ہندی میں جتنے فارسی اور عربی کے لفظوں کی کھپت ہو سکے گی اتنی ہی وہ وسیع اور مضبوط زبان ہو سکے گی۔ ہم کو تو اس بات پر ناز ہونا چاہئے کہ ہم صرف سنسکرت کے ہی نہیں بلکہ اور زبانوں کے لفظوں کو بھی اپنا جامہ پہنا کر اپنا لیتے ہیں اور اپنے لفظوں کے ذخیرہ کو بڑھا سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف "جاتے" "آتے" "ہیں" "تھے" وغیرہ لفظوں کو چھوڑ سب ہی عربی فارسی کے لفظوں کو اکٹھا کر دینے سے ہی ہندی کا جملہ بن جاتا ہے اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ جو لفظ رائج ہو گئے ہیں ان کو تو رکھنا ہی چاہئے اور ان کے بائی کاٹ کی کوشش فضول ہے۔ میرے ایک محترم دوست نے اس بائی کاٹ کے کام کو اتنا دور تک پہنچایا تھا کہ رومال جیسے چھوٹے اور سہل لفظ کو چھوڑ کر انھوں نے اس کے بدلے میں "مکھ مارجن وستر کھنڈ" کا استعمال مناسب سمجھا تھا۔ میں اس قسم کے بائی کاٹ کو ہندی کے ساتھ ظلم سمجھتا ہوں۔ اتنا ہی نہیں میں تو یہ بھی چاہتا ہوں کہ ایسے لفظ جو آج رائج نہیں ہیں پر اچھے ہیں جن سے ہمارا کام ٹھیک نکل سکتا ہے ان کو ہم اپنی زبان میں داخل کر لیں اور رائج کر دیں۔

ہندی کے الفاظ کے ذخیرہ کی تکمیل سنسکرت سے تو ہونی ہی چاہئے۔ پر اگر سلیس اور چھوٹے لفظ جن سے ہمارا مطلب ٹھیک نکل سکتا ہو دوسری زبان کے بھی ہوں تو ان کو لے لینے میں ہچکچانا نہیں چاہئے۔ خاص کر جب ہم ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان مانتے ہیں تو ہم کو اس پر ضرور دھیان دینا ہوگا کہ کن لفظوں کو اختیار کرنے سے اس کا پرچار بڑھ سکے گا۔

آج سے ۹۲ برس پہلے راجہ شیو پرشاد نے ہندوستانی کی نیو ڈالی تھی۔ ان کی زبان میں زیادہ تر وہی لفظ آنے پائے ہیں جو روزمرہ کی بول چال کے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔ "پنڈت لوگ سوچتے ہیں کہ جتنے اصلی سنسکرت شبد (چاہے وہ سمجھ میں آویں چاہے نہیں) لکھے جاویں اتنی ہی ان

کی ناموری کا سبب ہے۔ اور اسی طرح مولوی لوگ فارسی اور عربی کے شبدوں کے نئے سوچتے ہیں۔ غرض پل بنانے کے بدلے دونوں خندق کو گہرا اور چوڑا کرتے جا رہے ہیں" کتنے تعجب کی بات ہے کہ اسّی نوّے برس پہلے سے اپنی خرابی کو جانتے ہوئے بھی ہم آج تک سچ مچ اس خندق کو گہرا ہی کرتے جا رہے ہیں۔

اس موضوع پر غور کرنے میں ہمیں دو باتوں پر ضرور دھیان رکھنا چاہیے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان سب ہی ہندی جانتے اور بولتے ہیں۔ ان کی زبان میں عربی فارسی کے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں۔ پر وہ بھی ہماری زبان معمولی طور پر سمجھ لیتے ہیں۔ آج اُردو لکھنے والوں میں ایک چال چل گئی ہے کہ فارسی اور عربی کے بڑے بڑے لفظ لاکر اپنے مضمونوں کو بھر ڈالتے ہیں اور ہندی کے لکھنے والے بھی اس قصور سے بچے ہوئے نہیں ہیں ان میں بھی بہتیرے سنسکرت کے بڑے بڑے لفظ اپنی تصنیفوں میں بھر دیتے ہیں۔ دونوں جان بوجھ کر کیا کرتے ہیں اور دونوں دونوں کی شکایتیں کیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو سہل زبان لکھ سکتے ہیں وہ بھی جان بوجھ کر زبان کو کٹھن اور مشکل بناتے ہیں۔ اس بات کو ذیل میں ہندی اور اردو کے ایک ایک شاعر کی ایسی تصنیفوں کے نمونے سے میں اور بھی ثابت کر دینا چاہتا ہوں جو سلیس اور عام فہم زبان بھی لکھ سکتے ہیں اور سہل اور خوبصورت زبان کا استعمال کر کے عام طور پر مقبول بھی ہو چکے ہیں۔ جیسے:۔

"ایک دنیا سے انقلاب چاہتا اور ہے اٹھتی جوانی ایک کی" "چاند اور سورج گگن میں گھومتے ہیں رات دن" وغیرہ کے مصنف شاعر اجودھیا سنگھ جی اُپادھیا جیسے ہندی کے بے مثل شاعر لکھتے ہیں:۔

رو پودیان پر چِلّا پر ایکا ایکا رو کند و دسانا
تنوگی کلیا سی سُر سکا کر بڈ اکلانتی
شوبھا واری رہی کی سوا [illegible] نی سی لا دینہ لیلا میانی
شری رادھا مُرد و بھاشنی ور [illegible] دھور یہ سرورتی تھی

٭ ٭ ٭

کہنا دینا و نتا و نا موہ گمنا لینا

آسنا تمی نکٹ بتی کے امبو نیترا لیشووا

پہلے چار مصرعوں میں صرف "کی"، "سی"، اور "تھیں" کے استعمال کو چھوڑ کر ان میں اور سنسکرت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے دونوں مصرعوں میں اگر "تمی" اور "کے" ایک ایک بار نہ آتے تو یہ شعر سنسکرت کا اشلوک ہو جاتا۔

دوسری طرف کسی وقت "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور "دنیا کی محفلوں سے گھبرا گیا ہوں یارب" کے مصنف سر محمد اقبال کی نظمیں ہندوستان کے دیش بھگتوں کی زبان پر تھیں۔ بچے بچے تک ان کو گاتے تھے۔ ان کی ایک پرانی غزل ہے:-

سچ کہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ

داماں آسماں سے اس کا کلس ملادیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس کے الفاظ کتنے سلیس سہل اور خوبصورت ہیں۔ لیکن جب انھیں اقبال صاحب کے خیالات میں انقلاب ہوا تو اس کا پھل بیچاری زبان اور شاعری کو بھی بھگتنا پڑا۔ اور زبان بھی مشکل اور ناقابل فہم بنادی گئی۔ اس اُلٹ پھیر کی بانگی کے طور پر ان کی یہ کٹھن تصنیف دیکھئے:۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

جو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی

رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

٭ ٭ ٭

ہمارا مقصد ان دونوں کے بیچ کا متوسط راستہ ہے۔ ہم نہ عربی فارسی کے لفظوں کا بائی کاٹ کریں گے اور صرف سنسکرت لفظوں کو ہی لیں گے اور نہ سنسکرت کا بائی کاٹ کر کے صرف فارسی عربی کے لفظوں کو ہی رکھیں گے۔ اس لئے جہاں ہمیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فارسی عربی لفظوں کے بائی کاٹ سے ہم مسلمانوں کے لئے ہندی بہت کٹھن بناتے جائیں گے وہاں یہ بھی لحاظ رکھنا ہوگا کہ صرف فارسی عربی کے لفظوں کو لے کر اور سنسکرت کا بائی کاٹ کر کے ہم گجراتی، مرہٹی، آسامی، تامل، تیلگو، ملیالم اور کناڑی زبانوں کے لئے ہندی زیادہ مشکل تو نہیں بناتے جا رہے ہیں۔ ہندو تہذیب سنسکرت کے ذریعہ ہی سارے ہندوستان میں پھیلی ہے اور آج بھی سنسکرت لفظوں کا علم بلا واسطہ اور ان صوبوں کی زبانوں کی معرفت غیر ہندی صوبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے ایسے سنسکرت کے لفظوں کے ہندی میں لینے سے ان صوبوں کے رہنے والوں کے لئے ہندی ہم سہل بنا دیتے ہیں۔

ہمارے سامنے یہ مشکل سوال ہے کہ ہم نہ تو ان صوبوں کے ہندوؤں کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ شمالی ہند کے مسلمانوں سے ہندی کو الگ رکھ سکتے ہیں اگر ہم ایسا کریں گے تو اس کا پھل یہ ہوگا کہ جہاں ہم ایک طرف ہندی بولنے والوں کی تعداد بڑھائیں گے اور ہندی کے پرچار کو مضبوط کریں گے دوسری طرف ان کی تعداد جہاں آج زیادہ ہے وہاں گھٹائیں گے اور اس کا پرچار دکن میں بڑھا کر اتر میں کم کریں گے اس لئے عقلمندی اس میں ہے کہ الفاظ کے ذخیرہ کو بڑھایا جائے۔

الفاظ بڑھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فارسی کی لغت نکال کر اس کے سب ہی لفظوں کو ہندی کوش میں جوڑ دیا جائے بلکہ جو لفظ ہندی میں رائج ہو گئے ہیں ان کا بائی کاٹ نہیں کیا جائے۔ جو عربی فارسی کے لفظ گجراتی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی اور دکن کی زبانوں میں آ گئے ہیں اور ان کے ٹھیک ہم معنی لفظ ہندی میں نہیں ملتے ہیں ان کو بھی ہندی میں لے لیا جائے۔ ان کے علاوہ ایسے نئے لفظ جو نئے مطالب کو ادا کرتے ہیں ان کو بھی لینے میں ہچکچانا نہیں چاہیئے۔ مثال کے طور پر مغل بادشاہوں کے زمانہ سے ہی کچہریوں میں محکمہ مال اور حکومت سے متعلق بہتیرے لفظ ہندوستان کی سب ہی زبانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔ اگر ان کے ہم معنی سنسکرت لفظ ہندی میں رائج نہیں ہیں اور عام طور پر سمجھے نہیں جا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو نہ رکھا جائے اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے لفظ دھرم شاستروں سے کھینچ کر نکالے جائیں ایک بہت چھوٹا اور پرمعنی لفظ "شرط" ہے۔ کسی بھی ہندی جاننے والے کو اس کے سمجھنے میں کٹھنائی نہیں ہوتی ہے اور اس مطلب کو ادا کرنے والا دوسرا لفظ سنسکرت سے کھوج کر نکالا جائے تو وہ "کھ مارجن وستر کمنڈ" جیسا لنبا نہ بھی ہو تو بھی سمجھنے میں تو اتنا ہی کٹھن ہوگا۔ ایسی کوشش میری سمجھ میں بےکار ہے۔ جو اس سے بہتر کام میں لگائی جا سکتی ہے۔ یہ پنڈتوں اور عالموں کا کام ہے کہ ایسا لغت تیار کریں جس میں اس قسم کے سب ہی لفظوں کی کھپت ہو جائے۔

انگریزی راج میں بہت سے انگریزی لفظ بھی رائج ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹرین، اسٹیشن، ٹائم، پلیٹ فارم، ٹکٹ، لالٹین وغیرہ بہتیرے لفظ بولے جا چکے ہیں اور آتے ہی جا رہے ہیں ان کا

بائی کاٹ کرنے کے ٹرین کی جگہ پر" لوہ پتھ چلت واشپ یان" اور پلیٹ فارم کی جگہ " لوہ پتھ چلت واشپ یان ستھاپن ستھل" کہنے میں وقت اور لکھنے میں وقت اور جگہ کا بھی نقصان نہیں ہے ان مشکل لفظوں کا مطلب نکالنا بھی کم کٹھن نہیں ہے۔ اس لئے ایسے رائج بدیسی لفظوں کو رکھنا اور نئے لفظوں کو لے لینا ہی مناسب ہے۔ اگر ہم ٹکٹ کی ہندی " مولیہ پتر کا " بنائیں اور اسٹیشن پر مانگیں تو وہ ملے گا بھی نہیں۔ صوبہ کی زبانوں میں ایسے بہت سے لفظ ہیں جن کے مطلب بہت سندر اور موزوں ہیں۔ اگر وہ آج ہندی میں رائج نہیں ہیں تو ان کو بھی اپنانا ہمارا کام ہے۔ جس طرح ہم نے " لاگو " " چالو " " بازو " وغیرہ لفظوں کو اپنا لیا ہے اسی طرح اس معاملہ میں ہماری کوشش اور زیادہ ہونی چاہئے۔

خاص کر جب سیاسی اور علمی نئے لفظ سبھی ہندوستان کی زبانوں میں گڑھے جا رہے ہیں بہت اچھا ہو اگر سب ہی زبانوں میں نئے لفظ عام طور پر ایک ہی ہوں۔ جیسے کونسلوں کے لئے " دھارا سبھا " " ویوستھاپک سبھا " وغیرہ کتنے ہی لفظ کام میں لائے جاتے ہیں۔ عوام کو سہولت اور ہندی پھیلانے میں آسانی ہو اگر سب ہی ہندوستان کی زبانوں میں اس قسم کے لفظ ایک ہی ہو جائیں۔ اس میں کوئی کٹھنائی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ سب ہی لفظ نئے ہیں اور حال میں گڑھے گئے ہیں۔ اگر ہندی اور سب ہی صوبہ کی زبانوں کے علماء مل کر ایسے نئے لفظوں کی جگہ ایک ہی لفظ کو چلائیں اور سب ہی اخبار ان کو استعمال کرنے لگیں تو وہ جلد ہی رائج ہو جائیں گے۔

لفظوں کا ایک اور خزانہ ہے جس سے ہم ہندی کی لغت بڑھا سکتے ہیں۔ اور وہ خزانہ گاؤں کی بولی میں رائج لفظوں کا ہے۔ ان میں بہت سے ایسے لفظ ہیں جن کا مطلب سندر اور نہایت موزوں ہے اور جن کے ٹھیک ہم معنی لفظ سنسکرت ہندی میں اکثر نہیں ملتے ہیں۔ گھروں میں استعمال کی جتنی چیزیں ہوا کرتی ہیں ان سب کے لئے لفظ ہیں۔ گاؤں میں کھیتی کے جتنے سامان ہیں، بنائی، کتائی کے جتنے اوزار ہیں سب کے ایک ایک حصہ کے لئے الگ الگ نام رائج ہیں۔ ڈاکٹر گریرسن کی Bihar Peasant Life نامی کتاب میں اس طرح ہر چیز کے ہر ایک حصہ کا نام دیا ہوا ہے۔ ہم اگر کپڑے کے تیلی گھر میں جا کر دیکھیں تو ہمیں پتہ لگے گا کہ وہاں بجا عالی کا تقریباً دس

واقعہ ہے جو کسی بھی پارچہ باف کے گھر میں ہم دیکھتے ہیں ۔ صرف ایک کی جگہ پر بہتیرے پرزے کام کرتے ہیں اور ان کو انسان نہ چلا کر بھاپ اور بجلی چلاتی ہے ۔ ایسی حالت میں ہم اپنے پرانے لفظوں کو ہی کیوں نہ استعمال میں لائیں ؟ انگریزی میں بہتیرے پرانے لفظ نئے اوزاروں کے لئے آج بھی استعمال میں آتے ہیں ۔

گاؤں کی زبان میں نئے لفظ گڑھنے کی بھی اچھی طاقت ہے ۔ ریل، ٹرین، پلیٹ فارم کے لئے میں نے سنسکرت ہندی کے ہم معنی لفظوں کی مثال اوپر دی تھی ۔ گاؤں کی زبان میں موٹر کار کے لئے ہواگاڑی، بائیسکل کے لئے پیر گاڑی، ماچس کے لئے دیا سلائی، ریلوے سگنل کے لئے سگنل، سوف کے لئے پاؤ روٹی وغیرہ کتنے ہی بہت سے اچھے لفظ بن گئے ہیں جو اب کتابوں میں بھی کام میں لائے جا رہے ہیں ۔ اتنا ہی نہیں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی بھی جتنی طاقت ان گاؤں کی بولیوں میں ہے اتنی ہماری کتابوں کی زبان میں آج نہیں پائی جاتی ۔ یہی سبب ہے کہ ضرورت پڑنے پر ان بولیوں میں لفظوں کی کمی نہیں رہتی ہے ۔ گاؤں کے لوگ ضرورت پڑتے ہی لفظ بنا بھی لیتے ہیں ۔ جیسے لوٹنے سے لوٹاس، بکنے سے بکواس، صابن سے صبونانا، مٹی سے مٹیانا، پانی سے پنیانا، غصہ سے غصانا، دھکے سے دھکیانا، شرم سے شرمانا، گھن سے گھنانا وغیرہ ضرورت پڑنے پر ہماری کتابوں کی زبان میں بھی ان لفظوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے اگرچہ ہمارے یہاں بھی کچھ استادوں نے ایسی کوشش کی ہے ۔ جیسے :۔

" اور جو ناری سوامی کی نیندتی ہے " (پنڈت سدل مصر ناسی کے تو پاکھیان) " عرب کا اونٹ کس طرح جگاتا ہے " (پنڈت پدم سنگھ شرما پدم پراگ) " تیے کت کنیتی پڑھی بن جے بھونہ کان " بہاری لال ان میں نندا سے " نیندتی " جگالی سے " جگاتا " کان سے کنیتی لفظ بنائے گئے تھا ۔ لیکن ایسی کوشش کم ہوتی ہیں اور یہ استعمال میں اتنے کم لائے گئے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں ۔

گاؤں کی بولیوں کی طاقت صرف فعل اور اسم بنانے تک ہی محدود نہیں ہے ۔ کہاوتوں اور محاوروں پر خیال دوڑانے سے بھی ان کی طاقت کا پتہ چلتا ہے ۔ سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ

آج ہندی میں جن کہاوتوں کا پرچار ہے ان میں زیادہ تر دیہات کی ہی ہیں اور ہماری شائستہ ہندی انگریزی یا دوسری زبانوں کی کہاوتیں یا محاوروں کے ترجمہ کو اپنانے کے علاوہ اپنی نئی کہاوتیں یا محاورے اختیار کرنے میں بہت کم کامیاب ہوئی ہیں۔ اس طرف بھی ہم لوگوں کا دھیان جانا چاہئے۔ ساتھ ہی اپنے ملک کے رہنے والوں کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے نئے لفظوں کے جذب کرنے یا رائج لفظوں کے اپنانے میں پوری دلچسپی نہیں دکھلانے میں بھی ہم نہ تو ہندی کو پوری طور پر قومی زبان بنا سکیں گے اور نہ خیالات کو ظاہر کر سکنے کی قدرت واستطاعت کی دوڑ میں ہی کامیاب ہو سکیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ ہندی کو وسیع اور مشترکہ زبان "قومی زبان" بنانے کے لئے اس کا ذخیرہ الفاظ بڑھایا جائے اور اس میں فکر اور اندیشہ نہ کرکے جہاں سے ایسے اچھے لفظ مل سکیں جن کا سلیقے سے پرچار ہو سکتا ہو ہم لے لیں۔ تب ہی یہ زبان ہندوستان بھر کی قومی زبان ہونے کا دعوے ثابت کر سکے گی۔ سب ہی زندہ زبانیں اسی طرح سے ترقی کرتی ہیں اور یہی راستہ ہے جس پر چل کر ہندی اپنا نام لافانی کر سکے گی۔ ایسا ہونے سے ہندی اُردو کا جھگڑا بھی بہت حصوں میں مٹ جائے گا اور اگر اُردو صرف فارسی عربی کی طرف ہی اپنی نظر رکھ کر دوسرے لفظوں کا بائی کاٹ کرے گی تو اس کی ترقی کا سوتہ سوکھ جائے گا اور وہ محدود زبان بن جائے گی۔ اگر ہندی نے بھی اسی نقصان رساں اصول کی پیروی کی تو اس کی ترقی کا سوتہ بھی اسی طرح سوکھ جائے گا۔ اور وہ ہزار کوششوں سے بھی قومی زبان نہیں بن سکے گی۔

یہ ہم مانتے ہیں کہ زبان کی اصلاح کا کام کسی ایک آدمی یا ایک جماعت کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی شکل ہی بدل دی جا سکتی ہے۔ تو بھی اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر کسی زبان کے سب ہی مصنف اور عالم اس میں انقلاب لانا چاہیں تو بہت حصوں میں وہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ سب ہی زبانوں کی تاریخ میں اس قسم کے زبردست مصنف گذر چکے ہیں جنھوں نے اس زبان کے دھارے کو موڑ کر اس کا روپ بدل دیا ہے اور آج اگر کوئی ایک دو ایسے زبردست لوگ ہم میں نہ بھی ہوں تو سب ہی عالموں کی جمعیت تو اس کام کو کر ہی سکتی ہے۔ اس لئے آپ عالموں سے درخواست ہے کہ آپ اس پر غور کریں

اور اگر یہ باتیں سمجھیں تو ان کے مطابق کام کرنے کی کوشش کریں۔

زبان میں لفظوں کے علاوہ قواعد زبان کا بھی بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ الفاظ بدل دینے پر بھی اگر گرامر اور طرز تحریر نہ بدلا جائے تو زبان کی شکل نہیں بدلتی۔ اس کی لغات میں ہیر پھیر اور اس کے ذخیرہ الفاظ کی تبدیلی آسان ہے مگر گرامر بدلنا بہت کٹھن ہے۔ جو زبان بولی جاتی ہے اس کے قواعد بنتے رہتے ہیں اور اس کی گرامر کے اصول اتنے کڑے اور اٹل نہیں ہو سکتے کہ ان کو بدلنا ناممکن ہو جائے۔ آج انگریزی کے کسی بھی اچھے مصنف کی کتابیں آپ اٹھا کر پڑھیں اور گرامر میں دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق ان کو جانچیں تو ان میں بہتیرے ایسے جملے ملیں گے جن کو گرامر کے اصول کے مطابق غیر صحیح کہنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں سوال ہوتا ہے کہ جملہ غلط ہے یا گرامر کے اصول میں کوئی بھول ہے جب تک زبان بولی جاتی ہے اور دن بدن ترقی کرتی جاتی ہے گرامر اور زبردست مصنفوں میں اس طرح کا جھگڑا چلتا ہی رہتا ہے۔ سنسکرت میں شدہ اور اشدہ جملوں کا فیصلہ آج سہل ہے کیونکہ ان کی جانچ استادوں کے اصولوں کے موافق ہی ہو سکتی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اگر ہندی کو جیتی جاگتی پھیلنے والی قومی زبان رکھنا اور بنانا ہے تو اس کے گرامر کے اصول بھی ناقابل تبدیلی نہیں ہو سکتے اور اگر ایسی کوشش کی جائے گی، تو زبان کی ترقی رک جائے گی اور زبان کے اصولوں سے بھی زیادہ تعداد مستثنیات کی ہو جائے گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی اصول ہونا ہی نہیں چاہئے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اصولوں میں وقت اور مصلحت کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہے اور ان کو موزوں بنانا لازمی ہے۔ موزوں بنانے میں ایک بات پر دھیان رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جو ہندی نہیں جانتے ان کو تین چار اصولوں کی وجہ سے بہت مشکل پڑتی ہے۔ تذکیر و تانیث کا فرق وہ نہیں سمجھ سکتے اور سچ پوچھئے تو ہندی بولنے والے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ جو ہندی کے پرانے لفظ ہیں اور جن کی تذکیر و تانیث مشہور ہو گئی ہے ان کی بات چھوڑ دیجئے۔ اگرچہ پرانے ادب میں بھی ایک ہی لفظ دونوں طرح سے استعمال ہوا ہے۔ اتنا ہی نہیں تو آج بھی کبھی کبھی ہندی کے زبردست لکھنے والے بھی شک میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے " اور " لفظ عام طور پر

مونث ہی مانا جاتا ہے۔ لیکن ہندی کے ایک بہت بڑے مصنف نے اپنی ایک کہانی میں لکھا ہے "گھٹا چکر اسے دوسرے ہی اور لیجاتا ہے"۔

نئے لفظ جو لئے جا رہے ہیں ان کے لئے کوئی موزوں اصول بنانا آسان ہے۔ کچ اصول نہیں رہیں۔ لکھنے والے اور ان میں بھی زیادہ تر اخباروں کے ایڈیٹر جس کو چاہیں مونث اور مذکر بنا دیتے ہیں۔ کونین، لالٹین، موٹر، کانگریس اور کانفرنس کو کیوں مونث بنا دیا گیا؟ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اور اردو کا مذکر قلم اور چرچا ہندی میں پہنچتے ہی کیوں مونث ہو گئے؟ یا ہندی کی مونث قلم اور چرچا اردو میں پہنچتے ہی کیسے مذکر بن گئیں۔ اس کا بھی کوئی معقول سبب نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ ان کے ہم معنی لفظ جیسے سبھا، کمیٹی اور لیکھنی وغیرہ مونث ہیں کافی نہیں ہے اور نہ سنسکرت کی سند پر ہی ان لفظوں کی تذکیر و تانیث مقرر کی جا سکتی ہے۔ اگنی، آتما اور پستک سنسکرت میں مذکر ہیں پر ہندی میں مونث میں ہی ان لفظوں کا استعمال ہوتا ہے۔ جو بے جان چیزیں ہیں ان کی تذکیر و تانیث کے فیصلہ میں بہت گڑبڑی مچتی ہے اور جو ہندی زبان نہیں جانتے مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ تذکیر و تانیث کے فیصلہ کے لئے جو اصول ہیں وہ اتنے ہمہ گیر نہیں ہیں کہ سب ہی لفظوں پر لگ سکیں اور آج جب نت نئے لفظ آ رہے ہیں نئے لفظوں پر ان اصولوں کو لگانا اصولوں اور لفظوں دونوں کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ اگر سب ہی بے جان لفظوں کے لئے کچھ ایسے موزوں اور سہل اصول بنائے جائیں جن کو جاننے کے لئے اخباروں اور مصنفوں کی سند نہ لینا پڑے تو ہندی پرچار کے راستہ سے ایک بھاری رکاوٹ اٹھ جائے۔

"نے" کے استعمال میں بھی بہت مشکل پڑتی ہے۔ پنجاب میں "نے" کا استعمال الگ ہے اور ہندی لکھنے والے اسے سمجھتے اور جانتے ہیں۔ پر اس کے علاوہ بھی بہت سی مشکلیں ہیں۔ آپ حضرات کے سامنے ایک جملہ رکھتا ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ یہ جملہ صحیح ہے یا نہیں۔ "پرنتو اس ودیا کی جیسی انتی ہمارے پراتہ سمرنیا بھارتیہ ودوانوں نے اتی پراچین کال سے ہی کی ہوئی ہے۔ اس کی تُلنا میں سنسار کی ایک بھی بھاشا نہیں دکھتی کہ جو بھارتیا رشیوں کو پیاری سنسکرت بھاشا کی کسی انش میں

میں برابری کر سکے : اگر یہ جملہ صحیح ہے تو اصولوں میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے اور اگر یہ غیر صحیح ہے تو بڑے سے بڑے عالم بھی "نے" کے صحیح استعمال کو نہیں سمجھ پائے ہیں یہ ماننا ہوگا۔ ایسی حالت میں معمولی پڑھنے والوں اور نو سکھڑوں کی دقت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے اور ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں ہمارے اڈیا دوست شری گوپ بندھو چودھری اور شری راماد یوی نے "نے" کا استعمال اٹھانے کی صلاح دی ہے۔

اسی طرح بہت شکل اس بات سے بھی لاشبہ ہوتی ہیں کہ کب فعل کی جمع کام کے مطابق ہونا چاہئے اور کب کام کرنے والے کے مطابق۔ غیر ہندی علاقوں کے رہنے والے ہی نہیں ہندی بولنے والے بھی کبھی کبھی شکل میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بارے میں اور بھی دقتیں ہوتی ہیں۔ جیسے پنڈت جوالا پرشاد جی شرما نے دو ھوا نامی کہانی میں لکھا ہے :۔ " انھوں نے پہلے تو ال ہول کی" اس میں مونث فعل کے لئے کون سا مونث کام ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

اسم کی جمع بھی کبھی کبھی ہم کو گڑبڑی میں ڈال دیتی ہے۔ جیسے " آٹھ اونٹ آئے" اور آٹھ اونٹوں کو وہ ساتھ لایا" دونوں جملوں میں اونٹ لفظ جمع میں آیا ہے لیکن ایک جگہ اونٹ کی جمع اونٹ ہی ہے اور دوسری جگہ " اونٹوں" ہے۔ اس طرح کی بہتیری مثالیں ملیں گی جن کے بارے میں اصول ہونے پر بھی وہ اصول ایسے ہیں جن کا سمجھنا اور صحیح استعمال کی شکل ہوتا ہے۔

ہندی لکھنے کا طرز بھی مختلف مصنفوں کا مختلف ہے۔ ایک ہی لفظ کے ہجے کئی طرح کے ہو جاتے ہیں۔ غیر ہندی علاقوں میں ایک ہی لفظ کے دو روپ دیکھ کر لوگ اچنبھے میں پڑ جاتے ہیں اور گھبراتے ہیں کیونکہ اس کا دوسرا روپ دیکھ کر وہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید یہ دوسرا ہی لفظ ہے۔ اگرچہ یہ خرابی بہت عام نہیں ہے پھر بھی اس کا دور ہونا ضروری ہے۔ جیسے लिय اور लिये - चाहिय اور चाहिये - आई اور आयी - गयी اور गई۔ آنا ہی نہیں भूक اور भूख - सखी اور सखी - धोका اور धोखा وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ اور دوسرے لفظوں کے استعمال میں بھی ان کی جگہ کے بارے میں گڑبڑی ہوتی ہے۔ جیسے "ہی" کو لے لیجئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں "آپ ہی

کے لئے تو ہے" اور کچھ لوگ کہتے ہیں "آپ کے ہی لیے تو ہے" ان دونوں میں کون صحیح ہے۔

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لکھنے والے رائج لفظوں کو سنسکرت شکل دے کر سمجھتے ہیں کہ ہندی کو شدھ بنا رہے ہیں۔ اسی طرح فارسی داں فارسی لفظوں کو صحیح فارسی شکل دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ خیال کرنے کے لائق بات ہے کہ ہندی میں جو لفظ آگئے ہیں وہ ہندی ہو گئے ہیں یا یہاں بھی سنسکرت اور فارسی بنے رہتے ہیں جیسے ہندوستان میں اگر بھی انگریز انگریز ہی بنے رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہوگا تو ہو سکتا ہے کہ ان کی بھی وہی حالت ہو جو ان بدیسیوں کی ہوگی جو اپنا بدیسی پن نہیں چھوڑتے۔

ہندی رسم الخط کے بارے میں غور کرنے کے لئے آپ نے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ وہ اسی مضمون پر غور کر رہی ہے اور اپنی رپورٹ آپ کے سامنے رکھے گی۔ اس پر آپ غور کریں گے ہی۔ میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں پوری صحت کے ساتھ لفظوں کے لکھے جانے اور لکھے ہوئے لفظوں کے ٹھیک ٹھیک تلفظ ادا ہو سکنے کے علاوہ اس پر بھی دھیان رکھنا ضروری ہے کہ تیزی کے ساتھ بھی یہ رسم الخط لکھا جا سکے اور چھاپنے ٹائپ کرنے میں کم از کم جگہ لے اور کم سے کم شکل معلوم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کمیٹی نے ان سب پر غور کیا ہے اور اس کے نتائج کو آپ وہ وقعت دیں گے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ہمیں اس موضوع پر صوبہ کی زبانوں کے ادیبوں اور عالموں سے بھی امداد لینی پڑے گی۔ خاص کر مرہٹی کے ادیبوں سے کیونکہ ہندی اور مرہٹی ایک ہی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اور جو کچھ مشکلیں ہندی رسم الخط کے سامنے ہیں وہی مرہٹی کو بھی ستاتی ہوں گی اور جو حل ان مشکلوں کا ہم ایک کے لئے کریں گے وہ دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

میں نے ایسے سوالوں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے جن پر تبلیغ کی نگاہ سے غور کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ اتنے بڑے سمیلن میں اور ایک دو دن کی بیٹھک میں اتنے گہرے مسائل پر مکمل غور کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے اچھا ہوگا اگر آپ ادیبوں کی ایک ایسی کمیٹی بنا دیں جو زبان کی پاکیزگی، علم زبان کے اصولوں اور ہندی پرچار پر نظر رکھتے ہوئے ان کا حل سوچیں اور اپنی رپورٹ دیں اور خاص کر ہندی بولنے والوں اور ادیبوں کے سامنے رکھیں اور ان کے مشورہ سے بعد میں اس با اختیار کمیٹی کے نزدیک جو ترمیمیں اور تنسیخ مناسب پائی جائیں وہ قبول کر کے ہندی بولنے والوں اور ہندی سے محبت رکھنے والوں کے لئے مناسب

نکل ہی نہ سکیں گی جاسکیں۔ اگر آپ سمجھیں کہ ایک کمیٹی سے سب کام پورا نہیں ہو سکتا تو ڈکشنری کے لیے ایک الگ کمیٹی بنا دیجئے اور قواعد زبان کے لئے دوسری کمیٹی بنائی جائے۔ میں جہاں تک دیکھ سکتا ہوں دونوں کے لئے کافی کام ہوگا۔

ڈکشنری کی کمیٹی کے لئے صوبہ کی زبانوں کی ڈکشنریاں اور گاؤں میں رائج لفظوں کا جن میں کاروبار دیہاتی ہنر، کھیتی وغیرہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار لفظ شامل ہیں ایک خزانہ بھرا پڑا ہے۔ فارسی، عربی، ترکی، انگریزی وغیرہ کے ایسے لفظوں کا جو رائج ہو گئے ہیں یا ہو رہے ہیں یا جن کو رائج ہو جانا چاہئے بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ معمولی کاروبار میں تقریباً دو ڈھائی ہزار لفظ کام میں آتے ہیں اصطلاحی اور علمی لفظوں کو چھوڑ کر روزمرہ کے کام میں اس سے زیادہ لفظ ہم استعمال نہیں کرتے ہیں۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ ایک چھوٹا لغت ایسے لفظوں کا بنایا جائے جو ہندی اور اُردو دونوں کے لفظوں پر حاوی ہو۔ ہم اس چیز کو بھول نہیں سکتے کہ ہندی اور اُردو دونوں ہندوستان میں ہیں اور رہیں گی بھی۔ ایسی حالت میں ہندی جاننے والے کو معمولی اُردو لفظوں کا اور اُردو جاننے والوں کو ہندی لفظوں کا علم ہونا ضروری ہے اور اس علم کے بڑھانے میں اس قسم کا لغت بہت بڑا کام دینے والا ہوگا اس لئے ڈکشنری کی کمیٹی اس کام کو لے لیوے تو بہت مناسب ہو۔ اس کے علاوہ صوبہ کی زبانوں میں سے بھی اچھے لفظوں کو لے لینا اچھا ہوگا: انگریزی کا ایک بہت معمولی لفظ نوٹ ہے۔ ہندی میں اس کا ٹھیک ہم معنی لفظ نہیں ملتا لیکن مرہٹی، گجراتی اور کئی دوسری زبانوں میں اس کا ہم معنی لفظ "نوند" آتا ہے۔ ہم کیوں نہ اسے ہندی میں چلالیں۔ اس طرح کے اور بہتیرے لفظ ہیں۔ کمیٹی ان کی کھوج کرے اور جہاں ضروری ہو ان کو ہندی میں جگہ دے۔

گرامر والی کمیٹی زبان کی صحت کے مسائل کے علاوہ اس مسئلہ پر نظر ڈالے کہ ہندی سہل اور عام فہم زبان بنے جس سے دوسرے صوبوں میں اس کا پرچار تیزی سے ہو سکے۔

میں نے اس وقت تک ہندی پرچار کی نگاہ سے زبان کی خامیوں کو دور کرنے پر ہی غور کیا ہے ادب کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے۔ میں ادب کے لئے پسند نہیں ہوں

پر اتنا سننے کے بعد بھی کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ جس وقت میں اسکول کالج میں پڑھ رہا تھا اس وقت کی
وہ آج کی حالت میں بہت فرق ہو گیا ہے اب ہندی کو یونیورسٹیوں کی اونچی جماعتوں میں بھی جگہ مل گئی
ہے اور ہندی کے ادیب و عالم سب ہی مضامین پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ پر ابھی تک یہ نہیں ہوا ہے کہ
عالم اور مصنف اپنے اوریجنل مضامین اور کتابوں کو ہندی میں لکھیں اور جن کو اس مضمون کا علم حاصل کرنا ہو
وہ ان کے اوریجنل کتابوں کو پڑھنے کے لئے ہندی زبان کو سیکھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مصنفوں کو ابھی تک
یہ بھروسہ نہیں ہوتا ہے کہ ان کی اوریجنل تصنیفوں کے قدردان ہندی پڑھنے والوں میں مل سکیں گے۔ یہ
شک ایک حد تک بے بنیاد بھی نہیں ہے اس لئے ایسی گہری کتابوں کے پڑھنے کا شوق ہم کو پیدا کرنا ہے
کسی بھی ریلوے اسٹیشن پر آپ جا کر دیکھیں تو ہندی کی کچھ خوبصورت جلد والی اور بہت دام والی کتابیں
دیکھنے میں آئیں گی پر وہ کسی گہرے مضمون کی کتابیں نہیں ہوتیں اور نہ اعلیٰ مرتبہ کے ادب میں ہی ان کا شمار
ہو سکتا ہے۔ محض ناول ہونے سے ہی ایک کتاب کا مرتبہ گر جاتا ہے' یہ میں نہیں کہتا۔ ناول کی شکل میں
فرنچ، بنگلہ اور ہندی میں بھی کچھ مستند کتابوں کی اشاعت ہوئی ہے پر زیادہ تر کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو
وقت اور روپیہ کو ضائع کرنے کے سوا انسانی سیرت کو بھی خراب کرنے سے باز نہیں رہتیں۔ ادیبوں کا کام ہے
کہ عوام کا شوق بدلیں۔ اس کام میں نقاد اور مبصر بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ ہندی ادب اتنی ترقی نہیں کر رہا
ہے جتنی ہونی چاہئے۔ اس لئے ادب اور ادیب کے اصولوں سے پوری واقفیت کے علاوہ نقادوں میں
یہ خوبی بھی ہونی چاہئے کہ اپنے فرض کو پہچانے۔ نہ کسی کے ساتھ دشمنی کرے نہ کسی کی طرفداری۔ اس کا
فرض ہے کہ سچے ادب کی تخلیق میں مصنفوں کی مدد کرے۔ انسانی سیرت پر ادب کا سب سے گہرا اثر پڑتا
ہے اور سچا نقاد وہ پہرہ دار ہے جو انسانی سیرت کی حفاظت کرتا ہے۔ اُس انسانی سیرت کی حفاظت
کرتا ہے جو دولت اور انسانی زندگی سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ کیونکہ سیرت نہ رہی تو زندگی بے کار ہے۔
جب نقاد کا اتنا فرض پہرہ دار کی حیثیت سے ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ادیب کا کتنا زیادہ فرض ہے۔
وہ دوسرے کے پیدا کی ہوئی دولت کی حفاظت نہیں کرتا وہ تو خود دولت پیدا کرتا ہے۔ خود اپنی تقریر اور
تحریر سے بنی نوع انسان کی سیرت بناتا ہے اور اس کا اثر اس کے مرنے کے بعد بھی پڑتا رہتا ہے۔ اس لئے

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

وفاقِ ادبیاتِ ہند

(بھارتیہ ساہتیہ پریشد)

اپریل ۳۵ء میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں جو ہندی ادبی کانفرنس اندور میں ہوئی تھی اس میں کنہیا لال منشی صاحب گجراتی کے مشہور ادیب اور ان کے چند ہم خیال لوگوں نے ہندوستان کے مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان کے ادب سے تمام ملک کو واقف کرانے کی ایک تحریک اٹھائی تھی۔ جس کا ہندی کے ادیبوں نے خیر مقدم کیا تھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا کام ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا تھا جس کے ایک سرگرم کارکن کنہیا لال منشی صاحب تھے۔ انھوں نے مختلف زبانوں کے معزز اشخاص اور ادبی اداروں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے پاس اپنی تحریک سے متعلق لٹریچر روانہ کیا اور انھیں شرکت کی دعوت دی۔ اپنے ایک پمفلٹ میں اپنی تحریک کا مطلب سمجھاتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا۔

"ادھر کچھ دنوں سے ہندوستان کے ان سب ہی صوبوں میں جن کی اپنی خاص خاص زبانیں ہیں ایک ادبی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر زبان کی اپنی چھوٹی چھوٹی ادبی انجمنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ان سب نے اپنی اپنی زبان کے ادبی وفاقوں سے الحاق کر لیا ہے۔ مگر عموماً ملک کی مختلف زبانوں کے یہ وفاق ایک دوسرے سے الگ رہ کر کام کر رہے ہیں اور ان کی آپس کی جدائی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ ان کے ادیبوں کو جتنا علم انگلینڈ کے جدید ادبی اور تمدنی مشاغل کا ہے اتنا اپنے پڑوس کی زبان کے بارے میں نہیں ہے۔ ہر صوبے کے باہر ایسے بہت کم لوگ ہیں جنھیں اس صوبہ کی زبان کے نئے مصنفوں کے ادبی رجحانات اور طرز ہائے بیان کا تھوڑا سا بھی علم ہو۔ جن صوبوں میں ہندی نہیں بولی جاتی وہاں کچھ لوگ تلسی داس اور سور داس کے نام سے شاید واقف ہوں لیکن وہ ہندی کے موجودہ مصنفوں کو نہیں جانتے۔ بنگالی ادب سے ہماری جو کچھ واقفیت ہے وہ رابندر ناتھ ٹیگور کی وجہ سے ہے۔ گجراتی ادب کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں

وہ مہاتما جی کی آپ بیتی کے انگریزی ترجمہ کے ذریعہ سے۔ نئے گجرات نے جس رومانی ادب کو پیدا کیا ہے وہ دوسرے صوبہ والوں کے لئے ایک سربمہر کتاب ہے۔ کرناٹک، تامل ناڈ، آندھرا، کیرل وغیرہ صوبوں میں جس نئے ادب کا آغاز ہو رہا ہے دریائے گوداوری کے شمال میں رہنے والوں کو اس کا علم نہیں ہے۔

"لیکن باوجود اس دوری اور ناواقفیت کے جدید ادب پر اس وقت ہر جگہ قومیت کا رنگ چھایا ہوا ہے اور آئندہ بھی چھایا رہے گا۔ سب ہی صوبوں کی کوششیں ایک ملکی قومیت کو پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔ اس لئے ایک ایسے ادبی وفاق کی ضرورت ہے جس کی تعمیر میں ہر صوبہ نے اپنا بہترین اور اعلیٰ ترین حصہ پیش کیا ہو تاکہ ہندوستانی قومیت کا ترقی پذیر جذبہ اپنے انتہائی عروج کمال تک پہنچ سکے۔"

یہ خیالات تھے جن کا کنہیا لال منشی صاحب نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک ادبی وفاق قائم کرنے کے سلسلہ میں اظہار کیا تھا۔ تقریباً اسی قسم کے خیالات اور تمنائیں چونکہ قوم پرست ہندوستانیوں کے دلوں میں عام طور پر موجود تھیں اس لئے ان کے اس خیال کا ملک کے ہر حصہ میں نہایت اچھا خیر مقدم ہوا۔ ہر صوبہ کے رہنے والے اپنے دوسرے صوبوں کے ہم وطنوں کے خیالات، جذبات رسوم اور معتقدات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن زبان اور رسم خط کے اختلاف کی وجہ سے نہ تو دوسرے لوگوں کا مفہوم خود سمجھ پاتے ہیں اور نہ اپنا مفہوم اور اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر اخباروں، جلسوں اور قومی کاموں میں علیحدگی اور بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ فرقہ پرستی کے جذبات ترقی پاتے ہیں، غلط فہمیاں بڑھتی ہیں اور ایک دوسرے سے منافرت اور دشمنی کا برتاؤ کیا جانے لگتا ہے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے ہر محب وطن ایسی تمام کوششوں کو جن سے دوری کم ہو، آپس میں میل جول بڑھے، ایک دوسرے کو بہتر طریقہ پر سمجھنے سمجھانے کا موقع ملے اور قربت اور ہم نشینی کے امکانات پیدا ہوں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اس مقصد کو جامعہ کے کارکن بھی اچھا سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب کنہیا لال منشی صاحب کے خطوط شیخ الجامعہ صاحب اور جامعہ کی اردو اکادمی کے پاس آئے تو انھوں نے بھی اس تخیل کا خیر مقدم کیا اور اس وفاق کے لئے اپنے نمایندے نامزد کئے۔ لیکن منشی صاحب کی اس تجویز سے کہ "اس قسم کا ادبی وفاق صرف ہندی کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور ہندی کے لئے صوبوں کی زبانوں کو متحدہ طور پر کوشش کرنا چاہیئے" شدید اختلاف رائے کا اظہار کیا گیا۔ جامعہ سے مختلف لوگوں نے اس مسئلہ پر منشی جی کو جو خطوط لکھے ان میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی کہ ہندی اس کام کو انجام دینے کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہے بلکہ اس کام کے لئے اگر کوئی زبان موزوں ہو سکتی ہے تو وہ "ہندوستانی" ہے۔

وفاق کی تحریک کو چلانے کے لئے کنہیا لال منشی صاحب اور منشی پریم چند صاحب کی مشترکہ ادارت میں ایک رسالہ بھی نکلنا شروع ہوا جس میں ملک کی مختلف زبانوں کا ادب ہندی میں پیش کیا جانے لگا۔ اس رسالہ کے لئے جامعہ کے لوگوں نے مضامین بھی بھیجے جن میں سے بعض "ہنس" نے بجنسہ اپنی اصل شکل میں اور بعض کو صرف چند الفاظ کے ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ لیکن عام طور پر جو مضامین شائع ہوئے ان کی زبان سخت ہندی ہوتی تھی جس کی بابت جامعہ کی طرف سے برابر اعتراض کا سلسلہ جاری رہا اور اس بات پر اصرار کیا گیا کہ یہ زبان ہندوستانی ادبی وفاق کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ خط کتابت کے دوران میں کنہیا لال منشی صاحب نے بھی ہمارے خیالات کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اس مسئلہ کے متعلق آخری فیصلہ کو تمام زبانوں کے ادیبوں کی اجتماع تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اس اجتماع کے لئے مختلف تاریخیں مقرر ہوئیں جو مہاتما گاندھی کی مصروفیتوں کی وجہ سے ملتوی ہوتی رہیں۔ اس میں ہندوستان کی تمام زبانوں کی انجمنوں، مشہور ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں، یونیورسٹیوں کے نمایندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ دعوت نامہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، جامعہ ملیہ دہلی اور دوسرے اُردو کے اداروں کے پاس بھی بھیجے گئے۔ آخر کار یہ اجتماع ہندی ادبی کانفرنس کے ساتھ ناگپور میں ہوا۔ اس کے مہاتما

گاندھی منتخب کئے گئے۔ انجمن ترقی اُردو اور عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شرکت کے لئے مولوی مہالتی صاحب بھی تشریف لائے اور جامعہ ملیہ نے بھی اپنا ایک نمائندہ اس جلسہ کی کارروائی میں شریک ہونے کے لئے بھیجا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر کے خطبہ اور مہاتما گاندھی کے خطبہ صدارت کے بعد اس "وفاق ادبیات ہند" (بھارتیہ ساہتیہ پریشد) کے اغراض و مقاصد متعین کرنے کے لئے جلسہ کیا گیا۔ اس جلسہ میں جامعہ ملیہ کی طرف سے پروفیسر محمد مجیب صاحب کا ایک خط انگریزی زبان میں پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا جس کے ضروری اجزا ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"کئی سال سے کانگریس اس کا پرچار کر رہی ہے کہ ہماری قوم کے سیاسی حوصلوں کو سہارا دینے کے لئے ایک قومی زبان بھی ہونی چاہئے۔ اگر زبان کے لحاظ سے دیکھئے تو اس خیال کی وجہ سے بہت سے معتبر طرح طرح کے گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اردو کے ادبی حلقوں میں اس نے زبان کو سادہ اور گھریلو بنانے کا شوق پیدا کر دیا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے لکھنے والے جن کی ساری عمر عربی کتابیں پڑھتے گذری ہے اور جو ایسے مضمونوں پر لکھتے ہیں جن کی اصطلاحیں بدلنا ایک بے ادبی ہے انھوں نے بھی بڑے جوش کے ساتھ اپنی زبان کو سادہ اور ہندوستانی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس لئے کہ قومی زبان کا خیال ان کو بہت عزیز تھا۔

"کانگریسی حلقوں میں یہ قومی زبان ہندوستانی کہلاتی تھی۔ لیکن کانگریس نے اُردو اور ہندی بولنے والوں سے اس نام کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاسی اور سماجی زندگی میں ناموں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ نام کے ساتھ بہت سی باتیں یاد آ جاتی ہیں اس وجہ سے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ ہم اپنی قومی زبان کا نام کیا رکھیں گے۔ ابھی تک اردو بھی ایسی زبان تھی جو کسی ایک صوبہ کی یا کسی ایک مذہبی جماعت کی زبان نہیں تھی۔ ہندوستان بھر میں مسلمان اسے بولتے ہیں اور شمالی ہندوستان میں اُردو بولنے والے ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔

بدیسی زبان ہے تو سنسکرت کبھی بول چال کی زبان نہیں تھی - اور جو بول چال کی ہندی کے لفظوں کو غور سے دیکھے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے جو سنسکرت لفظ ہیں وہ زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ کیونکہ انہیں زبان سے بولنے میں دشواری ہوتی ہے، ایک مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ آپ لوگوں کو بھی - آپ دیکھیں گے کہ "گرام" اور "ورش" جیسے چھوٹے چھوٹے لفظ بھی بدل کر "گاؤں" اور "برس" ہو گئے ہیں۔ ہندی کے بہت سے پرچارک ان باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ انھوں نے ہندی کے ان شبدوں کی جگہ اصل سنسکرت لفظوں کو لکھنا شروع کیا ہے۔ معلوم نہیں اپنی قابلیت دکھانے کے لئے یا ان جانی یا اس تعصب کے سبب سے کہ سنسکرت کے جو لفظ بول چال میں لئے ہیں ان سب کو اُردو نے اپنے میں شامل کر لیا۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارے یہ دوست ہندی بول چال کی زبان کو پھیلانا نہیں چاہتے بلکہ ان کی نیت ہندوستانی زندگی پر پرانی آریائی رنگ چڑھانا ہے۔ ہمارے ہندو بھائی اپنے کو سدھارنے کی کوشش کریں یا کسی پرانے زمانہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی تو اس میں مسلمانوں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن یہ تو ایمانداری کی بات ہے کہ ایسی تحریکیں زبان کے مسئلہ سے بالکل الگ رکھی جائیں۔

" میرے ایک دوست عاقل صاحب کے خط کے جواب میں شری یت کے۔ ایم۔ منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کیرل والوں نے ادبی قاعدے اور رسمیں بنائی ہیں جن میں خالص اُردو کا قریب قریب کوئی اثر نہیں۔ اگر ہم ہندی بولیں گے تو یہ ایک قدرتی بات ہے کہ یہ ہندی سنسکرت کے رنگ میں ڈوبی ہوگی " اول تو مجھے ٹھیک معلوم ہے کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی میں بہت سے فارسی لفظ ہیں اور میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ گجراتیوں اور بنگالیوں کو ایک دوسرے سے اور مسلمانوں سے میل ملاپ کرنے کے لئے اپنی زبان پر سنسکرت کا رنگ چڑھانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ میں تو یہاں خالص اُردو سے مطلب نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کی بول چال کی زبان اور اس کے محاوروں سے ہے۔ اگر یہ زندہ بول چال کی زبان ہماری قومی زبان کی بنیاد ٹھہرائی جائے تو مسلمانوں کا اس کوشش میں شریک ہونا کارآمد ہو سکتا ہے

سنسکرت کی طرف واپس جانے سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ انھوں نے ہندی، گجراتی اور بنگالی کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ بھلا دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں ہم سے یہ کہنا کہ اس کام میں تم ہمارے ساتھ شریک ہو گویا یہ کہنا ہے کہ اپنی خودکشی میں شریک ہو۔

"بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے" ہندی سیوزیم "کے پہلے جلسے میں تقریر کی تھی اسے پڑھ کر مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اردو ہندی کا سوال ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد پیدا کرنے والا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ "چینی کے بعد ہندی ایشیا کی وہ زبان ہے جس کے بولنے والے تعداد میں سب سے زیادہ ہیں" دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں قومی زبان کا مسئلہ طے ہو گیا۔ یہ زبان ہندی ہوگی اس لئے کہ ہندوستان میں ہندی بولنے والے زیادہ ہیں۔ ہندوستانی کے لئے جو لوگ شور مچا رہے ہیں وہ اتنے تھوڑے ہیں کہ ہم ان کو دبالیں گے۔ اس لئے ان کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سروں کا گننا ویسا ہی غلط علاج ہے جیسے سروں کا پھوڑنا۔ ٹنڈن صاحب کا مطلب کچھ بھی ہو مجھے جان پڑتا ہے کہ ہم ایسی ہی کوئی بے عزتی کے لئے زمین تیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ "کمیونل اوارڈ" تھی۔ اس وقت بس آپ کی شہرت اور آپ کا ملک میں جو اعتبار ہے وہی ہم کو بچا سکتا ہے میں نیچے چند باتیں لکھتا ہوں جو میری ناچیز رائے میں سمجھ کے خلاف نہیں ہیں اور ایک قومی زبان کی مضبوط بنیاد بن سکتی ہیں۔ اگر آپ ان پر غور کریں اور انھیں کسی لائق سمجھیں۔ ایک اپنے ہی خیال میں نہیں بلکہ اس بڑے کام کو دیکھتے ہوئے جس میں مدد کرنا ان کا مقصد ہے تو آپ انھیں دوسروں تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔ جس چیز کا میں اس وقت خواب دیکھ رہا ہوں وہ تو یہ ہے کہ آپ انھیں کی بنا پر ایک اعلان اپنی طرف سے شائع کریں۔ وہ باتیں یہ ہیں:۔

(۱) ہماری قومی زبان ہندی نہیں کہلائے گی بلکہ ہندوستانی۔

(۲) ہندوستانی کا کسی ایک مذہبی سماج کے ورثہ سے تعلق نہ ہوگا۔

(۳) اس زبان کے لفظوں میں یہ نہ دیکھا جائے گا کہ کون دیسی ہیں کون بدیسی بلکہ یہ دیکھا

جائے گا کہ کس کا رواج ہے کس کا نہیں۔

(۴) اُردو کے ہندو لکھنے والوں اور ہندی کے مسلمان لکھنے والوں نے جو لفظ استعمال کئے ہیں وہ سب رائج مانے جائیں گے۔ لیکن اردو اور ہندی کی جو مذہبی حیثیت ہے اس پر اس قاعدہ کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔

(۵) اصطلاحیں اور خاص طور پر سیاسی اصطلاحیں تجویز کرتے وقت سنسکرت کے لفظ اس لئے نہ پسند کئے جائیں گے کہ وہ سنسکرت ہیں بلکہ اُردو ہندی اور سنسکرت کے لفظوں میں سے لوگوں کو چننے اور پسند کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔

(۶) دیوناگری اور عربی خط دونوں رائج اور سرکاری سمجھے جائیں گے اور ان تمام اداروں میں جن کا مقصد ہندوستانی کے پرچارکوں کے اثر میں ہے دونوں خط سیکھنے کا انتظام ہوگا۔

بہت سے دوست ہوں گے جن کو یہ تجویزیں مسلمانوں کا مطالبہ معلوم ہوں گی۔ ایسا نہیں ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر آپ کی اور پریشد کی طرف سے ایسی اطمینان دلانے والی باتیں نہ ہوئیں تو مسلمانوں کی ادبی کوششیں قومی زبان بنانے کے لئے کام نہ آئیں گی۔ اسی خیال سے میں نے یہ تجویزیں آپ کی خدمت میں پیش کی ہے۔ اگر یہ بے جا ہیں تو میں جانتا ہوں کہ آپ میری خطا معاف کر دیں گے اور اگر وہ ایسی ہیں کہ مجھے انھیں پیش کرنے کا حق نہیں تھا تو آپ ناراض نہ ہوں گے۔ میری تو خواہش بس یہی تھی کہ اپنا فرض ادا کروں اور آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کر کے دکھاؤں کہ مجھے آپ کی رائے پر کتنا بھروسہ ہے اور آپ کی انصاف پسندی اور رواداری پر کتنا اعتبار ہے۔"

اس خط کو سن کر مہاتما جی نے جلسہ میں مجیب صاحب کی رواداری اور وسعت قلب کی تعریف کی اور حاضرین کو یقین دلایا کہ مجیب صاحب نے جو لکھا ہے اسے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے فرقہ پرستی سے لکھا ہے بلکہ اسے ایک آزاد خیال آدمی کی رائے سمجھنا چاہئے۔ اس کے بعد سبجکٹس کمیٹی میں رزولیوشن پیش ہوئے۔ لیکن چونکہ رزولیوشن جس زبان میں لکھے گئے تھے وہ بہت مشکل تھی اس لئے جامعہ ملیہ کے نمائندے کو اس رزولیوشن کی کارروائی میں حصہ لینے سے احتجاج کے طور پر

انکار کرنا پڑا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "ہندی یعنی ہندوستانی" کی مخالفت اور ہندوستانی کی تائید کرتے ہوئے مہاتما جی کو کانگریس کا وہ رزولیوشن یاد دلایا جس میں ہندوستانی کو ملک کی قومی زبان قرار دیا گیا تھا اور جس کی ہر شخص کو اپنی سہولت کے مطابق عربی یا دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ مہاتما جی نے اس پر فرمایا کہ وہ رزولیوشن بھی میں نے ہی پیش کیا تھا اور آج کا رزولیوشن بھی میں ہی پیش کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک "ہندی یعنی ہندوستانی" ہی ملک کی قومی زبان بن سکتی ہے۔ محض "ہندوستانی" کے معنی اردو کے ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ اسی طرح خالی ہندی کے معنی ایسی ہندی کے ہیں جس سے فارسی عربی کے لفظ خارج کر دئیے گئے ہوں۔ "ہندی یعنی ہندوستانی" سے میرا مطلب ایسی ہندی ہے جس میں فارسی عربی کے لفظوں کا بائی کاٹ نہ کیا جائے اس لئے "ہندی یعنی ہندوستانی" کو ہی پریشد کے اظہارِ خیال کا مشترک ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ اس پر مولوی عبدالحق صاحب کی طرف سے جواب دیا گیا کہ "ہندوستانی" اور "اردو" کو ہم معنی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ "ہندوستانی" ایسی اُردو یا ایسی ہندی کا نام ہے جو ایک طرف فارسی عربی اور دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کے غیر مانوس اور مشکل لفظوں سے پاک ہو۔ "ہندوستانی" کے لفظ کو اختیار کرنے سے ہی ہم اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے قریب لاسکیں گے۔ لیکن مہاتما جی نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ رائے شماری ہوئی جس میں جامعہ کے نمایندے نے اس احتجاج کے ساتھ کہ رزولیوشن کی زبان ناقابلِ فہم ہے رائے شماری میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تین شخصوں کی مخالفت، کئی لوگوں کی عدم شرکت اور کثرتِ رائے کی تائید سے سبجکٹ کمیٹی میں پریشد کے اغراض و مقاصد کا رزولیوشن پاس ہو گیا۔ اس کے بعد مہاتما جی نے رزولیوشن کو عام فہم زبان میں لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری صاحب نے جہاں تک ہو سکا اس رزولیوشن کی زبان کو سہل کر دیا۔ دوسرے دن مکمل اجلاس میں وہ رزولیوشن دوبارہ پیش کیا گیا۔ رزولیوشن حسبِ ذیل تھا:۔

۱۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ ہندوستان کے سب صوبوں کی زبانوں کے ادبوں کی تنظیم کے لئے اس قسم کے پریشد کی بڑی ضرورت ہے لہٰذا اس پریشد میں جو لوگ

شریک ہونے میں اور اس کے مقاصد کو مانتے ہیں انھیں سے اس پریشد کا کام شروع کیا جائے۔

اس پریشد کے مقاصد یہ ہوں گے۔

۱۔ (الف) ہندوستان کے سب صوبوں کی زبانوں کے ادیبوں اور ادیبوں میں آپس میں میل کرانا اور اسی طرح ہندوستان کے ادبوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا

(ب) اس پریشد کا کام "ہندی یعنی ہندوستانی" میں ہوگا

۲۔ (الف) جو ادب زندگی کے اعلیٰ نصب العین کا مخالف ہو، اخلاق کو بگاڑتا ہو اور فرقہ وارانہ اتحاد میں رکاوٹ ڈالتا ہو ایسے پریشد کی یہ ادب ہرگز حوصلہ افزائی نہ کرے گا

(ب) عوام کی زندگی کے زندہ اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے والے ادب کے رواج کی یہ پریشد حوصلہ افزائی کرے گا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے رزولیوشن ۱ میں یہ ترمیم پیش کی کہ "ہندی یعنی ہندوستانی" ایک غیر واضح لفظ ہے۔ لہٰذا اس کی جگہ یا تو صرف "ہندی" کا لفظ لکھا جائے یا صرف "ہندوستانی" کا۔ اس ترمیم کی موافقت میں گیارہ رائیں آئیں۔ کچھ لوگ غیر جانبدار رہے اور باقی سب لوگوں نے مخالفت کی۔ پھر اس کے بعد اسی رزولیوشن میں دوسری ترمیم اختر رائے پوری صاحب نے پیش کی کہ "ہندی یعنی ہندوستانی" کی جگہ صرف "ہندوستانی" لفظ لکھا جائے اس کی تائید میں منشی پریم چند نے بھی تقریر فرمائی۔ جب رائے شماری ہوئی تو ترمیم کی تائید میں پانچ رائیں آئیں جن میں ایک منشی پریم چند صاحب کی بھی رائے تھی کچھ لوگ غیر جانبدار رہے اور بقیہ نے مخالفت کی۔ پھر اغراض و مقاصد کا پورا رزولیوشن پیش کیا گیا جو تین آدمیوں یعنی مولوی عبدالحق صاحب، اختر حسین رائے پوری صاحب اور جامعہ کے نمائندہ کی مخالفت کے بعد کثرت رائے سے منظور ہوا۔ اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر غیر رسمی گفتگو کے دوران میں مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے جو مختلف لغات شائع ہو رہے ہیں ان کا تذکرہ کیا اور بتلایا کہ وہ کس طرح ہندی اور اردو دونوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سنسکرت کی اصطلاحیں رائج کر کے آپ ہندی کو عوام کی بول چال سے علیحدہ ہٹا

ہے میں آپ نے یہ بھی دعوے کیا کہ اُردو میں عام بول چال کی ہندی کے جتنے الفاظ ہیں اتنے خود تحریری اور شائستہ ہندی میں نہیں ملتے مدرسوں اور اخباروں رسالوں کی ہندی ہندی نہیں رہی ہے بلکہ سنسکرت بن گئی ہے ۔

جیسے ہیں کچھ لوگ ایسے تھے جو ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کے اضافہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح ہندی بولنے والے، گجراتی، مرہٹی بنگالی اور آسامی بولنے والوں سے قریب ہو جاتے ہیں اور ہندی کو ان لوگوں میں مقبول ہونے کا موقع ملتا ہے ۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کثیر نہ تھی زیادہ تر لوگ ہندی سے عربی اور فارسی کے لفظوں کو ترک کرنا نہ چاہتے تھے ۔ اس سلسلہ میں پریشد کے صدر مہاتما گاندھی اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر کاکا کالیلکر صاحب کے خیالات بھی لائق توجہ سمجھ کر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

مہاتما گاندھی نے اپنا چھپا ہوا خطبہ پڑھ کر نہیں سنایا تھا بلکہ خطبہ تقسیم کرا کے ایک تقریر کی تھی تقریر کے ایک حصہ میں آپ نے فرمایا :-

" آج جس کام کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں وہ بڑا کام ہے ۔ اس کے لئے جتنے ادبی خدمت کرنے والوں کے جمع ہونے کی ضرورت تھی اتنے یہاں نہیں آ سکے ہیں ۔ اگرچہ تعداد کی طاقت کو میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن پھر بھی اس کام کا بوجھ کون اٹھائے گا یہ بات تو آپ کو سوچنا ہی ہوگی بلکہ اس کے بارے میں آپ کو رات دن سوچنا پڑے گا ۔ کیونکہ مختلف صوبوں کے ادیبوں کی تنظیم اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا مہابھارت کا کام تھا ۔

پریشد کے خیال کی ابتدا کی تاریخ کاکا صاحب نے ابھی آپ کے سامنے بیان کیا لیکن اس کی ابتدا گذشتہ سال اندور کے ہندی ساہتیہ سمیلن میں ہوئی تھی ۔ ہمیں اب یہ بات سوچنا ہے کہ ساہتیہ سمیلن اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے کام میں کچھ اختلاف ہے یا نہیں ۔ ساہتیہ سمیلن کا مقصد دوسرے ادیبوں کی تنظیم کرنا نہیں ہے ۔ اس کا مقصد تو ہندی زبان کی خدمت کرنا ہے ہندی کی ملک میں اشاعت کرنا ہے ۔ دوسری طرف اس پریشد کا مقصد ہندی زبان کی خدمت

کرنا نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ دونوں انجمنوں کے کاموں میں اختلاف کا کوئی خوف نہیں ہے۔ لیکن پریشد کا مقصد تو دوسرے ادیبوں کے جواہرات اکٹھے کرکے اس ملک کے عوام کے سامنے رکھنا ہے۔

"ہندی اور اُردو ایک ہی زبان ہے۔ اسے الگ بنانے والے وہ ہندو اور مسلمان ہیں جو آج ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھے ہیں۔ دونوں زبانوں کا صرف و نحو ایک ہے۔ شبلی صاحب کی سیرت میں بھی ہندی کے معمولی لفظ مل جاتے ہیں کیوں کہ ان سب لفظوں کو چھوڑنا ناممکن ہے ایسے ہی عربی فارسی کے لفظ بھی ہم نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ خود تلسی داس جی نے اپنے "مانس" (رام چرتر مانس) میں کافی فارسی کے لفظ لئے ہیں۔ یہ بات پنڈت رام نرائن جی ترپاٹھی نے اپنی مانس ٹیکا میں بتلائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تلسی داس کے دل میں فارسی سے نفرت نہ تھی اور ان کے زمانہ میں فارسی عربی کا بائی کاٹ نہیں کیا جاتا تھا۔

" ادبی خدمت میں بائی کاٹ جیسی کوئی چیز نہ ہونا چاہئے۔ جو اس میدان میں بائی کاٹ شروع ہوگا تو آٹھ کروڑ مسلمانوں کے ساتھ میل کیسے ہوگا؟ اس لئے ہندی نہ اردو کا بائی کاٹ کرے نہ اُردو ہندی کا۔ بنگال کے مسلمان اور دکن کے مسلمان اُردو نہیں جانتے۔ ان مسلمانوں کے لئے بھی ایسی زبان کی جسے میں نے "ہندی یعنی ہندوستانی" کہا ہے ضرورت ہے۔"

اسی موضوع پر کاکا کالیلکر صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے ہندی والوں سے جو اپیل کی ہے وہ بھی لائق توجہ ہے:۔

" دکن کی زبانوں کی طرف سے اور دکن کے قوم پرست دوستوں کی طرف سے مجھے ہندی والوں سے ایک درخواست کرنا ہے۔ ہم عربی یا فارسی لفظوں کے بائی کاٹ کے حامی نہیں ہیں۔ ہندی میں بڑے بڑے سنسکرت لفظ ٹھوس کر اسے پنڈتاؤ ہندی بنانے کے طرفداروں میں بھی ہم نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کی ہندی —— دہلی اور لکھنو کی طرف کی ہندی —— ہم بڑی مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اتنا آپ کو دھیان میں رکھنا چاہئے۔ پنڈت جواہر لال جی جو عوام ہندی بولتے ہیں وہ سب لوگوں کے لئے عام فہم ہندی ہوگی ہمارے لئے تو وہ بہت سخت ہندی ہے۔ ہم مشکل سے ہندی سیکھ

پاتے ہیں ۔ ہماری دکنی زبان میں عربی اور فارسی لفظ ہیں انھیں تو ہم رکھنا ہی چاہتے ہیں جو لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں وہ ہمارے ہی ہو گئے ہیں لیکن جب نئے الفاظ ایک دم زیادہ تعداد میں آ گھستے ہیں تب ہمارے لئے قومی زبان بھی ایک غیر اور ناقابل فہم زبان بن جاتی ہے ۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے برادرانہ تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں ۔ لیکن جب وہ بڑے بڑے عربی اور فارسی الفاظ ہی استعمال کرنے کی ضد کرتے ہیں تب ہم پریشان ہو جاتے ہیں ۔ دل ان کے نزدیک جانا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی مشکل زبان سے ہمیں دور رکھتے ہیں ۔ شمال کے ہندو اور مسلمان دونوں یہ کہیں گے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بازار میں گنوار لوگ بھی جس زبان کو سمجھ سکتے ہیں وہ بلا شبہ آسان ہندی ہے اور ہمیں اسے ہی آسان ہندی سمجھنا چاہیئے ۔ مگر یہ چاہے ہمارا گناہ ہو لیکن ہم نہایت صاف الفاظ میں اقرار کرتے ہیں کہ ہم اس زبان کے بہت کم الفاظ سمجھ پاتے ہیں ۔ ہم جیسے جیسے آپ کے ساتھ تعارف بڑھائیں گے ویسے ہی آپ کے الفاظ بھی سیکھ لیں گے ۔ تب تک آپ ہم پر رحم کیجئے اور ہمارے لئے مہربانی کرکے ایسے آسان لفظوں کا استعمال کیجئے جنھیں ہم سمجھ سکیں ۔ ہم بہت دور تک آپ سے ملنے کے لئے بڑھیں گے آپ بھی ہمارے لئے کچھ دو قدم آگے بڑھ کر ہماری طرف آئیے ۔ نہیں تو جیسی آج ہمیں انگریزی زبان سیکھنی پڑتی ہے ایسی ہی حالت آپ کی زبان کی بھی ہوگی ۔ کانگریس میں جو ہندی میں تقریریں ہوتی ہیں ان میں فارسی لفظوں کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ دیہات سے آنے والے ڈیلیگیٹس کے واسطے انگریزی اور ہندی دونوں زبانیں ایک سی ناقابل فہم معلوم ہوتی ہیں ۔ قومی محبت کی وجہ سے ہم یہ سب برداشت کر لیں گے ۔ لیکن کم از کم اپنی مشکل تو آپ کے سامنے پیش کریں گے اور کہیں گے کہ آپ کی زبان ہم سمجھ لیتے ہیں ایسا اگر آپ کا خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے ۔

" اور پھر یہ تو ساہتیہ پریشد ٹھیری ۔ اس میں تو آپ خوب ہی با محاورہ اور عالمانہ ہندی لفظ استعمال کریں ۔ مگر ۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر اس تنظیم کو کامیاب بنانا ہے تو آپ مہربانی فرما کر اپنی ہندی یا ہندوستانی ہمارے لئے جس طرح ہو سکے آسان کیجئے ۔ ہم سنسکرت

کے مرف دار نہیں بلکہ "ہندی یعنی ہندوستانی" کی ناکامی دور کرنا چاہتے ہیں۔

"میں نے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب ہماری اس مشکل کو محسوس کرتے ہیں اور ایسے آسان الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں جو ہماری سمجھ میں آنے والے ہوتے ہیں۔ اتنے دور رہتے ہوئی بھی رحم کی وجہ سے وہ ہماری مشکل سمجھتے ہیں اور اسے دور کرنے کی بس بھر کوشش کرتے ہیں"

کاکا کالیلکر صاحب نے جو باتیں اوپر کہی ہیں بالکل یہی باتیں اردو جاننے والے بھی کہنا چاہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں جہاں اوپر کی عبارت میں فارسی اور عربی کے الفاظ لکھے گئے ہیں وہاں وہ اس کی جگہ بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ درج کرنا چاہیں گے۔ میں نے کاکا کالیلکر صاحب کا خطبہ استقبالیہ ناگپور میں سنا تھا۔ ان کے خطبہ کا صرف وہ حصہ جس کا اقتباس میں نے اوپر درج کیا ہے ایسا تھا جس کے سمجھنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی ورنہ ان کا باقی تمام خطبہ میرے لئے ناقابل فہم تھا حالانکہ میں نہ صرف ہندی رسم خط جانتا ہوں بلکہ موجودہ ہندی کے اتنے الفاظ کا بھی مجھے علم ہے جن سے میں ہندی کے بہت سے مضمونوں کو سمجھ لیتا ہوں جب میرا یہ حال ہے تو ہندوستانی جاننے والے قوم پرستوں کو عام طور پر جو الجھن اور پریشانی ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قومی جلسوں کی تقریریں، قومی اخباروں اور رسالوں کے مضامین چند گنتی کے لوگوں کو چھوڑ کر باقی تمام ایسے لوگوں کے لئے جن کا شمار ہندی جاننے والوں میں کیا جاتا ہے بے نتیجہ اور بے اثر رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر دونوں طرف سے شکایت یکساں ہے تو اصل قصور کس کا ہے اور شکایت کی تلافی کی کوشش کسے زیادہ کرنا چاہئے۔

کاکا کالیلکر کے اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے رہنے والے اس زبان کو بھی جسے دہلی اور لکھنؤ کے عوام آسانی سے سمجھ سکتے ہیں سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ دکن کے رہنے والے جس زبان کو سمجھ سکیں اسی زبان میں لکھنا اور تقریر کرنا چاہئے۔ اگر اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر تو بڑی مجبوری ہو جائے گی۔ کیونکہ دکن کے رہنے والوں کا جب ہم نام لیں تو اس وقت ہمیں صرف سنسکرت کے پنڈتوں کو اپنے سامنے نہ رکھنا چاہئے بلکہ جیسے ہم نے دہلی اور لکھنؤ میں خواص اور

عوام دونوں کو اپنے سامنے رکھا ہے یہاں بھی ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ
دکن کے عوام میں بھی ہندوستان کے تمام دوسرے علاقوں کے عوام کی طرح ان سنسکرت کے لفظوں
کو سمجھنے والے لوگ جن کا آج کل کی جدید ہندی میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے بڑی تلاش کے
بعد دس بیس ہزار میں ایک دو ہی مل سکیں گے۔ اگر صورت یہ ہے تو کیا پھر ہمیں ایک قومی زبان
کا خیال ہی ترک کر دینا چاہیئے؟ اگر ہم واقعی ایک قومی زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو کسی
ایسی زبان کو ہی ہمیں سب لوگوں کی زبان بنانا پڑے گا جسے عوام اور خواص دونوں بہت آسانی
سے سمجھ لیتے ہوں اور کئی پیڑھیوں سے سمجھتے چلے آرہے ہوں۔ یہ زبان شمالی ہند کے لئے تو
ہندوستانی کے علاوہ اور کوئی دوسری زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ رہا جنوبی اور مشرقی ہند سو وہاں بھی
ریل کے سفر کی ترقی اور فیکٹریوں اور ملوں کے قائم ہونے کی وجہ سے اس زبان کے سمجھنے والوں کی
تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ صرف طبقہ متوسط کے سنسکرت پڑھے ہوئے کچھ لوگ ایسے ہیں
جنھوں نے اپنے والدین اور مدرسہ کے پنڈتوں کی تعلیم کے اثر سے ہندوستانی کو اشدھ سمجھ کر
اپنے آپ کو اس سے دور ہٹا لیا ہے۔ یہ لوگ اگر سنجیدگی کے ساتھ ذرا سی بھی توجہ کریں تو بہت
جلد ہندوستانی زبان میں مہارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنا تمام خطبہ اس
ہندی میں لکھا ہوتا جس میں انھوں نے وہ حصہ لکھا جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے تو انھوں نے
ہندوستانی کی بڑی خدمت کی ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ سوائے اس ٹکڑے کے ان کے خطبہ
استقبالیہ کے باقی تمام حصے بہت اوق ہندی میں لکھے گئے تھے۔ اچھی ہندوستانی زبان لکھنا
جانتے ہوئے بھی جب وہ قصداً ایسی ہندی لکھتے ہیں جسے سوائے ہندی ساہتیہ سمیلن کے وشاردوں،
ودیا النکاروں اور پنڈتوں کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تو اس میں قصور کس کا ہے؟

ہم نے شروع سے ہندوستان کے صوبوں کی زبانوں کے ادبی وفاق کی تحریک کا خیر مقدم
کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی قومیت کی ترقی میں یہ چیز بہت معاون ہو سکتی ہے۔
لیکن اس کے لئے ایسی "ہندی یعنی ہندوستانی" کو ذریعہ بنانا جس کے کاکا کالیلکر صاحب حامی ہیں

کبھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا یہ کام صرف "ہندوستانی" کے ذریعہ ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔

"ہندوستانی" کو اس کے صحیح اور اعلیٰ مرتبہ تک پہنچانے کے لئے ہمیں ہندی کے کارکنوں سے اپیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ ان سے ہمیں کوئی شکایت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس چیز کو ہم ہندوستان کے لئے صحیح اور مناسب سمجھتے ہیں اس کے لئے اپنے ہم خیال لوگوں کی ایک جماعت بنائیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کریں۔ اگر جس چیز کو ہم اچھا سمجھ رہے ہیں وہ واقعی اچھی ہے اور ہم ایمانداری کے ساتھ اس کے پھیلانے کی کوشش کریں گے تو ضرور وہ عوام میں وہ زیادہ مقبول ہوگی اور دوسروں کی کوششوں کا وہی حشر ہوگا جس کی وہ مستحق ہیں اور اگر اس کے برعکس ہماری کوششیں لغو اور فضول ہیں تو ہمیں اپنی ناکامی پر افسوس نہ ہوگا۔

مہاتما گاندھی کی "ہندی یعنی ہندوستانی"

(ذیل میں ہم مہاتما گاندھی کا وہ خطبہ درج کرتے ہیں جو آپ نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے صدر کی حیثیت سے ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں تقسیم کرایا تھا)۔

اس سبھا کا سبھاپتی بننا مجھے دینے کے کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھاویں گے۔

یدی ہم کشمیر نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہیں اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی یتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں؟

گجراتی اپنے پڑوسی مہاراشٹری کی بھاشا جاننے کا بھی پریتن کرتے دیکھنے میں نہیں آتے ہیں۔ ہندی جاننے والے بھی اردو لپی سیکھنے کا کشٹ کم اٹھاتے ہیں۔ اردو جاننے والے مسلمان کوچت ہی دیوناگری لپی پڑھنے کا اتھوا ہندی میں پرچلت سنسکرت شبدوں کے ارتھ جاننے کا کشٹ اٹھاتے ہیں۔ کہیں بھی دیکھیں وستو ستھیتی ایسی دیا جنک ہے۔ کسی کے دوش نکالنے کا یہ استھان نہیں ہے۔ دوش درشن میں ہمیں کچھ لابھ ہو سکتا نہیں۔ وستو ستھیتی جان کر اسے یتھا سمبھو مٹانے کے لئے ہی ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔

ودوان لوگ ایک دوسرے کے ساہتیہ کا کچھ گیان پاویں۔ اتنے ہی سے ہمیں سنتوش ہونے کا نہیں ہے۔ ہمیں تو دیہاتی ساہتیہ کی بھی درکار ہے اور دیہاتیوں میں آدھونک ساہتیہ کے

پرجا کی۔ شرم کی بات ہے کہ چیتنیا کی پرسادی بھارت ورش کے سارے بھاشا بھاشیوں
ترہ ویودھ کا نام تک شاید ہم سب نہیں جانتے ہوں گے۔ اتر بھارت کی جنتا تو اس سن
ہی نہیں۔ اس نے تھوڑے شبدوں میں جو گیان دیا ہے ویسا بہت کم سنت لوگ کر
بارے میں اس وقت تو تکارام کا ہی دوسرا نام میرے خیال میں آتا ہے۔

اگر ہم سارے ہندوستان کے ساہتیہ کے وشال کشیتر میں پرویش کریں تو کہ
سہامریادا ہونی چاہئے۔ میری درشٹی میں تو اوشیہ ہونی چاہئے۔ مجھے پستکوں کی سنکھ
کا موہ کبھی نہیں رہا ہے۔ پرتیک پرانت کی بھاشا میں لکھی اور چھپی پرتیک پستک کا پہچنے
سب بھاشاؤں میں ہونا میں آوشیک نہیں مانتا ہوں۔ ایسا پرتین یدی سمبھو بھی ہو تو اسے ہو
سمجھتا ہوں۔ جو ساہتیہ ایکتا کا، نیتی کا، شوریادی گنوں کا، وگیان کا پوشک ہے اس
پرتیک پرانت میں ہونا آوشیک اور لابھ دایک ہے۔

آج کل شرنگار یکت اشلیل ساہتیہ کی باڑھ سب پرانتوں میں آ رہی ہے۔ کوئی ت
تک کہتے ہیں کہ ایک شرنگار کو چھوڑ کر اور کوئی رس ہے ہی نہیں۔ شرنگار رس کو بڑھانے کے
ایسے سجن دوسروں کو "تیاگی" کہہ کر ان کی اپیکشا اور اپہاس کرتے ہیں۔ جو سب چیزوں
کر بیٹھتے ہیں وے بھی رس کا تو تیاگ نہیں کر پاتے کسی نہ کسی پرکار کے رس سے ہم سب بھو
دادا بھائی ناروجی نے دیش کے لئے سب کچھ چھوڑا تھا۔ وے تو بڑے رسک تھے۔ دیش سیوا
نے اپنا رس بنا رکھا تھا۔ اسی میں انہیں پرسنتا ملتی تھی۔ چیتنیا کو رسہین کہنا رس کو ہی نہ
ہے۔ نرسنگھ مہتا نے اپنے کو بھوگی بتایا ہے۔ یدیاپی وے گجرات کے بھگت شرومنی تھے آ
اکھرے تو میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میں شرنگار رس کو تچھ رس سمجھتا ہوں جب اس میں اشل
آتی ہے تب اسے سروتھا تیاجیہ مانتا ہوں۔ یدی میری چلے تو میں اس سنستھا میں ایسے
کو تیاجیہ منوا دوں۔ اسی طرح قومی بھیدوں کو دھرم اندھتا کو تھا پرجا میں اشتوادکیتوں میں
منسیہ کو جو ساہتیہ بڑھاتا ہے اس کا بھی تیاگ ہونا آوشیک ہے۔

پر کار یہ کیسے کیا جائے ؟ منشی جی اور کاکا صاحب نے ہمارا مارگ ایک حد تک صاف کر رکھا ہے۔ وہ ایک ساہتیہ کا پرچار وہ ایک بھاشا میں ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی بھاشا اپنہ بھاشا کی ایکشا منہدی ہندوستانی ہی ہے۔ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بھاشا میں فارسی محاورے کے شبدوں کا تیاگ نہ کیا جائے۔

انگریزی بھاشا کبھی سب پرانتوں کے لئے واہن (یا ماڈیم) نہیں ہو سکتی یدی ہم سچ مچ ہندوستان کے ساہتیہ کی ورودھی چاہتے ہیں بھن بھن بھاشاؤں میں جو رتن چھپے پڑے ہیں ان کا پرچار بھارت ورش کے کروڑوں منشیوں میں کرنا چاہتے ہیں تو ہم ہندوستانی کی معرفت ہی کر سکتے ہیں۔ اسی درشٹی سے منشی جی نے پرسدھ لیکھک پریم چند جی کی سہاتیا سے ماسک "ہنس" نکالا ہے اسے سمردھ بنانے کی کوشش کی ہے۔

میں نے تو تھوڑا ہی سے نکال کر اپنا ابھی پرایہ سنکشیپ میں بتایا ہے۔ سچا ابھی پرایہ تو یہاں جو ساہتیہ اچاریہ آئے ہیں۔ ان کا ہی ہو سکتا ہے۔ یدی آج کی سبھا کو ایک استھائی سنستھا میں پری نت ہونا ہے تو ساہتیہ اچاریوں کے دوارا ہی ہو سکتی ہے۔

دو رسالے اور ہندی اردو کا جھگڑا

(ذیل میں ہم اُردو اور ہندی کے جھگڑے پر رسالہ "ہندوستانی" اور رسالہ "ہمایوں" کے دو مضمونوں کے اقتباسات درج کر رہے ہیں۔ رسالہ ہندوستانی سے سنر کشن پرشاد صاحب کول کے اس مضمون کے اقتباسات لئے گئے ہیں جو "اردو ہندی اور ہندوستانی" کے عنوان سے اپریل ۱۹۴۳ء میں شایع ہوا ہے اور رسالہ "ہمایوں" بابت مئی سے میاں بشیر احمد کی اس تقریر کے اقتباسات جو انھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں سنائی تھی۔

اس سلسلے میں قارئین کو اُردو کے سچے بہی خواہ اور محسن مولوی عبدالحق صاحب، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی اس تقریر کی طرف بھی متوجہ کیا جاتا ہے جو صاحب موصوف نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں فرمائی تھی اور جو مئی کے ہمایوں میں شایع ہوئی ہے۔ نیز "بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت" کے عنوان سے جو مفصل مضمون آپ نے اُردو کے اخباروں اور رسالوں میں شایع کیا ہے وہ بھی پوری توجہ کا مستحق ہے)۔

اُردو ہندی اور ہندوستانی

اب عملی ضرورت کے پہلو سے غور کیجئے۔ اتنا بڑا ملک، مختلف نسلوں اور مذہبوں کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ، مختلف صوبوں میں بستے ہیں، اگر سارے ملک کی کوئی زبان نہ ہو تو تجارت اور کاروبار، عدالتوں کا کام، کونسلوں، کانفرنسوں اور جلسوں کی کارروائیاں اور تبادلۂ خیالات آخر کس طرح ہو۔ یا دوسرے ملکوں سے ربط و ضبط کس طرح بڑھے۔ کام کاج کس طرح چلے۔ اس کے لئے سارے ملک کی ایک زبان ہونا لازمی ہے۔ سو اس کا بھی فیصلہ سو برس ہوئے ہیں کہ غیروں کے قلم

سے ہو گیا اور فیصلہ بھی ایسا کہ جو بمنزلہ مقدر ہے کہ آپ مٹا نہیں سکتے۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان انگریزی عملاً ہو گئی اور ہم میں سے ہر ایک بادل خواستہ یا ناخواستہ اُسے سارے ملک کی زبان تسلیم کرتا ہے۔ ہماری تمام سیاسی اور سوشل زندگی کا دار و مدار اس پر ہے۔ یہ ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور جب تک ہندوستان میں انگریزی زبان کے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں اور میرے خیال میں خود مختاری اور آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یہ قائم رہیں گے اُس وقت تک انگریزی زبان ہی سارے ملک کی زبان رہے گی۔ اُردو یا ہندی اس کی جگہ نہیں لے سکتی محض اس وجہ سے کہ جن ضرورتوں کو جس خوبی اور آسانی کے ساتھ انگریزی زبان پورا کرتی ہے اُس کی اہلیت نہ ہندی میں ہے نہ اُردو میں اگر اُردو اور ہندی انگریزی کی جگہیں لے سکتیں تو کیا ممکن ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے ایک بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل یا تیلیگو کی جگہ لے سکے۔ ظاہراً تو سمجھ میں نہیں آتا۔ بنگالی زبان اور لٹریچر کا مرتبہ تو آج اُردو اور ہندی دونوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ گجراتی بھی ان دونوں میں سے کسی سے کم نہیں۔ مرہٹی تامل اور تیلیگو بھی اس مرتبہ پر پہنچ گئی ہیں کہ ان کو ہندی اور اردو سے کوئی خاص فیض نہیں پہونچے گا۔ اور چونکہ ان کی تمام سیاسی، سوشل اور کاروباری زندگی کی ضروریات ملکی، انگریزی کے ذریعہ سے پوری ہو رہی ہیں تو بنگال، بمبئی اور مدراس کے لوگ اپنی اپنی زبانیں چھوڑ کر ہندی اور اُردو کیوں سیکھنے لگے۔ آپ کو کون سی ضرورت ان زبانوں کے قبول کرنے پر مجبور کرے گی؟

مختصر یہ کہ جو بحث یہاں پیش کی گئی ہے اگر یک لخت رد کر دینے کے قابل نہیں تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سارے ملک کو نہ اردو کی ضرورت ہے نہ ہندی کی۔ نہ صرف یہی بلکہ اردو اور ہندی کے لئے سارے ملک میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور کچھ زمانہ بعد یہ کوشش ختم ہو کے رہ جائے گی۔ اردو اور ہندی کا مسئلہ صرف شمالی ہند تک محدود ہے اور محدود رہنا چاہئے۔ ان کی عملداری صوبہ سرحدی سے لے کر صوبہ بہار تک ہے۔ بہتر ہوتا کہ شمالی ہند میں بھی بجائے دو زبانوں کے ایک ہی زبان ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہونا تھا نہیں ہوا۔ پچھلے سو برس میں اُردو اور ہندی کا جس طرح علیحدہ علیحدہ نشو و نما ہوا ہے اس کو حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جا سکتا۔

ایک زبان قرار دینے کی کوشش نہ صرف دونوں زبانوں کو اپنی اپنی جگہ زیادہ مستحکم اور ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی جاتی ہے بلکہ قومی تعصب کے برافروختہ ہونے سے ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد میں بھی فرق پڑتا جاتا ہے چنانچہ ایک مرئی نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ پہلے جو ہندو بہ تعداد کثیر اُردو کی جانب مائل تھے وہ اب ہندی پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سوال یہ ہے کہ اگر شمالی ہند میں اردو اور ہندی دونوں برابر سے فروغ پاتی رہیں تو ہرج کیا ہے اور محض ایک ہی زبان رائج کرنے کی غرض کیا ہے؟ - اگر ایک زبان رائج کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں ربط و یگانگت بڑھے دونوں قومیں ایک دوسرے سے قریب آ جائیں، ان میں معاشرتی میل جول پیدا ہو، ان کے ادب اور تہذیب میں فرق باقی نہ رہے تو موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے اور اس ذہنیت کا لحاظ رکھتے ہوئے جو بدقسمتی سے اس وقت دونوں فریقوں میں نمایاں معلوم ہوتی ہے یہ غرض ایک زبان رائج کرنے کے اصرار سے بجائے پورے ہونے کے فوت ہوتی نظر آتی ہے۔ کم از کم پچھلے تیس سال کا تجربہ تو یہی ثابت کرتا ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں جو مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں ان میں ایک ہی معقول تجویز اس مسئلے کے حل کے متعلق پیش ہوتی ہے کہ جس سے وہ غرض جو ظاہرا ایک زبان رائج کرنے کی بتائی جاتی ہے بخوبی پوری ہوتی ہے لیکن اس تجویز پر افسوس ہے کہ اتنی توجہ نہیں کی گئی کہ جس کی وہ مستحق تھی۔ تجویز یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں شروع ہی سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی پڑھائی لازمی کی جائے۔ میں اس تجویز کی پوری تائید کرتا ہوں۔ اگر کوئی طریقہ ممکن العمل ایسا ہے کہ جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی زبان۔ لٹریچر۔ روایات۔ حسیات و جذبات سے واقف ہو سکیں اور ان میں ایک دوسرے کے طرزِ معاشرت سے یگانگت پیدا ہو۔ ایک دوسرے کی روایات و جذبات کا احترام اور رواداری مدنظر رہے تو وہ یہی طریقہ ہے۔ اسی کو ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ اس طرح ذہنیت کے بدلنے سے دونوں قوموں میں سیاسی و اقتصادی اغراض کی یکسانیت کا حس بآسانی پیدا ہو سکیگا۔ یہی ایک تجویز ایسی ہے کہ جس پر عمل کرنے میں ہندو اور مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے رہیں نصابِ تعلیم کی ترمیم کی دقتیں تو یہ ایسی نہیں کہ جو حل نہ ہو سکیں۔ کم از کم یہ ان دشواریوں کے مقابلے

یں کچھ بھی نہیں کہ جو اس وقت ایک زبان رائج کرنے کی کوشش میں پیش آ رہی ہیں اور جن کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو ایک زبان رائج کرنے کی ضرورت یا اس کے ممکن العمل ہونے کا قائل نہیں تاہم اگر ہمارے سامنے اس معیار کا رکھنا مناسب ہے، اگر یہ کسی طرح ممکن العمل ہو سکتا ہے۔ اگر تاریخ کا ورق پلٹا جا سکتا ہے اور کبھی کسی زمانہ میں جس کا اندازہ ابھی ہم نہیں کر سکتے شمالی ہند میں بجائے اُردو اور ہندی کے ایک زبان رائج ہو سکتی ہے تو اس کی داغ بیل اسی طرح ڈالی جا سکتی ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ہمارے مدرسوں میں لازمی قرار دی جائیں۔

ہندی اور اردو کی بحث سے قطع نظر کر کے اب ہندوستانی زبان کے مسئلہ کو لیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اردو میں سے فارسی اور عربی لفظ نکال دئے جائیں اور ہندی میں سے سنسکرت لفظ تو ہندوستانی زبان بن کر رائج ہو جائے گی۔ اس کے ثبوت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اب ہندوستان کے بڑے حصے میں ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے اور تقریباً تمام ہندوستان میں ہندوستانی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بیان ایک حد تک صحیح ہے لیکن صرف ایک حد تک یعنی ٹوٹی پھوٹی اردو اور بگڑی ہوئی ہندی، پنجاب میں پنجابی لب و لہجہ میں اور بہار میں بہاری تلفظ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ ہمارے صوبہ میں پوربی ضلعوں میں ایک قسم کی ہندی اور پچھمی ضلعوں میں ایک قسم کی اردو بولی جاتی ہے۔ اسی طرح دیہات میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ہندی سے ملتی جلتی ہے اور شہروں میں جس زبان کا استعمال ہے وہ اردو سے ملتی جلتی ہوتی ہے، تاہم جہاں تک بولی کا تعلق ہے آپ اس کو ہندوستانی بولی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح صاحب لوگ اور خانساماؤں اور بیراؤں کی بولی بھی ہندوستانی ہوتی ہے، اس ٹوٹی پھوٹی زبان کو بھی جو بمبئی یا کلکتہ وغیرہ کے اطراف میں مسافر اپنا مطلب نکالنے کے لئے بازاروں میں بولتے ہیں وہ بھی ہندوستانی کہلاتی ہے۔ اور اس معنی میں یہ کہنا کہ ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ٹھیک ہے لیکن بولی ایک چیز ہے اور ادبی اور علمی زبان بالکل دوسری چیز۔ جس وقت آپ یہ کوشش کریں گے کہ یہ ہندوستانی زبان ادبی اور علمی زبان قرار دی جائے لابدی طور پر وہ یا تو ہندی کی شکل اختیار کرے گی یا اردو کی۔ کیونکہ اس ہندوستانی بولی کی جس کو تمام

ملک کی زبان قرار دینے کا خیال بے حیثیت اور مرتبہ ہی زبان کا نہیں اور نہ اس میں زبان بننے کی اہلیت ہے۔ پچھلے پچاس برس میں اردو اور ہندی نے جس فضا میں نشو و نما پائی جس تہذیب معاشرت اور تمدن کی وکالت کے لئے انھوں نے زبان کھولی اس نے انھیں مجبور کیا کہ نئے نئے خیالات اور نازک ترین جذبات کے اظہار کے لئے نئے نئے علوم و فنون کی ترجمانی کی غرض سے اردو فارسی اور عربی سے اور ہندی سنسکرت کی مدد سے نئی نئی اصطلاحات، نئی نئی ترکیبیں اور محاورے گڑھے اور انھیں رائج کرے انگریزی سے بھی مدد لی۔ اس طرح سے دونوں زبانوں میں ارتقا ہوا۔ اور ان کا خزانہ ایک حد تک مالا مال ہوا۔ اب آپ کی کوشش یہ ہے کہ فارسی اور سنسکرت کی یہ اصطلاحیں، ترکیبیں اور محاورے جو دونوں زبانوں میں رائج ہو گئے ہیں ان کو خارج کیا جائے۔ تو کام کس طرح چلے گا۔ آپ زبان کو بجائے مالا مال کرنے کے اور کنگال بنائیں گے۔ اس سے زبان کی ترقی ہوگی یا تنزل؟ کہا جاتا ہے کہ بجائے فارسی اور سنسکرت کے ہندوستانی زبان میں انگریزی اصطلاحات اور محاوروں سے کام لیا جائے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اردو کا فارسی اور عربی سے اور ہندی کا سنسکرت سے تو کچھ واسطہ اور رشتہ بھی ہے، لیکن ہندوستانی زبان سے انگریزی کا کیا رشتہ ہے اور اس طرح جو زبان بنے گی اس کی صحت، لطافت اور پاکیزگی کا کیا حشر ہوگا۔ دنیا کی مستند زبانوں کی مجلس میں اس کی کونسی اور کہاں جگہ ہوگی۔ جو احباب "ہندوستانی" کی حمایت میں مضامین لکھتے ہیں وہ بھی ہندی یا اردو سے تجاوز کر کے ابھی تک "ہندوستانی" زبان کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔

اب تک اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا اُس سے غرض یہ تھی کہ اردو یا ہندی کی جگہ "ہندوستانی" زبان رائج کرنے کا خیال زبان کی ترقی اور نشو و نما کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا یا ایسا ہونا ممکن العمل بھی ہے؟ کیا ہندوؤں کی کثیر تعداد ہندی کو چھوڑنے اور مسلمانوں کی کثیر جماعت اردو کو الوداع کہنے کے لئے تیار ہے؟ پچھلے چالیس سال میں ایک زبان رائج کرنے کی تحریک نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے؟ کیا اس تحریک کا یہ اثر نہیں ہوا کہ ہر ایک فریق اپنی ہی زبان رائج کرنے اور اس کو ترقی اور اشاعت دینے پر زیادہ تُل گیا تو اب کس طرح امید کی جاتی ہے کہ 'ہندوستانی' کے رائج کرنے

کو خیال، نقار خانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت رکھے گا۔ بالفرض مان بھی لیا جائے کہ "ہندوستانی" رائج کرنے پر ایک کثیر جماعت راضی ہو جائے گی تو اس کے لئے رسم خط کون سا تجویز کیا جاتا ہے۔ فارسی یا ناگری۔ کیا اردو والے فارسی رسم خط کو چھوڑ کر ناگری کے اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے یا ہندی والے فارسی پر۔ اگر نہیں تو کیا رومن یا لاطینی رسم خط کیا جائے گا۔ کیا یہ مناسب یا ممکن ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ حال میں ترکی میں مصطفےٰ کمال نے حکومت اور قانون کے زور سے پوشاک میں ہیٹ، اور رسم خط لاطینی لازمی قرار دے کر رائج کر دیا ہے۔ اول تو معلوم نہیں کہ اس انقلاب کا آگے چل کر کیا حشر ہوگا اس کے علاوہ اس محکوم قوم میں کسی مصطفےٰ کمال کا نمودار ہونا بھی گمان غالب نہیں۔ جہاں تک میری عاجز رائے کام کرتی ہے میرے خیال میں تو اس ملک میں نہ ایک زبان کی ضرورت ہے، نہ ہندی اور اردو کی جگہ 'ہندوستانی' کا رائج کرنا مناسب ہے۔ نہ ان تینوں میں سے کسی ایک کا بھی سارے ملک کی زبان قرار پانا موجودہ فضا میں ممکن العمل ہے۔

ہماری قومی زبان

اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ہمارے ملک کی کوئی زبان ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ مدتوں سے واقعات کا گویا فطری طور پر یہ میلان رہا کہ اردو اس ملک کی قومی زبان بنے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کچھ مدت سے یہ بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ ملک کی قومی زبان کونسی ہو اور واقعات کو گویا مصنوعی طور پر اس طرح ڈھالا جا رہا ہے کہ اردو سے اس کا رتبہ چھین کر کسی دوسری زبان کو دے دیا جائے بلکہ ہو سکے تو بتدریج اردو کو مٹانے اور ملیامیٹ کرنے کی تدبیریں عمل میں لائی جائیں۔ ہندوستان کی جماعتوں میں جو قسم قسم کے اختلافات ہیں معلوم ہوتا ہے وہ کافی نہ تھے کہ وہاں یہ ایک اور نیا مناقشہ کھڑا کر دیا گیا ہے تاکہ قومی اتحاد اگر ممکن تھا بھی تو اسے ناممکن بنانے کی ایک اور صورت پیدا ہو جائے۔

جو ہندو اس ملک کو آریہ ورت بنانا چاہتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودگی سے "پوتر" نہیں رہا جو صرف بھیم اور ارجن اور کورو اور پانڈو کے قصے سنسکرت اور سنسکرت نما ہندی بھاشا میں

سنا سنانا چاہتے ہیں اور جو مسلمان اس ملک کو عربستان کی محض ایک زرخیز وادی تصور کرتے ہیں اور جو صرف متنبی اور ابوالعتاہیہ اور نظامی اور نظیری کے عربی اور فارسی اشعار ہی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں وہ نہ صرف ہندوستان کا بھلا نہیں چاہتے بلکہ وہ آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں ۔ اردو صحیح ہندو مسلم مفاہمت کی ایک بولتی چالتی تصویر ہے جسے دونوں فریق اپنے دل میں رکھ سکتے ہیں کہ "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی" اکبر مرحوم کی آواز ہر نیک نیت ہندو مسلمان کے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے کہ

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں — اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرء القیس بنیں — پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

اُردو کوئی مسلمانوں کی زبان نہ تھی۔ مسلمان جب پہلے پہل ہندوستان میں آئے تو ان کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ہندو مسلمانوں کا میل جول شروع ہوا تو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں میں، عربی فارسی کے الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے اور اسی سلسلے میں اردو وجود میں آئی ۔
جہاں جہاں مسلمان گئے انہوں نے بالعموم فارسی کو درباری اور دفتری زبان قرار دیا لیکن جوں جوں یہاں کے باشندوں سے ان کے تعلقات بڑھے انہوں نے روز مرہ کے استعمال کے لئے ایک ایسی زبان اختیار کی جس کی بنیاد ہندوانی اور جس کی باقی ساخت کچھ ہندوانی اور کچھ مسلمانی تھی، اس زبان کا رسم خط فارسی تھا لیکن اس کی قواعد اور اس کے لفظوں کا بیشتر ذخیرہ ہندوستان کی پیداوار تھی۔ سلیم مرحوم کے لفظوں میں گویا یہ نہ ہندو زبان تھی نہ مسلمان زبان بلکہ ایک ہندلمان یعنی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی اور ہندلمانیت کا سب سے بڑا مظاہرہ۔ اردو مسلمان حکمرانوں کی رواداری کی ایک روشن مثال ہے اور اردو ہی ہے جس کی فطری بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کی شاندار عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ملکی بھائی اس حقیقت سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں اور اس زبان سے جس سے انہیں اور ہمیں فطری طور پر لگاؤ ہونا چاہئے مصنوعی طور پر بیگانگی برت رہے ہیں۔ ہر سچے محب وطن کے لئے یہ امر انتہائی تاسف اور رنج کا باعث ہے ۔

ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اُردو کو چھوڑ کر جوق در جوق ہندی بھاشا کے حلقے میں داخل ہو رہی ہے

مسلمان اس کے جواب میں یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ پھر اپنی تمدنی زبان فارسی کی طرف منہ پھیر لیتے لیکن ایسا
کرنا ایک خلافِ فطرت مصنوعی فعل ہوتا۔ وہ بدستور اُردو کے حامی رہے اور رہیں گے۔ اگر بعض ہندو بھائی
کو اس سے انکار ہے کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے تو مسلمان ایک طرف اس بات پر اصرار
کریں گے کہ اُردو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زبان ضرور ہے اور دوسری طرف اس زبان
کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھیں گے تاکہ جب ہندو چاہیں بلا اجازت بخوشی پھر اس کے حلقے میں آ شامل
ہوں اور مدت کے بچھڑے ہوئے پھر مل جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے
ہندوستانیوں کی ایک مضبوط اور منظم قوم پیدا ہو۔ اس قومیت میں ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی
تہذیب کے اجزا شامل ہوں بلکہ حال کی مغربی تہذیب کا بھی ایک جزو ضروری حد تک اس میں
موجود ہو۔ لیکن اگر ہمارے ملکی بھائی ہمیں ہمارا مناسب حصہ دینے پر راضی نہ ہوں یا ان کی اکثریت
ہماری تہذیب کی روایات کو محض اجنبی سمجھ کر ملک بدر کرنا چاہے تو بدقسمتی سے ہمیں اپنے آپ کو
ایک جداگانہ قوم تصور کرنا پڑے گا جس کا مذہب جدا، بعض روایات جدا اور زبان بھی ایک حد تک
جدا ہوگی۔ خدا کرے یہ جدائی تھوڑے عرصے کے لئے ہو۔ خدا کرے جلد ہی ہم اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اور
وہ ایک دوسرے کے پڑوسی اور بھائی بھائی ہیں ہم ایک ہی سرزمین کے رہنے والے اور ایک ہی
میٹھی سی بولی بولنے والے ہیں۔

تیس چالیس سال ہوئے اُردو کے مقابل میں ہندی کا نام بہت کم سننے میں آتا تھا۔ بنگالی
گجراتی، سندھی کی طرح ایک زبان یہ بھی تھی کہ ایک مخصوص گروہ کی زبان تھی۔ مالوی جی نے ایک منصوبہ
تیار کیا جس کے ماتحت ان ہندوؤں کو جو اُردو لکھتے پڑھتے تھے اُردو کو چھوڑ کر ہندی لکھنے پڑھنے
کی ترغیب دی۔ انھیں بتایا کہ وہ ہندو ہیں تو انھیں صرف ہندوستان کی 'اپنی' دیسی چیزوں کو اختیار
کرنا چاہئے، قدیم ہندوانی تہذیب ہندی زبان، ہندی رسم خط کر یہی صحیح ہندویت اور یہی صحیح حب الوطنی
ہے۔ یہ وہ بھول گئے کہ قدیم ہند کی طرف رجوع کرنے میں وہ پورے ایک ہزار سال اور کم از کم آٹھ دس
کروڑ مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں وغیرہ پرسے گویا پھاند رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں کہ یہ لوگ کبھی یہاں

آئے ہی نہ تھے۔ اس اربابی کوتاہ اندیشی کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ ہے کہ ہندو قوم ایک اعلیٰ درجے کی قدیم تہذیب کی مالک تھی۔ حالات ایسے ہوئے کہ مسلمان اس ملک پر حملہ آور ہوئے اور صدیوں تک یہاں حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں زوال کی علامتیں ظاہر ہوئیں اور ایک اور اجنبی قوم سات سمندر پار سے آکر ہندو مسلمانوں پر مسلط ہو گئی۔ ہندو کچھ دیر کے بعد ابھرے مسلمانوں پر ابھی غفلت طاری تھی۔ خیالی جمہوریت کی آوازیں سنائی دینے لگیں معلوم ہوا کہ اب کثرت کی حکومت آنے والی ہے۔ ہندوؤں کی کثرت تھی، ان کے پاس روپیہ تھا، وہ نئی تعلیم پا رہے تھے، ایک مشترک قابل حصول نصب العین کا احساس کرتے ہوئے وہ منظم بھی ہو رہے تھے، اس کے مقابل میں مسلمان ابھی خواب خرگوش میں تھے۔ اس حال میں قدرتی بات تھی کہ ہندوؤں کی اکثریت کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ ہمارا ملک ہے، صدیوں ہم اجنبیوں کے زیر اثر رہے، اب ہم زیادہ قابل اور زیادہ ہوشیار ہیں اور اس لئے ہم ہی خوشحالی اور ترقی اور حکومت اور آزادی کا زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔ یہ مان لیا کہ ایسا محسوس کرنا ایک قدرتی بات تھی لیکن غور کرو تو واضح ہو جائے گا کہ یہ عقلمندی نہ تھی، دور اندیشی نہ تھی، اس میں ہندوستان کی بلکہ بالآخر خود ہندوؤں کی بہتری نہ تھی۔ آٹھ کروڑ انسانوں کی طرف سے آنکھ کان بند نہیں کئے جا سکتے خواہ وہ کاہل یا نادار ہی کیوں نہ ہوں۔

دنیا کا مستقبل قومیت کے ہاتھوں میں نہیں، بین الاقوامیت اور انسانیت کے ہاتھوں میں ہے ہندوستان کو یہ زریں موقع حاصل ہے کہ یہاں ایک نہیں کئی قومیں پہلو بہ پہلو آباد ہیں۔ کئی تہذیبیں ہیں، کئی زبانیں ہیں ان حالات میں رواداری اور بلند نظری برتنی چاہئے تاکہ یہ ملک قومیت کی خطرناک منزل کو پھاند کر صحیح انسانیت کی راہ پر لگ جائے۔ یہاں کی تہذیب اور یہاں کی زندگی میں اسلامی اور ہندوانی اور مغربی تہذیب کا ایک شاندار ملاپ ہو جسے دنیا رشک کی نظروں سے دیکھے!

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال (خدا کرے عارضی طور پر) صورت حالات کچھ اور ہے، فی الحال ہمارے ملکی بھائیوں کی اکثریت بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت بھی ایک ایسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہندی والے اردو کے دائرے میں برسوں سے اپنی نشر و اشاعت کے سلسلے

مُسلمانانِ ہند کے لئے آیندہ راہِ عمل

(بسلسلہ سابق)

ہندوستان کے پیشوں کی جو طویل فہرست ہم نے اوپر دی ہے اس میں مسلمان دوسرے فرقوں کے دوش بدوش تقریباً ہر پیشہ میں موجود ہیں لیکن ان کی نمائندگی بڑھنے کی جگہ برابر کم ہوتی جا رہی ہے ۔ ہر جگہ ان کے پاؤں جمے ہوئے نہیں بلکہ اکھڑے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی گرفت مضبوط نہیں بلکہ ڈھیلی ہو رہی ہے ۔ یہ حملہ نہیں بلکہ مدافعت کر رہے ہیں ۔ یہ اپنے پیشرؤوں کی جگہ لینے آگے نہیں بڑھتے، ایک سیڑھی اور اونچا نہیں اٹھتے بلکہ اپنی سیڑھی پر قائم رہنا چاہتے ہیں یا دھکا کھا کر نیچے گرنے کی طرف مائل ہیں ۔ نیچے گرنے کے بعد بھی یہ اپنا پاؤں جما نہیں پاتے بلکہ یہاں بھی اکھڑے ہوئے پاؤں کے ساتھ مقابلہ شروع کرتے ہیں اور بلند مقام کی صاف فضا کے مقابلہ میں یہاں کی فضا میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے ۔ یہاں دماغی مقابلہ کم اور جسمانی مقابلہ زیادہ ہونے لگتا ہے ۔ لوگوں کے دھکوں سے جوڑ جوڑ ہلنے لگتا ہے اور بدن پکے پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے ۔ لیکن مقابلہ اور مسابقت کی بے رحم قوتیں اپنا عمل جاری رکھتی ہیں ۔ یہاں تک کہ بھک منگوں، لولوں، اپاہجوں، دائم المریضوں کے گروہ میں شامل ہونے کے لئے لوگ مجبور ہو جاتے ہیں اور یوں اپنی ناکارہ زندگی کو سسک سسک کر ختم کرتے ہیں اور اپنے سے زیادہ نکمی اولاد چھوڑ کر سوسائٹی کی تندرستی کو زہر آلود کرتے ہیں ۔

لکھنؤ اور دہلی اور دوسرے قدیم مسلم شہروں کے شاہی خاندانوں، نوابوں، امیروں، سپہ سالاروں، صوبہ داروں، فوجداروں، عالموں، محدثوں، فقیہوں، قاضیوں، مفتیوں، طبیبوں، مورخوں، مصنفوں اور صوفیوں کی اولاد کو چھوڑیئے وہ تو کبھی کی تباہ ہو چکی اور ان کا مرثیہ و ماتم کرنے والے بھی خاک کا پیوند بن چکے ۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کے کونہ کونہ میں اعلیٰ اور ممتاز

عہدوں پر مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے۔ دنیا کے سب عیش و آرام، حکومت و اقتدار صرف انھیں کو حاصل تھے۔ وہ راجاؤں کے راجہ، غاصبوں کے غاصب جابروں کے جابر اور ظالموں کے ظالم تھے۔ بد ھر نکل جاتے تھے سب کے سر ان کے سامنے خم ہو جاتے تھے۔ سب کے زر و مال اور اندوختے ان کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتے تھے۔ ان کا عیش سب کے عیش پر مقدم تھا وہ زمانے تو مدت ہوئی دفن ہو چکے اور اچھا ہوا کہ دفن ہو چکے۔ حکومت و سلطنت اور مطلق العنان استبداد کے زمانہ کا ذکر نہیں سوال تو زمانہ محکومیت کا ہے۔ سر سید کی تحریک کے بعد کے زمانہ کا ہے اس زمانہ کا جس نے مسلمانوں میں خفیف سے بیداری پیدا کر کے انھیں ظلم پر نہیں بلکہ اپنے جائز حقوق کے مطالبہ پر آمادہ کیا تھا اور جس کی وجہ سے کہیں کہیں مسلمان ججوں، کلکٹروں، ڈپٹی کلکٹروں، بیرسٹروں، وکیلوں، ڈاکٹروں، انجینیروں، پروفیسروں، اڈیٹروں اور مصنفوں کی صورتیں نظر آنے لگی تھیں ملوں کے مالکوں بڑے بڑے تاجروں اور ٹھیکیداروں میں بھی مسلمان نظر آتے تھے۔ اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کو پبلک لائف میں ایک خاص وقعت اور اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور برادران وطن ان کے اشتراک عمل کے لئے کانگریس لیگ اور خلافت کی حمایت جیسے سمجھوتوں پر منت و خوشامد کے ساتھ تیار رہتے تھے۔ سوال تو اس قریبی زمانہ بلکہ آج کا ہے یعنی آج جو پرانی نسل کے اول درجہ کے مسلمان اپنی عمر طبعی پوری کر کے موت کے آغوش میں جا جا کر سو رہے ہیں ان کی جگہ لینے والے کون پیدا ہو رہے ہیں؟ زمانہ ایسے سائنس دانوں صنعتی ماہروں اور ہر قسم کے انجینیروں کو پکار کر بلا رہا ہے جو قوم کی معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکیں۔ کتنے مسلمان اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے بڑھ رہے ہیں؟ زمانہ سرمایہ کی قوت و اقتدار اور اس کی عالمگیر حکومت کا ہے کتنے مسلمان اس نئی شہنشاہیت میں شریک ہونے کا دعوے کر سکتے ہیں؟ یا یہ نہیں تو زمانہ مزدور کی فتح و نصرت اور عروج و کامرانی کا ہے کتنے مسلمان مزدور اپنی تقدیر کی ان بیداریوں کے خیر مقدم کرنے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں؟

"آپ اپنے محلہ اور قصبہ میں غور سے نگاہ ڈالئے۔ آپ کے علم میں کوئی کوتوال انسپکٹر تھانہ دار

ڈپٹی کلکٹر، تحصیلدار، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، منصف صدر اعلیٰ جج مختار وکیل بیرسٹر آنریری مجسٹریٹ رہتا ہو۔ تو ملاحظہ کیجئے کہ اس کی اولاد، بیٹے پوتے نواسے اپنے بزرگوں کے رتبہ کو پہنچے ہیں کہ نہیں محلے شہر قصبہ میں ہر طرف غور سے نگاہ دوڑائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر کی اولادیں تباہ حال ہیں۔ ان کے بیٹے آٹھویں درجہ سے آگے بڑھے ہوئے نہیں ملیں گے حالانکہ قدرت نے انہیں بیرسٹر اور انجنیر بننے کا موقع دیا تھا۔ کوتوال کے بیٹے اور پوتے چپلائی کرتے ملیں گے۔ نینی تال کے مشہور آنریری مجسٹریٹ کے صاحبزادے گھڑیاں صاف کرتے ہوئے ملیں گے۔ ریاست رامپور کے مشہور ہیڈ ماسٹر کے صاحبزادے کسی دفتر میں کاغذ گھسیٹتے ملیں گے۔ مراد آباد کے ایک مسلمان سب جج کے بیٹے پوتے کچہری میں اس انتظار میں کھڑے ہوئے ملیں گے کہ کوئی شخص چار آنے پیسے دے کر ان کی جھوٹی گواہی کرالے یا محکمہ رجسٹری میں شناخت کرالے۔ مراد آباد کے سب سے بڑے اور سب سے مشہور نواب کا پوتا کچہری میں بیٹھے عالوں سے عرضی نویسی کرتا ملے گا یا مراد آباد کے کانجی ہوس کا محرر ملے گا۔"

اس کے برعکس دوسری طرف "ہندو پٹواریوں کے لڑکے قانونگو نائب تحصیلدار، مختار، وکیل، بیشکار ہیں۔ ہندو مالیوں کے لڑکے بی۔ اے ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ ہیں۔ چار روپے کے بچے ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ہندو چاٹ بیچنے والوں کے لڑکے منصف، سب جج اور آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ ہندو چپراسیوں کے لڑکے سو روپیہ پانے والے بابو ہیں۔ غرض ہر ہندو بھائی کا لڑکا ترقی کی دھن میں اپنے ماں باپ سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہندو تحصیلدار کا لڑکا ڈپٹی تو ہو سکتا ہے لیکن نائب تحصیلدار نہیں ہو سکتا۔ ہندو پارسی انگریز بھائی کی آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی ہیں۔ اسٹیشن پر ایک دن ماتا دین قلی نے مجھ سے کہا کہ میرا بچہ بنارس یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے اور وہیں مراد آباد کے مشہور سب انسپکٹر ساکن شیدی سرائے نے فرمایا کہ میرا بچہ نہیں پڑھتا مجبور ہو کر میونسپلٹی کے اسکول صنعت و حرفت میں ڈال دیا ہے۔ قلی کا بچہ بی۔ اے ہوگا اور سب انسپکٹر کا بچہ مراد آبادی برتن مزدوری پر بنائے گا۔" ہندوستان کے تمام سرکاری محکمے ہندو بھائیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں صرف قلی چپراسی، خانساماں

چوکیدار تو مسلمان ہیں باقی سب ہندو بھائی ہیں:" "ہر تعلیم یافتہ ہندو بھائی گورنر بننے کی کوشش میں ہے ہر پہلے پڑھا ہندو بھائی تجارت کر کے کروڑ پتی بننے کی تاک میں ہے۔ مسلمان پھاوڑہ کلہاڑی اور تیشہ بنوانے کی فکر میں ہے۔ انجام یہ ہو رہا ہے کہ ہندو بھائی گورنر اور کروڑ پتی بن رہے ہیں اور مسلمان تانگہ والے، بہشتی، بھانڈ، گویّے، تیلی، جولاہے ہیں اور ابدالآباد تک یہی رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میر صاحب، شیخ جی، خانصاحب پیوند لگے، میلے گندے کپڑے پہنے کئی وقت کے فاقہ سے مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہاں حقہ کا دم لگاتے ہیں، وہاں قرض ادھار مانگتے پھرتے ہیں:

"ایک ایک ضلع میں مسلمانوں پر اسّی اسّی لاکھ روپیہ قرض ہے اور دس لاکھ روپیہ سالانہ مسلمان بنیوں کو سود میں دیدیتے ہیں۔" "پندرہ سولہ لاکھ روپیہ سالانہ کی جائیدادوں کا نیلام میری آنکھوں کے سامنے ہر ۲۰ تاریخ کو ہوتا رہتا ہے۔ جتنے اسے حزیقے رہتے ہیں اور میں دیکھا کرتا ہوں۔ لاکھوں روپے کی ڈگریوں میں مکانوں کے جو برتن اور پلنگ بسترے اور کپڑے ہر سال نیلام ہو جاتے ہیں وہ علیحدہ ہیں۔" "میں نے اکثر موقعوں پر دیکھا ہے کہ بعض مسلمان زمیندار یا حاکم کو بھی اپنی مرضی کے خلاف کام کرنا پڑتے ہیں کیونکہ بنیا اپنے قرضے کے دباؤ سے مسلمان قرضدار زمیندار مجسٹریٹ سے جو چاہتا ہے کرا لیتا ہے۔ اپنے موافق فیصلہ کرا لیتا ہے۔ سفارش کراتا ہے تو ماننی پڑتی ہے جھوٹی گواہی دلاتا ہے تو دینی پڑتی ہے سچی گواہی دینے کو منع کرتا ہے تو مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے مسلمان قرضدار ممبر اور چیرمین اپنی مرضی اور انصاف کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سارے ہندوستان میں آپ کو مرغ باز سب کے سب بلا کسی استثنا کے مسلمان ملیں گے۔ بٹیر باز سب مسلمان ہیں اسّی اسّی برس کے بوڑھے سفید داڑھی والے بندگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ پتنگ باز، تیتر باز، شرابی، افیون کوکین کھانے والے، جواری، زانی، رنڈی باز ایسے چودھری اور پنچ جو تصفیہ کا نصف روپیہ خود لیتے ہیں۔ اگر تصفیہ نہیں ہوتا تو عدالت میں مقدمہ لڑوا دیتے ہیں وکیلوں کا اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ ممبری کے انتخاب کے موقع پر ممبر صاحب سے روپیہ لے کر غریبوں سے زبردستی ووٹ دلاتے ہیں۔ یہ سب لوگ مسلمانوں میں ہی ملتے ہیں۔"

بجگی۔ اب بھی گورنمنٹ کی سرپرستی سو حکام گورنمنٹ ملازمتوں میں ان کے مناسب حق کو تسلیم کرکے
احکام جاری کرتے ہیں۔ مگر غالب جماعت کی قوت اور اس کے عادی ہونے کی وجہ سے ایسے احکام
پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا جو مسلمانوں کے مفید مطلب ہیں اور اگر کچھ ہوتا ہے اور چند مسلمانوں کو برادران وطن
کی مرضی کے خلاف سرکاری محکمہ جات اور دفاتر میں کچھ جگہیں مل جاتی ہیں تو فرقہ وارانہ بدمزگیوں کی وجہ
سے مسلمانوں کی محدود تعداد نرغہ میں پڑ جاتی ہے اور ان کی زندگیاں تلخ ہو جاتی ہیں۔ ان کی ترقیاں
مسدود ہو جاتی ہیں۔ ذرا ذرا سی لغزشوں پر جوابات طلب ہوتے ہیں۔ مقدمات قائم ہو جاتے ہیں اور
بہت سوں کو بیک بینی و دو گوش گھر کی راہ لینی پڑتی ہے اور لطف یہ ہے کہ مسلمان ملازموں کی بے کسی
کی یہ حالت اقلیت کے صوبوں میں ہی نہیں بلکہ ان صوبوں میں بھی ہے جہاں ان کی تعداد برادران
وطن سے زیادہ ہے۔"

صنعت و تجارت کی حالت بیان کرتے ہوئے کمیٹی نے کہا کہ صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی مردم شماری
پندرہ فی صدی ہے مگر وہاں مسلمان کاریگر چوالیس فی صدی ہیں۔ اسی طرح ہر صوبے میں مسلمان کاریگروں
کی تعداد ان کی مردم شماری کی نسبت سے زیادہ ہے۔ اس لئے ہندوستان کی صنعت ٹوٹنے سے
سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ پھر سود کے جدید قانون سے جو ۱۸۵۵ء میں جاری ہوا سود پر
سے تمام قیود اٹھا دی گئیں گراں شرح سود اور سود در سود سے مدیون برباد ہو گئے۔ ہر قسم کی تباہی کے
بعد اب بھی ملک میں جو صنعت بہتر سے بہتر ہے اس میں مسلمانوں کا حصہ نمایاں ہے۔ کشمیر میں شال،
لکڑی اور چینی کا کام ہوتا ہے جس کی شہرت یورپ تک ہے وہ سب مسلمانوں کا ہے۔ مگر کیفیت یہ ہے کہ
وہاں مسلمان کاریگر مثل کولہو کے بیل کے کام کرکے مفلس اور قلاش رہتے ہیں اور ان کی محنت مشقت
اور عرق ریزی کے پھل دیگر اقوام کے سرمایہ دار اور دوکاندار کھاتے ہیں۔ یہی حال بنارس، دہلی، علی گڑھ
مراد آباد بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان کاریگروں کا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں مسلمان پارچہ بافوں کی تعداد
آبادی کے تناسب سے دوگنی مگر بزازوں کی تعداد دیگر اقوام سے نصف تھی۔ مسلمان لوہار جو ہتھوڑا چلانے
میں جان کھپاتے ہیں اپنے تناسب سے دوگنے مگر لوہے کی دوکان کرکے اس سے نفع اٹھانے والے

اپنے تناسب سے آٹھویں حصے سے بھی کم تھے مسلمان تیلی اپنے تناسب سے اٹھارہ گنے مگر تیل کی تجارت
کرنے والے ایک ثلث سے بھی کم تھے۔ پنجاب میں بالعموم کھتریوں کی قوم سرمایہ دار ہے چنانچہ ۲۲۹
کھتریوں کے مقابلہ میں صرف ۶ مسلمان شیخ بڑے کارخانہ دار نظر آتے ہیں درآنحالیکہ شیخ کاریگروں کی
تعداد کھتریوں سے دوگنی ہے۔ پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد تقریباً مساوی ہے مگر روپے
کے کاروبار میں مسلمان نادار ہیں۔ البتہ دلالی اور روپیہ کے ادنیٰ کاروبار میں ان کی تعداد تیرہ ہزار کے
قریب تھی۔ اس کے مقابلہ میں ہندو ساہوکاروں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی جو مسلمانوں سے ۱۲ گونہ ہے۔
زمینداری اور کاشتکاری کے عام انحطاط کے متعلق بیان کرتے ہوئے کمیٹی نے بتلایا کہ کس طرح
مسلمان زمیندار ساہوکاروں کے پنجے میں گرفتار ہیں اور سرکاری محاصل اور مقدموں کی پیروی کے خرچ
اخراجات ان کا خون چوسے ڈال رہے ہیں۔ پھر انڈیا ان ۱۹۳۰ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دیہاتی
آبادی کی بہت بڑی اکثریت ہمیشہ اس حالت میں رہتی ہے کہ اسے محض قوت لایموت مل سکتا ہے اور
زراعتی مزدوروں کی حالت تو غالباً سب سے زیادہ بدبختی کی ہے۔ کمیٹی تحقیقات بنک نے ۱۹۲۲ء کے
اعداد کی بنیاد پر لکھا تھا کہ ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ آمدنی فی کس آٹھ پونڈ اور کاشتکار کی تین
پونڈ یا ۴۲ روپیہ سالانہ ہے۔ اسی کے ساتھ کمیٹی مذکور نے کاشتکاروں کے مجموعی سودی قرضہ کی مقدار
نو ارب بتائی ہے جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

مندرجہ بالا بیانات اگر صحیح صورت حال کو ظاہر کرتے ہیں تو مسلمانوں کی معاشی محرومیاں اور بدنصیبیاں
سب سے اول لائق توجہ ہیں۔ ان محرومیوں میں کچھ ایسی ہیں جن میں مسلمان اپنے دوسرے ہموطنوں کے ساتھ برابر کے شریک
ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان میں مسلمانوں کی تاریخی روایات، رسم و رواج عادات و اطوار
اور تمدن و معاشرت کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے جو تجاویز تمام ہندوستان کے لئے بنائی جائیں ان کا مسلمانوں کے لئے
یکساں طور پر مفید ہونا لازمی نہیں ہے۔ ان کے مخصوص حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لئے چند ایسی
تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی جو صرف انہیں کے لئے مخصوص ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے لئے ملک کے
تمام دوسرے فرقوں سے علیحدہ ایک راہ عمل دریافت کرنے کی جستجو کر رہے ہیں۔ (باقی)

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اُردو اکادمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مندرجہ ذیل کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اراکین اردو اکادمی اپنے حساب میں طلب فرما سکتے ہیں۔

ترجمان القرآن (جلد دوم) از مولانا ابو الکلام صاحب آزاد

قیمت بلا جلد [illegible] ۔ مجلد [illegible]

مختصر تاریخ ہند ۔ از سید ابو ظفر صاحب ندوی۔ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ

قیمت [illegible]

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۔ از مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

قیمت [illegible]

مقالاتِ شبلی جلد پنجم ۔ (تاریخی) شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

قیمت [illegible]

انقلابِ روس ۔ از کشن پرشاد صاحب کول۔ شائع کردہ۔ ہندوستانی اکیڈمی۔ الہ آباد

قیمت [illegible]

جوشِ فکر ۔ مجموعہ مضامین سید سلطان حیدر صاحب جوش

قیمت [illegible]

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۶ | جون ۱۹۳۶ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

اس سال کا خوبصورت تحفہ

سال گرہ نمبر ۱۹۳۶ء

پیامِ تعلیم کے سال گرہ نمبر کی تیاری ابھی سے شروع ہو گئی ہے جن بچوں نے پچھلے سالوں کے تاسیس نمبر دیکھے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ خاص نمبر ہم کس اہتمام سے نکالتے ہیں پچھلے تاسیس نمبر ۳۵ء کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمیں بادلِ ناخواستہ بچوں کی بے شمار درخواستیں واپس اور اخباروں کے ایجنٹوں کی بہت سی فرمائشیں منسوخ کرنا پڑیں۔ اس سال ہمارا تاسیس نمبر اللہ نے چاہا پچھلے سال کے خاص نمبروں سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ اس مرتبہ ہم نے اس کی قیمت ۱۲ر رکھی ہے لیکن خریداروں سے اس کی زائد قیمت نہیں لی جائے گی تم یہ نمبر حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ابھی سے رسالے کے خریدار ہو جاؤ یا (عہ) کے ٹکٹ بھیج دو۔ اس خاص نمبر میں اشتہار بھی چھپ سکتے ہیں لیکن صرف وہی جو بچوں کی دلچسپی اور فائدے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایجنٹ حضرات کو ابھی سے باخبر رہنا چاہئے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

ماتمِ انصاری

یہ جوشِ نالۂ غم یہ نوائے گریہ و زاری ؏ رہے گی چشمِ ملت حشر تک وقفِ گہرباری

قیامت تک وطن کو خون کے آنسو رلائے گی ؏ پئے یارانِ ہمدم آپ کی یہ گرم رفتاری

ضرورت تھی کہ "انصاری" [illegible] ؏ جہاں تھے بزم آرا خلد میں "یارانِ انصاری"

کہیں ہیں کارفرما اجمل و جوہر کہیں شبلی ؏ وہاں بھی ہے "امیرِ وفد" کے مقدم کی تیاری

ہیں نورِ چشمِ ماہ آنکھیں آج ان ترکی شہیدوں کی ؏ کہ جن کی نزع کے عالم میں کی تھی تم نے دلداری

یتیموں اور بیواؤں کے غمخوارانِ رفتہ سے ؏ مگر لینے گئے ہیں آپ دادِ بیکسی غمخواری

سکوں ناآشنا دل درد سے ہر دم تڑپتا تھا ؏ کہ تھے تم آشنائے لذتِ دردِ دلِ افگاری

مریضِ قوم کے حق میں دکھائی تھی مسیحائی ؏ دمِ عیسیٰ سے بڑھ کر آپ کی وہ نرم گفتاری

گوارا تھا نہ تم کو اس غلام آباد میں جینا ؏ وطن کی اس فضا سے تھی تمہیں از بسکہ بیزاری

بالآخر ہو گئے آزاد تم زندانِ ہستی سے ؏ زمانہ کو دکھا دی مر کے تم نے شانِ خودداری

مدام اے روح تک تڑپا کیا دل دردِ ملت سے ؏ وطن کے غم میں وہ آنکھیں رہا کیں وقفِ خونباری

جہادِ حریت کے آپ وہ تنہا مجاہد تھے ؏ صفِ اعدا کو اب تک یاد ہے جس کی جگرداری

وہ پھونکی روح تم نے قالبِ بے روحِ ملت میں ؏ کہ دوڑی ذرہ ذرہ کی رگوں میں برقِ بیداری

جسے دیکھا اسے حبِ وطن سے چور کر ڈالا ؏ مرے ساقی کی چشمِ مست کی اللہ رے سرشاری

ابھی کل تک امیرِ عسکرِ احرارِ ملت تھے ؏ مبارک اب شہیدانِ وطن کی تم کو سرداری

ترے ہی دم سے قائم تھا وقارِ مجلسِ ملی ؏ ترا ہی فیض تھیں خاکِ وطن کی عظمتیں ساری

اسی جنسِ گراں کی تھی طلب ہیہات زمانہ کو ؏ تجھی سے تھی متاعِ حریت کی گرم بازاری

قیادت کی قبا بس تیرے قد پر راست آتی تھی ؏ ترے ہی سر پہ زیبا تھی کلاہِ فخرِ مختاری.

رہے گی بارِ احساں سے ترے خم گردنِ ملت ۔ نہ لائے گی کبھی یہ ناتواں تابِ گرانباری

سہے گی جامعہ اب عمر بھر صدمے یتیمی کے ۔ رہے گی سوگوارِ ماتمِ حب الکلو انصاری

ودیعت ہے ترے آغوش میں اے خاکِ ملیہ[1] ۔ شبستانِ وطن کا آفتابِ صبحِ بیداری

نہ پھر چمکے گا یہ لیکن وطن کے ذرہ ذرہ میں ۔ رہیں گی اس کی کرنیں حشر تک گرمِ ضیاباری

پیامِ آفریں اے سرفروشِ مشہدِ ملت ۔ سلامِ آخریں اے سرفرازِ رحمتِ باری

وداع اے ساکنِ "دارالسلام" اے عازمِ جنت ۔ فراق اے طائرِ سہنہ داستانِ عہدِ بیداری

تمھیں اس دور میں سب چارہ سازِ دردِ ملت تھے
تمھیں اس عہد میں نازِ وطن تھے، فخرِ امت تھے

[1] جامعہ ملیہ ۔

شمالی ہندوستان کے دیہات کی زبان

پورے سے ہندوستان کا کوئی اخبار یا رسالہ، دفتر یا دکان، کالج یا مدرسہ ایسا نہیں جہاں یہ گفتگو نہ ہو "ہماری اصلی زبان تو ہندی ہے اور مسلمانوں نے ناحق اُردو اُردو کا شور مچا رکھا ہے" یا یہ کہ "ہندوستان" کی زبان سوائے اُردو کے دوسری نہیں ہو سکتی کیونکہ صرف اسی میں مشترکہ زبان (لنگا فرینکا) کہلانے کی تمام خصوصیتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں" وغیرہ وغیرہ جب سے گائے کی قربانی اور مسجدوں کے سامنے باجے بجنے کے سوالات مدہم ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک کے سارے نوجوان پہلوانوں اور سیاسی لڑنت کے چالاک استادوں نے اپنا اکھاڑہ اس نئے میدان میں لا جمایا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس نئے اکھاڑے میں وہ داؤں گیر بھی خم ٹھونک کر اترنا شروع ہو گئے ہیں۔ جو پہلے دنگلوں میں صرف آنکھ کے اشاروں سے کام لیا کرتے تھے۔ ظاہر میں ان کی بھگتی قابل مثال تھی، بات بات پر وہ اتحاد، اتحاد کے نعرے لگاتے تھے، اور فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والوں پر آوازے کستے تھے ــــ جب اُردو ہندی کا سوال پیدا ہوا، تو ابتداً اس کو کوئی سیاسی سوال نہیں سمجھا گیا تھا۔ ہر شخص اس کو ایک ضروری لسانی مسئلے سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ گر اندر ہی اندر چھریاں چل رہی تھیں۔ مگر کسی نے اس کو وہ نہیں سمجھا جو آج ہر شخص سمجھ رہا ہے، اور اس کے وجوہ بھی ہیں، کہ اس کو وہی سمجھا جائے۔

دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ہندی ملکی زبان ہے۔ درست۔ مگر جب یہ سوال کیا جاتا ہے، کہ وہ زبان جو ہندو ادیب اختیار کرتے جا رہے ہیں، کس حصہ ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ صوبہ آگرہ اودھ صوبہ متوسط کے ایک حصے اور جنوبی پنجاب میں۔ بہت خوب، چلئے یوں ہی سہی۔ لیکن اگر یہ سوال کر لیا جائے، کہ کیوں صاحب اُردو ہندوستان کے کس صوبہ میں نہیں سمجھی جاتی؟، کتنے مدراسی، بنگالی، بہاری، گجراتی، مرہٹے، پنجابی اور سرحدی ہیں، جو اپنی مقامی زبان کے علاوہ اُردو سمجھتے ہیں اور بولتے ہیں، اور اسی طرح کتنے ہیں جو ہندی سمجھتے اور بولتے ہیں؟ تو اس سوال کے جواب

میں یا تو جا بجا انگریزی کی بحث کی جائے گی، یا دانش مندی سے گفتگو کا رخ ہی بدل دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر یہی سوال کیا جائے۔ کہ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ، جنوبی پنجاب اور صوبہ متوسط کے ذکر [illegible] میں بیٹھے جن کی زبان کے ادیب بڑا عجیب بات کرتے ہیں، تو کس زبان میں لکھتے ہیں؟ اور [illegible] جیسا تو وہ زبان کونسی ہوتی ہے؟ تو اس کے جواب میں بھی آپ کو پہلا تجربہ دوہرانا پڑے گا کیونکہ اُردو کا تو نام لینا بھی مہا پاپ ہے۔

اُردو زبان کو مٹانے کا جذبہ جن اصحاب کے دلوں میں موجزن ہے۔ اُن کو اقسام ذیل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ وہ سیاسی متعصب ہندو، جو کھلے بندوں اُردو کو اسلامی زبان سمجھ کر اس کو ہندوستان سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس "خدمت" کو وہ اس لئے مستحسن سمجھتے ہیں۔ کہ اُن کے خیال میں اُردو کی جگہ "ہندی" زبان کے اختیار کرنے سے مسلمان، ہندو تہذیب و معاشرت اور آخر کار مذہب اختیار کر کے ان میں مدغم ہو جائیں گے۔

۲۔ وہ، جو مسلمانوں کی نام نہاد "بین الاقوامی" حیثیت سے خوفزدہ ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ اُن کا تمدنی اور مذہبی تعلق اسلامی دنیا سے قطع ہو جائے جس سے وہ مجبور ہو کر بقول اُن کے "خالص ہندوستانی" بن جائیں۔ یہ گروہ اُردو زبان کی متعصبانہ مذمت تو نہیں کرتا۔ مگر اردو رسم الخط کی خامیوں اور عربی و فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال کو قابلِ اعتراض قرار دیتا ہے۔ اُردو اور ہندی کے ساتھ مل کر ایک طرف تو مصلحین کے گروہ کے قائم کرنے کا پرچار کرتا ہے۔ اور دوسری طرف کھلے بندوں ہندی کمیٹیاں قائم کرتا ہے۔ اگر کسی صوبے میں فارسی زبان کی تعلیم ابتدائی بالکل نصاب تعلیم سے خارج کر دی جائے، تو اسے جائز قرار دے سکتا ہے۔ اور اُردو کے خارج کئے جانے کی کوششوں کو بھی غیر مستحسن قرار نہیں دیتا۔ ہاں اگر صوبہ سرحد میں (جہاں ہندی یا گورمکھی کا نام و نشان نہیں ہے) ہندی یا گورمکھی کے رواج دیئے جانے کو روکا جائے، تو اس کے خلاف شدت سے آواز بلند کرتا ہے۔ مسلمانوں کو وہ مشورہ دیتا ہے، کہ "یہاں تم مکے مدینے کا ذکر اپنے مضامین میں کیوں کرتے ہو، ترکی و شام

ذیل بہت مشہور ہیں، اور ان ہی کا بیان تذکرۃً فی الحال کیا جاتا ہے۔

آلہ - پورن بھگت - دولا دھاڑی - جمیل بھٹیاری - ہیر رانجھا - بھگت پہلاد - نل دمنتی
لیلیٰ مجنوں - [illegible] - وغیرہ۔

مذکورہ بالا منظوم قصص عموماً سو سال کے اندر کے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی نظم پرانی بھی ہے۔ تو وہ بھی بعد کے زمانے کے گویّوں کے روزمرہ کے اثرات سے بدل کر بالکل آج کل کی زبان میں ڈھل چکی ہے —— ان قصص کی زبان میں صرف تلفظ کا فرق غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ گو بظاہر لفظ کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک جگہ "پانی" بولا جاتا ہے اور دوسرے علاقے میں "پونی" بولا جا رہا ہے۔ اسی طرح "تہئے" کو "تئے" بولتے ہیں۔ مگر یہ صرف تلفظ کا فرق ہے۔ اس لئے ان اقتباسات کے مطالعہ کے وقت جو آگے ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

مذکورہ قصص آگرہ و دہلی کے درمیانی علاقے، اور راجپوتانے و ہریانے دیہات میں رائج ہیں جن میں برج کا علاقہ بھی شامل ہے، جس کو ہندی زبان کا مولد قرار دیا جاتا ہے۔

آلہ یا آلہا

آلہا میں پرتھی راج کے زمانے کے بعض واقعات کو نظم کیا گیا۔ مسٹر لال کو اس کا مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ یہ مشہور پاکیزہ دیہاتی نظم اس قدر دیہات میں پسند کی جاتی ہے۔ کہ جب وہ کسی گاؤں میں گائی جاتی ہے تو آس پاس کے تمام دیہات کے بوڑھے، جوان، بچے تک اس کے سننے کے شوق میں کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ یہ نظم راجپوتانہ، صوبہ آگرہ و اودھ، وصوبہ متوسط، اور جنوبی پنجاب میں عام طور پر سنی جاتی ہے مندرجہ ذیل اقتباس بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

جسراج اور بچھراج کا حال

اب تم "ذکر" سنو ناہل کا جس نے "ظلم" دیئے کروائے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"نظر" گھوم گئی جب کڑتیا کی سامنے آئی پڑا دکھائے
آؤ چودھری اور تیلی والے کہنے لگا کڑنگا رائے
"کرسی" ڈالدی تیلیا کو بیسڑا اور پان کا لائے
بولا کڑتیا جب للکارا اب تم سن لو تیلیا رائے
بہت "دنوں" میں تم آئے ہو ہم کو "حال" دیو بتلائے
کہو "حقیقت" گڑھ مجے کی کیسے رہے چندیلا رائے
تم نے کہدیا تھا گنگا پر ہم تجھے میں پہنچے جائے
بہت "سپاہی" مرے ہمارے اور وہاں ارلاکھین نئے
بڑے کڑیا وہ پانچوں تھے چھتری گھوڑوں کے "اسوار"
جو نا ہوتے بھانک پر چھوڑتا نہیں نولکھا ہار
لوٹ کرالیا مجنے کی اور راجہ کو دیا مار
جتن بتادو اب "جلدی" سے کیسے ملے نولکھا ہار
اس پر "جواب" دیا آئی نے راجہ مانڈو کے "سردار"
جو تم چاہو ہار نولکھا "لشکر" "جلدی" کرو "تیار"
کرو "تیاری" تم "جلدی" سے اپنا "لشکر" لیو سجوائے
ایسا جتن تمھیں بتلاؤں سارا "کام" "فتح" ہو جائے
بہت دنوں کا "عرصہ" ہوگیا۔ بوڑھے ہوئے بناپھل رائے
"قلعے" بنا کر چندیلے نے سب کو نیارا دیا بسائے
ایسا "وکت" نہیں ملنے کا کڑتیا سن لو کان لگائے

۵۔ سپاہ　　۵۔ وقت

آدھی رات کو جا پہ مارو "قلعہ" جھپا ٹوٹ گھیر و جائے

اس اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نہایت مقبول اور مشہور نظم کی زبان کیا ہے ظلم۔ دل۔ قلعہ۔ خبر۔ شعلہ۔ اژدر۔ غصہ۔ بدن۔ تیار۔ منزل۔ داخل۔ نظر۔ کرسی۔ حال۔ حقیقت۔ سپاہی۔ سوار۔ جواب۔ جلدی۔ لشکر۔ فتح۔ وقت۔ ۲۱ الفاظ فارسی و عربی کے [illegible] اشعار میں آئے ہیں۔ اور ان میں سے بعض الفاظ کئی کئی دفعہ آئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور سینکڑوں خالص عربی فارسی کے الفاظ ملتے ہیں۔ اور بعض جگہ مصرعے کے مصرعے اور پورے اشعار تک انہی لفظوں سے بنائے گئے ہیں مثلاً

"حکم سنایا سرداروں کو لشکر جلد کر د تیار"

"جو کچھ ہاتھ لگا کڑیا کے لاو لیا سارا سامان
میندی، کاکش، بادلے، کمخواب، اور ریشمی تھان"

"نہیں بھروسہ زندگانی کا جتنے نکل جائے کب جان"

"حکم دیا سرداروں کو لشکر جلدی لو سجوائے
توپ، بندوق، رفل، رہکلا سب شکروں پر دو چڑھوائے"

"افسر افسر چڑھے ہاتھی پر اور گھوڑوں پر چڑھے سوار"

"گھٹ بندھ گیا رجپوتوں کا کا وہ دیتے پھریں سوار
پیدل پلٹن اور رسالے آگے چلے جھپٹی بردار"

"ہاتھی بندھ گئے، گھوڑے بندھ گئے، سب نے کھول دھرے ہتھیار

چاروں طرف کو لشکر پڑ گیا، پیدل، پلٹن اور سوار"

مذکورہ بالا اقتباس مثال کے طور پر آلہا کی صرف ایک داستان کے ۵۰ ابتدائی اشعار میں سے دیے گئے ہیں۔ ساری نظم اسی انداز اور اسی زبان میں ہے۔ ذرا تلاش تو کیجئے کہ ان اشعار میں کتنے لفظ ہیں جن کو اُردو ادیب استعمال نہیں کرتے ہیں۔

سَت ساگر

یعنی

پورن بھگت کے قصّے کا پہلا حصہ

سَت ساگر نامی سانگ میں پورن مل بھگت کے قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ پورن بھگت نہایت مشہور ہندو کردار ہے۔ اس سانگ کو برج کے علاقے اور اس کے متصل علاقے کے دیہات میں ہر چھوٹا بڑا بہت اشتیاق سے دیکھتا ہے۔ جب سانگیوں کی ٹولی ایک گاؤں سے دوسرے دور و دراز فاصلے کے گاؤں میں جاتی ہے، تو بہت سے شوقین لوگ سانگ دیکھنے کے شوق میں اس طویل فاصلے کو طے کرنے کے لئے سانگیوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں، مصنف چھدا لال ساکن موضع بروالی [illegible] جسے "برج باشی" کہنا ہی زیادہ موزوں ہے۔ سانگوں میں مصنفین غزلیں بھی لکھتے ہیں جن کے لئے وہ "بحرِ طویل" اور "قوالی" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ "قوالی" سے مراد چھوٹی بحر کی غزل سے ہوتی ہے۔ اور "بحرِ طویل" سے ہر وہ بحر مراد لی گئی ہے۔ جو ذرا بھی چھوٹی سے بڑھ جائے۔ الفاظ "قوالی" و "بحرِ طویل" دونوں قابلِ غور ہیں۔ تمام سانگ سوال جواب میں ہی ہوتا ہے کہیں کہیں مصنف

ساہی کے بیان کو "رنگا چابکا جواب" لکھتا ہے۔ ناظرین کے ملاحظے کے لئے ست ساگر کے جستہ جستہ اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:-

قصے کو شروع کرتے وقت سرخی دی گئی ہے "آغاز داستان" اور پھر نظم یوں شروع ہوتی ہے:-

دوہا

سجن جن یہ "داستاں" نیت دھرم سے "پورے"
بست ملک پنجاب اک "دنیا" میں "مشہور"

چوبولہ

"دنیا" میں "مشہور" "حسن" کی جہاں "یکتائی" ہے ۔ دیکھ "نور" "شرمندہ" "حوروں" نے "قسم" کھائی ہے
ہیں پانچ "دریا" کیا ایشور کی پربھتائی ہے ۔ تیاگ کشی کی چھوٹی سی راجدھانی جہاں کھاری ہے

قوالی

شنک پت مندر میں ظاہر بیان ان کا سناتا ہوں ۔ پرنم "استاد" اپنے کو "دھرم" "سر" جھکاتا ہوں
جتی برہم چری پورنل زپت کے ایک لڑکا تھا ۔ نیت دھرم میں پورت جن کا نیک لڑکا تھا
ایک دن کسم نگری سے تیر آیا سوبھر کا ۔ جلن کا "قصد" زپت کینا "ہرش" چھایا سوبھر کا

دوڑ

بشن - بھوشن، پھرے تن، شنک پت خوش ہو من میں، زپت "محل" میں آئے
دیکھ سجاوٹ رانی اشبادیوی یوں سنائے

---

۱ پُر
۲ چوبولہ یعنی چار "بول" چار مصرع
۳ دریا
۴ حرص

قصے کی ابتدا یوں کی گئی ہے۔ کہ ایک ملک تھا پنجاب جہاں کی راجدھانی سیالکوٹ تھی جس کے باشندوں کا "حسن" "حوروں" کو "شرمندہ" کرتا تھا۔ راجہ کا نام نرپت تھا اور رانی کا اچھا دیوی راجہ صاحب کو غالبی عمر کے تھے، ان کے ایک کنوارا، نیک لڑکا پورن بھی تھا۔ مگر تھے ہوس پرست، کسم نگری سے خط آیا کہ وہاں کی راجکماری کا سوئمبر ہے۔ راجہ صاحب بن سنور کر "محل" میں آئے۔ آگے چل کر شاعر کہتا ہے۔ کہ رانی نے کہا "مہاراج کدھر چلے" "نوشہ" بن کر "نوجوان" بن کر "جہاں پناہ" "عجب" "ادا" سے آپ سجے بنے ہیں۔ کیا ارادہ ہے "خاکسار" رانی سے "مہربانی" سے دل کا "حال فرمائیے"۔ راجہ صاحب نے کہا کہ رانی پھولندے کا سوئمبر ہے جس سے دل کو "بے قراری" ہے۔ چھتری کئی شادیاں کر سکتے ہیں، اسی لئے اس سوئمبر میں جانے کی "تیاری" ہے۔ اب رانی سمجھاتی ہے کہ مہاراج آپ کی عمر شادی کے قابل اب نہیں ہے۔ اور راجہ صاحب رانی کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

جواب راجہ کا

دوہا

سن لی تیری کہانی بس چپ رکھ "زبان" - لائیں رانی دوسری "دل" میں ٹھانی ٹھان

چوبولہ

دل میں ٹھانی ٹھان رنگ تو اپنا کیا جانے - کاہے نا کی آج "نصیحت" ہم کو کیا سنانے
باتیں کیا بنائے سبھے کیوں "غصہ" کیا دلانے - چل ہٹ "بیوی" تو کو تو بڑھاپا کیا بتانے

دوڑ

بجائے کیوں گال کو، نہ مانو تیرے بچن کو، سنی ہے تیری بانی، "شاہوں" کا "سرتاج" ہوں بیاہوں پھولندے رانی۔

جواب رانی کا

مانو مانو پران پت، سچ پیاری کی کہن - پھر نشدنی پچھتاؤ گے، ملے نہ پل بھر چین

اگے رنگا چار (راوی) بیان کرتا ہے کہ رانی نے "ہر چند" سمجھایا۔ مگر راجہ صاحب نہ مانے اور
سوئمبر جانا "پسند" کر کے مع "لشکر" روانہ ہوگئے۔ اور سیالکوٹ کے "سلطان" سوئمبر پہنچ گئے
راجہ پھول چکر نے خوب "خاطرداری" کی۔ سوئمبر میں فیصلہ راجہ سیالکوٹ کے حق میں ہوا۔ اور بمعہ
رانی پھولندے اپنی راجدھانی میں آئے۔ جس وقت نئی رانی کی ڈولی "محل" کے دروازے پر پہنچی۔ تو
نئی رانی نے راجہ سے جھنجلا کر کہا۔

جواب پھولندے کا

دوہا

"جلد" نکالو سوت کو "محلوں" سے بھر تار
بلے جائے دوجے "محل" ذرا نہ کرے اَبار[۵۱]

چوبولہ

ذرا نہ کرے ابار، "قدم" "محلن" میں کبھی دھروں گی۔ ڈولی سے کبھی اتروں جو کہیں کرا سب لوں گی
دیکھ سوت کو جلے "بدن" کیسے "دل" "صبر" کروں گی۔ سدا کرے گی راڑ سوت میں کہاں تک نیچی رہوں گی

دوڑ

"گذر" نا ہووے میری۔ کروں "بخت"[۵۲] کی ڈھیری۔ سوت ہر "وقت" ستاوے
رہنا پاس سوت کے میری سمجھ نہ آوے

رنگا چار کہتا ہے۔ کہ اس پر راجہ نے اپنی بڑی رانی سے کہا، کہ جو کچھ تم نے کہا تھا وہی آگے آیا،
دوسرا "محل" کھلوا کر جا رہو "دیر" مت کرو۔ اس نے جواب دیا اے پران ناتھ جو کچھ آپ "حکم" دیں گے
وہی میں "منظور" کروں گی۔ میرا کیا "مقدور" کہ "محل" خالی نہ کروں۔ چنانچہ اباد دیوی نے فوراً دہ

---

[۵۱] ادیر - تاخیر
[۵۲] بخت - نصیب

محل خالی کر دیا۔ اور پھولندے رانی محل میں آباد ہوئی۔ پھولندے شباب سے مست ہو رہی تھی۔ راجہ صاحب کی "جوانی" ڈھل چکی تھی۔ راجہ صاحب امور سلطنت میں مصروف رہتے، اور جوبن میں چور رانی اپنے دل سے یہ باتیں کیا کرتی۔

پھولندے کا بچار کرنا

دوہا

موتن۔ جوبن، چور ہے پریتم کا یہ "حال"۔ "طاقت" "بے باقی" ہوئی گوری ٹھنٹھن گوپال

ٹھمری

بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی "بہار"۔ رات ٹھنٹھن، دن، موکو کرے کام "بیدار"
سیاں کو دیکھو، درشا، تو ہتی نار[۵۱] جی۔ بھرتا ر بوڑھے جوبنا میں آئی بہار

"ظرف" "ہنسی" "باقی" "بیٹھ گئے" "رخسار"۔ "حسن گلستان" ادھر پھول رہی پھلوار جی
بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی بہار
اس ڈگرا[۵۲] کے بھوگ مٹے نہ "دلی غبار"۔ ملے "مہ جبیں" "تا ہر" "قلعہ دار" "دلدار" جی
بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی بہار
"رنج" جب ہی "غم" ہو ملے "ساز" "بے ساز"۔ مروں کٹاری کھا کے گل ہے "زندگانی خوار" جی
بھرتا بوڑھے جوبنا میں آئی بہار

دوڑ

کروں کیسے کت جاؤں، کون بدھن سمجھاوں، "تمنا" ہوئی نہ "حاصل"
کتنے ہمارے ڈھیلے ڈھالے ساجن ہی کے "قابل"

---

۵۱ نار یا ناڑ۔ گردن ۵۲ ڈگر۔ راستہ

آتا نہیں "یقین" تُو تو پاپن کہلاتی - نہیں تجھ کو "تب بھیا" ہیری تُو تو پھونکے چھاتی
جا ڈوب کیوں نا مری، کیوں مُنہ دکھلاتی - میرے سے تے "دغا" کیے تیں ٹری جلاتی

دولا دھاڑی

ایک سانگ دولا ڈاکو کا دیہات و قصبات میں اکثر کیا جاتا ہے۔ مصنف اس کے گھنشام داس ہیو دیو پرشاد ساکنسی کے رہنے والے ہیں۔ جو علاقہ برج میں واقع ہے۔

قصہ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ دلیپ سنگھ نامی جس نے دولا نام اختیار کر لیا تھا شاہ نورنگ کا (جو غالباً شاہ جہانی عہد کا کوئی پنجابی صوبے دار قصے سے معلوم ہوتا ہے) اس لئے دشمن ہو گیا تھا کہ نورنگ نے اس کے باپ کو جوڑا کو قتل کرا دیا تھا۔ رنگا چار اس قصے کو یوں بیان کرتا ہے:۔

جواب رنگا چار کا

دوہا

"کُل" "ادنیٰ" "اور" "اعلیٰ" "سنو یہ مضمون" "نیکا" - "دنیا" میں ہے "ظاہر" "ملک" "اک پنجاب

چوبولہ

"ملک" ایک پنجاب کہوں واں کی ایک کہانی - "پیدا" ہوا "نبیر" "دلاور" بیر بھٹ مانی
انہی دنوں "شاہ" نورنگ کی تھی "سلطانی" - "اسی" "ملک" میں تھی گڑھ صندل چھوٹی راجدھانی

قوالی

وہ دولا دھاڑوی وہاں پہ بیر بانکا تھا - "سپاہ" کچھ سنگ میں رہتی اڑکا وہ "ادا" کا تھا
اور وہاں نو گاؤں کی "باقی" نہ دیتا شاہ نورنگ کو - سدا "بے خوف" "تھانہ ڈر" شاہ جہاں "کا تھا
"دغا" سے اسکے "والد" کو شاہ نے کرا "فنا" دینا - سنی جب سے ہوا "دل" پہ "بہادر" کے سنا کا تھا
سو نچتا تھا سدا کہ کب بدلہ لیسیلوں والد کا - اسی "شش پنج" میں ہر "دم" "دست خنجر" "فنا" کا تھا

دوڑ

دلی دل کا "خیال" تھا۔ بڑا بھاری "ملال" تھا۔ "شوق[۵۱]" "والد" کا "جاری"
سنگھ دلیپ نے ماتا سے "عرض گزاری[۵۲]"

جواب دھاڑی کا ماتا سے

دوہا

"عرض[۵۳]" "برخوردار" کی سن بیاؤ صروصیان ۔ "شہر" میں "در در" جائے کر سنا ایک "بیان"

چوبولہ

سنا ایک "بیان" "جبھی" سے "جگر" جلاتا ہے ۔ ہر دم آوے "یاد" "یہ" "دل" "غم" میں "غوطہ" کھاتا ہے
اس "رنج" مجھے نہ کھانا پانی بھاتا ہے ۔ "والد" کے مرنا کا "خیال" جبھی مجھے آتا ہے

دوڑ

میرا "دل" بڑا کہا ہے ۔ چڑھا "غم" کا "غبار" ہے۔ "حال" سب "معلوم" تجھکو
کا بدلہ مارے گئے بتا ۔ جنی بتلا دے مجھکو

جواب ماتا کا دلیپ سنگھ سے

دوہا

بیٹا چھو ہونا لاڈلے متی بنے "نادان" ۔ بہکایا کس نے کنور میرے جیول پران

چوبولہ

میرے جیول پران تجھے کیا "خواب" "نظر" آیا ۔ یا کوئی "دشمن" نے بیٹا تجھکو بہکایا
ہوا کیوں "تنگیں" تیرے کیوں نین جل چھایا ۔ سوچ کر کیا نہیں "کام" وہی زہچھتایا

---

۵۱ شوق

۵۲ عرض گزاری

۵۳ عرض

بھگت پہلاد

پہلاد بھگت کے قصے پر بھی بہت سے دیہاتی شاعروں نے سانگ لکھے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول عام نتھا کا بنایا ہوا سانگ ہے۔ جو ہانسی کے قریب کا رہنے والا ہے اس لئے اُسے "برج باشی" ہی کہنا چاہئے۔ اس سانگ کا خاص انداز یہ ہے کہ شاعر نے "رنگاچار" (راوی) کا کام خود اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ جسے وہ "جواب کب کا" لکھتا ہے۔ "کب" "کوئی" یا "کویت" اور "کبیت" کا اختصار سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ پرمیشور کی حمد و ثنا کے بعد قصہ اس طرح شروع کرتا ہے:۔

جواب کب کا

دوہا

بسے "ملک" پنجاب میں "شہر" ایک ملتان - یہیں ہرن کشیپ نرپت ہوا بڑا بلوان

پھر آگے کہتا ہے۔ کہ اس کا ایک بہت "ظالم" بھائی تھا۔ جس کو انسانی روپ اختیار کر کے رام نے مار ڈالا۔ جس کا اس کو بڑا صدمہ ہوا۔ مگر اس نے بہت ریاضت کی۔ جس پر خوش ہو کر شنکر جی آئے۔ اور کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس پر اس نے کہا کہ مجھے وہ قوت عطا ہو۔ کہ نہ کوئی "انسان" مجھے مار سکے، اور نہ کوئی "جانور"۔ اور نہ میں رات میں مروں اور نہ دن میں نہ زمین میں نہ "آسمان" میں۔ اور نہ کوئی ہتھیار مجھ پر اثر کر سکے۔ آپ اپنا وعدہ "دل شاد" ہو کر پورا کیجئے اس کی مراد پوری ہو گئی۔ اور جو مانگا وہ اُسے دیا گیا۔ اس پر بہت "خوش" ہو کر اس نے "حکم" جاری کر دیا کہ کوئی رام کا نام نہ لینے پائے۔ جس سے سب کو "خوف" پیدا ہو گیا۔ چنانچہ لوگوں نے "بالکل" رام کا نام لینا چھوڑ دیا۔ اور جس نے حکم کی خلاف ورزی کی "فوراً" سولی پر چڑھایا گیا۔ ایسی "سزا" سے سب پر "دہشت" چھا گئی۔

ہر فرعونے راموسیٰ کے مصداق، اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام پہلاد تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ------ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رانی یہ پرانشوت کے لگے بیری "خلق" ڈوب جگانا ری ۔ کر رکھا کو نہد، میں نے آندر پت لوٹ لی ساری

میئر

رانی سن میری "ارداش" راجہ نل ہے نوکر "خاص"

دوہا

بکھا شیش پہلے لیا، سے بدل گئی اور ۔ نیہ سمایا دھرتی میں ہوا "طور بے طور"

چوبولہ

ہوا "طور بے طور" رانی کی "فوج" بگڑ گئی ساری ۔ مچی "ملک" میں اٹ "خلق" سب ڈوبے ماری ماری

"کمول" "خزانہ" دیکھتے جی راجہ کا بھنڈار ۔ کچن ہو گئے کوئلہ تو تیری "قدرت" پہ بلہاری

میئر

کرتا "قلم" کبھی بے طور جگت میں کوئی نہ تسا اد

جواب راجہ کا

دوہا

کچن ہو گئے کوئلہ، بیری ہو گیا "جہان" ۔ وہی لوٹ کر لے گیا جس کا گھمنڈ "گمان"

چوبولہ

تھا جس کا گھمنڈ "گمان" انھوں نے ایسی دھوم مچائی ۔ ننگی کر کے رانی رٹی "ایک" دیا نہیں آئی

دو[illegible] سے رانی چھوٹی میری آج تک نا پائی ۔ ایک رانی دموونی میں نے "شکل" سے دکھائی

میئر

"جان" "قربان" کر دوں گا، نہیں میں تجھے تجوں گا۔ شیش پہ بپتا سہوں گا

لہ عرضداشت

چوبولہ

بنگالیش پہ لے لی میرے چھٹ گئے "عیش آرام" - ایسی لوٹ مچی "محلن" میں ہوئی "فجر" سے "شام"
سب نوکر "دشمن" ہو گئے "نمک حرام" - یہ "چار جامہ" بچا تو بن گھوڑے کس "کام"

میئر

کرتا "قلم" کبھی "بے طور" جگت میں کوئی نہ تما ہو

لاونی کا نمونہ یہ ہے -

لاونی

جواب رانی کا

سُن سُن ری گجری بہنا، ہم تو دو بہو کے "مہمان" چھاچھ تھوڑی سی دینا

گجری کا جواب

چل چل ری ہٹ تو کون کدھر سے آئی - مرے بچھڑے بدکے جائیں پرے ہٹ جائی

جواب رانی کا

ترے بچھڑے، بچھیا بھی "سلامت" نہیں - ہم ترے دوار یہ چھاچھ مانگنے آئیں

جواب گجری کا

نہ ملے مفت میں چھاچھ اری تجھکو - میں نے "مطلب" کی بات کہی تجھکو

جواب رانی کا

تو کیا "مطلب" لالچ کی ماری بولی - میں نے اپنا دریبہ لٹا دیا بھر بھر جھولی

جواب گجری کا

تو بڑی درب کی دھائی کہاں سو آئی - تجھے چھاچھ مانگتے ذرا "شرم" نہ آئی

جواب رانی کا

کہاں رہے "شرم" جب بابا پیٹ پکارے - ہو گئے دن سات ہمکو بھوک کے مارے

"عام خاص" ہور ہا "آباد"، "خواص" کھیلے" خانہ زاد" کبیر کند کسوم گا دنا آباد" اڑتے پھرے پرداو

ہولی کھیلیں آپ "حضور" ، بجتے "تاشے" ، ترئی ، "تنبور" ، ٹھاریاں توپیں اور جنبورے[۱] ، دیکھیں گوری

سمت انیس سے چون بیچے گاؤں گاؤں میں سمن کھیلیں چھتری ، بنئے ، بمن ، ہل مل ہوری

دوسری ہولی کا نمونہ

سری بجے سنگھ جی مہاراج ، ہونگے بادن گڑھ "سرتاج" ، ساجے سب ہولی کے "ساج"[۲]
"مشغلیں"[۳] ری ری
ہاتھی گھوڑے سب "پچرنگ"[۴] ہورا "شہر" میں ناچ اور رنگ ، ہولی کھیلیں سب کے سنگ
—— کیسر گھولی۔
چوتھے "دور" پاتھے نیڑے جنہیں "جوان" بانکے ڈٹے ۔ "حکم" بیج بلوائے بیلے ،
آئے جھٹ ، پٹ ——
سیکن[۵] تان اور پلٹن ، آئی "محل" چوک میں بن ٹھن جنہیں "جوان" سارے ایک من ،
ٹھاکر ، بامن ، گوجر ، جٹ ،

۱؎ زنبور ، چھوٹی قسم کی قدیم توپ ،
۲؎ ساز
۳؎ جمع مشعل کی
۴؎ پنچ رنگ
۵؎ سیکنڈ تان ۲/۹ فوج کا نمبر ہے۔

باجے بجے "بے شمارے" بین بانسری "ستارے" زیب کی پری
آگے آگے کپتان کرنل، "افسر" گھوڑے "پہل دریں" پہلے کینی "نسلا" جرنل
سب سے کینی ہے "سلام"۔

عشق مجنوں

مذکورہ بالا سانگ ل منیی کا اقتباس، راجپوتانے کے سلمان کا ابھی آپ نے ملاحظہ کیا تھا، لیکن اب ذرا انتھارام اتعرس نواسی، برج کے ایک ہندو شاعر کا بنایا ہوا سانگ بھی ملاحظہ فرمائیے، جو اس نے ایک خالص عربی قصے کو سن کر لکھا ہے، ابتدا اس طرح کی گئی ہے:۔

دوہا

"قلم" نہ "ہرگز" لکھ سکے، "صفت" "عالم الغیب"
اے" قادر" اے "کبریا" "ذات" تری "بے عیب"

چوبولہ

"بے شمار" "اسرار ترا" "لیل ونہار" رہتا ہے ۔ "گنہ گار" "بندوں" کا "ہر دم" "مددگار" رہتا ہے
رہے نہیں "بے خبر" بہت کچھ "خبردار" رہتا ہے ۔ "حال" "نہاں" "بشر" کا تجھے "آشکار" رہتا ہے

بحر طویل

"رب المالک" "ہے" "عزت" "دو عالم" کا تو "آسماں" "ہے ترا اور" "زمیں" "ہے تیری
کوئی آئی نہ دہ ہے" "نظر" کے تلے" "نہاں جس" "شے" "میں" "قدرت نہیں ہے تیری
دی دکھائی نہ" "لیکن" "تعجب" "ہے یہ" "حسن" کی "روشنی" "چارسو" "ہے تیری
"جابجا" تو ہی تو ہے" "جلوہ نما"، "چھوہ نما"، "چھوہ زلائی ملے" "پردہ نشیں" ہے تیری

---

[1] صلاح

لکھمی چند اور ٹیک چند نے علیحدہ علیحدہ لکھے ہیں۔ پہلے لکھمی چند کے بنائے ہوئے سانگ کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

نوٹنگی لکھمی چند

دوہا

اے ایشور سب کے دھنی، جگت رچاون ہار
مجھ مورکھ "ناچیز" کو دیئیے پار اتار

اپدیش

ٹیک:۔ بھارت کو کھو دیا "فرق نفاس میں کوئی کوئی انس" باقی تھے

(۱) پیارتے "دغا" کمائے، سرپے باپ کا بھار اٹھائے، بیٹی کے روپیہ کھائے،
ناریت برتی نیائے سے، بھارت کھو دیا ... الخ

(۲) آدوں نے بنا ہیرے "عقلمند" چاتر، ارے جس گھر کو سندر پاتر،
پھر یاری کرن کی "خاطر" کرے "طراں طراں"[1] کی چلائی سے۔ بھارت کھو دیا ... الخ

(۳) ناپاپ کرن تے ڈرتے، "جگہ جگہ" کُکرم کرتے پھرتے، "شرم" نا ہین کی کرتے،
چاہے کوئی دادی، تائی، کاکی سے۔ بھارت کھو دیا ... الخ

قصہ کا آغاز اس طرح کرتا ہے:۔

دوہا

سیالکوٹ کے بیچ میں ہوئے گیے سنگھ سردار
دو پتر جن کے لاڈلے، چندر ماں کے اونہار

چوبولہ

چندرماں کے اونہار کرے تھے "خوب" کمائی ۔ بڑے بھائی بھوپ کی تھی "حورم" لگائی

---

[1] طرح طرح

پھول سنگھ چھوٹے کے نا بیاہ سگائی ۔ بھاوج کے کہنے سے جا نُونگی بیاہی

کمتال

"عال" میں سبھی سناؤں جی ۔ نار نُونگی بیاہوں جی

دیا بھاوج نے "طعنہ" مار ۔ "شہر" ملتان کو جاوں جی

بارتہ[۵۱]

"سردار کسی "وقت" کا "داستان" ہے، کہ ھوپ سنگھ کا چھوٹا بھائی پھول سنگھ اپنے 'یار' کندن سیٹھ کے ساتھ بن سے "شکار" کھیل کر "واپس" آتا ہے، اور اپنی بھاوج سے آکر کہتا ہے۔

اس سانگ نے حسن اتفاق سے ہریانے کی زبان کی بالکل صاف تصویر کھینچ دی ہے کہ "بارتہ" کے بہانے سے نظم کے علاوہ نثر بھی آگئی ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کیا زبان بولی جاتی ہے۔

نُونگی مصنفہ نیک چند

پر اُٹھنا (دعا) کے بعد اس طرح شروع کرتا ہے،

دوہا

جو "وعدہ" تینے کیا، مت نا کرے "خلاف" ۔ بہو بنا کے اپنے لال کی سُنے لے چلئے آپ

کافیہ[۵۲]

چولی "زیور" جلدی لیا رے، اتنے "عطر" چھیل ملوں میں

---

۵۱ ارتھاؤ، یعنی وضاحت

۵۲ مراد قافیے سے معلوم ہوتی ہے کہ اس طرز نظم میں قافیے کا التزام نظر آتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (١)

[illegible]

[illegible] (٢)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(٣)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس سانگ میں بھی صدہا الفاظ فارسی کے نظر آتے ہیں جس کا اندازہ اس نمونے سے ہی ہو جائے گا۔

اس مضمون کے ناظرین کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔ کہ ہمارے "ہندوستانی" دیہات میں کیسی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن آیندہ اشاعت میں ہم یہ بتائیں گے کہ وہ کون سی زبان ہے۔ جو ہندی پرست اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں، اور پھر یہ موازنہ بھی کریں گے۔ کہ دیہات کی روزمرہ نام نہاد ہندی بولیوں کی زبان سے قریب ہے یا اُردو ادیبوں کی زبان سے علاوہ ازیں اگر فرصت ملی، تو ایک فہرست اُن فارسی و عربی الفاظ، استعارات، محاوروں اور ضرب الامثال کی پیش کریں گے۔ جو دیہاتی زبان میں مدت سے رائج ہو کر جزو زبان بن چکے ہیں۔

قدیم ترین تراجم

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب کہ مختلف مغربی اقوام نے ہندوستان میں تھوڑی بہت قوت حاصل کر لی۔ اس سلسلہ میں اولین قابل ذکر کوشش عیسائی پادریوں کی ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً انجیل کے مختلف حصوں کے ترجمے کرائے۔ اب تک جو کچھ مواد دستیاب ہو سکا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل کا ترجمہ پہلی دفعہ ہندوستانی زبان میں بنجامن شلطز نے ۱۷۲۵ء میں کیا۔

فورٹ ولیم کالج مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے ساتھ حکومت بھی شروع کر دی۔ اور اس کی قوت روز بروز زیادہ مستحکم ہوتی گئی۔ تجارتی اور حکومتی اغراض کے تحت کمپنی نے ابتدا ہی سے محسوس کر لیا کہ انگریزی ملازمین کو ہندوستان کے رسم و رواج اور معاشرت و زبان سے واقف کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس بناء پر انگریزوں کے لئے دیسی تعلیم کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ کے انگریزی حدود میں ایک مشرقی مدرسہ قایم کیا تھا جہاں انگریزوں کے ساتھ ہندوستانی طلبہ کے لئے بھی لکھنے پڑھنے کا انتظام تھا۔

چونکہ کمپنی کے ملازم عام طور پر نوعمر انگریز ہوتے تھے اور انگلستان میں بھی ان کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہوتی تھی اس لئے لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی جو تجویز پیش کی تھی اس میں ایشیائی زبانوں مثلاً عربی فارسی سنسکرت اُردو بنگالی تلنگی مرہٹی اور کنٹری کے علاوہ یورپین زبانوں میں لاطینی یونانی اور انگریزی اور علوم و فنون میں عام تاریخ شمالی ہندوستان اور دکن کا جغرافیہ دکن کی تاریخ اصول قانون اور تاریخ ہند (قدیم و جدید) کی تعلیم کا انتظام کرانا چاہا تھا۔ لیکن کمپنی نے اخراجات کے ڈر سے اس درس گاہ کو صرف مشرقی زبانوں کی تعلیم تک محدود کر دیا۔

اس زمانہ میں اردو یا ہندوستانی کو عام زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی نصابی ضرورتوں کے

تحت اُردو ادبیات کی تلاش ہوئی ۔ اس کا سارا ذخیرہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا ۔ اس لئے ادبی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا ۔ اس سررشتہ میں اخلاقی قصص اور بعض تاریخی کتابوں کے ترجمے قدیم مشرقی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت سے کئے گئے ۔ دوسرے علوم یا سائنس پر کوئی کتاب اس عہد میں تیار نہیں ہوئی ۔

شمالی ہند میں اُردو نثر کی باضابطہ ابتدا انگریزی اثر کی بنا پر ہوئی لیکن اول اول اس پر انگریزی یا مغربی اثر بہت کم پڑا اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے فورٹ ولیم میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہندوستانی میں نہیں ہوا وجہ یہ تھی کہ دیسی اہل قلم انگریزی سے ناواقف تھے ۔ فورٹ ولیم کالج کے کسی اہم کام کا ذکر مغربی زبانوں سے ترجموں کے سلسلہ میں کیا جا سکتا ہے تو صرف اس اُردو انگریزی لغت کا جس کا ایک حصہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں چھپوایا ۔ فورٹ ولیم کالج اس لغت کی طباعت کے دو سال بعد ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا لیکن چونکہ گلکرسٹ اس کالج کے روح رواں تھے اس لئے ہم نے ان کے کام کا ذکر اس کے سلسلہ میں کر دیا ۔

مرزا فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ مرتب کر کے چھاپا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ یونانی زبان سے کیا گیا ۔ ۱۸۰۸ء میں کپتان ٹیلر نے اپنی لغت شائع کی ۔ اس کے بعد ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت جہازرانی طبع کرائی جس میں جہازرانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اردو ترجمہ بھی درج ہے جو کمانداروں کو میدان جنگ اور بارکس میں کارآمد ہو سکتے ہیں ۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ایک عرصہ بعد یعنی ۱۸۴۵ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے جس کا نام مجموعہ گنج ہے اور جو کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس میں چھپی ہے یہ کتاب چونکہ ان تراجم میں سے ہے اور کامیاب ہے اس لئے اس کے کچھ اقتباسات درج کر کے زبان اور طرز بیان کی خصوصیات پر ذیل میں روشنی ڈالی جاتی ہے ۔

کتاب کے نام یعنی "مجمع گنج" کے نیچے حسب ذیل عبارت لکھی ہے ۔

"عقل روشن کرنے والی تعلیموں کا

اور

.... والی تبلیغوں کا"

اس میں

اکثر ملکوں کی بستی اور شہر اور آدمیوں کے احوال کا بیان ہے۔

ہندوستانی لڑکوں کے لئے

انگریزی زبان سے زبان اُردو میں ترجمہ کیا گیا"

یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۷۲ صفحوں پر مشتمل ہے اور اس میں ۴۴ مضامین اور عنوانات ہیں جن کے تحت تاریخ اور جغرافیہ کے ابتدائی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں اس وقت کے ہندوستان کی کیفیت لکھی ہے۔

اس رسالہ کی عبارت میں قدامت پائی جاتی ہے۔ جملوں کی ترکیب پر انگریزی تراکیب کا اثر نمایاں ہے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں جو عرصہ ہوا متروک ہو چکے ہیں۔ تجارت کی جگہ "سوداگری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مثلاً "انگریزوں کے وقت میں ہندوستان کی سوداگری خوب چمک گئی"۔ نے کے غلط استعمال اور جملہ کی ترکیب کی اجنبیت ملاحظہ ہو "کمپنی کے سوا کوئی آدمی پوست کا کھیت کرنے اور افیون مول لینے نہیں سکتا ہے مگر کمپنی کے حکم سے"۔ امریکہ ملک "برطین کی ولایت" اور انگریز کا ملک" جیسی ترکیبیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ جملوں کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انگریزی کا ترجمہ ہے۔

"ہند کی سوداگری کے بیان میں"

"ہند میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں دوسرے ملک میں لیجا کے بیچنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے اور ہند میں دولت مند ہونے کا بڑا وسیلہ سوداگری ہے۔ جو چیزیں آدمی کو ضروری ہیں ان کے بہتات سے پیدا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

١٣٥٥

مثال ملاحظہ ہو۔

"استادوں نے دریافت کئے ہیں کہ"

بعض مقامات پر اسم کیفیت یا حاصل مصدر کے بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً

"ہوا کے دو جسموں کے تصادم سے گرجنا پیدا ہوتا ہے"

بعض جگہ داخل کرنا، دل لگی، امتحان اور صرف کرنا جیسے الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں وہ اب مستعمل نہیں ہیں۔

شکر کو باسن میں داخل کرنا	(بمعنی ڈالنا)
واسطے سیکھنے اور دل لگی نوشنا بوں کے	(دلچسپی)
امتحانات بیان کئے گئے ہیں	(تجربے)
یہ آلہ پانی کو چڑھانے کی غرض سے صرف کیا جاتا ہے	(استعمال)

بعض الفاظ کا املا بھی قدیم ہے مثلاً

کوین کو "کوے" اور وہ کو "دو" لکھا ہے۔

انگریزی الفاظ کے ہجا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ ہیڈروجن کو کہیں 'ہ' سے لکھا ہے اور کہیں 'ح' سے۔

سائنس کی بعض اصطلاحات کے ترجمے کر لئے گئے ہیں اور بعض انگریزی تلفظ کے مطابق اردو میں لکھے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

علم آب کی ترازو	Hydro statics Balance.
غوطہ زنوں کا آلہ	
پانی چڑھانے کا پمپ	
چوسنے کا پمپ	Sucking Pump.
زبردستی کا پمپ	Force Pump.

کلاں بین	Microscope.
ہوائی بندوق	Air Gun.
آلۂ تحلیل	
مدائی پون	
موسمی پون	Monsoon.
تبدیلی پون	
بخار کا آلہ	
نقشہ نویس کا صندوق	
قندیل سحر نما	
انحرافی دوربین	
منعکسی دوربین	Reflecting Telescope.
آئینہ ہزار چشمی	
موازی شعاعیں	Parallel Rays.
انقباضی شعاعیں	Convergent Rays.
انبساطی شعاعیں	Divergent Rays.
انحرافی روشنی	Defracted Light.
منعکسی روشنی	Reflected Light.
دنبالہ دار ستارہ	Comet.

جن انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ان میں سے بعض یہ ہیں:-

ہیڈرا میٹر

بیرا میٹر۔

تھرمامیٹر

پیرامیٹر

ہیگرامیٹر

ان کتابوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ مندرجہ بالا خصوصیات کی حامل ہونے کے باوجود سادہ اور سلیس ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مباحث کے سمجھنے میں بھی عام پڑھنے والے کو کوئی دقت پیش نہیں آتی اس سے ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنے والوں نے اصل کتاب کے مطالب کو پوری طرح اور خوبی کے ساتھ سمجھ لیا تھا اس لئے کسی مقام پر بھی معنوی تعقید یا گنجلک پیدا نہیں ہونے پاتی۔ عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ افسوس کہ باوجود تلاش کے ریورنڈ چارس کی اصل کتابیں ہمیں نہیں مل سکیں اس لئے یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ ترجمہ اصل سے کہاں تک مطابق ہے۔ یہ کتابیں سوال و جواب کے طرز پر لکھی گئی ہیں اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

تعریفات اور کیفیات علم آب

"علم آب جس کو یونانی زبان میں ہیڈرس ٹاٹکس کہتے ہیں علم فلسفۂ طبیعی کی ایک نوع ہے جو طبیعت اور ثقل اور دباؤ اور حرکت اکثر سیال کی ظاہر کرتا ہے"

وہ اجزا کہ جن سے سیال بناہے فرض کئے ہیں کہ نہایت خرد اور گول اور مستقل ہیں" اور یہ بھی فرض کیا گیا ہے کہ وے اجزا نہایت سخت اور بہت دبنے کے قابل نہیں ہیں۔ "جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے اس قدر پانی میں ڈوبے گا کہ ایک مقدار آب اس جسم کے ٹکڑے کے برابر جو پانی کی سطح کے نیچے ہے اس کے تمام جسم کے ہم وزن ہوگا" ہیڈرامیٹر کو شراب اتارنے کی جایوں میں شراب کی قسمیں دریافت کرنے اور ان کا محصول مقرر کرنے کے کام میں لاتے ہیں"

"سفن ایک مڑی نلی ہے"

"کوئے سے پانی کا چڑھنا جو سنے کے پمپ میں ہوا کے دباؤ سے ہوتا ہے اور ۳۲ فیٹ

تک چڑھتا ہے :

" ہمیشہ پانی کی یکساں دھار دونوں نلوں میں کے ڈاٹوں کے متواتر حرکت کرنے سے حاصل ہوتی ہے "

پہلی گفتگو

" تلمند کلاں " تلمند خرد ۔ حیدروا سٹاٹکس کمال لفظ ثقیل اور اجنبی ہے ۔ اکثر نام جو ان علوم میں آئے ہیں یونانی ہیں اور ہر لفظ دوسری زبان کا جب تک محاورے میں نہ آوے ثقیل معلوم ہوتا ہے اور اصل وضع سے بعضے نام کے معنی مفرد ہوتے ہیں اور بعضوں کے مرکب ۔ یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے ایک حیدرو جو اس زبان میں پانی کو کہتے ہیں دوسرا اسٹاٹکس مطلقاً اس علم کو کہتے ہیں جس سے ثقل و خفت اجسام کی معلوم ہوتی ہے ۔ چونکہ اس علم سے مقتضائے طبیعت تمام اجسام کا اور ثقل و خفت انھوں کی اور حرکت کرنا .... انھوں کا اور ترکیبیں اجسام غیر سیال کے وزن کرنے کی انھوں میں دریافت کرتے ہیں اس جہت سے اس علم کو حیدروا سٹاٹکس یعنی علم آب کہتے ہیں "

نواب شمس الامرا نے علم کیمیا کی بعض انگریزی کتابوں کا ترجمہ کروایا تھا ۔ کتب خانہ آصفیہ میں ہمیں " کیمسٹری کا مختصر رسالہ " ملا ۔ مصنف کا نام ریورنڈ جان ٹائم ہے ۔ کتاب قلمی ہے ۔ دیباچہ میں لکھا ہے ۔ " یہ رسالہ مختصر علم کیمسٹری کا حسب الحکم حضرت نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر دام اقبالہ کے ترجمہ کیا گیا کہ جس میں تبدیل اور ترکیب عناصر اور چند اصول علم کیمسٹری کا بیان ہے اگرچہ اس علم میں بڑی بڑی کتابیں مع دلائل انگریزی زبان میں ہیں لیکن ساکنان فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو بالکل آگاہی نہ تھی اس واسطے ریورنڈ جان ٹائم صاحب کا مختصر رسالہ انگریزی زبان سے اردو عبارت میں لکھا گیا کہ تا ناواقف لوگوں کو کچھ کچھ اس علم کے اصطلاحات سے آگاہی ہووے اور یہ رسالہ مرتب ہوا نو باب اور سو امتحانات پر ۔ سنہ ۱۲۵۹ھ مطابق سنہ ۱۸۴۳ء "

کتاب کے شروع میں اصطلاحات کے ترجموں کی فہرست بھی دی گئی ہے ۔

"نام دوائیوں کے انگریزی معہ ترجمہ"

سلفرک اسڈ	گندک کا کشتہ
میورائیک اسڈ	کھانے نمک کا کشتہ
نیٹرک اسڈ	شورے کا کشتہ
آلو آئیل	زیتون کا تیل
ٹرمرک	ہلدی
مرکری	پارا
سلفٹ آف کوپر	نیلا تھوتھا
نیٹرٹ آف پٹاس	شورہ
سوب برٹ آف سوڈا	سہاگہ
نٹریٹ آف سلور	سفوف نقرہ
نٹریٹ آف کاپر	تانبے کا شورہ
گولڈ لیف	سونے کے ورق
ٹرمرک پیپر	ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ

بعض انگریزی اصطلاحات مثلاً سنتھی سس، انیلیس، سوڈیم پٹاسیم، وغیرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"کیمسٹری وہ علم ہے کہ جس سے اجسام کا باہم گل دریافت کیا جاتا ہے اور اس سے اجسام قدرتی کے اجزا نمود ہوتے ہیں خواہ حالت بساطت میں ہوں یا حالت ترکیب میں اس علم کے مرکبات کی ذات کو پہچانتے کے واسطے دو ترکیبیں ہیں چنانچہ سنتھسس اور انلسس۔ سنتھسس ایک لفظ ہے کہ اس کا معنی دو جسم یا زیادہ اجسام سے اتصال کیمسٹری حاصل کرنا ہے۔ اور انلسس وہ لفظ ہے کہ اس کا معنی ہر ایک جسم کو جدا کرنا اور جدی جدی حالت میں دکھلانا ہے۔"

ڈکامپزیشن

الیکٹرسٹی

نیٹرک آسڈ

تھرمامیٹر

کنڈکٹر

نان کنڈکٹر (بعض مقامات پر نن کنڈکٹر بھی لکھا ہے)

پسٹن

سلنڈر

کاسٹک

میگنشیا

جن اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :-

قوت جاذبہ ۔ خواہش رغبت محبت	Attraction.
قلم	Crystal.
مہوس	Chemist.
جامد	Solid.
سیال	Liquid, Fluid.
ہوائی	Gas.
سنگ چقماق	
گھلنے کی خاصیت	Solubility.
بھون	Iron filings.
شعلہ گیر۔	Inflamable.

Borax. سہاگہ

Starch. نشاستہ

سریش

گلشی

Heat. حرارت

اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ کتاب "بطریق مکالمہ" لکھی گئی ہے۔ اصل انگریزی کتاب اور مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ اس کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا گیا کہ ترجمہ کس شخص یا جماعت نے کیا۔

سوال۔ کس طرح معلوم کیا جاتا ہے کہ فلانی چیز اسڈ ہے یا نہیں۔

جواب۔ پہلے ذریعے دوسرے یہ کہ جتنی نیلی چیز نباتاتی اس میں ڈالی جاوے ان کو سرخ کر دیتا ہے۔

سوال۔ سلفورک اسڈ کیا کام آتا ہے۔

جواب۔ رنگین کپڑے کو جو سفید کیا چاہیں تو یہی اس کی دوا ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ تین حصے پانی میں اس کا ایک حصہ ملا دیا جاوے تو اس کی گرمی تین سو درجے تک تھرمامیٹر کے ہوتی ہے۔ تو کھولتے پانی کی گرمی سے اس کی گرمی سوم حصہ زیادہ ہے اور اس کے سبب سے جو ہیڈروجن گاس نکلتا ہے اس کی ترکیب آگے ہی لکھی گئی ہے۔

ایک اور مقام سے تھوڑی سی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

"سوال۔ ڈیکامپزیشن کے کیا معنی ہیں۔

جواب۔ کسی مرکب کے اجزائے بسیط کو جدا کرنا۔ مثلاً ایک روٹی لو اور اس میں جو میدا خمیر نمک پانی ہے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرو۔ یہی ڈیکامپزیشن کہلاتا ہے اسی طرح آب و آتش خاک و باد ہر ایک ان میں سے ڈیکامپزیشن ہو سکتا ہے۔

سوال۔ اگر یہ سب مرکب ہیں تو کونسی چیز بسیط ہے۔

جواب - یوں تو پچاس ساٹھ چیزیں بسیط ہیں پر یہاں چاروں مفرد نہیں چنانچہ ہوا دو چیزوں سے مرکب ہے یعنی آکسیجن اور نیٹروجن اس کا بیان مفصل آگے ہوگا ۔

نواب فخر الدین خاں کے فرزند عمدۃ الملک نواب رفیع الدین خاں نے مغربی اور جدید ترین علوم و فنون کو اُردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ ان کے ایما سے رسالہ علم ہند ۱۲۵۱ھ رفیع الحساب ۱۲۵۲ھ رفیع البصر رفیع الصنعت اور رفیع التراکیب ۱۲۶۱ھ جیسی متعدد کتابیں شائع ہوئیں لیکن ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ یہ تصانیف ہیں یا تراجم رفیع الدین خاں کی بعض کتابیں ان کے والد نواب فخر الدین کی زندگی میں شائع ہوئیں ۔

نواب ابوالخیر خان بہادر نامور جنگ شمس الامرا کے حکم سے ۱۳۰۲ھ میں جان مارٹس ساکن حیدرآباد نے الیمانی امین صاحب کی ایجاد " رسالہ ہومیو پاتک " کا ترجمہ کیا ۔ یہ کتاب مطبع رحمانی حیدرآباد میں چھپی ہے ۔ اور ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔

ترجمہ کی عبارت فارسی آمیز ہے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

حق تعالیٰ عز شانہ نے انسان ضعیف البیان کو عقل سے مکمل کیا اور ضرورت اور منفعت کے صدہا فوائد بخشے جس کے سبب بنی آدم کا رتبہ اشرف المخلوقات ہے ۔ انسان بیماری دور کرنے کے لئے قوت کثیف اور معین اپنے اندر رکھتا پس اس عقل پر واجب ہے کہ جسم کے امراض دفع کرنے سریع التاثیر اور قوی العمل کے علاج کو معلوم کرے جو مشیت ازدی سے اس کے وجود میں مطلقاً نہیں ہے ۔ لیکن جب یہ بات ہم کو قدرت سے مرحمت نہیں ہوئی تو اس طبیعت کو ہمارے حاجتوں کے لئے کافی نہ جاننا چاہئے ۔ بلکہ بہبودی اور خوبی کے واسطے عقل کے خزانے کو لاتعین طور سے صرف کرنا ضرور ہے

شاہان اودھ

اس عہد میں اُردو ترجموں کا تیسرا اور آخری مرکز لکھنؤ تھا ۔ شاہان اودھ نے لکھنؤ میں جدید مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئے ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	(١٠)
[illegible]	(٥)
[illegible]	(٧)
[illegible]	(٢)
[illegible]	(٨)
[illegible]	(٩)
[illegible]	(٤)
[illegible]	(٨)
[illegible]	(٨)
[illegible]	(١)

[illegible]

انفرادی کوششیں

گزشتہ صفحات میں ہم نے صرف اجتماعی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ مختلف افراد نے انفرادی طور پر جو ترجمے شائع کرائے ان میں اکثریت تاریخی کتابوں کی ہے۔ ایک ترجمہ ۱۸۲۹ء میں چھپا جس کا نام "قاصدین سوپولوس مودین والیان کون لیکھوبیین سو کا غذ ہے" نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب دکنی زبان میں ہے۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء تک یعنی بیالیس سال کے عرصہ میں جو ترجمے شائع ہوئے ان میں حسب ذیل مطبوعات شامل ہیں۔

ٹائٹلر کی ایلیمنٹس آف جنرل ہسٹری کا ترجمہ ایل ڈی کاسٹا نے ۱۸۲۹ء میں جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ "تاریخ انگلینڈ کی" ۱۸۴۰ء میں مدراس میں چھپی۔ ڈاکٹر گولڈ سمتھ کی کتاب کا اردو ترجمہ "تاریخ روم" کے عنوان سے ۱۸۴۱ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ "تاریخ ملک چین" جیمس کورکورن کی تاریخ کا ترجمہ ۱۸۳۱ء میں بہ مقام کلکتہ شائع ہوا۔ مشہور انگریزی ناول نگار جان بنیان کے مشہور ناول پلگرمس پروگرس کا ملخص ترجمہ ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۱۸۳۹ء میں سید محمد میر نے مشہور انگریزی ادیب ڈاکٹر جانسن کے ناول راسلس کا ترجمہ "قصہ راسلس ولایت حبش کے شہزادے کا" کے عنوان سے کیا۔ ۱۸۲۵ء میں "داؤد کے زبور" سرام پور سے شائع ہوئی۔ راجہ کالی کرشنا بہادر نے مسٹر گے کے فیبلس کا ترجمہ ۱۸۳۶ء میں کلکتہ میں شائع کیا۔ ۱۸۴۲ء میں "خلاصہ علم الارض" کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی۔

ابابیل

اس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامولہار کے بچے نے اس کے بیل کی دم میں کانٹے باندھ دیئے تھے تو مارتے مارتے اس کو ادھ موا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہو لہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کمبخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہہ دیا "ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے"۔ بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ بیٹھے بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیئے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا 'نتھو' دوسرے کو 'چھدو'۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا "کیوں بے 'نتھو' تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورا کرے گا۔ اور ابے 'چھدو' تیری بھی شامت آئی ہے کیا" اور پھر ان غریبوں کی شامت آ ہی جاتی۔ سوت کی رسی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک کم ہے، بیوی کو

ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کررہا ہے، اس کو اٹھا اٹھا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بیہوش کردیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کی بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بیچارے کیا کرسکتے تھے اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی ہوگئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا "ہلاس پور کی طرف جاؤ تو ذرا نورو کو لیتے آنا" بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہوگیا۔ "میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا"

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا۔ اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اتارنے کے لئے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پاکر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لئے اپنی ماں کے پاس رام نگر جارہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لئے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لئے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلاف معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کررہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولہے کو جاکر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پئے ہی پڑ کر سو رہا۔

تھوڑا ہی چلی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔

اندر آ کر کواڑ بند کئے اور چراغ جلا کر اجالا کیا۔ حسب معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دئے۔ "ارے او بندو۔ ارے او نورو" پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دئے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کر کے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو زمیندار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ "ارے بندو۔ ارے نورو۔ کہاں مر گئے۔ آج تمہیں کون کھانا دے گا؟" چند ابابیل کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

"بیچارہ پاگل ہو گیا ہے" کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا "صبح کو شفاخانہ والوں کو پتہ دیدیں گے کہ پاگل خانہ بھجوا دیں۔"

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفاخانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

دنیا میں ذخیرۂ غذا

(ذیل کا مضمون "الہلال" (مصر) کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے)

دنیا کی آبادی تقریباً ایک ہزار آٹھ سو ملین ہے۔ کرۂ ارض میں خشکی کا رقبہ، منطقۂ قطبی کے خشکی حصہ کو علیحدہ کر لینے کے بعد ۳۳ ہزار ملین ہے۔ اور اس کا نصف حصہ مشکل سے کاشت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ معاشیین کا خیال ہے کہ فی شخص پانچ ایکڑ زمین زیست کے لئے کافی ہے۔ تو گویا اگر کرۂ ارض کے تمام خشک حصے، کاشت کے قابل بنائے جائیں تو چھ ہزار ملین آبادی کی گذر اوقات کے لئے کافی ہوں گے۔ اور اگر صنعت و زراعت کی موجودہ ترقی قائم رہی تو چھ ہزار ملین نفوس کرۂ ارض پر نہایت سہولت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔

انیسویں صدی کے دو بڑے ماہر اقتصادیات — ریکارڈو اور مالتھس کا خیال تھا کہ اس وقت انسان نے اگرچہ پیداوار کے بڑھانے کے لئے مختلف سینٹیفک وسائل ایجاد کر لئے ہیں لیکن اس کے باوجود پیداوار، آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ صنعتی وسائل بہ نسبت زرعی وسائل کے زیادہ ترقی پذیر ہیں — انسان نے زراعت سے زیادہ صنعت کی طرف توجہ کی اور اسے ترقی کے آخری زینہ تک پہونچایا لیکن ان کا یہ خیال تمام ممالک کے لئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ولایات متحدہ میں زراعت کو جس قدر فروغ حاصل ہے وہ صنعت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو بہت حد تک ابھی ترقی دینے کی گنجائش ہے۔ وہاں کے ماہرین زراعت ہر طریقہ سے زرعی پیداوار کو ترقی دینے اور اس کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ زمین کے تمام خشک حصے کو قابل زراعت بنا لینا توسیع زراعت کے سلسلہ میں آخری اقدام ہے۔ کیونکہ سائنس زراعت کی ترقی کے لئے روزانہ جدید وسائل دریافت کرتی رہتی ہے، جو زمین کی پیداوار اور غلہ

زیادتی میں معین ثابت ہوئے ہیں اگر سائنس کے یہ اکتشافات ایزاونس کے ساتھ قائم ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آبادی میں چاہے جس قدر بھی اضافہ ہو جائے مگر خوراک کبھی کم نہیں ہو سکتی۔

دنیا میں ذخیرۂ طعام کی مختلف قسمیں ہیں۔ جنھیں حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ غلہ۔ مثلاً گیہوں، چاول
۲۔ ترکاری۔ مثلاً لوبیا، سیم
۳۔ نبات۔ مثلاً گنا، آلو
۴۔ روغن دار تخم۔ مثلاً تخم روئی، تل
۵۔ بری حیوانات۔ مثلاً بکری، گائے، طیور
۶۔ آبی حیوانات۔ مثلاً مچھلی وغیرہ

یہی ذخیرۂ خوراک ہے جسے زیادہ تر لوگ استعمال کرتے ہیں اور جن پر ہم آگے چل کر اختصار کے ساتھ ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کریں گے۔ لیکن اسے ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بہت سے ایسے اسباب بھی ہیں جن کا ذخیرۂ خوراک اور پیداوار پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ مثلاً (۱) قابلیت زمین (۲) زراعتی معلومات (۳) اسباب زندگی (۴) ایک جگہ سے دوسری جگہ خوراک کے نقل و حرکت کے وسائل (۵) آبادی سے مرکز غذا کا قرب و بعد۔

قارئین کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ اقسام خوراک میں ہم نے پھلوں کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر پھلوں کو غذا میں شمار نہیں کیا جاتا اور عموماً بطور غذا کے استعمال بھی نہیں ہوتے۔

۱۔ غذاؤں میں سب سے زیادہ اہمیت غلہ کو حاصل ہے درحقیقت یہ انسان کی توجہ کا بہت زیادہ مستحق بھی ہے کیونکہ اس میں کالوری (گرمی کی مقدار) بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ولایات متحدہ کے باشندے غلہ ہی کو اپنی مستقل اور اصلی غذا خیال کرتے ہیں۔ اور مشرق کی تو ایک بڑی جماعت کی غذا کا انحصار محض غلہ پر ہے۔ خصوصیت کے ساتھ گیہوں، چاول، باجرہ، جو

جئی، اور جاودار (Rye) کو ان کی غذا میں بہت دخل ہے۔

دنیا میں غلہ کی پیداوار کا ہم ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ مشرقی ممالک کی پیداوار یکسر غیر معروف ہے۔ مگر علماء اقتصادیات نے حسب ذیل مقدار میں اندازہ لگایا ہے۔

گیہوں	ایک ہزار میں اردب[1]
جاودار (Rye)	چارسو " "
باجرہ	ایک ہزار میں اردب
جئی (oats)	" " "
جو	چارسو " "
چاول	ایک ہزار " "
دوسرے اقسام کے غلے	چھ سو " "

ان تمام کا مجموعہ تقریباً پانچ ہزار چار سو اردب ہوتا ہے۔ اور یہ مقدار تقریباً ہر سال پیدا ہوتی ہے ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ کل آبادی اٹھارہ ہزار میں ہے تو گویا فی کس سالانہ ۳ اردب کا اوسط ہوتا ہے اور یہ مقدار ایک شخص کے لئے نہ صرف کافی بلکہ زیادہ ہے۔

غلوں کی پیداوار کا انحصار مختلف اسباب پر ہے جنہیں محنت اور مصارف کی کمی کو بہت دخل اور اہمیت حاصل ہے۔ اسی بنا پر جہاں جس کی کاشت میں سہولتیں زیادہ حاصل ہیں اور مزدوری کم لگتی ہے وہاں اس کی کاشت بہت زیادہ ہے مثلاً مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان اور چین میں چاول کی پیداوار بہت کافی ہوتی ہے۔ اگر وہ تمام وسائل جو غلہ کی پیداوار کے ضمن میں استعمال ہوسکتے ہیں، کام میں لائے جائیں تو موجودہ مقدار میں حیرت انگیز اضافہ ہوسکتا ہے۔

۲۔ غذا کی دوسری قسم میں ترکاری داخل ہے ——— ترکاری قدیم زمانہ سے انسان کی

---

[1] ستر سیر ۱۲ تولہ کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔

غذا ہے۔ افسوس کہ اس کی پیداوار کا ہمیں صحیح طور پر علم نہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی
تک اکثر مشرقی ممالک نے اس کی زراعت کو کسی خاص طرح پر منظم نہیں کیا ہے اس کی علت غالباً
یہ ہے کہ بہ نسبت غلہ وغیرہ کے اس کی تجارت میں بہت سی دشواریاں اور مشکلات ہیں اور اس میں
نقصان کا بھی بہت زیادہ امکان ہے۔

یہ بالکل واضح ہے کہ ترکاریوں میں عموماً پروٹین (نشاستہ) اور روغنیت کی مقدار بہت کافی
ہوتی ہے اس لئے اس میں اس بات کی پوری صلاحیت ہے کہ وہ گوشت کی قائم مقام بن سکے۔
عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جن ممالک کی آبادی زیادہ ہے وہاں ترکاری کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے
اگر آپ ہندوستان، چین، جاپان اور ان دیگر ممالک کو بغور دیکھیں جہاں آبادی بہت زیادہ ہے
تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ترکاری کی کاشت کو نہایت سرعت کے ساتھ فروغ حاصل ہو رہا ہے
اور وہاں ترکاری بتدریج گوشت کی جگہ حاصل کر رہی ہے۔ مشرق میں ترکاری کی کثرت کی ایک
سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی بعض قومیں خصوصاً ہندوؤں کی بعض جماعتیں گوشت
کا کھانا بالکل حرام سمجھتی ہیں اور وہ اس کمی کو غلہ اور ترکاریوں سے پوری کرتی ہیں۔ چین میں بھی ترکاری
بہت کثرت سے استعمال کی جاتی ہے مگر اس کی وجہ گوشت کی گرانی اور ترکاری کی ارزانی ہے
یعنی اقتصادی حالات نے ترکاری کے استعمال اور گوشت کے ترک پر مجبور کیا۔ آج کل بعض یورپین
قومیں بھی چینی سیم (Soy Beans) کی کاشت پر بہت زیادہ توجہ مبذول کر رہی ہیں
کیونکہ اس میں غذائیت اور پروٹین بہت کافی مقدار میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نہایت
آسانی سے گوشت کی قائم مقام ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے
کہ یہ بہت زیادہ ارزاں ہوتی ہے جسے غربا بھی بغیر کسی زحمت کے استعمال کر سکتے ہیں۔

علمی اور زرعی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ ایک ایکڑ زمین کے
غلہ میں پروٹین کی جو مقدار ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اتنی ہی زمین کی پیدا کردہ ترکاری میں
ہوتی ہے۔ اسی بنا پر یورپ میں غذا کی کمی اس قدر واقع نہیں ہوتی جتنی چین وغیرہ میں پائی جاتی ہے

اور نہ ایک طویل مدت کے لئے اس قسم کا خطرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یورپ زرعی کے بجائے صنعتی ملک ہے۔ اس لئے اس کی غذا ترکاری کے بجائے زیادہ تر گوشت ہے لیکن وہ ممالک جو اپنی مصنوعات اور غلے کی نکاسی پر قدرت نہیں رکھتے ان کی کوشش عموماً یہ ہوتی ہے کہ اپنے یہاں کی مروجہ غذا کی کاشت کو بہتر سے بہتر طریقہ پر منظم کریں۔

۳۔ تیسری قسم میں ہم نے نبات کو رکھا ہے۔ اس میں گنا، چقندر، آلو اور گاجر وغیرہ داخل ہیں۔ ان میں نشاستہ اور کاربو ہائی ڈریٹ (Carbohydrates) بہت زیادہ ہوتی ہے اور پروٹین اور دہنیت سے بالکل پاک ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ غذائیت میں کسی طرح کم نہیں ہوتیں دوسرے یہ کہ یہ کبھی شاذ و نادر ہی خراب ہوتی ہیں۔

گنے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جنگ عظیم سے قبل شکر کی پیداوار دنیا بھر میں ۱۸ ملین ٹن تھی۔ مگر اب اس کی پیداوار ۲۵ ملین ٹن ہے جس میں سے ۱۶ ملین ٹن گنے سے تیار ہوتی ہے بقیہ ——— ۹ ملین ٹن ——— چقندر سے۔ لیکن جنگ عظیم نے بالکل کایا پلٹ دی۔ یہ گنے کے حق میں بہت زیادہ مفید اور چقندر کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئی۔ مگر اب اس میں تغیر ہو چلا ہے۔ چقندر کی کاشت اپنی پہلی حالت کی طرف واپس آرہی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اقالیم معتدلہ میں۔

بہر حال ان دونوں کی کاشت کے لئے میدان بہت زیادہ وسیع ہے انھیں اس قدر ترقی دی جا سکتی ہے کہ موجودہ آبادی کے دس گنا اضافہ کے لئے کفایت کر سکتی ہیں۔ و نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا سال ختم نہ ہوگا کہ دوسرے سال شکر کی مقدار ترقی کر کے ۴۰ ملین تک پہونچ جائے گی۔

آلو کو غذا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہر جگہ عموماً اور یورپ و شمالی امریکہ میں خصوصاً بہت استعمال کیا جاتا ہے حتیٰ کہ تقریباً دسترخوان کے لوازمات سے ہو گیا ہے گذشتہ سال اس کی پیداوار تقریباً ۱۲۰ ٹن تھی (واضح رہے کہ روسی پیداوار اس میں داخل نہیں ہے جس کی مقدار بہت کافی ہے) اور یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں آلو کا جس قدر رواج ہے مشرقی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اُردو رسم خط میں ایک تبدیلی کا مشورہ

کسی زبان کی بقا و ترقی کے لئے دو باتوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ آسان و مفید ٹائپ

۲۔ پڑھنے میں سہولت

لیکن بدقسمتی سے اُردو ابھی تک ان دونوں باتوں سے محروم رہی ہے ٹائپ کی غیر موجودگی سے اُردو کو جو کچھ نقصان پہنچا رہا ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ کاتب سے لکھوانے۔ پتھر پر اتارنے اور پھر چھاپنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان سے بھی کوئی بے خبر نہیں۔ کبھی حرف اڑ جاتے ہیں۔ کبھی پتھر ٹوٹ جاتا ہے اور کبھی کاتب بیمار پڑ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں اسی خامی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی کے باوجود اُردو اخبارات و رسائل کو وہ آسانیاں حاصل نہیں جو انگریزی اخبارات و رسائل کو حاصل ہیں۔ اس لئے ایک حد تک اُردو اخبارات کا حلقۂ اشاعت انگریزی اخبارات کے مقابلہ میں محدود ہونے کا سبب بھی اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی سبب سے اُردو اخبارات کے مقابلہ میں ہندی و انگریزی اخبارات کو یہ فوقیت بھی حاصل ہوگئی ہے کہ اُردو اخبارات ہندی و انگریزی اخبارات کی طرح تصاویر نہیں چھاپ سکتے کچھ عرصہ سے چند اخبارات نے ابتدائی و آخری صفحوں میں تصاویر دینا شروع کر دی ہیں۔ لیکن اس میں ان کا کافی صرفہ ہو جاتا ہے۔

اب میں ان چند ہی نقصانات کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے ان باتوں کی تشریح کرتا ہوں جنھوں نے ابھی تک اُردو کو مفید و آسان ٹائپ کے وجود سے محروم رکھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی تجویز بھی پیش کرتا ہوں جس کو عملی جامہ پہنانے سے نہ صرف ان نقصانات کی تلافی ہو جائے گی اور انگریزی سے بہتر اُردو ٹائپ بن جائے گا بلکہ اُردو پڑھنا اس قدر آسان ہو جائے گا کہ اس کے سیکھنے میں چند دن سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔ یا بالفاظ دیگر جس قدر جلد کوئی شخص حروف تہجی اچھی طرح پہچاننے لگے گا۔ اسی قدر جلد وہ

اُردو پڑھنا بھی سیکھ جائے گا۔

ٹائپ کے لئے حرفوں کا علیحدہ علیحدہ ہونا نہایت ضروری ہے یا اگر ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہوں تو اس طرح کہ ان کی حقیقی شکل پر کسی قسم کا فرق واقع نہ ہو۔ لیکن اُردو کے موجودہ رسم الخط میں اس کے بالکل برخلاف ایک حرف دوسرے حرف سے اس طرح چھوٹے چھوٹے شوشوں اور قوسوں کے ذریعہ ملا ہوتا ہے کہ ایک خاص حصہ یا نشانی کے علاوہ اس حرف کی حقیقی شکل قطعاً باقی نہیں رہتی۔ یہی نہیں بلکہ مقام استعمال و موقع کے اعتبار سے یہ حصہ یا نشانی بھی بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً "عرب" اور "ربع" میں ایک ہی حرف استعمال ہوتے ہیں لیکن دونوں جگہ حروف کی شکل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اب اگر اُردو نستعلیق ٹائپ بنایا جائے تو ان دو لفظوں کے لئے تین کے بجائے چھ حرف رکھنا پڑیں گے لیکن اگر ان ہی لفظوں کو متصل حروف کے بجائے علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ لکھا جائے تو صرف تین ہی حروف درکار ہوں گے۔ مثلاً "عرب" کو "ع ر ب" اور "ربع" کو "ر ب ع" لکھا جائے تو جائے استعمال بدلنے کے باوجود حروف کی شکل میں اختلاف نہیں ہوتا۔

حروف کی اشکال کی تبدیلی سے زیادہ ان کے ملانے والے شوشوں و قوسوں کی کثرت اُردو ٹائپ کی راہ میں حائل ہے۔ ایک ہی حرف کو مختلف حروف سے ملانے کے لئے مختلف شوشے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ مثلاً جب "ب" یا اسی قسم کے دوسرے حروف "ن۔ت۔ر۔ وغیرہ" کو "خ۔ د۔ ر۔ ط۔ ی وغیرہ" سے ملاتے ہیں تو ہر حرف کے لئے ایک مخصوص شوشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ الفاظ:۔ بخت ۔ بد ۔ بر ۔ بط ۔ بی

کو غور سے دیکھئے۔ ہر شوشہ دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس اعتبار سے اُردو نستعلیق ٹائپ میں صرف ایک حرف کے لئے پانچ شوشے رکھنا پڑیں گے جو بجائے خود مکمل حروف کے برابر ہوں گے۔ لیکن اب ان ہی الفاظ کو علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ

ب خ ت   ب د   ب ر   ب ط   ب ی

کی طرح لکھا جائے تو صرف ایک ہی حرف سے کام نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد الفاظ

شاہ ۔ نامہ ۔ شہر ۔ بارش

کو لیجئے دیکھئے ہائے ہوز موقع و محل کے لحاظ سے چار مختلف طریقوں سے لکھی گئی ہے اور ہر جگہ اس کی شکل جداجدا ہے۔ لیکن اگر ان ہی الفاظ کو

ش ا ہ   ن ا م ہ   ش ہ ر   ہ ا ر

کی طرح لکھئے تو تین حروف کی بچت ہو جاتی ہے۔ غرضکہ اس طرح اشکال حروف کی تبدیلی اور شوشوں کی کثرت نے اردو ٹائپ کی راہ میں سینکڑوں مشکلیں حائل کر دی ہیں اور یہی وجہ تھی کہ برسوں کی کوششوں و دماغ سوزیوں کے باوجود بھی کوئی صاحب ایک عرصہ تک اردو نستعلیق ٹائپ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اگرچہ عبدالکریم صاحب حسینی کی کوششیں ایک حد تک بارآور ہوئیں اور اردو نستعلیق ٹائپ بن گیا جس کے لئے صاحب موصوف قابل تحسین و مبارکباد ہیں لیکن شوشوں اور اشکال حروف کی کثرت نے اس ٹائپ کی کامیابی میں بھی وہی موانع پیدا کرئے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

آج کل اردو اخبارات اور خاص کر روزناموں کو ٹائپ کی شدید ضرورت ہے کتابت و طباعت میں جو ایک ہی عمل کا اعادہ کرنا پڑتا ہے اس میں بہت سا وقت ضایع ہو جاتا ہے حسینی صاحب کے ٹائپ میں اعادۂ عمل کے بجائے مخصوص شوشوں اور مستقل حروف کی مقامی شکلوں کی تلاش میں کم و بیش وہی وقت پیش آتی ہے اور کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث عجلت کے مضامین اور روزانہ اخبارات کی طباعت و اشاعت میں وہ آسانی کسی طرح بھی پیدا نہیں کی جا سکتی جو انگریزی اخبارات کو حاصل ہے۔ لیکن اگر ہر لفظ کے حروف کو علیحدہ علیحدہ بغیر ملائے ہوئے لکھا جائے تو پھر انگریزی ٹائپ سے بھی زیادہ آسانی پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ انگریزی کے چھوٹے بڑے حروف (capital and small letters) کی کل تعداد اردو کے حروف تہجی سے تقریباً ڈیڑھ گنی زیادہ ہے۔

ؔ اگرچہ ہائے مخلوط (ھ) بھی ہائے ہوز ہے۔ لیکن اس کے مخلوط التلفظ ہونے کی صفت کے باعث اس کو ایک علیحدہ حرف قرار دیتے ہوئے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اب میں ٹائپ کو چھوڑ کر اپنے مضمون کے دوسرے حصہ پر بحث کرتا ہوں جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اُردو نہ تو حکمراں قوم کی زبان ہے اور نہ اس کو اب سے پچاس سال قبل کی طرح پورے ملک کی حمایت و سرپرستی حاصل ہے۔ بلکہ اب اس کو انگریزی و ہندی کا مقابلہ کرنا ہے۔ جن میں سے ایک تو حکومت کی سرپرستی میں جڑیں پکڑ رہی ہے اور دوسری اکثریت کی حمایت سے پروان چڑھ رہی ہے ایسی صورت میں صرف ایک ہی شے ہے جو لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلا سکتی یا اس کے حاصل کرنے کے لئے آمادہ کر سکتی ہے اور وہ "پڑھنے میں سہولت" ہے۔

اگر ایک شخص کو معلوم ہے کہ وہ دو دن میں اُردو پڑھنا سیکھ جائے گا تو یقین کیجئے ہندو ہونے کے باوجود اور "ہندی اُردو قضیہ" کی پیدا کردہ متعصبانہ فضا کے زہر انداز ہوتے ہوئے بھی وہ اُردو سیکھنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف اگر اُردو پڑھنے میں وقت ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لئے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے تو ایک مسلمان بھی کچھ عرصہ تک کوشش کرنے کے بعد اکتا کر چھوڑ دے گا۔ یہ یاد رکھئے ایک شخص قومیت کے نام پر اپنے وقت کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے لیکن اپنی آسان طلب فطرت پر غالب نہیں آ سکتا۔

اگرچہ اُردو میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو اس کو ہندی و انگریزی سے بالاتر ثابت کرتی ہیں اور جن کا اعتراف منشی پریم چند نے بھی کیا ہے تاہم ابھی اس میں وہ آسانیاں موجود نہیں جو انگریزی کی بڑھتی ہوئی ترقی کے مقابل اُردو کا پرچم لہرا سکیں یا ہندی سیلاب کو روک سکیں جو اکثریت متمول طبقہ کی زیر حمایت برابر آگے بڑھ رہا ہے ایسی صورت میں یہ ہمارا فرض ہونا چاہئے کہ اُردو میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کر کے اس کی اصلاح کریں اور اسے اس قدر آسان بنا دیں کہ حکومت و اکثریت دونوں کو ہمارے سامنے جھکنا پڑے۔ ورنہ بصورت موجودہ اس کی کامیابی کسی طرح بھی یقینی نہیں کہی جا سکتی۔

اُردو کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ ہے کہ اس کے پڑھنے میں بہت دقت ہوتی ہے اور یہ دقت تمام تر حروف کے اتصال کے باعث ہے۔ حرفوں کی حقیقی اشکال سے تو طالب علم ابتداء ہی میں واقف ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا لیکن حرفوں کے اتصال

سے جو مقامی شکلیں پیدا ہوتی ہیں ان کا سمجھنا ایک مبتدی کے لئے نہایت دقت طلب امر ہے کیونکہ ان سے وہ اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ بار بار اس کی نظر سے گذر کر ذہن میں نقش نہ ہو جائیں اور اس کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور ایک شخص زیادہ عرصہ تک اپنے ارادہ پر اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جبکہ جو کچھ وہ پڑھتا جائے وہ اس کے سمجھ میں آتا جائے۔ کیونکہ اس طرح اُسس کو اپنی کامیابی پر انتہائی مسرت ہوتی ہے جو اس کی دلچسپی کو بڑھاتی اور آگے پڑھنے کے لئے آمادہ کرتی ہے لیکن اُردو میں اس کے برعکس طالب علم اس دوران میں حرفوں کی تبدیلیوں اور حروف کی مقامی اشکال کی یکسانیت کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر گھبرا جاتا ہے۔

ایک طالب علم کو حروف تہجی یاد کرنے کے دوران میں معلوم ہوتا ہے کہ ہائے ہوز کی شکل " ہ " کی طرح ہے لیکن جب وہ لفظ " ہار " پڑھتا ہے تو اس کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا پہلا حرف ہائے ہوز ہے جو پہلی شکل سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے بعد جب وہ لفظ " شہر " پر پہنچتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا دوسرا حرف ہائے ہوز ہے۔ جو پہلی دوسری دونوں شکلوں سے مختلف ہے۔ پھر لفظ " نامہ " تک پہنچنے پر بتایا جاتا ہے کہ اس کا آخری حرف ہائے ہوز ہے جو پہلی۔ دوسری اور تیسری تینوں شکلوں سے مختلف ہے۔ اب بتائیے ایک مبتدی جو آسانی کا متلاشی ہوتا ہے کیا گھبرا نہ جائیگا کیا وہ ان سب کو یاد رکھ سکے گا۔ کیا یہ خیال اس کو بددل نہ کرے گا کہ شاید ہائے ہوز ابھی اور باقی ہوں یا جس طرح ہائے ہوز کئی ہیں اسی طرح دوسرے حروف بھی کئی کئی ہوں گے۔

لفظ " معمر " کو لیجئے۔ اس میں " ع " اور " ر " کی شکلیں ان شکلوں سے بالکل مختلف ہیں جن کو ایک طالب علم شروع شروع میں پڑھتا ہے اس طرح لفظ " مآب " میں اول تو " م " کی شکل اصل شکل سے مختلف اور پھر " م " کے الف ممدودہ سے مل جانے کے باعث ایک ایسی شکل بن جاتی ہے جو طالب علم کے لئے بالکل نئی ہوتی ہے اور جس کا سمجھنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

اشکال حروف کی کثرت سے زیادہ بعض حروف کی یکسانیت طالب علم کے انتشار کا باعث ہوتی ہے۔ لفظ " بد " کو دیکھئے۔ " د " کی شکل اس کی حقیقی شکل سے ذرا بھی مشابہ نہیں۔ اس کے

برخلاف " ر " سے ملتی جلتی ہے اس لئے شروع شروع میں طالب علم " بد " " بر " پڑھتے ہیں۔ لیکن جب ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ " بر " نہیں " بد " ہے تو پھر وہ " بر " کو " بد " پڑھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ بتدی کی نظر کبھی چھوٹے چھوٹے اختلافات پر نہیں پڑتی۔ برخلاف اس کے آنے والے الفاظ میں پچھے ہوئے حروف کے ساتھ مشابہت کا متلاشی ہوتا ہے۔ مجھے خوب خیال ہے کہ جب میں ابتدائی درجہ میں پڑھتا تھا تو ایک ہندو لڑکے نے جو نیا نیا داخل ہوا تھا " کا " کو " کھا " پڑھا تھا۔ جس پر عرصہ تک بچارہ کا مذاق اڑتا رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عقلمند تھا اس نے جو کچھ سمجھا اور پڑھا وہ قاعدہ اور عقل کے عین مطابق تھا۔ " کا " کا تجزیہ کیجئے آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا۔

لفظ " ہالہ " پر غور کیجئے۔ اس کے دوسرے حرف " ا " اور تیسرے حرف " ل " کی شکل میں ذرا بھی فرق نہیں۔ اس لئے طالب علم اس وقت تک ان دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتا جب تک کہ تشریح کرکے بتایا نہ جائے کہ ایسی یکساں اشکال میں " ا " کے بعد کوئی حرف ملا ہوا نہیں آتا اور " ل " میں اس کے برعکس ہوتا ہے لیکن اس قسم کی تشریحات کی جگہ جگہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو یاد رکھنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے اور یہ بجائے تسلی کے طالب علم کے ذہنی انتشار کا باعث بن جاتی ہیں،

ایک اور مشکل یہ ہے کہ شوشے اور نقطے چھوٹے چھوٹے اور قریب قریب ہوتے ہیں اس لئے بتدیوں کو یہ تمیز کرنے میں انتہائی دقت ہوتی ہے کہ کون نقطہ کس شوشہ سے متعلق ہے اور بعض اوقات تو بڑی سخت غلطی کر جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چوتھے درجہ میں پڑھتا تھا تو ایک جگہ لفظ " انجم " کتاب میں آیا۔ میں نے اس کو " اُب ثُم م " پڑھا تھا۔ جس پر ماسٹر صاحب بے انتہا ناراض ہوئے۔

شوشوں کے قرب کے علاوہ ایک خامی یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں (ی یا یے) دو حرفوں کے درمیان ملی ہوئی آتی ہے تو کوئی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ آیا وہ یائے مجہول ہے یا یائے معروف اس لئے جن طلباء کو ایسے الفاظ کا تلفظ معلوم نہیں ہوتا وہ یائے مجہول کی جگہ یائے معروف اور یائے معروف کی جگہ یائے مجہول پڑھ جاتے ہیں۔ لفظ " بیڑی " کو دیکھئے۔ آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ شوشوں اور یائے مجہول و معروف میں امتیاز نہ ہونے کے باعث کس قدر غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ بظاہر شکل کے

اعتبار سے تو یہ صرف ایک ہی لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً تین لفظ ہیں جن کا تلفظ اور حروف دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں پہلے لفظ کے معنی تو اس شے کے ہیں جسے عوام سگرٹ کی جگہ پر استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے کے مجرموں کی زنجیر اور تیسرے کے آلۂ برقی۔ اس لفظ کو مختلف اشخاص سے پڑھنے کو کہئے۔ کوئی پہلے معنی کے لحاظ سے پڑھے گا۔ کوئی دوسرے اور کوئی تیسرے لیکن اگر

ب ی ڑی　　ب ے ڑی　　ب ے ٹ ری

کی طرح علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ لکھئے تو کسی قسم کی غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا اور چند دن کا مبتدی بھی ہر لفظ کو تھوڑی سی کوشش کے بعد بآسانی صحیح صحیح پڑھ سکتا ہے۔

اس پر بعض صاحبان یہ فرمائیں گے کہ ان ہر سہ الفاظ کو ان کے موقع و محل کے اعتبار سے صحیح پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب کے لئے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ نقص ہر حالت میں باقی رہتا ہے اور کیا یہ ممکن نہیں کہ بعض جگہ تین یا دو مطالب پیدا ہوتے ہیں۔

آپ نے اکثر تجربہ کیا ہوگا کہ جن طلبا نے اردو شروع کی ہو اگر ان کو "دل آزاری" کی طرح ایسے الفاظ دیئے جائیں جن میں حرف علیحدہ علیحدہ ہوں تو وہ آناً فاناً پڑھ دیتے ہیں۔ مگر چونکہ الفاظ ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں اس لئے بعض اوقات ایک لفظ کے حرف کو دوسرے لفظ کے حرف سے ملا دیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی عبارت لکھی جائے جس میں حروف کے ساتھ الفاظ بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو یہ غلطی بھی باقی نہیں رہتی اور پڑھنے میں انتہائی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ ذیل میں اس عبارت کا ایک نمونہ دیا جاتا ہے۔

ت م[1] ک و ج س ع ل م ک ی ض رورت ہ ے و ہ و ہ
ع ل م ہ ے ج و ت م ھاری س اک ن و پ ژ م رد ہ
ق و و ت[2] ول ک و م ت ح رک اور ش گ ف ت ہ ک ر د ے

---

[1] تم کو جس علم کی ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو تمہاری ساکن و پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ کر دے۔

[2] یہاں تشدید کے بجائے ایک حرف کو مکرر لکھا گیا ہے۔ اس طرح تشدید کی ضرورت نہیں رہتی۔

آپ کو اس عبارت کے پڑھنے میں الجھن ضرور محسوس ہوگی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ اس قسم کی عبارت پڑھنے کے عادی نہیں اور برسوں سے متصل حروف سے لکھی ہوئی عبارت پڑھتے آرہے ہیں لیکن جب اس کے عادی ہو جائیں گے تو موجودہ رسم خط کی عبارت سے زیادہ جلد اور آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں گے اس عبارت کو ایک چند دن کے طالب علم کو دیجئے جو صرف حروف کی شکلوں کو پہچانتا اور زیر و زبر و پیش کے استعمال سے واقف ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بغیر آپ کی رہنمائی کے تھوڑی سی کوشش کے بعد آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر یہ رسم خط جاری ہو جائے تو اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کم از کم ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا اور جو اخبارات و رسائل اس رسم خط میں شائع ہوں گے نہ صرف ان کے اخراجات میں کمی اور طباعت و اشاعت میں آسانی پیدا ہو جائے گی بلکہ ان کا حلقہ اشاعت بھی موجودہ رسم خط کے اخبارات سے وسیع ہوگا۔

بعض اصحاب یہ اعتراض کریں گے کہ تجویز کردہ رسم خط موجودہ رسم خط کے مقابلہ میں زیادہ جگہ گھیرے گا۔ جواباً عرض ہے کہ موجودہ رسم خط میں حروف کی مقامی شکلیں اس قدر چھوٹی ہوتی ہیں کہ کاتب اس سے زیادہ باریک عبارت نہیں لکھ سکتے جتنی آج کل کے اخبارات میں لکھی جاتی ہے اور اگر لکھ بھی سکیں تو پڑھنے میں انتہائی دقت ہوگی۔ لیکن نئے رسم خط کی عبارت ٹائپ کی مدد سے کاتب سے کہیں زیادہ باریک لکھی جا سکے گی اور چونکہ حروف مکمل اور علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ اس لئے پڑھنے میں بھی کسی قسم کی دقت نہ ہوگی اور ایک حد تک اس نقصان کی تلافی ہو جائے گی لیکن اگر اس کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس رسم خط کے فوائد اس قدر زیادہ ہیں جن کے سامنے تھوڑے سے کاغذ کے نقصان کی کچھ حقیقت نہیں۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کلمات کے لکھنے کی کیا صورت ہوگی جن میں حروف شمسی اور قمری استعمال ہوئے ہوں۔ میری رائے میں اس کی بہتر اور آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حروف قمری میں سے "ا" اور حروف شمسی میں سے "ال" کو نکال دیا جائے۔ لیکن اگر آپ اس



ادب اور سماج

(اپریل ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں جو آل انڈیا ہندی ادبی کانفرنس ہوئی تھی اس میں بعض حوصلہ مند ادیبوں نے یہ طے کیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک ادبی وفاق قائم کیا جائے اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلی تجویز یہ تھی کہ ایک ہندی رسالہ نکالا جائے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں جو ادب شایع ہو رہا ہے اسے پیش کیا جا سکے اس خیال کے حامیوں میں منشی پریم چند بھی تھے۔ اس لئے ان کے رسالہ "ہنس" کو ہی اس کام کے لئے منتخب کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے "ہنس" برابر ہر مہینہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادب ہندی زبان میں پیش کر رہا ہے۔ ذیل میں اسی رسالہ کے ایک مضمون کو ہم درج کر رہے ہیں۔ ہم اس مضمون کو جس طرح یہ "ہنس" میں شایع ہوا ہے بجنسہٖ ویسے ہی اُردو رسم الخط میں نقل کر رہے ہیں اس سے اُردو داں طبقہ کو اندازہ ہو سکے گا کہ "ہنس" میں کس قسم کی زبان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا ہندی کے سلیس اور فصیح مضمونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی زبان غیر معمولی طور پر صاف اور سنسکرت کی گرانباری سے پاک ہے دوسرے مضمونوں کی زبان اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ اس کے شایع کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اہل ذوق قارئین اور خصوصاً ہمارے زبان کے ادیب اور معاصر ہندی ادب کی رفتار ترقی سے واقف ہو سکیں اور اپنی زبان کو وسیع اور ہمہ گیر بنانے کے لئے ضروری اصلاحی تدبیروں کو اختیار کر سکیں)۔

ایک سمے تھا جب ساہتیہ (ادب) کا سماج کے ساتھ کوئی وشیش سمبندھ نہیں تھا۔ پرنتو اس یگ میں ایسا نہیں ہے۔ آج کل ساہتیہ سماج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زمانہ گیا جب چندر کانتا اور "حاتم طائی" کی دھوم تھی۔ دور کیوں جائیے۔ ایک ہمارے مترہیں جواب بھی کبھی کبھی "طوطا مینا"

کی کہانی پڑھا کرتے ہیں۔ یدی ان سے کوئی پوچھے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو یہی کہیں گے "طبیعت نہیں مانتی"۔ "لیلےٰ مجنوں" "شیریں فرہاد" "گل بکاولی" کی کہانیاں کیا ہم اور آپ چاؤ سے فلم میں نہیں دیکھتے ہیں۔ والیس (Wallace) اور گارویس (Garvie) کا ایک سماپت نہیں ہوا ہے۔ انگلینڈ کے Penny Dread- اور Shilling Shockers fulls اب تک مشہور ہیں۔ مگر جو کچھ ہو ہم یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ سنسار کی رُچی ایسی ہے۔ جو ساہتیہ کے سچے اور گہرے پریمی ہیں وے ساہتیہ کو دوسری کسوٹی پر رکھتے ہیں۔ ان کا دیکھنے دوسرا ہوتا ہے۔ وے تکیوں کے نیچے رکھی ہوئی کہانی کی پستکوں پر تو نہیں ہوتے۔ وے نینی تال کی جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے مچھلی مارنوں میں سے نہیں ہیں جو مچھلی بھی مارتے ہیں اور کہانیاں بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ وے دھیرج اور ایکاگرتا کے ساتھ ساہتیہ کا ادھین کرتے ہیں اور وے ہی ہم کو اور آپ کو بتائیں گے کہ سماج اور ساہتیہ کا کیا سمبندھ ہے۔

جوں جوں سماج نے اُنتی کی اس کا پربھاؤ ساہتیہ پر بڑھتا گیا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ہندی ساہتیہ میں "چندرکانتا" ہی مشہور تھی۔ آج وہ سمے ہے جب لوگوں کو "سیوا سدن" پسند آتا ہے کتنا پریورتن ہو گیا! اس کا کارن یہی ہے کہ رُچی کے انوسار ساہتیہ کا بھی رنگ بدل گیا۔ لوگوں نے اپنا نیا ساہتیہ بنایا۔ ساہتیہ میں مہتو آ ہی نہیں سکتا جب تک وہ سماج سے دور رہے گا۔ چودھویں شتابدی کے فرنچ لیکھک بکچیو (Boccaccio) کو لیجئے۔ اس کی کہانیاں سنسار بھر میں مشہور ہیں۔ کئی ایک بھاشاؤں میں وہ چھپیں۔ انگلینڈ کا سب سے پہلا کوی چوسر (Chaucer) بھی اسی سمے میں ہوا۔ اس کی کینٹربری ٹیلس (Canterbury Tales) کو لیجئے، زمین اور آسمان کا انتر ہے۔ بکچیو نے من کو لبھانے والی کہانیاں لکھیں اور کداچت سنسار میں ایسے بہت کم ہیں جو اس کے سمان لکھ سکیں۔ پرنتو وہ پھر بھی سماج سے دور تھا۔ چوسر کی کہانیوں میں سماج کا پرتی دنب دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنی کہانیوں میں سماج کے کُھسیہ انگوں کی کڑی آلوچنا کی۔ اس نے مانو ہردیہ کے ساتھ ساتھ مانو سماج کا بھی ادھین کیا تھا۔ اس نے سماج کو اپنی آنکھوں سے

دیکھا تھا۔ یہی کارن ہے کہ اس کا چتر چترن بڑا ہی سچا ہے۔ اور اسی کارن اس کی کوتا میں مہتو ہے۔

جب جب ساہتیہ سماج سے الگ ہوا ہے اس میں وہ جان نہیں رہی ہے۔ وہ سُندر ہو پر نتو اس میں جیون اتھاوا شکتی نہیں رہتی۔ ساہتیہ تو ایک پرکار کا درپن ہے جس میں سماج کی مورتی صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ یدی لیکھک یا کوی اپنے کو سماج کا انگ سمجھتا ہے تو اس کی کرتیوں میں سماج اوشیہ جھلکے گا۔ اور یدی وہ اپنے کو اپنے یُگ سے الگ رکھے گا تو اس کی کتابوں میں ایک عجیب طرح کا سوار ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ وہ کلاکار ہے اور اس کے ہر دیہ کو پرتی دن کے پرشنوں سے کوئی سمبندھ نہیں۔ پرنتو اس کا ارتھ یہ نہیں ہے کہ وہ گرجت کے پادری کے سمان کھڑا ہو کر سنسار کو کھری کھری سنائے۔ ساہتیہ یعنی سچا ساہتیہ وہی ہے جس میں زبردستی کی شکشا نہ دی جائے۔ کسی کے گلے میں کڑوی دوا ٹھونسنے سے کیا لابھ؟ کیا اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ساہتیہ مانو جیون پر پربھاؤ ڈالے؟ یہی ایک ایسی بات ہوتی ہے جس سے بہت لوگوں کو ٹھوکر کھینچتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لیکھک یا کوی ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اور کہتا ہے "یہ دیکھو یہ بُرا ہے وہ بُرا ہے۔ سنسار میں یہ اوگن ہیں اور ان کو ٹھیک کرو۔ میں یہاں سے سب دیکھ رہا ہوں" تو ہم گھبرا پڑتے ہیں۔ ایسے لیکھک یا کوی اور ایک نٹ میں کیا انتر؟ نٹ بھی تو رسّی اور بانس پر الٹا لٹک کر ہماری اور پرسنتا سے تاکتا ہے۔

ساہتیہ میں شکشا ہونا تو اُچت ہے۔ پرنتو اں' پروکش روپ سے، پرکش روپ سے نہیں۔ یدی ساہتیہ جیون کا درپن ہے تو اسی درپن میں جیون کے لئے بل اور شکتی ملیں گے سنسار کے جتنے بڑے کلاکار ہوئے ہیں، انھوں نے پہلے اپنا دھرم یہی سمجھا کہ وے جیون کے رہسیہ کو ڈھونڈھیں اور پرکھیں اور تب لوگوں پر چھوڑ دیں کہ وے اس پرکھ میں اپنے لئے اودھارن اور شکتی ڈھونڈھیں۔ ہماری اپنی ہندی میں ابھی اس بات کی کمی ہے۔ اُردو میں جیسے "لیلیٰ مجنوں" اور "گل و بلبل" کے بھوت اب تک شاعروں کو تنگ کرتے ہیں اسی پرکار ہندی کے کویوں پر بھی کئی بھوت سوار ہیں۔ "لکیر کے فقیر" ہی ان کے لئے ٹھیک ہے۔ یدی ان سے کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب کیا

آپ دوسرے ڈھنگ پر نہیں آسکتے ؟ تو ناک سکوڑ کر یہی کہیں گے " دوسرا تو کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے"
بچارے اندھے سورداس اور گوسوامی تلسی داس کی تو مٹی ہے۔ جس نے چاہا اس نے روئی کے سمان
انھیں دھن ڈالا اور کہیں اتفاق سے ایسے مہاشے آدھونک یگ کی طرف جھک جاتے ہیں تو دیکھیے
کیا کرتے ہیں؟ بس پھر شکشا ہی دینے لگتے ہیں۔ کہانی لیکھکوں میں ہمارے یہاں بہت کم ایسے ہیں
جنھیں ہم اونچا استھان دے سکتے ہیں۔ پریم چند جی کا نام کوئی نہیں بھول سکتا۔ وے بھی شکشا دیتے
ہیں۔ پرنتو کم سے کم اوروں کے سمان یہ تو نہیں کہتے کہ دنیا میں دودھ کی دوکانیں ہیں شراب کہیں
بکتی ہی نہیں' ایسے ہی مہانو بھاؤ ہمارے ساہتیہ کو اونچے استھان پر بٹھا سکتے ہیں۔

ساہتیہ کو جیون سے الگ کرنا ایسا ہی ہے جیسے بیوی کو میاں سے۔ یہ سچ ہے کہ آج کل
طلاق کا زمانہ ہے۔ پرنتو خیر ہمارے یہاں اتنا زور نہیں ہے۔ ساہتیہ پر جیون کی چھاپ سدا رہتی ہے
آج کل کے روسی ناٹکوں کو دیکھیے۔ ان میں روس کی ورتمان ستھتی کا کتنا سچا درشن ہے ایسے بہت
سے ناٹک ہیں جن میں ہمیں آج کل کی روسی سبھیتا اور وچار دھارا کا پربھاؤ دکھائی دیتا ہے۔

"Inga" by (ٹیمپو) "Tempo" by Nikolai Pogodin.
"Bread" by Viladimar (انگا) Anatole Clebou.
"Fear" by Alexandar Apmogenyel. (بریڈ) Kirshon.

(فیئر) وغیرہ ناٹک آدھونک روس کی بھن بھن تصویریں ہیں۔ ان ناٹکوں کا پہلا دھیئے یہ نہیں ہے کہ
وے لوگوں کو کمیونزم (Communism) کا پاٹھ پڑھائیں۔ وے اپنی جنتا اور ان کی
کٹھنائیوں کا سچا چتر کھینچتے ہیں۔ انھیں چتروں میں ہمیں بھی شکشا دکھائی دیتی ہے۔ آدھونک انگریزی
ساہتیہ کو دیکھیے۔ وہ بھی آدھونک انگلینڈ سے الگ نہیں ہے۔ اس میں بھی انگلینڈ کی ورتمان دشا
کا چتر ہے۔ پرنتو ہمارے یہاں دوسری حالت ہے۔ ہم اور ہمارے وچار اتنے دقیانوسی ہیں کہ ہم
دھوم پان بھی کریں گے تو اپنے لکڑ دادا ہی کے حقے کو پئیں گے۔ دوسرا خریدیں گے ہی نہیں۔ یہی کارن
ہے ہمارے ساہتیہ میں اب تک سچی سمالوچنا کے لئے کوئی استھان نہیں ہے۔ ہم اب بھی باتوں کو دہراتے

ہیں اور ان میں ان ملاتے ہیں۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ کسی داس پر انگلی اٹھائے۔ نیلے رنگ کے رچھری
چل جائے۔ پرنتو کسی پراچین کوی یا ساہتیکش پر وچار برکٹ کرنا انوچت ہے۔ اس پرکار کی بھکتی سے
کیا لابھ ؟ اور اس پرکار کے بگلہ بھگتوں سے ساہتیہ کو کوئی فایدہ نہیں۔ یہی تو کارن ہے کہ آج کل جس
نے فراک "مجھے کوئی شبد انت سے بلا رہا ہے" بس ہم نے پاٹھ شالا کے لڑکوں کے سمان تالیاں
پھینکنا شروع کیں اور کہا " واللہ کیا بات کہی ہے ؟ " اس دن سے وہ رہسیاوادی کوی کہلایا
جانے لگا۔ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس نے کبیر کی سوکھی روٹیوں کو کتنا چاٹا ہے۔ مگر وہ ایک نیا
یگ ستھاپت کرنے والا رہسیاوادی کوی کہلاتا ہے۔ یدی ہمارے یہاں سمالوچنا کا پربھاؤ ہو تو ساہتیہ
میں اچکے اور رنگے سیار کبھی نہ پیدا ہوں۔ سمالوچنا کا ہونا ہی ایک پرمان ہے کہ ساہتیہ اور جیون میں
گھنشٹ سمبندھ ہے۔

جب تک ہمارے ساہتیہ میں ہمارے جیون کی چھاپ نہیں ہوگی ہمارا ساہتیہ کبھی وستریت
روپ سے پھیل نہیں سکتا۔ اور جب تک ساہتیہ پرتیک یگ کا پرتی روپ نہیں ہوگا۔ جنتا اس کو اپنائے
گی نہیں اور سادھارن منشیوں کو اس سے کوئی لابھ نہیں ہوگا۔ سماج کا درشن ساہتیہ اور کلا ہے۔ انگلینڈ
کا مہاکوی شیکسپیئر بھی اپنے یگ کا تھا۔ پرتیک یگ اپنے کوی اور اپنے کلاکار پیدا کرتا ہے اور اسی
پرکار کوی اور کلاکار بھی اپنے اپنے یگوں کا سنگار کرتے ہیں۔ سماج اور ساہتیہ دو ہردے ہیں۔ ایک
کے ہردے کی دھڑکن دوسرے کو سنائی دیتی ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب:-

تاریخ الحدیث | مؤلفہ قاضی عبدالصمد صاحب سیوہاری لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۲۰۰ صفحے۔ قیمت ۶/۔ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب مکتبہ شرقیہ دہلی۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے علم حدیث کی تاریخ میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس عنوان پر اُردو زبان میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر قاضی عبدالصمد صاحب نے اس کتاب میں حدیث کی تاریخ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ عہد بعہد کے رواۃ اور ان کی کتب، علوم حدیث اور ان کے حاملین کے طبقات اور ائمہ جرح و تعدیل کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اور کوئی گوشہ حدیث کی تاریخ کا تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ منکرین حدیث کے جوابات دینے میں حدیث کی حمایت اور عقیدت کا جذبہ ان کے اوپر غالب آگیا ہے۔ لیکن یہ مذہبی بحث ضمنی طور پر آگئی ہے۔ بحیثیت تاریخی معلومات کے یہ کتاب اُردو زبان میں قابل قدر اضافہ ہے۔

علوم الحدیث | مؤلفہ مولانا شاہ محمد عزالدین میاں صاحب پھلواروی خطیب شاہی مسجد لاہور۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۱۶۸ صفحے۔ قیمت عہ۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب بھی حدیث کی تاریخ میں ہے۔ اس میں بھی عہد بعہد کی حدیث کی کتابوں، علوم حدیث اور محدثین کے طبقات کے حالات لکھے گئے ہیں لیکن اختصار کے ساتھ۔ حجیت حدیث کی بحث بھی چھیڑی گئی ہے جو خالص مذہبی ہے اور جس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور غالباً یہی جذبہ اس کی تصنیف کا بھی محرک ہوا ہے۔ بہر صورت کتاب ابتدائی معلومات کے لئے مفید ہے۔ قیمت کسی قدر زیادہ ہے۔

ح-۱

مادرِ ہند | از حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۰ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۲ ؍ ملنے کا پتہ۔ شاد بک ڈپو چوگمرہ پٹنہ سٹی۔

یہ عجیب و غریب مثنوی حضرت شاد نے ہندوستان کے ناخوشگوار سیاسی حالات سے متاثر ہوکر لکھی ہے قصے کا خلاصہ یہ ہے۔ "کہ ایک زمانہ میں مادرِ ہند (ہندوستان) بڑے عروج پر تھی اُس کے دو سپوت رام اور رحیم بڑے میل ملاپ اور پیار اور محبت سے رہتے تھے۔ مگر بعد میں کچھ ایسی ہوا چلی کہ دونوں میں بگڑ گئی "مادرِ ہند" نے بہت کچھ اونچ نیچ سمجھائی مگر ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ آخر ہندوستان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ اور غیروں کی نظریں اُس پر پڑنے لگیں۔ تا آنکہ کچھ نووارد تجارت کے بہانے سے آئے اور مادرِ ہند پر قابض ہوگئے۔ مادرِ ہند نے پھر ان ناسمجھ بچوں کو سمجھایا اور تاجروں کو ان ناسمجھ فرزندوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی سفارش کی۔ آخر ۱۸۵۸ء کے شاہی فرمان اور ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر یہ کہانی ختم ہوگئی"۔

یہ مثنوی آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے حضرت شاد نے ملکہ معظمہ کی جوبلی کے موقع پر لکھی ہے اگرچہ ضروریات و مقتضیات ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں تاہم آخری حصے کو چھوڑ کر جس میں وفاداری کا جذبہ زیادہ نمایاں ہوگیا ہے یہ مثنوی آج بھی ہمارے لئے درسِ عبرت ہے اگرچہ یہ بڑی حد تک افسوسناک بات ہے کہ اربابِ زمانہ کی ناقدردانی کی وجہ سے اتنے طویل عرصے تک یہ کتاب منظرِ عام پر نہ آسکی لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ حضرت شاد کو کئی بار اس پر نظرِ ثانی کا موقع مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں حسن و عشق کی چاشنی نہیں ہے پھر بھی کہیں بے نمکی خشکی یا تلخی نہیں پیدا ہوئی ہے۔

الزہرا | از جناب عبدالرحمٰن صاحب کاشغری استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۸ صفحے کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۸؍ مصنف سے شبلی ہوسٹل لکھنؤ یا مکتبہ الضیاء کے پتے پر مل سکتی ہے۔

یہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کاشغری کے ان عربی قصیدوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ندوے میں

مختلف موقعوں پر پڑھے ہیں کاشغری صاحب ترکی النسل ہیں عربی کی تعلیم شروع سے آخر تک ندوے
میں پائی ہے۔ جو شخص ان کی طالب علمی کی زندگی سے واقف ہے اُسے معلوم ہے کہ انھوں نے عربی
زبان وادب کے حصول میں کس قدر محنت شاقہ برداشت کی ہے۔ شاعری کا انھیں ابتدا سے ذوق تھا اب
اس ذوق میں پختگی آچلی ہے اور یہ بات ان کے زیر نظر دیوان سے ظاہر ہے۔ کلام بے عیب ہے اور جملہ
لوازم شاعری سے مرصع ۔ البتہ بقول مقدمہ نگار صاحب ایک عجمی کے کلام کو عربی شعرا شوقی
بک، رافعی۔ احمد محرم وغیرہ کی شاعری کے معیار پر پرکھنا انصاف سے بعید ہوگا۔ بایں ہمہ بعض بعض
فقروں پر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عربی شاعر ہی یہ شعر
اسی طرح کہتا۔ شروع میں مولوی مسعود عالم صاحب ندوی ایڈیٹر الضیا (عربی) کا طویل مقدمہ
بھی ہے جو بہت محنت اور خلوص سے لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ عربی داں طبقے میں اس دیوان کی
کافی قدر ومنزلت کی جائے گی۔

یاد حالی | مرتبہ غلام طیب صاحب لکچرر اردو اورنگ آباد کالج سائز چھوٹا ضخامت ۱۳۲ صفحے کتابت
وطباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت درج نہیں غالباً پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پتے سے مل سکتی ہے۔
عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں بزم حالی کے ماتحت ۵ نومبر ۳۴ء کو مولانا حالی کی صد سالہ
برسی کا جشن بہت اہتمام سے منایا گیا تھا۔ اس موقع پر مولانا پر بہت اچھے اچھے مضمون پڑھے
گئے تھے اور ان کی مختلف حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا تھا۔ یہی مضمون اب یاد حالی کے نام سے کتابی
صورت میں مرتب کردئے گئے ہیں۔ مضمون لکھنے والوں میں مولانا عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو۔
سر شیخ عبدالقادر۔ مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل کالج۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ ڈاکٹر
محی الدین صاحب اور شیخ چاند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مضامین کے علاوہ خاص خاص پیام بھی
ہیں جو اس موقع پر ملک کے نامور لوگوں کی طرف سے بھیجے گئے ہیں چند اچھی اچھی نظمیں بھی ہیں جو
مولانا حالی پر لکھی گئی ہیں۔ غرض یہ مجموعہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور خاصے کی چیز ہے لکھائی چھپائی

میں بھی نہایت نفاست اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے شروع میں مولٰنا حالی کی تصویر ہے ہم اس کامیابی پر بزمِ حالی کے کارکنوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

یادگارِ حالی | مرتبہ منشی دیا نرائن نگم بی اے۔ سائز بڑا ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ کتابت وطباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۱۲ / ملنے کا پتہ دفتر زمانہ پریس کان پور۔

مولٰنا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب میں اُردو کے مشہور رسالہ زمانہ کان پور نے بھی نہایت اہتمام سے خاص نمبر (حالی نمبر) شائع کیا تھا۔ اسی خاص نمبر کو یادگارِ حالی کے نام سے اب کتابی شکل دے دی گئی ہے نگم صاحب نے اس پرچے یا کتاب کو بہت محنت سے مرتب کیا ہے۔ اور اس بات کی خاص طور پر کوشش کی ہے کہ حالی مرحوم کی علمی و عملی زندگی کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ مضامین میں "حالی ایک انسان کی حیثیت سے"۔ "مسدس حالی"، "مولانا حالی کا فارسی کلام" "حالی اور غزل"، خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ نظمیں بھی اچھی ہیں مولٰنا حالی کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست بھی ہے۔ آخر میں ایڈیٹر صاحب نے بتایا ہے کہ رسالہ زمانہ سے مولانا کو کتنا تعلق اور دلچسپی تھی۔ مولانا حالی اور اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی تصویریں بھی ہیں۔

اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان | از مولانا ابو الکلام آزاد تقطیع بڑی۔ ضخامت ۷۵ صفحات کتابت وطباعت اوسط کاغذ اچھا قیمت ۸ / ملنے کا پتہ۔ الہلال بک ایجنسی فاروق گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

یہ عالمانہ مضمون الہلال مرحوم کے صفحات پر شائع ہوا تھا الہلال بک ایجنسی نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے اس میں مولانا نے اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان وحزب اللہ وحزب الشیطان۔ اصحاب النار و اصحاب الجنۃ اصحاب المیمنۃ و اصحاب المشئمۃ۔ اصحاب الیمین و اصحاب الشمال

کے زیرعنوان دنیا کے دو متضاد گروہوں کی تفصیل بتائی ہے، جن حضرات کو مولانا کے اس قسم مضامین
کے مطالعے کی سعادت نصیب ہوئی ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس میں کیا کیا نکات
بیان فرمائے ہوں گے۔ الہلال بک ایجنسی مستحق ستائش ہے کہ وہ ایسی نایاب چیزیں جو مرحوم
الہلال کے فائلوں میں مدفون تھیں تفحص و تلاش کے بعد اس اہتمام سے شائع کر رہی ہے۔

افسانۂ ہجر و وصال | از مولانا ابوالکلام آزاد تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۴ صفحے کتابت و طباعت اور کاغذ
اچھا۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ الہلال بک ایجنسی فاروق گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

یہ مضمون بھی الہلال میں شائع ہوا تھا اور اب الہلال بک ایجنسی نے کتابی صورت میں شائع
کیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک دردمند دل کی آہ ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی غفلت اور بے حسی سے
متاثر ہو کر نکلی ہے۔ زبان نہایت صاف، سادہ اور سلیس۔ اور طرز بیان پر جوش اور دلوں کو ہلا
دینے والا۔

فن انشا پردازی | از جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ۔
سائز بڑا ضخامت ۱۱۵ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج
نہیں۔

یہ کتاب بقول جناب مصنف اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ نوجوانوں میں صحیح ادبی ذوق
نشو و نما پائے۔ کتاب علاوہ مقدمے اور اشاریہ کے ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں۔ کیوں
لکھیں کیا لکھیں۔ کس طرح لکھیں۔ اسلوب بیان۔ اپج پیدا کرنا بچوں کے لئے لکھنا۔ عورتیں اور
انشا پردازی۔ وغیرہ زور صاحب نے کوشش کی ہے کہ تمام کام کی باتیں کتاب میں آجائیں بعض
باتیں ایسی بھی کتاب میں درج ہو گئی ہیں، جو کچھ غیر ضروری سی معلوم ہوتی ہیں مثلاً اشاعت کے راز،
مسودہ کی تشکیل وغیرہ تاہم نومشق نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

خواب پریشان | از مولنا عنایت اللہ بی اے دہلوی۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ٹائٹل خوشنما قیمت ۸ ملنے کا پتہ شاہجہاں بک ایجنسی دہلی۔

یہ دلچسپ قصہ بھی رسالہ ساقی میں شائع ہو چکا ہے اس میں ایک فلسفی حکیم صاحب کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ اور پھر ایک خواب میں فلاسفہ یونان قدیم کے سامنے انھیں پھانسی دلوائی گئی ہے قصہ شروع سے آخر تک بہت دلچسپ ہے۔ حکیم ہندی صاحب کا کیرکٹر بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ خواب کی عبارت بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

انکشاف حقیقت | از جناب صادق الخیری بی اے دہلوی۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا قیمت ۸ ملنے کا پتہ شاہجہاں بک ایجنسی دہلی۔

یہ دلچسپ افسانہ ساقی کے کسی پچھلے افسانہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان اور ایک خاتون میں جو فرضی ناموں سے رسائل میں مضمون لکھتے ہیں خط وکتابت کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر ان دونوں میں یکایک دو ایک ملاقاتیں ہوتی ہیں تعلقات بڑھتے ہیں اور شادی ہو جاتی ہے اور پھر شکر رنجی۔ اس شکر رنجی کا اثر خاتون پر خاص طور پر پڑتا ہے وہ قریب مرگ ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں یک بیک یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ دونوں تو وہی ہیں جو پہلے فرضی ناموں خط وکتابت کرتے رہے ہیں۔ افسانہ بحیثیت مجموعی کامیاب ہے۔ صادق الخیری صاحب کو افسانے لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے ان کے قلم میں بھی شگفتگی اور اثر ہے۔

عروس ادب | از جناب قاضی عباس حسین صاحب ظریف دہلوی۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۸۰ صفحے کتابت وطباعت و کاغذ اوسط۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

یہ جناب ظریف صاحب کے ان چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو شاہجہاں، شباب اردو اور ساقی میں شائع ہو کر سند قبول حاصل کر چکے ہیں افسانے خاصے دلچسپ ہیں۔ دلی کی آسان اور

نکھری ستھری زبان میں لکھے گئے ہیں۔ موقع بموقع ظرافت کی چاشنی نے مزید لطف پیدا کر دیا ہے، فنی حیثیت سے بھی کامیاب ہیں۔ کرداروں میں بھی ایک خاص زندگی۔ اور جان ہے۔ علاوہ اس کے ہر افسانہ کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ آخر میں چند ظریفانہ غزلیں بھی ہیں۔ بہت دلچسپ۔

تاریخی ناول (افغانی و انگریزی) | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب بی اے سابق رئیس تدریسات افغانستان۔ تقطیع بڑی۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت۔ ملنے کا پتہ حمید خاں بستی نو۔ جالندھر۔

اس ناول میں جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب نے ناول کے پیرائے میں افغان اور انگریز مردوں اور عورتوں کے عادات و خصائل بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ قصہ ۱۸۴۱ء سے کچھ پہلے کا ہے جبکہ افغانستان بھی شور و شوں کا مرکز تھا۔ انگریزی فوج کابل پر حملہ کر رہی تھی اور افغانی جواں مرد دلیری سے ان حملوں کی مدافعت کر رہے تھے اسی اثناء میں ایک نوجوان افغانی اکرم پر ایک انگریز دوشیزہ کی نظر پڑ گئی اور وہ اس پر سو جان سے فدا ہو گئی۔ یہی حالت اکرم کی ہوئی تا آنکہ انگریز لڑکی مسلمان ہو گئی اور ان دونوں میں نکاح ہو گیا۔ اس سلسلے میں بہت سے دلچسپ، ہیبتناک واقعات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی کتاب میں جگہ جگہ عیسائیت کے متعلق مناظرے بھی ہیں ان میں دلائل و براہین سے تمام مذاہب پر اسلام کی برتری اور فوقیت دکھائی ہے۔ افغانستان کے پرانے ملاؤں اور قاضیوں وغیرہ کی بھی خوب قلعی کھولی گئی ہے۔ حافظ صاحب نے یہ کتاب فنی اصول کو مد نظر رکھ کر نہیں لکھی اس لئے اگر اس قسم کے نقائص ہوں تو انھیں نظر انداز کر دینا چاہیے۔

اقتباس مثنوی | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب سابق رئیس تدریسات افغانستان تقطیع چھوٹی

حضرت محمد صلعم اور اسلام | از بابو گنج لال دلوالی ام اے۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۵۹ صفحات۔ کتابت و طباعت اچھی قیمت ۸ ملنے کا پتہ بابو گنج لال دلوالی ام اے بیول (نزد دہلی)

۱۰ اگست ۲۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے آنحضرت صلعم کے روز ولادت کی تقریب پر گوالیار میں ایک جلسہ ہوا تھا بابو گنج لال اس کے صدر تھے انھوں نے اس روز ایک تقریر بھی کی تھی اور یہی صدارتی تقریر افادہ عام کی غرض سے انھوں نے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کردی ہے۔ اس میں آنحضرت کے مختصر حالات ہیں اور ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن کے معقول۔ مدلل اور مسکت جوابات ہیں بابو صاحب نے اسلام اور اس کی تاریخ کا غور و توجہ اور چشم بصیرت سے مطالعہ کیا ہے اگر ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور فرقوں کے لوگ اسی فراخ دلی سے دوسروں کے مذاہب کا مطالعہ کریں تو ان آئے دن کے جھگڑوں اور فسادوں کا نام و نشان ہی مٹ جائے جنھوں نے ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں بے شمار رخنے پیدا کردئے ہیں۔

(م-ح-ح)

رسائل:۔

کامران (ماہوار) | ایڈیٹر حاجی نبی احمد صاحب و سید ولایت حسین صاحب تقطیع بڑی حجم ۴۰ صفحے کتابت و طباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت سالانہ ۳ فی پرچہ ۴ر مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ "مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی ہمہ جہتی ترقی" کے لئے نکالا گیا ہے۔ لیکن زیادہ تر توجہ "علمائے کرام" کی اصلاح کی جانب ہے۔ شروع میں مولانا راشد الخیری مرحوم کا مضمون ہے جس میں انسداد ارتداد کے بارے میں نہایت سنجیدہ مشورے دئے گئے ہیں اس کے بعد مولانا عنایت اللہ بی اے دہلوی نے ڈانٹے کے جہنم کے ایک حصے کا ترجمہ کیا ہے اور یہی یہ کتاب کلاسکل ہے اسی طرح ترجمہ بھی ادب عالیہ میں شمار ہونے کے قابل ہے اس کے بعد تفاسیر القرآن کے عنوان سے مولانا اسلم کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے مختصر طور پر تفسیر کے مدون ہونے کی تاریخ بیان کی ہے۔ پھر

کے جشن تاج پوشی کی تقریب میں محمود آباد نمبر کے نام سے اس کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے ۔ اداریہ پیغامات اور راؤں کے علاوہ اڑتیس مضامین نظم و نثر ہیں ۔ فرمانروائے محمود آباد دام اقبالہ مہاراج کمار بیاہ محمود آباد دام اجلالہ کے ارشادات عالیہ بھی شریک اشاعت ہیں ان کے علاوہ جناب مرتب نے ملک کے تمام مشہور ادیبوں اور شاعروں کے کلام نظم و نثر سے اس پرچے کو زینت دی ہے ۔ اور بڑے سلیقے سے اس گلدستے کو سجایا ہے رسالے کی ظاہری تزئین بھی اس کی شان کے مطابق ہے اور نظامی پریس اور اس کے کارکن اس معاملے میں بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں رسالے میں گذشتہ و موجودہ فرمانروایان محمود آباد اور جشن تاج پوشی کے موقع کی تصویریں بھی ہیں ۔

المُوسی (سہ ماہی) ایڈیٹر محمد افضل الدین و سید مہدی حسین ۔ تقطیع بڑی ، ضخامت ۱۲۰ صفحات سرورق خوب صورت مقام اشاعت دفتر المُوسی سٹی کالج حیدر آباد دکن ۔

یہ رسالہ سٹی کالج کے طالب علم کئی سال سے بہت محنت اور توجہ سے نکالتے ہیں اس کا معیار بھی برابر بلند ہوتا جا رہا ہے ۔ زیر نظر نمبر اس کا بہت اچھا نمونہ ہے ۔ اس میں علاوہ طالب علموں کے بہت اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں مثلاً جناب آغا حیدر حسن صاحب حضرت فانی بدایونی ہزاکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت و صدر اعظم ۔ آخر میں مدیر کے قلم سے کالج سنسار کے زیر عنوان کالج کی مختلف دلچسپیوں کی بہت دلچسپ انداز میں روداد بیان کی گئی ہے ۔ ہم اس کامیابی پر طلبائے سٹی کالج خصوصاً اس کے مرتبین کو مبارکباد دیتے ہیں ۔

دلچسپ (ماہوار) ایڈیٹر کرم چند و عبدالحمید ۔ سائز بڑا ۔ کتابت و طباعت اوسط درجے کی ضخامت ۴۴ صفحے ۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ ۔ مقام اشاعت بمبئی ۔

یہ باتصویر رسالہ بمبئی سے نکلنا شروع ہوا ہے ۔ مضامین عام مذاق کے ہوتے ہیں ۔ تصویروں کا بھی انتظام ہے ۔

تاج (ہفت روزہ) | مرتب حضرت نشتر جالندھری و قربان علی کاظم طباعت وکتابت اور کاغذ اچھا ٹائٹل دیدہ زیب۔ قیمت سالانہ تین روپئے مقام اشاعت لاہور۔

یہ اخبار تاج کمپنی لاہور کی طرف سے نکلنا شروع ہوا ہے زیر نظر پرچہ جلد کا پہلا نمبر ہے۔ شروع میں "تاج کے خیر مقدم" کے عنوان سے جناب خاں صاحب ابو الاثر حفیظ جالندھری صاحب کی ایک نظم ہے۔ دوسرے صفحے پر "جنگ بدر" کی تفصیل ہے پھر آغاز سفر کے عنوان سے افتتاحیہ ہے جو جناب نشتر نے بڑے جوش اور ولولے سے لکھا ہے پھر شذرات ہیں۔ اس کے بعد خبروں کا انتخاب ہے۔ پھر خاموش غلیل کے عنوان سے ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ [illegible] و دیا پر حضرت سالک کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔ اس کے بعد مسلمان بچیوں کی تعلیم کی ابتداء پر ممتاز رفیع بیگم صاحبہ نے ایک مضمون لکھا ہے۔ پرچہ بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور نشتر صاحب کی یہی توجہ رہی تو آئندہ اس سے بہت کچھ امیدیں قائم کی جاسکتی ہیں۔

رہنما (ہفت روزہ) رئیس التحریر ابو سعید صاحب بزمی ام اے کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت سالانہ عمر مقام اشاعت بھوپال۔

یہ اخبار بھوپال کے عوام کا ترجمان ہے افسران حکومت پر آزادی سے نکتہ چینی کرتا ہے۔ لب ولہجہ متین و سنجیدہ ہے۔

(م۔ح۔ح)

دکن کے زمانہ ماقبل تاریخ کی یادگاریں | از غلام یزدانی صاحب، ایم اے، ایف اے ایس بی، ناظم محکمہ آثار قدیمہ سرکار عالی و ماہر کتبات اسلامیہ سرکار عظمت مدار سلسلہ مطبوعات سرکار عالی۔ حجم ۱۰۰ صفحے، قیمت ۱۰ر۔ با تصویر۔

یہ نہایت ہی دیدہ زیب رسالہ غلام یزدانی صاحب کی ایک تقریر ہے جو انھوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۳۹ء کو حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشن سے کی تھی۔ دہلی کی طرح حیدرآباد میں بھی ریڈیو کی تقریروں کا مختصر ہونا شرط

ہے اور سب کچھ دیکھتے ہوئے بہتر بھی یہی ہے، پھر بھی جب غلام یزدانی صاحب کی سی قابلیت اور وسیع معلومات رکھنے والے ریڈیو کو اپنی تقریر کا شرف بخشیں تو جی چاہتا ہے کہ ایسا کوئی قاعدہ نہ ہوتا۔ رسالہ کے اختصار کا سبب یہی ہے، لیکن ان دس صفحوں میں دکن کے زمانہ قبل تاریخ کی نسبت جو کچھ معلوم ہو جاتا ہے اس کے آگے ہے بھی بہت کم۔ یزدانی صاحب مختصر تقریر کریں یا کوئی اور موٹی کتاب لکھے، پڑھنے والے کو حال قریب قریب اتنا ہی ہوگا۔

زندوں کا حال مردوں سے معلوم کرنا، زندگی کا آثار قدیمہ سے، مکانوں کا قبروں سے اور مقبروں سے، بڑا مشکل اگرچہ بہت ہی دلچسپ کام ہے۔ جب حقیقت تک پہنچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اسی شکل دلچسپی کو اختیار کرنا پڑتا ہے، اصاب تک ہندوستان اور دکن کے آثار قدیمہ کے محکموں سے علم تاریخ کو جو فیض پہنچا ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ غلام یزدانی صاحب کے شوق اور محنت کی بدولت ریاست حیدرآباد کے محکمہ آثار قدیمہ نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں ان کا اندازہ اس محکمے کی سالانہ رپورٹوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے، مگر شمالی ہندوستان میں ان خدمات کا اعتراف بھی کیا جائے تو ذکر نہیں کیا جاتا۔ سبب نہ پوچھئے، بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بہر حال، یہ تو ثابت ہے کہ ریاست حیدرآباد اور برطانوی ہند کے محکمہ آثار قدیمہ نے جو انکشافات کئے ہیں انھوں نے قدیم تاریخ ہند کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ اب نہ آریوں کی قدامت کوئی ایسی قدامت رہی ہے، نہ ان کا مذہب خاص، نہ تہذیب دوسروں سے بہتر۔ ایک محقق کی رائے میں تو نہ ان کا رنگ صاف تھا نہ ناک اونچی نہ ڈیل لامبا، یعنی وہ باہر سے نہیں آئے تھے، یہیں کے لوگ تھے، دوسروں کو جنھیں وہ اپنے مخالف جانتے تھے، انھوں نے جی میں آیا تو غلام اصلی میں آیا تو بھوت پریت کہہ دیا۔ ان کی زبان ایک خاص مت کی زبان تھی اسے سمجھنے والے وہی تھے جن کا خود ستائی میں فائدہ تھا، لہٰذا انھوں نے جیسا چاہا قانون بنایا اور جس کو چاہا دیوتا بنایا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ انھیں اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرنے میں اپنا فائدہ نظر آیا یعنی انھوں اندر اور ورن سے منہ پھیر کر شو اور وشنو (کرشن) کو سجدہ کیا اور اپنی لاج رکھنے کے لئے دیوتاؤں کے نسب نامے اور تخیلی علامات کو

[illegible]

نااہل بادشاہ کی آبرو قائم رکھی، کمینوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی' اور خود غرضیوں اور حماقتوں میں گھر کر بھی کبھی سیدھے ایمانداری کے رستے سے ایک قدم نہ ہٹایا۔ ریاست کے وفادار اور جاں باز خادم اور بھی تھے، جو محمد خاں بنگش کی طرح تباہ ہوئے۔ اس لئے کہ وہ ہر داؤ پر سب کچھ لگا دیتے تھے اور کھیل میں ماہر نہ تھے، ان کی شکست میں بے شک مردانگی کی شان نظر آتی ہے مگر دنیا میں مردانگی کے علاوہ اور اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں۔ نظام الملک شمالی ہندوستان کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے نہیں بچا سکا، نادر شاہ کو نہ روک سکا نہ لوٹا سکا، پر یہ کیا کم ہے کہ اس نے دکن کے صوبے کو مرہٹوں سے پاک کر دیا، اور اس وقت جب کہ اس کا سر جھکانے والا کوئی نہ تھا اس نے بزرگوں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپنا سر جھکائے رکھا، اور شاہان مغلیہ کی آبرو رکھی۔ ہوشیار سپہ سالار بھی یہی کرتے ہیں کہ جب پوری فوج کو بچانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو ایک حصے کو بچالیتے ہیں اور اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

یوسف صاحب کی تصنیف تحقیق کے موجودہ معیار پر پوری اُترتی ہے، ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور کتب خانہ آصفیہ اور دفتر دیوانی میں انھیں قلمی کتابوں اور کاغذات اور اسناد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مل گیا ہے جو دوسرے مورخوں کو میسر نہ تھا۔ اس ذخیرے سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور ان کی کتاب نہایت مستند ہے۔ ان کے طرز تحریر میں بھی ایک محتاط عالم کا انداز نظر آتا ہے، اور اگرچہ وہ اپنے ہیرو کے بہت معتقد معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اس عقیدت کو ثبوت اور سند کا پابند رکھا ہے۔ ان کے اس احتیاط سے نظام الملک کی شخصیت گھاٹے میں نہیں رہتی، کیونکہ پس منظر صاف ہو تو اصل تصویر خود بخود اُبھر آتی ہے، اور یوسف صاحب پس منظر کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ نظام الملک کی عاقبت بینی اور مصلحت اندیشی کو بھی نمایاں کرتے رہے ہیں۔ ان کی تصنیف میں کوئی کمی محسوس ہوگی تو انھیں لوگوں کو جو 'شاعری' کو تاریخ کا رس سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر متین اور سنجیدہ عالموں کی گھڑکیاں بھی سہنے کو تیار ہوتے ہیں۔

نذرِ حسینؑ

رُباعی

آنکھیں غمِ شبیرؑ میں تر ہیں دونوں ۔ ہم پہلوئے دردِ دل جگر ہیں دونوں
عاشورہ و چہلم کی عزاداری سے ۔ یک رنگ، محرم و صفر ہیں دونوں
لیتا ہے شقی کا نام کب کوئی کہیں ۔ لیکن لقبِ سعد ہے ہر دل میں مکیں
ہے نام بد و نیک کی نسبت کا یہ فرق ۔ لاکھوں ہیں حسینؑ، اور یزید ایک نہیں

سلام

کیا پوچھتا ہے کوئی محرم میں کیا ہوا ۔ گھر کربلا میں، ذبح شہِ کربلا ہوا
حشر کربلا کی زمیں میں بپا ہوا ۔ بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا جدا ہوا
کیوں فرشِ کربلا کو نہ عرشِ علا کہوں ۔ ہے سلسلہ نبی سے خدا تک ملا ہوا

قطعہ

احوالِ کربلا سبق آموزِ عام ہے ۔ دنیا پر اُس کے فیض کا در ہے کھلا ہوا
لیکن طلسم سازِ فریبِ نگاہ ہے ۔ آنکھوں پہ غفلتوں کا ہے پردہ پڑا ہوا
اٹھ جائے یہ حجاب تو ہو جائے یہ عیاں ۔ ہر ذرہ ہے چراغِ ہدایت بنا ہوا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اردو مثلاً مرزا غالب، خواجہ حالی، علامہ شبلی، مولانا آزاد، مولانا شرر، علامہ اقبال منشی پریم چند اور اردو کے جملہ مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، حیدرآباد اورنگ آباد، اعظم گڈھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت ہمارے یہاں موجود رہتی ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرماکر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں۔

رعایت مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف ہوسکتا ہے بشرطیکہ

(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔

(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ پانچ روپیہ سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔ البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہوگا۔

مکتبہ جامعہ کے مندرجہ ذیل رسائل کے نمونے مفت طلب کیجئے

"رسالہ جامعہ" ماہوار	با تصویر "پیام تعلیم" ماہوار	"کتاب نما" ماہوار
سالانہ چندہ (ص)	سالانہ چندہ (عہ)	سالانہ چندہ (۸)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سنہری موقعہ

صیغہ بجلی کے ملازمین کی تنخواہ میں پچاس فی صدی اضافہ

بجلی کے صیغہ میں کام کرنے والے مستریاں۔ الیکٹریشنوں۔ وائرمینوں۔ لائن مینوں۔ الیکٹرک فرٹروں۔ میٹر ریڈروں وغیرہ وغیرہ کی کامیابی اور بہبودی کے لئے تحریر کیا جاتا ہے۔ کہ جو ملازمین کسی بجلی کی تعلیم گاہ کے باقاعدہ سند یافتہ نہ ہوں اور اپنے عملی تجربہ کی وجہ سے بجلی کے کام میں خاصی مہارت رکھتے ہوں وہ ہماری درس گاہ کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کرکے اپنا عہدہ بڑھا سکتے ہیں۔ جس سے ان کی تنخواہ میں کم از کم پچاس فیصدی اضافہ ہوسکتا ہے۔

انسٹیٹیوٹ ہذا میں ان کی قابلیت کے معیار کے مطابق پرائیوٹ امتحانات وغیرہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ بجلی کے محکمہ کے اکثر ملازمین ہمارے امتحانات پاس کرکے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب مندرجہ ذیل پتہ سے خط و کتابت کریں۔

منیجر پنجاب انجنیرنگ انسٹیٹیوٹ جالندھر شہر

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن

دوسری جلد

سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک

یہ جلد اپنی نوعیت میں پہلی جلد سے بھی زیادہ اہتمام بالشان ہے۔ یعنی حواشی زیادہ مفصل اور دلکش اور اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔ طباعت و کتابت بھی بہتر ہے۔ چونکہ سورۂ یوسف، انفال، توبہ، کہف، مریم، انبیاء وغیرہ اس حصے میں آگئی ہیں اور مولانا کو کتابت کے جدید انتظام کے باعث جی کھول کر بحث کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس لئے کتاب اپنے رنگ میں بے نظیر ہوگئی ہے۔

ہدیہ بلا جلد [illegible] مجلد [illegible]

جلد اول صرف مجلد مل سکتی ہے ہدیہ [illegible]

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔